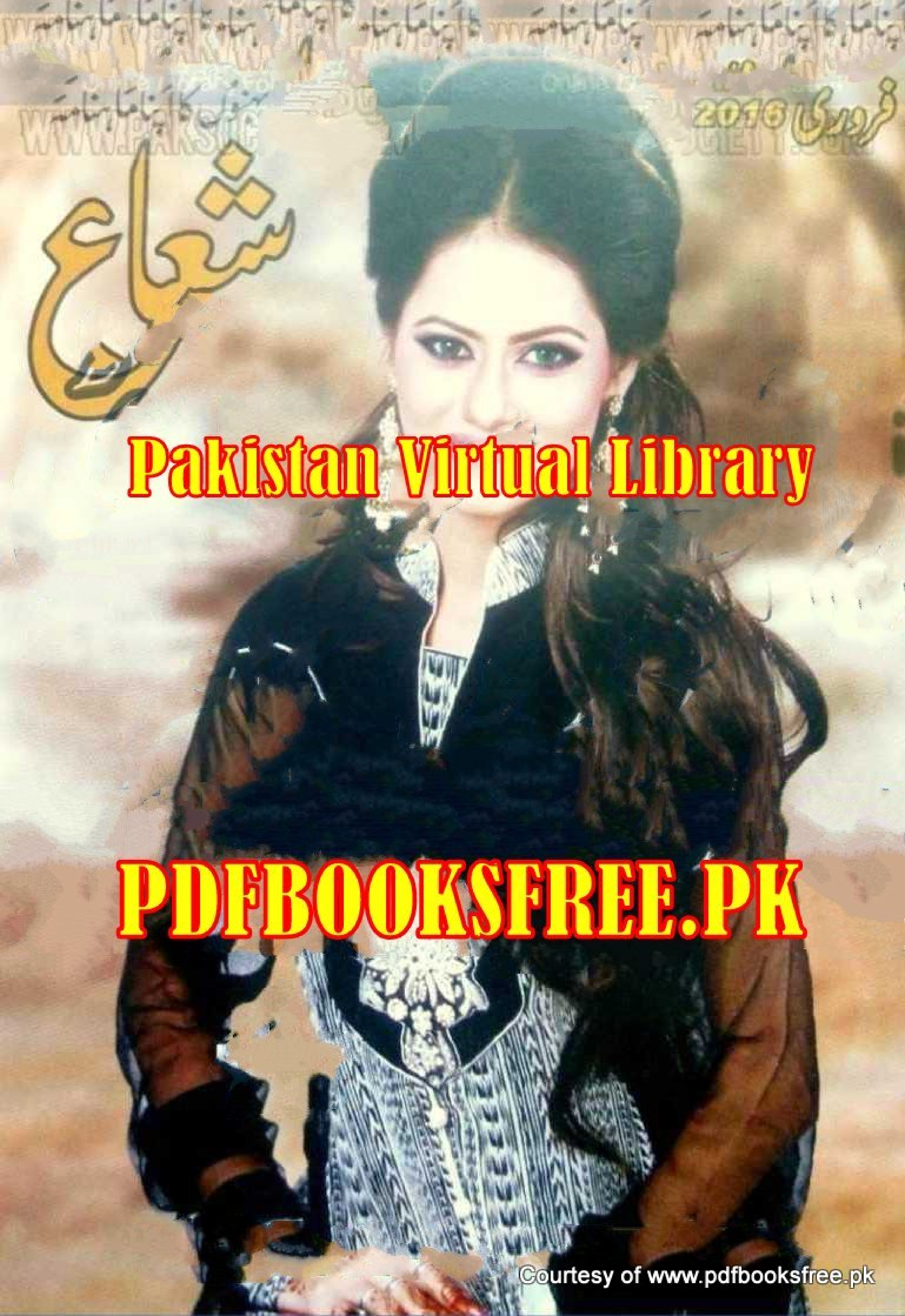


شعاع
فروری 2016
Pakistan Virtual Library
PDFBOOKSFREE.PK
Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

محمود ریاض

رضیہ جمیل

آذر ریاض

امت الصبور

شاہین رشید

خالدہ جیلانی

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 7000 روپے





فروری 2016

جلد 30 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۰۱ بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website

نگہت جمیل



شعاع فروری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

وقت کی رفتار تیز ہوئی ہے تو تبدیلی کا عمل بھی تیز ہو گیا ہے۔ بہت کچھ بدل گیا ہے۔ سوچ، فکر، عمل، رشتے، اقدار ہر چیز تیزی سے بدل رہی ہے۔ تغیر ہی راز حیات ہے۔ صنعتی زندگی، عالمی دہشت گردی، خوف، انتشار اور پریشانی نے سوچ و فکر پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ تیز تر تبدیلی کے اس عمل میں انسان پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی پہچان گم ہو گئی ہے۔ اس کی فطرت میں جو عنصر شامل کیے گئے ہیں ان سے انحراف نے اسے سکون قلب سے محروم کر دیا ہے۔

انسان نے ازل سے ہی اس کائنات کو سنوارنے کے، آنے والے زمانوں کو بہتر بنانے کے، تیرگی کو روشنی میں بدلنے کے اس محدود زندگی کو لامحدود بنانے کے خواب دیکھے ہیں اور ان کی تعبیر پانے کی کوششوں نے ہی زندگی کو ترقی کی بلندیوں سے ہم کنار کیا ہے۔

عہد حاضر کی برق رفتار زندگی اور ہر لحہ تیزی سے بدلتی دنیا میں وہ خواب دھندلا گئے ہیں۔ اس ہماہمی میں انسان اپنی فطرت اپنے اصل سے بچھڑ کر زندگی کی سچائیوں کی پہچان کھو بیٹھا ہے۔

جو کچھ ہمیں دکھایا جاتا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے۔ ہمیں نظر آتا ہے، وہ پورا سچ نہیں ہے۔ حقیقت اس سے دور کہیں پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ حقیقت کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے اس نظر کی ضرورت ہے جو ہر تعصب سے پاک ہو۔ تہذیبی لسانی اختلافات، مذہب، مسلک ہر تفریق سے بالاتر ہو۔ غلط اور صحیح کی پہچان رکھتی ہو۔ اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے نکال کر وسعتوں سے ہم کنار کیجیے۔ ایک اچھا انسان بہت قیمتی ہوتا ہے۔ خواہ وہ اپنا ہو یا پرایا۔ وہ جہاں بھی رہے۔ اس کے وجود کی خوشبو ارد گرد کی فضا کو معطر رکھتی ہے۔ اپنی سوچ کے دائرے کو وسیع کر کے معنویت دیں۔ تب ہی باہمی اعتماد کی فضا ہموار ہو گی اور ہمیں اور ہمارے بعد آنے والوں کے مستقبل کو استحکام مل سکے گا۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ تم میری ہو،
- مصباح اعوان کا مکمل ناول۔ ستارۂ زیست،
- نگہت عبداللہ، صائمہ اکرم اور سمیرا حمید کے ناولٹ،
- حنا یاسمین، قرۃ العین رائے، آئینہ ملک، ثمینہ فرحان اور ندا حسنین کے افسانے،
- کرکٹر سرفراز احمد اور خوش بخت سرفراز کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- جب مجھ سے ناتا جوڑا ہے۔ قارئین کا سلسلہ،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی ذہانت کے آئینہ دار، آپ کے خط صرف آپ کی رائے جاننے کا ذریعہ نہیں بلکہ ہمارے اور ہماری قارئین کے لیے دل چسپی کا باعث بھی ہیں۔ شعاع پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

نامور کو ایک پل میں کر دے تُو گمنام بھی
گر کرم فرمائے تو بن جائیں بگڑے کام بھی

تُو جسے چاہے کشادہ رزق ہو اُس کو عطا
ہو غضب تیرا تو مانگیں بھیک سارے اغنیاً

دستِ قدرت میں ترے ہر ذی نفس کی جان ہے
جو تجھے مانے اکیلا صاحبِ ایمان ہے

گلشنِ ہستی کو تُو چاہے تو ویرانہ کرے
صاحبِ فہم و ذکا کو چاہے دیوانہ کرے

ہے پرندوں کو فضاؤں میں اُڑانا تیرا کام
مجرموں کو سیدھی راہوں پر لگانا تیرا کام

تُو اگر چاہے بنیں مثلِ گلستاں، ریگزار
قادرِ مطلق یقیناً ہے تُو ہی پروردگار

خشک بیجوں سے نکالے سبز کونپل بالیقیں
تیری قدرت کا جہاں بھر میں کوئی ثانی نہیں

ریاض حسین قمر



محرومیوں کی رات اندھیری تھی ڈھل گئی
شمع تھی اُن کے نور کی سینے میں جل گئی

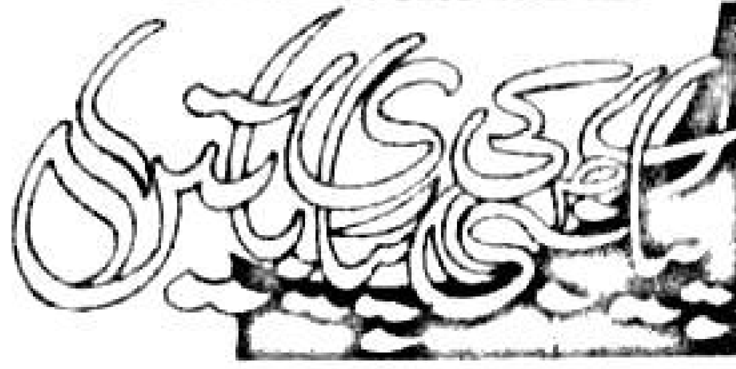
مجھ کو میرے حضورؐ کے در پہ بُلا لیا
قسمت میری رب کے کرم سے بدل گئی

دیکھا جو روضہ پاک تو آنسو نکل پڑے
جو بات دل میں تھی وہ زباں سے نکل گئی

چوکھٹ پہ سر جھکایا تو محسوس یہ ہوا
بدلی میرے گناہوں کی میرے سر سے ٹل گئی

ساحل نے میرا ہاتھ لیا تھام اے فدا
کشتی میری بھنور سے سلامت نکل گئی

فدا حسین فدا عطال



اعتدال کی راہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اعتدال اختیار کرو اور سیدھے رہو۔ تم میں سے کسی کو بھی اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔''

حاضرین نے کہا۔

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو بھی نہیں؟''

فرمایا ''مجھے بھی نہیں، سوائے اس کے کہ اللہ مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل میں چھپالے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اعتدال کا مطلب افراط و تفریط سے اجتناب ہے، یعنی نہ تو بدعت کا ارتکاب کیا جائے اور نہ فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی جائے۔

2۔ جنت اصل میں اعمال کا بدلہ نہیں بلکہ اللہ کی خاص رحمت ہے کیونکہ بندے کے نیک اعمال اللہ کے احسانات کے مقابلے میں انتہائی حقیر ہیں بلکہ ان اعمال کی توفیق بھی اللہ کا احسان ہے۔

3۔ اصل مقصود اللہ کی رضا کا حصول اور جہنم سے نجات ہے۔

4۔ نیک اعمال کا مقصد اللہ کی رحمت کا حصول ہے۔ اس کے نتیجے میں جنت بھی مل جائے گی اور جہنم سے بچاؤ بھی ہو جائے گا۔

دکھاوے اور شہرت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ عزوجل فرماتا ہے: میں دوسرے شریکوں کے مقابلے میں، شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ جس نے (بظاہر) میرے لیے عمل کیا، اس میں میرے سوا کسی اور کو بھی شریک کرلیا تو میں اس سے لاتعلق ہو جاتا ہوں۔ اور وہ (عمل) اسی کے لیے ہوتا ہے جس کو اس نے (میرا) شریک بنایا۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کسی اور کو شریک کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دکھاوے کے لیے کام کیا جائے جس کے ذریعے سے اسے دنیوی مفاد حاصل ہو یا لوگوں کی نظر میں متقی اور پارسا کہلائے۔

2۔ ایسا عمل اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتا۔

3۔ وہ عمل دوسرے کے لیے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا کوئی ثواب نہیں دیتا۔ اگر ریاکار ثواب کا طالب ہے تو اسی انسان سے ثواب لے جس کو دکھانے کے لیے اس نے کام کیا ہے۔ ظاہر ہے انسان دوسرے انسان کو نیکی کا بدلہ نہیں دے سکتا، اس لیے قیامت کے دن ریاکار کو شرمندگی ہوگی اور اسے عمل کا کوئی ثواب یا فائدہ نہیں ملے گا۔

4۔ ریاکاری شرک اصغر ہے۔ اس سے وہ عمل تباہ ہو جاتا ہے جس میں ریا شامل ہو، تاہم یہ شرک اکبر نہیں جس کی سزا دائمی جہنم ہے۔

صرف اللہ کے لیے

صحابی رسول حضرت ابو سعد بن ابو فضالہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے تمام انسانوں کو جمع کرے گا' اور وہ دن ایسا ہے جس میں کوئی شک نہیں' تب ایک اعلان کرنے والا اعلان کرے گا: جس نے اللہ کے لیے کیے ہوئے عمل میں (کسی کو) شریک کیا' وہ اس عمل کا ثواب غیر اللہ ہی سے مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ دوسرے شریکوں کے مقابلے میں شراکت سے سب سے زیادہ بے نیاز ہے۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ ریاکاری قیامت کے دن رسوائی کا باعث ہے۔

2۔ ثواب دینا صرف اللہ کا کام ہے' لہٰذا کوئی کسی سے کوئی ثواب حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لحاظ سے ریاکاری والے اعمال بے کار ہیں جن کا ثواب نہ اللہ تعالیٰ دے گا' نہ عوام دے سکیں گے۔

3۔ ریاکاری قیامت کے دن شرمندگی کا باعث ہو گی۔

دجال سے زیادہ خطرناک

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس (گھر سے) باہر تشریف لائے جب کہ ہم مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا۔

"کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟"

ہم نے کہا: کیوں نہیں (فرمائیے۔)"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چھپا ہوا شرک۔ (وہ یہ ہے) کہ آدمی نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے' جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے تو اپنی نماز کو خوب صورت بناتا ہے۔" (احمد)

فوائد و مسائل:

1۔ ریاکاری دجال سے زیادہ خطرناک اس لیے ہے کہ دجال کھلا دشمن ہے' اس کا کفر واضح ہے جبکہ ریاکار کا عمل بظاہر نیکی کا عمل ہوتا ہے۔

2۔ اسے پوشیدہ شرک اس لیے کہا گیا ہے کہ کسی بت' درخت' قبر' چاند' سورج وغیرہ کی پوجا کرنے والا یا اسے سجدہ کرنے والا سب کو نظر آتا ہے کہ یہ غیر اللہ کی عبادت کر رہا ہے۔ اس کا شرک واضح ہوتا ہے۔ لیکن ریاکاری کرنے والا بظاہر اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے یا رکوع سجود میں مشغول ہوتا ہے' اسے دیکھ کر پتا نہیں چلتا کہ یہ اللہ کی رضا کے لیے نماز نہیں پڑھ رہا بلکہ اپنے نفس کی پوجا کر رہا ہے۔

3۔ اگر نیکی کرنے والے کی نیت یہ ہو کہ اس کی تعریف کی جائے تو یہ ریا ہے لیکن اگر اس کی نیت یہ نہیں' لوگوں کو ویسے ہی اس کی نیکی کا علم ہو جاتا ہے اور وہ تعریف کرتے ہیں' اس میں عمل کرنے والے کا قصور نہیں۔

4۔ جس طرح یہ جائز نہیں کہ نماز پڑھنے والے کو کوئی دیکھ لے تو وہ نماز لمبی کر دے' اس طرح یہ بھی درست نہیں کہ لمبی سورت پڑھنا شروع کی ہے' اچانک کوئی آ گیا تو نماز مختصر کر دے بلکہ اپنی پہلی نیت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

5۔ نماز کے علاوہ دوسرے اعمال کا بھی یہی حکم ہے' مثلاً" صدقہ' جہاد وغیرہ۔

شہرت کے لیے

حضرت جندب (بن عبداللہ بن سفیان) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو دکھلاوا کرے گا' اللہ اس کی حقیقت ظاہر کر دے گا اور جو شہرت کے لیے نیکی کرتا ہے' اللہ اس کی تشہیر کرے گا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ ریاکاری کرنے والا کام اس لیے کرتا ہے کہ لوگوں میں اس کی خوبی کی شہرت ہو اور وہ اس کی تعریف اور عزت کریں لیکن اللہ تعالیٰ لوگوں کے سامنے اس کی یہ بری نیت ظاہر کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بدنام ہو جاتا ہے اور اس کی عزت ختم ہو جاتی ہے۔

2۔ اس حدیث کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب مخلوق کے سامنے یہ ظاہر فرمادے گا کہ یہ شخص اخلاص کے ساتھ نیکی نہیں کرتا تھا جس سے سب کے سامنے اس کی بے عزتی ہو جائے گی۔

حسد کا بیان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حسد (رشک) صرف دو ہی کاموں میں جائز ہے۔ ایک وہ شخص جس کو اللہ نے مال دیا اور اسے حق کی راہ میں خرچ کرنے پر لگا دیا۔ (اس پر رشک کرنا چاہیے۔" اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے (دین کی) سمجھ دی، وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ "حسد" کا اصل مفہوم یہ ہے کہ کسی کو اللہ کی طرف سے نعمت ملی ہو تو اسے دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہو کہ اس کی یہ نعمت ختم ہو جائے۔ یہ جذبہ رکھنا بہت بڑا گناہ ہے۔ اس حدیث میں حسد سے مراد "رشک" ہے، یعنی یہ خواہش کرنا کہ جیسی نعمت اس کے پاس ہے ویسی مجھے بھی مل جائے یہ جائز ہے۔

2۔ حسد تو کسی پر بھی جائز نہیں۔ رشک بھی دنیا کی دولت، شہرت اور حکومت پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ کسی کا نیک عمل ہی اس قابل ہے کہ اس طرح کا عمل کرنے کی کوشش کی جائے۔

3۔ خوبیوں میں سب سے زیادہ قابل رشک دو خوبیاں ہیں: سخاوت اور علم۔ یہ عمل بھی تب خوبیوں میں شمار ہو سکتے ہیں جب اللہ کی رضا کے لیے خلوص کے ساتھ انجام دیے جائیں ورنہ شہرت کے لیے حاصل کیا جانے والا علم اور خرچ کیا جانے والا مال سخت ترین سزا اور شدید عذاب کا باعث ہوگا۔ اللہ محفوظ رکھے۔

صرف دو کام

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حسد (رشک) صرف دو کاموں میں جائز ہے۔ ایک اس آدمی سے (رشک کرنا چاہیے) جسے اللہ نے قرآن (کا علم) دیا، وہ رات کے اوقات میں بھی اس پر قائم رہتا ہے اور دن کے اوقات میں بھی۔ اور (دوسرا) وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا، وہ رات کے اوقات میں بھی اسے (نیکی کے کاموں میں) خرچ کرتا ہے اور دن کے اوقات میں بھی (اس پر رشک کرنا چاہیے۔") (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ قرآن پر عمل کرنا بھی ہے اور نماز کے قیام میں اس کی تلاوت بھی، خواہ فرض نمازوں میں، ہو یا نوافل و تہجد میں۔

2۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

3۔ مسجدوں کے میناروں اور دیواروں کی زیب و زینت کے بجائے علماء اور طلباء پر خرچ کرنا زیادہ ثواب ہے۔ اسی طرح مسجد کے مفلس یا مقروض نمازی اور مسجد کے قرب و جوار میں رہنے والے مدد کے مستحق غریب آدمیوں کو دینا زیادہ ضروری ہے۔ مسجد سادہ رہے تو افضل ہے۔

ظلم و زیادتی

حضرت ابوبکرہ (نفیع بن حارث ثقفی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"زیادتی اور قطع رحمی سے بڑھ کر کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی جلدی دے دیتا ہے جب کہ اس کے ساتھ اس کے لیے آخرت کا عذاب بھی سنبھال رکھتا ہے۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ ظلم و زیادتی سے پرہیز کرنا انتہائی ضروری ہے کیونکہ اسلام کی اہم خوبی عدل اور رحم ہے۔

2۔ ظلم اور رشتہ داروں سے بدسلوکی کی سزا دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں بھی، خواہ ظلم کسی انسان پر کیا جائے یا کسی حیوان پر۔

مسلمان کی تحقیر

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"انسان کے لیے اتنی برائی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے (یا اسے حقیر جانے)۔"

فوائد و مسائل :

1۔ مسلمان کو ذلیل کرنا یا اسے حقیر اور کم تر سمجھ کر بدسلوکی کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

2۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی میں صرف یہی عیب ہو، کوئی اور عیب نہ ہو تو اسے برا آدمی قرار دینے کے لیے یہی عیب کافی ہے۔

تواضع

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی نازل کی ہے کہ تواضع اختیار کرو اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل :

مسلمان پر ہر قسم کی زیادتی کرنا حرام ہے۔

احتیاط اور تقویٰ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت عطیہ (بن عروہ) سعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بندہ تقویٰ کے (بلند) مقام تک نہیں پہنچتا حتیٰ کہ حرج والی چیز سے بچنے کے لیے وہ چیز بھی چھوڑ دے جس میں حرج نہیں (لیکن شک ہے کہ شاید منع ہو)۔" (ترمذی)

افضل کون ہے

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا۔

"کون سا آدمی افضل ہے؟" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر صاف دل والا، سچی زبان والا۔"

صحابہ نے عرض کیا: "سچی زبان والا تو ہم جانتے ہیں، صاف دل والا کون ہوتا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پرہیزگار، پاک باز، جس (کے دل) میں نہ کوئی گناہ ہو، نہ زیادتی، نہ کینہ نہ حسد۔" (مکارم الاخلاق)

فوائد و مسائل :

1۔ دل کی صفائی اور پاکیزگی آخرت میں نجات کا باعث ہے۔

2۔ متقی آدمی دوسروں سے افضل ہے۔

3۔ کینہ کا مطلب ہے دل میں ناراضی رکھنا تاکہ موقع ملنے پر بدلہ لیا جاسکے۔ یہ بہت ہی بری عادت ہے۔

متقی

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ! متقی ہو جا، تو سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہو جائے گا۔ قناعت پسند بن جا، تو سب سے زیادہ شکر گزار ہو جائے گا۔ لوگوں کے لیے وہی کچھ پسند کر جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، تو مومن بن جائے گا۔ اپنے ہمسائے کے ساتھ ہمسائیگی کا اچھا تعلق رکھ، تو مسلم بن جائے گا، اور ہنسا کم کر دے کیونکہ زیادہ ہنسی دل کو مردہ کر دیتی ہے۔" (ابن ماجہ)

فوائد و مسائل :

1۔ جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اعمال عبادت میں شامل ہیں، اسی طرح گناہوں اور مشکوک کاموں سے پرہیز کرنا بھی عبادت کا ایک پہلو ہے۔ زیادہ عبادت

گزارہ ہے جو عبادت کے دونوں پہلو مدنظر رکھے۔

2۔ موجود نعمتوں پر مطمئن نہ ہونا اور مزید کی حرص رکھنا' دل میں شکر کے جذبات پیدا نہیں ہونے دیتا۔ شکر کے لیے ضروری ہے کہ موجود نعمتوں کی اہمیت اور فوائد کو مدنظر رکھا جائے۔ اس سے اللہ کے احسانات کا احساس پیدا ہوگا اور بندہ شکر گزار بن جائے گا۔

3۔ مومن کی امتیازی صفت دوسروں سے حسن سلوک ہے۔

4۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ زیادہ اختلافات ان سے پیدا ہوتے ہیں جن کے ساتھ زیادہ میل ملاپ ہوتا ہے اور انسان کو ہمسایوں سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے' لہٰذا ہمسایوں سے حسن سلوک کا عادی سب کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آتا ہے' اس طرح وہ صحیح مسلمان بن جاتا ہے۔

5۔ زیادہ ہنسنا غفلت کو ظاہر کرتا ہے اور غفلت و بے پروائی مردہ دلی کی علامت ہے اور دل جب مردہ ہو جائے تو اسے اپنے اخروی نفع و نقصان کا احساس نہیں رہتا'

اس لیے ہنسی مذاق کی زیادتی بری بات ہے' البتہ خندہ پیشانی اچھی صفت ہے۔

حسب و شرف

حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حسب مال ہے' اور شرف تقویٰ ہے۔"

(ترمذی)

فوائد و مسائل :

1۔ لوگ مال کو دیکھ کر عزت کرتے ہیں۔ اونچے خاندان کا ایک آدمی غریب ہو جائے تو اس کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ لوگوں کے ہاں یہ کیفیت ہے۔

2۔ اصل چیز جو عزت و احترام کا باعث ہونی چاہیے وہ کسی کی نیکی اور پرہیزگاری ہے۔ اصل شرف یہی ہے' اس لیے آخرت میں تقویٰ کی بنیاد پر ہی عزت ملے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ "اللہ کے ہاں زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔" (الحجرات۔13)

اچھی رائے عامہ

حضرت ابو زہیر (معاذ بن رباح) ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نباوہ یا بناوہ کے مقام پر ہم سے خطاب فرمایا' یہ مقام طائف کے قریب ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہو سکتا ہے تم جنتیوں اور جہنمیوں کو الگ الگ پہچان لو۔"

ہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول اللہ صلی علیہ وسلم! کس علامت سے؟"

فرمایا: "اچھی رائے کے اظہار سے' اور بری رائے کے اظہار سے۔ تم ایک دوسرے پر اللہ کے گواہ ہو۔"

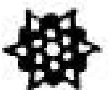
فوائد و مسائل :

1۔ نیک متقی آدمی اسی کی تعریف کر سکتا ہے۔ جس میں وہ واقعی اچھی صفات دیکھے کیونکہ متقی خوشامد اور چاپلوسی نہیں کر سکتا۔

2۔ نیک متقی آدمی اسی کو برا کہے گا جس میں واقعی بری عادات موجود ہوں کیونکہ وہ جھوٹ بول کر کسی کو بدنام نہیں کرتا۔

3۔ اچھی تعریف (یا لوگوں کی اچھی رائے) سے مراد ہر قسم کے عوام کی رائے نہیں بلکہ توحید و سنت پر کاربند نیک لوگوں کی رائے مراد ہے' جن میں سب سے بلند مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے' لہٰذا جس شخص کے بارے میں ایسے عظیم افراد اچھی رائے رکھتے ہوں' وہ یقیناً نیک اور جنتی آدمی ہوگا۔

4۔ خوارج' معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ کے گمراہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ صحابہ اور تابعین نے ان کی آراء کو غلط قرار دیا ہے اور پوری قوت سے ان کی تردید فرمائی ہے۔



بندھن

آل راؤنڈر سرفراز احمد ہمراہ خوش بخت سرفراز

شاہین رشید

ہمارے پیارے قارئین کی اکثریت ہم سے فرمائش کرتی ہے کہ آپ کھلاڑیوں کے انٹرویوز بھی کیا کریں... تو ہم ان کی خدمت میں یہی عرض کرتے ہیں کہ کسی بھی فیلڈ کے سیلبرٹی کے اتنے نخرے نہیں ہوتے جتنے ہمارے کھلاڑیوں کے۔ خصوصاً "کرکٹ کے کھلاڑیوں کے ہوتے ہیں... مگر پھر جب کسی کرکٹر کو اچھا پرفارم کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو پھر دل چاہتا ہے کہ اسے بھی آزمالوں... اور پھر ایسے کھلاڑی کو آزمانے میں تو سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا کہ جس کے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ "دھوکا نہیں دے گا" مگر یہ سب فلمی کتابی اور جذباتی باتیں ہیں... اور ایسا مجھے "سرفراز" کو آزمانے کے بعد محسوس ہوا... زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ یہ کھلاڑی اس جملے میں "دھوکا نہیں دے گا" بالکل بھی فٹ نہیں آتا۔

ہاں البتہ ہم ان کی مسز "خوش بخت" کی تعریف ضرور کریں گے جنھوں نے ایک فون کال پہ ہمیں انٹرویو دیا... اور انٹرویو کے مکمل ہونے میں دو چار سوال ہی رہ گئے تھے کہ لائن کٹ گئی اور پھر وہ لائن آدھا گھنٹہ انگیج رہی... سوچا شاید فون خراب ہو گیا ہو گا۔ (پی ٹی سی ایل پہ کال کی تھی) پھر جب فون ٹھیک ہوا، ہم نے کال کی۔ خوش بخت کہیں جا چکی تھیں۔ ہم نے اپنا موبائل نمبر دیا... اور اس انٹرویو کے لکھنے تک خوش بخت کی بھی کوئی کال نہیں آئی... قصور ان کا نہیں ہے، بلکہ اس شہرت اور عزت کا ہے۔ جو انہیں قبل از وقت مل گئی۔

خوش بخت نے جتنا بھی انٹرویو دیا بہت اچھا دیا۔ شکریہ... خوش بخت!) اور سرفراز کے بارے میں جو معلومات ہمیں ہیں وہ آپ کے گوش گزار کریں گے اور ہاں اس انٹرویو کے لیے ہم سرفراز کی پھوپھو "صالحہ عزیز" کے شکر گزار ہیں کہ جنھوں نے انٹرویو کا موقع فراہم کیا۔

"کیسی ہو "خوش بخت" اور شادی کی بہت مبارک باد ہو۔ ہماری طرف سے اور ہمارے ادارے کی طرف سے...؟"

"جی اللہ کا شکر ہے اور بہت شکریہ مبارک باد دینے کا۔"

"آپ کا نام "خوش بخت" ہے اور ایک بہت ہی مشہور شخصیت کا نام بھی خوش بخت ہے" تو کیا ان سے متاثر ہو کر آپ کا نام رکھا گیا؟"

"جی بالکل... جب خوش بخت نعتیں پڑھتی تھیں اور ٹی وی پہ پروگرام کرتی تھیں تو میری دادی نے سوچ لیا تھا کہ جب میری پوتی ہو گی تو میں اس کا نام "خوش بخت" رکھوں گی۔"

"دادی ہوں یا نانی، انہیں تو "پوتوں" کی آرزو ہوتی ہے اور آپ کی دادی نے پوتی کی خواہش کی، حیرت ہے؟"

"اصل میں ان کے دو پوتے تھے، تو وہ چاہتی تھیں کہ ایک پوتی بھی ہونی چاہیے، تو بس اللہ نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔"

"پہلے اپنے بارے میں بتاؤ کہ کہاں سے آپ کا تعلق ہے اور...؟"

"جی... میرے والدین کا تعلق انڈیا سے ہے لیکن پیدائش یہاں پاکستان کی ہے۔ میں والدین کی طرف سے "سید" ہوں۔ میں دو بھائیوں کی اکلوتی بہن نہیں

ہوں بلکہ مجھ سے بھی چھوٹی ایک بہن ہے۔ میں 6 جون 1996ء کو پیدا ہوئی۔ کراچی میں ہی اور میں اپنی فیملی میں بھی اور اپنے خاندان میں بھی پہلی لڑکی ہوں جس کی شادی ہوئی ہے۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوگیا؟ اور کیا رلیشن ہے سرفراز سے آپ کا؟"

"ہماری شادی کو چھ ماہ ہوگئے ہیں یعنی 19 مئی کو شادی ہوئی اور 25 مئی کو ولیمہ ہوا اور ان سے کوئی رلیشن نہیں تھا۔ البتہ سرفراز اور میرے بھائی کرکٹ کھیلا کرتے تھے تو ان کا ہمارے گھر آنا جانا رہتا تھا اور دونوں فیملیز ایک دوسرے کے گھر آتی جاتی تھیں۔"

"تو کبھی سرفراز کو دیکھ کر دل چاہتا تھا کہ یہ میرے شریک سفر بن جائیں؟"

"نہیں... نہیں... ایسا کبھی نہیں سوچا... اور نہ ہی اس نظر سے دیکھا تھا ہمیشہ سرفراز بھائی کہہ کر ہی میں انہیں بلاتی تھی۔"

"جب ان سے آپ کا رشتہ طے ہوا تو یہ شاید کافی مشہور ہو چکے تھے تو مشہور شخصیت کا پروپوزل آنا خوشی کا باعث بنا؟"

"جب ہماری منگنی ہوئی اس وقت یہ ٹیم میں نہیں تھے۔ ہماری منگنی تین سال رہی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ابو کو لمبے عرصے کے لیے ملک سے باہر جانا تھا اور وہ جانے سے پہلے منگنی کروانا چاہتے تھے۔ منگنی کیا تھی یوں سمجھیں کہ بات پکی ہوئی تھی اور شادی اس لیے نہیں ہو سکتی تھی کہ میں اپنی پڑھائی مکمل کرنا چاہتی تھی مگر تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی میری شادی ہوگئی اور شادی کے بعد بھی پڑھائی جاری ہے۔ میں اکاؤنٹنگ کے 4th سمسٹر میں ہوں اور گھر والوں کی طرف سے بہت پریشر ہے کہ اپنی پڑھائی مکمل کرو۔ مارچ میں میرے پیپر ہیں۔"

"جب منگنی ہوئی تو سرفراز ٹیم سے ڈراپ تھے تو کبھی ان کے فیوچر کے لیے فکر مند ہوتی تھیں؟"

"نہیں... میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا اور اس وقت تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ یہ ٹیم میں واپس بھی آسکتے ہیں یا نہیں۔ بس بات پکی ہوگئی تو ہوگئی، رزق دینے والا تو خدا ہے وہی وسیلہ بناتا ہے۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ اور گھر والوں سے تعلقات کیسے ہیں؟"

"جی شادی دھوم دھام سے ہوئی کیونکہ ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی تو بہت ہلہ گلہ رہا گھر میں اور سرفراز کے گھر کی دوسری شادی تھی، میں دوسری بہو ہوں اور ماشاء اللہ گھر والوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔"

"گھر اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟"

"بہت فرق پایا... ہم بہت زیادہ براڈ مائنڈ اور ماڈریٹ فیملی سے ہیں... یہاں رشتہ داروں کا Influence ذرا زیادہ ہے تو بس ایڈجسٹ ہونے میں بھی کافی دیر لگی۔"

"مطلب... "عبایا" حجاب" لیتی ہیں؟ ہنی مون تو حج عمرہ ہوگا؟"

"جی بالکل... خیر وہ تو میں منگنی اور شادی سے پہلے بھی پہنتی تھی مگر بہت باقاعدگی سے نہیں۔ ہاں شادی کے بعد باقاعدگی سے لینے لگی ہوں۔ ہنی مون ہمارا ہوا نہیں، ویسے ہم سری لنکا گئے۔ پھر لاہور گئے۔ کیونکہ ان کے میچز چل رہے تھے، بس جو ایک ہنی مون ہوتا ہے وہ نہیں منا سکے۔"

"جب یہ ٹیم کے ساتھ جاتے ہیں تو آپ بھی ساتھ جاتی ہیں؟"

"جی میں ان کے ساتھ جاتی ہوں لیکن ان پر کھیل کا بہت پریشر ہوتا ہے تو پھر ہم انجوائے نہیں کر سکتے۔ وہ تو ایک ٹرپ ہوتا ہے اور بزنس ٹرپ کی طرح ہوتا ہے اور ٹرپ میں بھی ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ کبھی کہیں تو کبھی کہیں ہوتے ہیں۔ یہ تو گھر میں بھی شادی کے بعد رہے کبھی نہیں۔ کبھی ایک ہفتہ تو کبھی دس دن بس اس طرح رہے ہیں۔ تقریباً دو مہینے یہ گھر میں رہے مگر مسلسل نہیں..."



"تم زیادہ تر سرفراز کے ساتھ ملک سے باہر رہتی ہو۔۔۔ تو بڑی جٹھانی یا سسرال میں کوئی مائنڈ تو نہیں کرتا؟"

"میری بڑی جٹھانی مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی ہیں اور ہماری بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے' ہم دوستوں کی طرح ہیں اور گھر میں امی ہوتی ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"منگنی کے دوران ملاقاتیں ہوتی تھیں' کیونکہ یہ تو گولڈن پیریڈ ہوتا ہے؟"

"نہیں ملاقات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ صرف فون پر بات ہوتی تھی اور آپ صحیح کہہ رہی ہیں کہ یہ گولڈن پیریڈ ہوتا ہے اور دل تو چاہتا تھا مگر وہ تو نکل گیا اب یہی گولڈن پیریڈ ہے۔"

"ان کے لیے ایک جملہ "دھوکا نہیں دے گا" بہت مشہور ہوا؟"

"گھر میں تو ایسا کچھ نہیں سننے کو ملا۔ البتہ یونی ورسٹی میں بہت سننے کو ملتا تھا' تو مجھے ورلڈ کپ کے دوران اپنا ایک سمسٹر ڈراپ کرنا پڑا کہ ہر طرف سے یہی آواز آتی تھی کہ دھوکا نہیں دے گا۔"

"سرفراز کے میچز جانماز پر بیٹھ کر دیکھتی ہو یا ویسے ہی؟"

"ہمت نہیں ہوتی' ان کی امی کو دیکھ کر سیکھا ہے کہ بیٹنگ نہیں دیکھتی' بس جانماز پر بیٹھنا ہے دعا کے لیے تو ان کی دیکھا دیکھی میں بھی ایسا ہی کرلیتی ہوں۔۔۔ لیکن اگر اسٹیڈیم جاتی ہوں تو پھر تو وہاں بیٹھ کر دیکھنا ہی پڑتا ہے اور پھر ہم سب پاکستانی مل کر دعا کررہے ہوتے ہیں۔"

"سب کھلاڑیوں کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا ہے اور یہ لائف اچھی ہے یا پہلے والی؟"

"جی بالکل ہے۔ جن کی شادیاں ہوگئی ہیں ان کے ساتھ گیٹ ٹوگیدر رہتی ہے۔ یہ لائف اچھی ہے لیکن ذمہ داریاں بہت ہیں اور اچھی لگتی ہیں یہ ذمہ داریاں۔"

"گھریلو ذمہ داریاں تم پر زیادہ ہیں یا جیٹھانی پر؟"

"اب تو ہماری باریاں بن گئی ہیں۔ ایک دن میں کھانا بناتی ہوں' ایک دن بھابھی اور مل بانٹ کے کام

کرتے ہیں۔ کسی ایک پہ بوجھ نہیں ڈالتے' ہم سہیلیوں کی طرح رہتے ہیں۔"

"اپنی شادی کو خود انجوائے کیا' رسمیں ہوئی تھیں؟"

"انجوائے نہیں کر سکی' کیونکہ میڈیا اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ رخصتی کے وقت بہت رونا آرہا تھا تو چھوٹی بہن بار بار کہہ رہی تھی کہ مت رو' میک اپ خراب ہو جائے گا اور رسمیں کرنے کا تو وقت ہی نہیں ملا۔ اتنے لوگ تھے کہ کچھ نہیں ہو سکا۔ ہزار بارہ سو لوگ بلائے تھے اور ڈھائی ہزار لوگ آگئے۔

بارات اور ولیمہ کا جوڑا سسرال کی طرف سے تھا اور بہت خوب صورت تھا اور میں ساتھ نہیں گئی تھی' میری ساس اور نند نے مل کر تیاری کی تھی اور مجھے پتا تھا کہ جو چیز آئے گی اچھی آئے گی اور سچی بات تو یہ ہے کہ چونکہ میرا سمسٹر چل رہا تھا تو میرے پاس ٹائم ہی نہیں تھا شاپنگ کا اور میرے گھر سے میری تیاری میری امی نے کی تھی۔"

"کس لباس میں پسند کرتے ہیں؟"

"میں نے بتایا نا کہ ان کا گھرانہ مذہبی ٹائپ کا ہے اور میں ان کے ساتھ جہاں جاتی ہوں عبایا میں ہی جاتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ ویسے بھی یہ اسٹار ہیں۔ پبلک فگر ہیں' سرمایہ ہیں ملک کا' تو ہمیں اپنے لباس کا خیال رکھنا چاہیے' تاکہ کوئی ان کی بیوی کے متعلق بات نہ کر سکے ـــــ میں حجاب لیتی ہوں تو لوگ میری تعریف ہی کرتے ہیں۔ ہمیں دیکھ کر لوگ سیکھتے ہیں۔"

"سرفراز مزاج کے کیسے ہیں؟ اور فضول خرچ کون ہے؟"

"بہت ٹھنڈے مزاج کے ہیں۔ ویسے کسی شریف انسان کو چھیڑنا نہیں چاہیے اور چھیڑ جائیں تو بس پھر مت پوچھیں کہ کیا ہوتا ہے اور فضول خرچ تو ہم دونوں ہی نہیں ہیں اور ـــــ پھر لائن کٹ گئی۔ خیر ـــــ

سرفراز کے بارے میں ہم آپ کو بتائیں کہ ـــــ"

"سرفراز کے والد بیڈمنٹن کے بہترین کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ ان کے "تایا" کرکٹ کے کھلاڑی رہ چکے ہیں اور تایا زاد بھائی کرکٹ کھیلتے تھے اور چونکہ گیمز کے سب شیدائی تھے تو سرفراز کو بھی کرکٹ سے لگاؤ ہوا۔ 22 مئی 1987ء میں کراچی میں جنم لینے والے سرفراز نے کرکٹ کا آغاز 2006 میں کراچی کی طرف سے فرسٹ کلاس کھیل کر کیا۔ سرفراز کا گھرانہ بنیادی طور پر ایک مذہبی گھرانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرفراز نے پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک "مدرسے" میں تعلیم حاصل کی اور 1997ء میں قرآن پاک حفظ کر کے حافظ قرآن ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ والد صاحب چونکہ مذہبی معاملات میں سخت تھے۔ لہٰذا سب ہی بہن بھائیوں کی تربیت میں دینی تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔

سرفراز کو کھیل میں والد سے زیادہ والدہ نے سپورٹ کیا۔ سرفراز نے گلی محلے میں کرکٹ کھیل کر کرکٹ سیکھی اور اس طرح جب انہوں نے کلب جوائن کیا تو انہیں 2000ء میں انڈر 15 میں کھیلنے کا موقع ملا۔ "کے سی سی اے زون 6 سے" پھر انڈر 19 کھیلنے کا موقع ملا اور یوں یہ کھلاڑی اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔"

سرفراز احمد کی فیملی پانچ بھائیوں اور دو بہنوں اور والدین پر مشتمل ہے۔ 19 مئی 2015ء میں ان کی شادی خوش بخت صاحبہ سے ہوئی جو ان سے تقریباً گیارہ سال چھوٹی ہیں۔ بقول سرفراز کے کہ مجھے تو اپنی شادی انجوائے کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا' کیونکہ 19 مئی کو شادی ہوئی اور 21 مئی کو ٹی ٹوئنٹی کھیلنے کے لیے یہ لاہور چلے گئے۔ 25 مئی کو اپنا ولیمہ کر کے 26 مئی کو واپس لاہور چلے گئے۔ سرفراز کو ہنی مون منانے کا موقعہ نہیں ملا۔ ویسے یہ بیگم کے ساتھ حج کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں اور کرکٹ کے سلسلے میں جہاں بھی جاتے ہیں وہاں اپنی



بیگم کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں اور آپ کو پتا ہی ہے کہ ہمارے ملک میں تو باہر کی ٹیمیں آتی نہیں ہیں۔ لہٰذا ہماری ہی ٹیم کو ملک سے باہر جانا ہوتا ہے۔

ایک انٹرویو میں سرفراز احمد نے کہا کہ شادی کے بعد میری زندگی میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ مجھے اب اپنی چیزوں کے لیے کسی کو آواز نہیں دینی پڑتی۔ اپنی چیزوں کو خود سے ڈھونڈنا بھی نہیں پڑتا۔ ہر چیز قرینے' سلیقے سے اپنی جگہ پر موجود ہوتی ہے۔ کپڑے استری ہوتے ہیں۔ پہلے زندگی میں بہت بے ترتیبی تھی۔ اب ترتیب آگئی ہے۔ اب زندگی زیادہ اچھی اور آرگنائزڈ ہوگئی ہے۔

سرفراز اپنے پروفیشنل مسائل اپنی بیگم سے شیئر نہیں کرتے کہ میڈیا کا دور ہے' بات ادھر سے ادھر بھی جاسکتی ہے۔ اس لیے اپنے قریبی ساتھیوں سے اور کرکٹ کی نامور شخصیات سے بات چیت کرتے ہیں۔

سرفراز نے بیگم کو رونمائی میں سونے کی زنجیر دی تھی' جبکہ ان کی بیگم نے انہیں پرفیوم کا تحفہ دیا تھا۔

سرفراز کو ابھی تک اپنی بیگم میں کوئی برائی نظر نہیں آئی۔ انہوں نے اپنی بیگم کو ایک سلیقہ شعار اور فرماں بردار ہی پایا ہے۔ ہر بات کو جلدی مان جانے والی۔

بقول سرفراز کے کہ "میں وقت کا بہت پابند ہوں۔" اور بیگم کو کہیں جانے کے لیے تیاری کا جو ٹائم دیتا ہوں اس ٹائم پر تیار نہ ہوں تو مجھے برا لگتا ہے۔ مجھے انتظار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ (مگر شاید انتظار کرانا اچھا لگتا ہے۔) میں تقاریب میں وقت پر پہنچنے کا قائل ہوں۔۔۔ اسے آپ میری اچھی عادت کہہ سکتے ہیں۔

"دھوکا نہیں دے گا" کے بارے میں سرفراز کا کہنا ہے کہ یہ ڈائیلاگ میرے ساتھ چپک کے رہ گیا ہے مگر میں اس ڈائیلاگ کو اب سیریس نہیں لیتا۔



مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق میں گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھ کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔

غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں' کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی' نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ' گالم گلوچ' لڑائی جھگڑا' طعنے تشنے ہوں' اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ اس ماہ ہم اسی حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

وفا لاہور

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" یہ جملہ پڑھتے ہی دل چاہا کہ وہ سب کچھ جو مجھ پر بیت گیا ہے آپ سب سے بھی شیئر کروں' کیونکہ بہت سی ایسی باتیں ہیں' جو اپنے گھر والوں سے بھی نہیں کی جا سکتیں۔ چلیں جی! دل کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہو جائے گا۔

س "شادی کب ہوئی؟"

ج۔ "میری شادی 26 نومبر 2006 کو ہوئی۔"

س "شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں؟"

ج۔ شادی سے پہلے بہت خوش باش زندگی تھی۔ ڈائجسٹ پڑھنا' سیر و تفریح کرنا' دوستوں سے ملنا ملانا بازاروں میں شاپنگ کرنا' بہنوں سے گپیں لڑانا وغیرہ۔ غرض ہر خوشی' ہر تہوار' ہر فنکشن دل بھر کر انجوائے کیا۔ پڑھائی جت کر کی اور ہر میدان میں کامیابی حاصل کی۔

س۔ "اس رشتے میں آپ کی مرضی تھی یا والدین کے فیصلے پر سر جھکا دیا؟"

ج۔ "آہ۔ اس رشتے میں سراسر میری مرضی شامل تھی' میرے والد حیات نہیں والدہ ادھر راضی نہیں تھیں کیونکہ ہم سید تھے اور یہ دوسرے مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے ماں کو راضی کیا۔ ڈانٹ کھائی مار کھائی' لیکن پروا نہ کی۔ اصل میں میری سوچ تھی کہ جو لوگ لو میرج کرتے ہیں شاید وہ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں اور یہی میری سب سے بڑی بھول تھی جو آج تک بھگت رہی ہوں۔

س "ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں' جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟"

ج۔ میرے نزدیک خوب صورتی، شکل و صورت کا کوئی اتنا ایشو نہیں ہے۔ میں تو چاہتی تھی کہ جیون ساتھی ایسا ہو جو دکھ سکھ کا ساتھی ہو۔ محبت کرنے والا ہو، جس کے ساتھ آپ ہوں تو زندگی کا ہر غم مٹ جائے۔

اب میں سمجھی کہ جسے میں اپنے لیے ٹھیک سمجھ رہی ہوں اس میں یہ سب خوبیاں بھی ہوں گی لیکن میرے خوابوں کا تاج محل محض شادی کے چھ سات دن بعد ہی دھڑام سے گر گیا وہ بھی جب میری والدہ مجھے ایک آدھ دن کے لیے اپنے ساتھ لے جانے آئیں اور میں اپنے زیور پہننے لگی تو تالے میں سے سب چیزیں غائب۔

میں اتنی حواس باختہ ہوئی فوراً" اپنی ساس سے پوچھا "امی میری چیزیں نہیں مل رہیں۔"

توانہوں نے آنکھیں چرالیں اور کہا "مجھے کیا پتا"

میرے میاں آئے ان سے پوچھا تو کہنے لگے۔

"وہ سب میں نے نکالے ہیں۔"

اس وقت تو میں چپ ہوگئی کیونکہ اپنی ماں پہ یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی چپ کر کے چلی گئی لیکن شکر ہے میں نے پہلے ہی دیکھ لیا کیونکہ ان کا ارادہ میرے گھر والوں پر الزام لگانے کا تھا۔

س۔ "منگنی کتنا عرصہ رہی، شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟"

ج منگنی شاید دو تین مہینے رہی کیونکہ منگنی کے فوراً" بعد انہوں نے شادی پر زور ڈال دیا تھا۔ شادی سے پہلے فون پر روز بات ہوتی تھی اور میں اپنی قسمت پر نازاں تھی کہ کوئی شخص ہے، جو دنیا میں سب سے بڑھ کر مجھے چاہتا ہے لیکن قسمت تو شاید میرا مذاق اڑا رہی تھی اور میری بے وقوفی پر قہقہے لگا رہی تھی۔ ملاقات بھی ایک دو دفعہ ہو ہی گئی تھی۔

س۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے خیالات کیا تھے؟"

ج۔ شادی سے پہلے بہت ہی نیک خیالات تھے۔ میں نے سوچا تھا اپنے سسرال والوں کی خدمت سے ان کے دل جیت لوں گی لیکن شروع شروع میں بہت پریشانیاں اٹھائی ہیں۔

میں جتنی کوشش کر سکتی تھی وہ میں نے کی۔ اپنی ساس کے ساتھ ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹاتی جو وہ کہتیں وہ کرتی لیکن شروع شروع میں بہت مشکل پیش آئی کیونکہ اپنے گھر میں تو کبھی ہل کر پانی بھی نہ پیا تھا۔

س۔ "شادی کے لیے آپ کو تعلیم چھوڑنا پڑی یا قربانی دینی پڑی؟"

ج ہاں جی! ابھی میں نے اور تعلیم حاصل کرنی تھی اور میری والدہ نے منگنی بھی اس شرط پر کی تھی کہ دو سال شادی کا نام نہیں لینا لیکن میرے سسرال والوں نے بہت دباؤ ڈالا اس لیے شادی کرنی پڑی اور قربانی بھی دی جو بتا نہیں سکتی۔

س۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین میں کوئی بدمزگی پائی؟

ج چونکہ میری والدہ ان کو جانتی نہیں تھیں۔ اس لیے وہ میری سیکیورٹی کے لیے حق مہر زیادہ لکھوانا چاہتی تھیں اس وجہ سے تھوڑی بدمزگی ہوئی لیکن رسموں میں کچھ بھی نہ ہوا۔ حق مہر میں پانچ ہزار اور زیور لکھا گیا پانچ ہزار تو اسی وقت مجھے دے دیے گئے اور زیور نکال لیا گیا۔ بری بھی کچھ خاص نہ تھی میں نے بھی اپنی والدہ کو تنگ نہ کیا تھا کہ مجھے فلاں چاہیے ڈھمکاں چاہیے۔ بس میں نے کہا تھا آپ شادی سادگی سے کریں کیونکہ مجھے ان پر بہت اعتماد تھا جو جلد ہی ٹوٹ گیا اور میں اپنی ماں کی دور اندیشی کی قائل ہوگئی کہ انہوں نے مجھے ضرورت کی ہر چیز دی تاکہ میں کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں اور اس بات کے طعنے آج تک ملتے ہیں کہ میں زیادہ کچھ نہیں لائی۔

شادی کے بعد

س۔ ''شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟''

ج۔ کچھ خاص نہیں؟ نہ تعریف کی اور نہ ہی تنقید۔ بس نصیحتیں۔ جس میں فرائض بتادیے گئے اور حقوق ندارد۔

س۔ ''شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟''

ج شادی کے بعد پوری زندگی ہی بدل گئی ہے۔ میں اپنے سسرال والوں کو پھر بھی مارجن دے دیتی ہوں۔ لیکن جس کی خاطر آئی' اس نے ہی مان نہ رکھا تو کسی اور سے کیا گلہ۔

اور آپ کو یہ بھی بتادوں کہ مجھے ان سے کوئی خاص محبت یا عشق نہ تھا بلکہ میں صرف ان کی خاطر شادی پہ مجبور ہوئی میں نے سوچا کہ اتنا گڑگڑا کر' اتنی چاہت سے میرا ساتھ چاہتے ہیں تو کسی سے تو شادی کرنی ہے ان سے ہی کرلوں کیونکہ میں نے اپنے خاندان میں بہت سے مسائل دیکھے تھے تو میں نے سوچا جو آپ سے چاہت کرے بس اسی سے شادی کرو۔

لیکن میری پوری زندگی ہی بدل گئی اور وہ شخص جسے میں جانتی تھی' وہ تو کہیں گم ہی ہوگیا اور جو سامنے آیا۔ اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

س۔ ''شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟''

ج۔ مکلاوے کے اگلے دن سے ہی۔ سب سے پہلے میں نے ہنڈیا بنائی تھی اور اس وقت سے آج تک بس کام ہی کام۔

س۔ ''میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟''

ج جی بالکل بالکل! میری امی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔ میں ان میں بھی کیڑے نکالا کرتی تھی (سوری) لیکن بعد میں شروع میں تو ساس نے کہا کہ میں کھانا بنایا کروں۔ میں نے بنایا بھی لیکن اس طرح کہ ہانڈی میں گھی وہ ڈال کر دیتی تھیں کہ بہت ضائع کردیتی ہوں اور گرم مسالہ پیاز وغیرہ وہ اپنے کمرے میں چھپا کر رکھتی تھیں اور جب وہ فوت ہوئیں ان کے بیڈ کے نیچے سے یہ ڈھیر سارا پیاز' چینی' چیچ' اور گرم مسالہ نکلا۔

کتنے افسوس کی بات ہے ناں کہ کوئی ان چیزوں کو کتنا زیادہ استعمال کرسکتا ہے۔ ظاہر ہے جتنی ضرورت ہے اتنا ہی ناں لیکن سمجھنے کی بات ہے۔ اور پھر تھوڑے عرصے کے بعد انہوں نے خود ہی پکانا شروع کردیا کہ میں چیزیں ضائع کرتی ہوں تو بس پھر نہ پوچھیں کہنا تو نہیں چاہیے لیکن دو سال میں اچار سے روٹی کھاتی رہی لیکن سالن کھانے کا حوصلہ مجھ میں نہ تھا۔

ان کی زندگی میں میں دو دفعہ پریگننٹ ہوئی اور کھانا مشکل ہوگیا۔ اس حالت میں تو ویسے ہی اچھا کھانے کو دل کرتا ہے لیکن اتنا برا کھانا کھانا پڑتا اور پھر قے کرکے حشر ہوجاتا۔ اس لیے میں اچار ہی کھاتی رہی۔

س۔ ''میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس کیا؟''

ج ٹوٹلی ڈفرنٹ! میکے میں آزادی' خوشگوار ماحول اور سکون۔ لیکن سسرال میں سخت ماحول' باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی اب تو بہت فرق آگیا ہے اب تو میں اپنے سات سال کے بیٹے کے ساتھ کہیں بھی چلی جاتی ہوں لیکن پہلے تو دم گھٹتا تھا۔ ذرا بھی باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔

اب بھی میکے مہینے میں ایک دن جانے کی اجازت ہے اور رات رکنے کی بھی نہیں۔ میں ان نو سالوں میں ناراض ہو کر ہی میکے رہی ہوں۔ صلح کی صورت میں کبھی نہیں ہمت کہ بھائیوں کی شادیوں میں شرکت بھی غیروں کی طرح کرتی رہی ہوں۔ اور ماحول کا فرق اس لحاظ سے بھی کہ ہمارے سسرال میں کوئی بیمار ہو تو الزام بہوؤں پر کہ تعویذ دھاگے کرتی ہیں۔

جب میری ساس فوت ہوئیں بہت عرصہ تک میرے میاں کا موڈ ٹھیک نہ ہوا کہ (نعوذ باللہ) جیسے موت کا قانون میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور

ان کی والدہ کو میں نے مارا ہے اپنے تعویذوں سے۔ یقین کریں کبھی ایسا خیال بھی نہ آیا اور نہ کسی بابے وغیرہ کو جانتے ہیں۔

س۔ ''سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی' اور کن پر تنقید ہوئی؟''

ج بہت سی باتوں پر تنقید ہوئی کیونکہ میں انیس سال کی تھی جب شادی ہوئی۔ کام کبھی کیا نہ تھا۔ پیپر کے اگلے دن شادی کی تقریبات تھیں لہٰذا کوشش تو بہت کی لیکن پھر بھی تنقید بہت ہوتی رہی' حالانکہ میری عادت ہے کہ جو بات کسی کو مجھ میں بری لگے۔ میں وہ بات ہی ختم کر دیتی ہوں لیکن سسرال تو پھر سسرال ہے نا اور اب جا کر کبھی کوئی تعریف کر ہی دیتا ہے۔ بھولے بھٹکے۔

اور ایک بات اور آپ سے شیئر کروں گی کہ ایک دفعہ شادی میں جانا تھا۔

میری ساس نے مجھے 'میری جٹھانی کا زیور اور بریسلٹ پہنا دیا اور گھر آ کے میں نے واپس دیا لیکن جب میری ساس فوت ہوئیں اور جٹھانی نے واپس مانگا تو میرے میاں نے کیا کیا (صرف اس لیے کہ والدہ پر کوئی بات نہ آئے) کہ ساری چیزیں انہوں نے جو سنبھالی تھیں یہ کیا کہ گھر آئے اور الماری کی تلاشی لینے لگے اور ایک شاپر میری طرف پھینکا کہ اس میں کیا ہے میں نے دیکھا تو بریسلٹ میں اتنی حواس باختہ ہوئی کہ سمجھ ہی نہ پائی کہ کیا قصہ ہے نہ اتنی چالاکی' ہوشیاری تھی۔

میں نے پریشانی میں ان سے کہا کہ اب تو سب مجھ پر الزام لگائیں گے ایسا کریں کہ میں اپنی والدہ سے کہتی ہوں وہ نیا بنوا دیں آپ یہ اپنے پاس رکھ لیں اور اس بات کو انہوں نے اپنے پورے گھر میں پھیلا دیا کہ اس کے پاس سے نکلا ہے اور یہ ایسے کہہ رہی ہے۔

لیکن میری جٹھانیاں اچھی تھیں وہ مجھے جانتی ہیں' سمجھتی ہیں۔ انہوں نے کہا ہمیں تم پر اعتماد ہے۔

اس بات پر آج بھی دل خون کے آنسو روتا ہے اور میں اپنے میاں کو بھی کبھی کسی بھی صورت اس بات کے لیے معاف نہیں کروں گی۔

س سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ سسرال میں گھریلو امور اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟''

ج بالکل نہیں' کوئی مقام نہیں ملا اور میں سمجھتی ہوں کہ میاں اچھا تو سب اچھا اس لیے کسی سے گلہ نہیں اور رہی رائے کی بات تو کبھی کوئی خاندانی معاملے پر میرے سامنے بات ہی نہیں کی جاتی۔ میرے میاں تو ہر بات مجھ سے چھپا کے رکھتے ہیں حالانکہ اگر ان کے خاندان میں کسی کا رشتہ بھی ہو تو مجھے اور میری جٹھانی کو نہیں بتایا جاتا کیونکہ ہماری نظر لگتی ہے۔ میں اور میری جٹھانی' ہم دونوں ان کی فیملی کا حصہ جو نہیں ہیں۔

س۔ ''سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟''

ج میری توقعات' جو میرے میاں سے تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں باقی تو دور کی بات ہے۔ آپ سب سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ میرے میاں کو میرے حق میں اچھا کر دے۔ مہینے میں ایک ہزار ملتا ہے اور اس میں اپنی ضرورت کی چیزیں لیتی ہوتی ہیں مثلاً'' شیمپو وغیرہ۔ اور سال میں عید پر ایک ہزار روپیہ اور بڑی عید پر پانچ سو یا پھر کبھی وہ بھی نہیں۔

اس کے علاوہ کبھی میری کوئی ضرورت پوری نہیں کی۔ میں ٹیوشنز پڑھاتی ہوں اور اپنے کپڑے وغیرہ بنا لیتی ہوں یا اپنے بیٹے کی کوئی چیز لینی ہو تو۔ یہ نہیں کہ میرے میاں کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ بہت اچھا کماتے ہیں لیکن بس مجھے نہیں دیتے۔

میرے سسرال والے بھی سمجھاتے ہیں لیکن ان پر رتی برابر اثر نہیں ہوتا اور میں بس اچھے دنوں کی آس میں زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں اس لیے میں کبھی فارغ نہیں بیٹھی کہ یہ سوچیں میرا جینا حرام کر دیتی ہیں۔

س۔ ''بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں

بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے مثلاً "پہلا بچہ۔"

ج ہاں۔ واقعی بچوں کی پیدائش بڑا امتحان ہے اور میرا تو اس لیے کہ نو مہینے ٹینشن میں رہی مار یں کھائیں، طعنے سنے، آتے ساتھ ہی پریگننٹ ہو گئی تھی اور میاں کا رویہ انتہائی خراب۔

اسی ٹینشن میں آپریشن ہوا سب نے کہا بچہ بہت کمزور ہے، دو تین دن تک دیکھا نہیں۔ پھر میاں آئے کہا۔

"تمہیں اپنے بچے کی ذرا پروا نہیں۔"

میں پریشان ہو گئی اور پھر جو انہوں نے خبر دی میرا دل پھٹ ہی گیا وہ یہ کہ میرا بچہ معذور تھا۔ جی! اس کے دونوں ہاتھ ہی نہیں تھے جب میری امی کو پتا چلا تو وہ بھاگتی ہوئی میرے پاس آئیں اور کہا۔

"میں تو تمہیں اب بھی نہیں بتانا چاہ رہی تھی کیونکہ تمہارا بی پی پہلے ہی بہت ہائی تھا۔"

بس وہ بھی ایک قصہ ہے سب نے اتنی باتیں کیں کسی نے کہا ہائے بہت کھاتی تھی۔ یقین کریں کبھی ساس نے مرضی کا سالن نہیں بنایا تھا لیکن الزام تو موجود تھا نا، کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ نہیں سمجھا تو کوئی ایک ماں کا درد۔ جس نے پہلی دفعہ ایسا بچہ دیکھا تھا۔ اور اس کا تالو بھی اونچا تھا۔ مدر فیڈ نہیں لے سکتا تھا لیکن سب نے کہا پلانا ہی نہیں چاہتی۔

اور ایک سال بعد میں دوبارہ پریگننٹ ہوئی اور جب میں جانے لگی تو میرا بچہ بہت بیمار تھا اور جب میرا آپریشن ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی ڈیتھ ہو گئی۔

مجھے جب واپس گھر آنا تھا تب پتا چلا لیکن دل کو ایک دھڑکا سا لگ گیا تھا اور میں روتی رہتی تھی اسپتال میں۔ تب بھی سب نے بڑی باتیں کیں، بتانے لگوں تو صفحات بھر جائیں۔ قصہ مختصر یہ کہ دو دفعہ ماں بنی اور دونوں دفعہ سخت اذیت کاٹی اور اب یہ حال ہے "بھی نام لوں تو کہتے ہیں۔

"میں نے نہیں پیدا کرنا بیمار عورت ہو اور میں خرچا افورڈ نہیں کر سکتا نہ میں بچوں پر خرچ کر سکتا ہوں۔"

س۔ "آپ جوائنٹ سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند کرتی ہیں؟"

ج جوائنٹ فیملی سسٹم میں بہت ٹینشن ہوتی ہے کوئی نہ کوئی آپ کی ٹانگ کھینچنے میں لگا رہتا ہے اور خاص کر تب جب میاں بیوی لڑتے ہوں تو پھر باقی سب سے بہت شرم آتی ہے کیونکہ اگر میاں بے ہودہ الزامات لگانے والا ہو تو دوسروں سے نظر ملانا مشکل ہو جاتا ہے۔

س۔ "آپ نے سسرال کا ماحول بہتر بنانے کی کوشش کی؟ اور اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں؟"

ج۔ سسرال کا ماحول بہتر کیسے ہو سکتا ہے۔ جب سب اپنے آپ کو مکمل سمجھیں تو پھر کوئی کیا کر سکتا ہے۔

ہمارے سسرال میں سب نماز پڑھتے ہیں، دنیا کی نظر میں بہت ہی اچھے اور شریف ہیں لیکن یہ تو کوئی گھر والوں سے پوچھے کہ کیا حال ہے۔ دنیا ان کی اتنی تعریف کرتی ہے ہمیں تو غلط کہہ سکتی ہے مگر انہیں نہیں کیونکہ ہر کسی کے کام آتے ہیں اور بہت اخلاق سے ملتے ہیں۔

اگر نہیں ملتے تو سسرالی رشتے داروں سے، اپنے رشتہ داروں سے قطع تعلق کیا ہوا ہے۔

میرے میاں نے آج تک کبھی عید تہوار گھر میں نہیں منایا ان کا کام ہی ایسا ہے۔ کبھی کہیں لے کر نہیں گئے اور نہ ہی عید، شب برات گھر میں گزاری ہے، بس پیسے کی دھن ہے۔ جو لگی ہوئی ہے۔

میں بہت سالوں سے شعاع، خواتین پڑھ رہی ہوں لیکن کبھی قلم نہیں اٹھایا۔ لیکن جب سے یہ سلسلہ شروع ہوا ہے، دل چاہ رہا تھا کہ لکھوں اپنی داستان حیات۔ کیونکہ اس میں، میں یہ نصیحت کرنا چاہتی ہوں کہ ماں باپ کے فیصلے ہمیشہ درست ہوتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تجربے کی آنکھ سے وہ دیکھ لیتے ہیں، جو ہم نادان لڑکیاں نہیں دیکھ پاتیں اور ایک شخص کی اندھی محبت میں اپنے گھر والوں کی سچی محبت کو ٹھوکر مار دیتی ہیں۔

عراق اشکبار ہیں ہم

مصنف: سلمیٰ اعوان
تبصرہ: آمنہ زرین

سفر تخیل کا ہو یا حقیقی، اپنے اندر ایک ایسی کشش رکھتا ہے جو اس کے چاہنے والوں کو کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ سفر کی خواہش انسان کے تخیل کو مسافر بنا دیتی ہے اور حقیقی سفر انسان کو!

مسافر کو سفر کا حوصلہ عطا کرنے والا محرک کیا ہے؟ وسائل؟ بہت سوں کو میسر ہیں مگر وہ مسافر نہیں!

مسافر کو سفر پر جانے سے کیا چیز روک سکتی ہے؟ وابستگی، آرام و آسائش سے دستبرداری اور ان ہونی کا خوف؟

مگر کیا مسافر رکتا ہے؟

اور اگر مسافر عورت ہو، تنہا ہو اور پاکستانی سماج کا حصہ ہو تو.... قابل داد!! پاکستانی معاشرہ عورت کو بھلے بہت کچھ دیتا ہو.... مگر مسافرت اختیار کرنے کی آزادی؛ شاذ و نادر.... ایسے میں اگر کوئی اسی جنم میں اپنی خواہش کو حسرت کے درجے پر پہنچنے سے روک پائے تو اعصاب یقیناً" قابل رشک قرار دیے جا سکتے ہیں۔

زیر نظر کتاب ایک ایسی ہی خاتون سے ملاقات کا ذریعہ ہے۔ جن کو مسافر بننے سے نہ کسی وابستگی نے روکا اور نہ ہی زندگی کے ان سب جھمیلوں نے.... جن میں ہر کوئی یہ سوچ کر الجھا رہتا ہے کہ جب یہ ختم ہوں گے .... تب!

مگر آفرین ہے ہر اس مسافر پر.... جو تب کے بجائے اب اور ابھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر مسافر کی تقدیر دوسرے، بہت سوں سے خود بخود منفرد ٹھہرتی ہے!

لگن پا لینے کا سودا ہے، جو من میں سما جائے تو پھر چین سے بیٹھنا؟ سفر پر نکلنا کسی ایسے ہی جذبے کا مظہر ہے جو ہم جیسے گھس گھسنوں کے لیے قابل رشک ہے مگر سفر کو جستجو اور دریافت کا ذریعہ بنا دینا.... ناواقف خطوں اور انجان لوگوں کے رہن سہن، عادات و اطوار، موسمی حالات کو متعارف کروانا یقیناً" ایک ایسا عمل ہے جو پڑھنے والے کو لکھنے والے کا احسان مند کرتا ہے۔

سفرنامے کو عموماً" دلکش مناظر، خوب صورت مقامات اور دلچسپ واقعات کا بیانیہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر مصیبت زدہ علاقوں کا سفر؟ وہ سرزمین کہ کرب و بلا سے پیوستہ، وہ سرزمین کہ تباہی و بربادی کی مثال دیتے وقت، جس کا نام استعارہ بن چکا ہو؟

ایک ایسی سرزمین کے سفر کا ارادہ کرنے والی خاتون کو آپ کیا کہیں گے؟

اور پھر اپنے ارادے کو مجسم کر دینا؟

واللہ.... اعصاب!

عراق کا احوال ست رنگی کرنوں جیسا ہے .... شاندار ماضی کی روشنی حال کی درماندگی میں بھی ماند نہیں پڑی.... عراق کی تاریخی حیثیت آپ کو اس کے مقام کی آگہی دے گی اور صاحبان علم و ہنر کی قدر دانی عراقیوں کے بالیدہ شعور کی خبر.... ہارون اور زبیدہ کا احوال آپ کو محظوظ کرے گا.... تو ادب اور موسیقی کے نامور لوگوں کا ذکر حیران.... امام ابو حنیفہ، عبدالقادر جیلانی، جنید بغدادی، معروف کرخیؒ اور دیگر بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کا احوال اس سرزمین کے تقدس کی گواہی دے گا۔ دجلہ اور فرات کے نصیب میں لکھی دل گداز تاریخ، قدیم درسگاہوں، مساجد اور قبرستان کا احوال آپ کو سوز و الم میں مبتلا کرے گا.... اور وہیں پر الف لیلیٰ کے شاہکار کرداروں کو مجسموں کی صورت میں نصب دیکھ کر بے پایاں مسرت کے احساس میں شریک ہونا بھی آپ کے حصے میں آئے گا

۔ علی بابا چالیس چور کی مرجانہ ' شہزاد اور شہریار کے کرداروں کو مجسم دیکھنا ۔۔۔ ہم میں سے ہر ایک کو اس کے بچپن کی طلسماتی کیفیت سے ملوانے کا تجربہ ہے!

تو چلیے جھلکیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں!

سفر وسیلۂ ظفر ضرور ہے لیکن صعوبت بھی سفر سے مشروط ہے۔ یعنی پکی پکائی کھیر صرف گھر میں مل سکتی ہے اور لذت دریافت کو پانے کے لیے خود کو حالات کی سختی ' موسم کی شدت اور تمام تر متوقع کمی بیشی کے سامنے پیش کرنا پڑتا ہے ۔۔۔ اور خاتون کا توکل ۔۔۔ سونے پہ سہاگہ! وابستگی سے مراد رشتے ناتے تھے ' اور خاتون ' دادی ' نانی کے رتبے پر فائز ' ڈی ہائیڈریشن کی مریض ۔۔۔ جولائی کا مہینہ اور صحرائی سرزمین کا درجہ حرارت 55 کو پہنچا ہوا ۔۔۔

"پانی تو ایسا تھا کیتلی میں پتی ڈالو اور دم پر لگالو۔ نیل کے گھر میں ہونے کے باوجود گاڑی کا ایئر کنڈیشنر آن نہیں تھا۔ کھلے شیشوں سے دوزخ کی ہوا فراٹے مارتی اندر آتی تھی۔"

زیارتی پیکج پر عراق جانے والے ایک گروہ کے ساتھ ان کو جانے کا موقع ملا تو ٹھہرنے کا موقع اور سہولیات بھی اسی حساب سے تھیں۔ سفر پر نکلنے سے پہلے عراق کے موسمی وار سے بچنے کے لیے ہمہ وقت ابر کے ٹکڑے کی فرمائش بھی نوٹ کروائی ۔۔۔ بھئی دینے والے کی مرضی ہے ۔۔۔ تو مانگنے والے بھی اپنی مرضی کے مالک ہیں ۔۔۔ جو چاہے مانگ لیں ۔۔۔ مانگنا ہی تو دراصل شان کبریائی کا اعتراف ہے۔

لیکن بعض نعمتوں کا ظہور مانوس نہیں لگتا کیونکہ وہ مطلوبہ سانچے میں ڈھل کر سامنے نہیں آتا ۔۔۔ ہم گمان کی دھند میں چھپی حقیقت کو پہچان نہیں پاتے ۔۔۔ مگر وہ بادل کا ٹکڑا نہ سہی اخلاق کی صورت میں ظاہر ہو گیا!

اخلاق ۔۔۔ تاریخ ' سیاحت اور گائیڈ سے دلچسپی رکھنے والا نوجوان ٹیکسی ڈرائیور ۔۔۔ ایم ایس سی کیمیکل انجینئرنگ۔ بمباری میں مارے گئے خاندان کا صدمہ لیے ' ایک بار خودکشی کی کوشش کے بعد ' اس پیشے سے وابستہ ۔۔۔ پیارا اخلاق!

اہم مقامات ' راستوں کا انتخاب ' موسم کے مطابق سفر اور آرام کے اوقات کا تعین ' اہم افراد سے ملاقات ' سوال جواب اور معلومات کا ذریعہ ' دن رات اخلاق کا ساتھ میسر رہا۔ تو کیا بادل کا ٹکڑا ۔۔۔؟

خیر یہ تو میرے خیال کی اختراع رہی ۔۔۔

چلیے ۔۔۔ عراق اور جانیں عراقیوں کا حال اور احوال

صدام حسین کے بارے میں دو مختلف مؤقف سامنے آئے ۔۔۔ اور امریکہ کے بارے میں ایک۔

لفظ امریکہ کہنے کی دیر تھی۔ دونوں بوڑھیوں نے انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا دیں۔ کیسا حزن و یاس آنکھوں میں ابھرا تھا؟ کیسی بے بسی کا اظہار تھا چہرے پر؟

"امریکہ اور برطانیہ ہمارے تین لاکھ سے زائد معصوم بچوں کے قاتل ہیں۔ میں نے بڑوں کی گنتی نہیں کی۔ انہوں نے صدام کو تو ہٹا دیا مگر ملک برباد کر دیا۔ وہ ہمارے لیے نہیں اپنے مقاصد کے لیے آئے ہیں۔" اور ساتھ ہی گالیوں کی بوچھاڑ تھی۔ "وہ ہمیں آزادی دلانے نہیں بلکہ حملہ آور بن کر ہمارا تیل لوٹنے آئے ہیں؟"

"اس جمہوریت کے علم بردار نے جو ہمیں آمر سے آزاد کروانے آیا تھا ۔۔۔ اس نے قید خانوں کو Taboo بنا دیا ہے۔ خوب صورت عورتوں کے شوہروں کی پکڑ دھکڑ ' ان کا گھروں کے اندر سے اغوا ' ان کی عصمت ریزی ' بعد میں کہیں انہیں جلانے ' کہیں پھینکنے ' کہیں زندہ صورت جیلوں میں ٹھونسنے ' کہیں ان کی دوسرے ملکوں میں اسمگلنگ ' بچے کہیں ' مائیں کہیں اور شوہر کہیں۔"

یہ ایک سرگرم عراقی خاتون کا اظہار خیال تھا اور دیکھیے عراقی خاتون کی سیاسی بالغ نظری کا ایک عمدہ اظہار۔

"شیعہ مسلک سے تعلق کے باوجود مجھے حکومت کا

یہ رویہ قطعی پسند نہیں۔ امریکی ان کے مونڈھوں پر سوار ہیں۔ سنی عورتیں اس تشدد کا زیادہ نشانہ بنیں اور بن رہی ہیں۔ ابھی بھی جیلوں میں بے شمار ہیں۔ جنہوں نے مزاحمت کی اور مقامی پولیس اہلکاروں اور امریکی فوجیوں کو قتل کیا۔"

عراق عوام کا سیاسی شعور اور بالغ نظری متاثر کن ہے۔ ایک ہی جگہ پر بیٹھے ہوئے لوگ' مختلف موقف کا اظہار نہایت آزادی اور آسانی کے ساتھ کرتے ہیں جبکہ ہمارے لیے یہ خاصا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ دیکھیے' ایک میاں بیوی سے کی گئی گفتگو اور ان کی مختلف آرا۔

"صدام نے ہر عراقی کو پڑھا لکھا بنایا۔ یہ کریڈٹ اسے دینا پڑے گا۔ صحت کو اس نے بڑی اہمیت دی۔ پورے عراق میں تقریباً" دو سو پچاس فلٹریشن پلانٹ لگائے۔ صنعتیں اس کی ترجیح تھیں۔ وہ اول و آخر ایک عراقی تھا۔ ظالم و جابر تھا۔ آزادی رائے پر پابندی تھی مگر لوگوں کی بہتری اور خوشحالی کا خواہاں تھا۔ (بیوی)

"اندازا" کوئی پونے تین لاکھ ایرانی' ڈھائی لاکھ عراقی اس بے کار جنگ میں ختم ہوئے۔ کوئی اسی ہزار تعداد زخمیوں اور دس لاکھ کے قریب متاثرین تھے۔ دنیا نے تماشا دیکھا اور اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کیا اور خوش ہوئے کہ دو مسلمان ملک جو بڑھتی ہوئی طاقت تھے کمزور ہوئے۔ کاش صدام سمجھ دار ہوتا۔ کاش امام خمینی بصیرت سے کام لیتے اور دونوں ملک تباہ ہونے سے بچ جاتے۔" (شوہر)

خلیج جنگ کے اسباب و نتائج ہوں' عراق پر عائد پابندی یا انا کی بھینٹ چڑھنے والے ایرانی' عراقی مسلم کے خون کی ارزانی کا ذکر ہو۔۔۔ صدام براہ راست ایک اہم کردار ہے۔ اس کی وجہ سے کیا ہوا۔۔۔ جو ہوا۔۔۔ اس کو روکا جا سکتا تھا' اس کی ذاتی زندگی' خود پرستی' متشم مزاجی کی تفصیلات اہم عراقی شخصیات اور عام لوگوں سے گفتگو کے نتیجے میں ہماری فہم تک رسائی حاصل کرتی ہیں اور نتیجہ؟ فرد واحد کی انا نے غاصب قوتوں کو گھر کے اندر تک کا راستہ دکھایا۔۔۔ اور اپنے لوگوں کو کرب و بلا میں مبتلا کر کے۔۔۔ صدام اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

عراق۔۔۔؟ مگر۔۔۔ زندگی۔۔۔ رواں دواں ہے!

"یورینیم شیلوں کی بھرمار نے ماحول کو' زمین کو اور پانیوں کو زہر آلود کر دیا ہے۔ اب اس صدر سٹی کا حال سن لیجیے جہاں بم شیلنگ نے بڑے بڑے گڑھے پیدا کر دیے ہیں۔ پینے کے پانی اور سیوریج کے پائپوں میں سوراخ ہو جانے سے دونوں کے پانی مل گئے ہیں۔ اب زہر پیا جا رہا ہے۔ ایسے میں عراق کی ماہر سائنس دان مائکروبیالوجی میں پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہدیٰ میری اماش جب اس پر آواز اٹھاتی تھی تو اس ثبوت کے ساتھ کہ عراقی فصلوں اور بچوں میں یہ بیماریاں پہلے کبھی نہیں تھیں جتنی خلیج کی جنگ کے بعد ہوئی ہیں تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یہی سلوک ہماری دوسری سائنس دان ڈاکٹر رباب طٰہ کے ساتھ ہوا۔"

"آخر یہ کیمیائی مواد صدام کے ہاتھوں کیوں بیچا گیا؟ اسے گیس بنانے کی اجازت کیوں دی گئی؟ کردوں اور ایرانیوں کا تخم مارنے کے لیے کہ شاہ ایران کے بعد انہیں مشرق وسطیٰ میں اپنے مطلب کا بندہ چاہیے تھا۔"

یہ عراقی فوج کے سابق کرنل کے ساتھ ملاقات میں ہونے والی گفتگو تھی۔ جس میں پاکستان کا ذکر بھی ہوا۔ ہمارے ایک آمر نے فلسطینیوں کے ساتھ جو سلوک کیا۔۔۔ بیشتر پاکستانی تاحال اس سے بے خبر ہیں۔۔۔ خیر بے خبری تو ہمارا طرۂ امتیاز بنتی جا رہی ہے کیونکہ خبر کا معیار شادیوں' طلاقوں اور عدالت میں پیشیوں کو چٹ پٹا کرنے کی سطح پر آ چکا ہے۔

"ذرا پل بھر کے لیے سوچیے کہ آپ عراقی ہیں۔ آپ کی سرزمین اور اس کی باسیوں کو بے موت مارا جا رہا ہو تو آپ کے لیے ممکن ہے کہ آپ نہ بولیں۔ اپنی آواز بلند نہ کریں۔ نتیجتاً" گرفتاری' جیل جانا اور پھانسی کے پھندے پر چڑھنا آپ کا مقدر بنتا ہے۔

آپ ہتھیار اٹھاتے ہیں بقول ان بڑے ملکوں، کی وضع کردہ اصطلاح کے دہشت گرد بن جاتے ہیں۔ خود مرتے اور دس لوگوں کو مارتے ہیں، مگر یہ سب ہوگا۔ جتنی ہمت، استعداد اور آپ جس مقام پر ہیں، آپ نے اسے استعمال کرنا ہے اگر آپ میں اخلاص ہے اور آپ کو اپنے وطن سے محبت ہے۔"

مسلمان حکمرانوں کو واحد چیز جو درکار ہے، خوف خدا ہے اور اسی کا قحط دراصل حکمرانی اور آمریت کی بدترین مثالیں قائم کرتا ہے! عراقی عوام کا سیاسی شعور میں بالغ نظری کا مظاہرہ عام دکھائی دیتا ہے... مگر عوام کے پختہ شعور کے وارث، حکمران بن بیٹھتے ہیں اور اس معاملے میں مسلم اقوام کا حل چھپا ہوا کب ہے...؟

تحریر اپنے لکھنے والے کا حال دل تو بیان کرتی ہی ہے... کچھ راز مزاج کے بھی کھولتی ہے۔ سلمیٰ اعوان کی تحریر میں موجود سادگی دراصل ان کی فطری سادگی ہے۔ درویشی، توکل اور ممتا کے جذبات کا خمیر دراصل خلوص نیت سے اٹھتا ہے اور دھیرے دھیرے آپ بھی خود کو اس محبت کے دائرے میں موجود پاتے ہیں۔ کیسے؟ احساس کی شراکت کے ذریعے! روزمرہ زبان میں سادہ تراکیب اور مادری زبان کا تڑکا دراصل ان کی تکلف برطرف طبیعت کی طرف اشارہ کرتا ہے اور محبت کی وسعتوں سے لطف اندوز ہونا ہو تو تکلف نامی رکاوٹیں راستے میں کہاں ٹھہرتی ہیں؟ پُرخطر مقامات کا سفر، خطرہ مول لینے کی عادت تو ہے مگر خود کو کائنات کے رب کے سپرد کرنے کا وتیرہ بھی شامل حال ہے... جو بھی، جیسا بھی ملے... نخرے میں وقت کا ضیاع بالکل نہیں!

مجھے تو لگتا ہے... سفر دراصل درویشوں کا ہی طرہ امتیاز ہے... وہی کر سکتے ہیں جو میں، کیوں، نہیں کے دروازے بند کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں!

خیر...

"صد شکر کمرے میں مناسا فریج تھا۔ کسی سے پلیٹ چھری مانگی۔ کپڑا بچھا کر آدھے تربوز کو دوائی جان کر ٹھونسا۔ صبح سے اناج نام کی ایک کھیل اندر نہیں گئی تھی۔ نسرین او نگھتی تھی۔ فریج میں بقیہ آدھا رکھ کر اسے کھانے کا کہا۔ منہ ہاتھ دھویا۔"

"ناشتہ حسب معمول غریبانہ سا تھا۔ تین چار عورتیں پراٹھے پکانے میں ہلکان ہو گئی تھیں۔ رات کا سالن تھا اور چائے۔ چلو شکر، نو بجے اٹھ کر بغیر کہیں جائے یہ نیم ٹھنڈا نیم گرم نصیب تھا۔"

"آنسو پونچھتی، ناک صاف کرتی اٹھ کر کمرے میں آگئی۔ لیٹی تو آنکھ لگ گئی۔ نسرین نے کوئی دو بجے اٹھایا۔ وہ میرا اور اپنا کھانا لے آئی تھی۔ گروپ کے کسی صاحب کی نیاز کا مزے دار کھانا۔" چلیں یہ تو درویشی سامان طعام تھا... مگر جہاں جہاں ان کی میزبانی کی گئی تو عراقیوں کی مہمانداری کا لازمی جزو قہوہ اور کھجور رہا... "چائے کے نام پر تو وہی کڑوا کسیلا قہوہ تھا پر ساتھ میں ایک پلیٹ میں کھجوریں تھیں۔ مغز اخروٹ میں گندھی ہوئی۔ کیا مزے کی چیز تھی۔"

چھوٹی سی نان نما روٹی پر کریم اور تازہ گٹھلی نکالی ہوئی کھجوروں کا لیپ سا کیا ہوا تھا۔ (خبض) جانیے عراق کے کھانے اور ان کے نام...

تب ہی بڑے سے طباق میں تکوں سے سجا شہد بھرے کوٹ سے دمکتا جلیبی جیسے بلوں میں الجھا گرم گرم سمون خوشبوئیں اڑاتا کمرے میں آکر تپائی پر سج گیا تھا۔"

"ابلے ہوئے چاولوں کا ڈھیر جس پر بھنا ہوا گوشت، موٹا کٹا ہوا پیاز، ٹماٹر، کھیرے کا سلاد۔ آفتابہ آیا، وہیں ہاتھ دھلائے گئے اور سب بمعہ اس عمر رسیدہ کھانا لانے والے کے، سینی کے گرد بیٹھ گئے اور ہاتھوں سے کھانا شروع ہو گیا۔

بغداد... قدیم تہذیب، علم و ہنر کا عالمی گہوارہ... دجلہ اور فرات کے بغیر اس کا ذکر ادھورا ہے۔ کتابوں سے محبت کا ورثہ آج بھی روشن حوالہ ہے۔ ہارون رشید اور زبیدہ کا بغداد... خلیفہ منصور، جعفر برمکی اور مستنصر کا بغداد... امام غزالی، امام ابوحنیفہ، جنید بغدادی، معروف کرخی، عبدالقادر جیلانی کا بغداد، الف لیلیٰ کا بغداد... دیکھیے کچھ قدیم اور جدید بغداد کی جھلکیاں...

"خلیفہ منصور نے بغداد کی بنیاد رکھی تو اپنی پوری مملکت سے نامی گرامی کاریگر ماہر تعمیرات اور جید ریاضی دان بلوائے کہ عمارتیں اصول ہندسہ کے مطابق تعمیر ہوں۔ ان ماہرین کے افسر اعلیٰ امام ابو حنیفہ تھے۔ امام اعظم نے ایک ایک اینٹ شمار کرنے کے بجائے لکڑی کے لمبے پیمانوں سے اینٹیں ماپنے کا طریقہ رائج کیا۔ بعد میں ان کا یہی طریقہ رائج ہوا۔"

"دجلہ کی اہمیت مقدم کہ عراق کا دل بغداد اور بغداد کی جان دجلہ اس کے پانیوں نے شاہوں کے بے وفائیوں اور قہر و عتاب کے دکھ جھیلے ہیں۔ جعفر برمکی کی لاش کے تین ٹکڑے دجلہ کے تین پلوں پر لٹکائے گئے اور سر اس پل پر جسے باب المدام کہتے ہیں۔ ذہانت، فطانت و سخاوت اور خلیفوں سے محبت و رفاقت اور وفاداری جیسی خوبیوں سے مالا مال یہ سرمینوں اس پل پر لٹکا شہریوں کے لیے سامان عبرت اور پانیوں کے لیے وجہ غم و درد بنا رہا۔"

سیدون اسٹریٹ کی اندرونی گلیوں میں پرانے بغداد کی وہ جھلکیاں تھیں جنہیں دیکھنے کے لیے میں مری جا رہی تھی۔ وہی تنگ تنگ گلیاں، چھجے دار بالکونیاں، محرابی لمبی کھڑکیاں، گلیوں میں کھلتے تنگ تنگ دروازے، گھروں پر برستی کہنگی، کہیں کہیں کوئی نیا بنا ہوا گھر۔ قہوہ کیفے کے دکانیں، حقہ پیتے، تاش کھیلتے لوگ۔"

اعتنابی سٹریٹ، دسویں صدی کے ایک ایسے شاعر کے نام سے منسوب ہے، جو اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ جس کا کہنا تھا" جو کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔ میرا کاغذ، قلم اور حرف اس سے زیادہ موثر ہیں۔" تکبر ذات کا نشہ چڑھا تو پیغمبری کا دعوا بھی کر دیا ۔۔۔ سیاسی خواہشوں کا ہیجان تھا۔۔۔ قید با مشقت بھی کاٹی اور اپنی خواہشوں میں ناکام بھی ہوا۔۔۔ مگر شاعر کے طور پر کمال کو پہنچا۔

بغداد نے اپنے دور کی عظیم علامت کو یاد رکھا ہوا ہے۔ علی بابا اسکوائر وہ جگہ ہے جہاں الف لیلیٰ کے کرداروں اور مناظر کو مجسموں کی صورت نصب کر کے دنیا بھر کے سیاحوں اور ان کرداروں کے مداحوں کی مسرت کا سامان کیا گیا ہے۔

بغداد کا ایک حوالہ عالمی معیار کی درس گاہوں کی کثرت بھی ہے۔ درسگاہوں، کتب خانوں اور کتابوں سے محبت کا ورثہ عراقی آج بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

"اتنی بڑی دکان تھی کہ میں حیرت سے گنگ اسے دیکھے چلے جاتی تھی۔ لڑکا مجھے لے کر غربی سمت بڑھا جہاں چند سیڑھیاں اتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اترے۔ یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادبی چہرہ تھا۔ جہاں چوبی بنچوں پر دھرے خوب صورت گدے نما کشنوں پر چند لوگ بیٹھے تھے کے کش لگاتے، بحث و مباحثے میں الجھے ہوئے دکھے تھے۔"

چلیے۔۔۔ مستنصریہ۔۔۔!

"میں پہلے ایوان سے پہلے صحن میں داخل ہو کر ساکت کھڑی اپنے سامنے زردی مائل مٹی رنگ کی اینٹوں سے بنی دو منزلہ عمارت کی بالکونیوں، ان پر کندہ بھاری پٹیوں کو دیکھتی تھی۔ دنیا کا عظیم ترین، قدیم ترین صدیوں کا اثاثہ سنبھالے، میلوں کے رقبے میں پھیلی یہ درسگاہ اپنی عظمتوں کے ساتھ اس عہد کو خراج پیش کر رہی تھی جو کبھی تہذیب و ثقافت کا دنیا بھر میں مرکز تھا۔ جہاں پر پڑھنے کے لیے پوری اسلامی دنیا سے طلبہ آتے اور ریاضی، ادب، طب، فلسفہ، انجینئرنگ، قانون اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سنی مسلک کے چاروں عقائد، حنبلی، شافعی، مالکی اور حنفی کے لیے الگ الگ ڈپارٹمنٹ تھے۔"

"تعمیر کا سال 526ھ یا 1226ء کہہ لیجیے۔ بننے میں کوئی چھ سال لگے۔ بنانے والے کا ذوق کہ دجلہ کو ہمسایہ بنایا۔ کشادہ کمرے طلبہ کے کلاس روم تھے۔ ان کی اقامت گاہیں تھیں۔ کاغذ، قلم، روشنائی کی فراہمی مدرسے کی ذمے داری، ہوسٹل میں طلبہ کو کھانے پینے سے لے کر میڈیکل تک کی سہولت بھی حاصل تھی۔

"شاہی کتب خانے سے 160 اونٹوں پر لاد کر کتابیں یہاں لائی گئی تھیں۔ انہیں اس انداز میں

ترتیب دیا گیا تھا کہ طلبہ آسانی سے جو کتاب نکالنا چاہتے نکال لیتے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی لائبریری میں اسی ہزار کتابیں تھیں۔"

مستنصر کو علم سے محبت تھی جس کا اظہار مستنصر کے ہر انداز سے تھا۔"

جی ... اپنے عہد میں حکمران جس چیز سے محبت کرتے ہیں' اسی کی نشانیاں چھوڑ کر جاتے ہیں ... ہمارے خطے میں ...!

"حمورابی Oblish دیکھی۔ سنگ مرمر کی اس بلند و بالا چہار پہلو ستون نے چوراہے کو سجا رکھا تھا۔ بابل کا عظیم بادشاہ حمورابی' دنیا کا پہلا قانون ساز جس کے دو سو بیاسی مکاتیب آج بھی قانون دانوں کو حیرت زدہ کرتے ہیں۔"

"بابل کے باغات تو دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک ہونے کا شہرہ رکھتے ہیں ... مگر بادشاہ حمورابی اور اس کے کارناموں سے جانکاری پہلی مرتبہ ہوئی ... اور یہ بھی کہ باغات کیوں اور کیسے بنوائے گئے ... ہر عہد اپنی نشانیاں چھوڑ کر جاتا ہے اور وہ نشانی آنے والے زمانوں کو اس کمال کی' ذوق اور ذہنی اپچ کی خبر دیتی ہے!

ہم جس عہد میں جی رہے ہیں ... آنے والے زمانوں کو کیا خبر ملے گی؟ مکہ اور مدینہ کے بعد مسلم دنیا کے لیے زیارت کے حوالے سے تیسرا مقدس ترین شہر ... نجف اشرف!

شیر خدا کے شہر کی قدم بوسی' مزار کا منظر اور عقیدت کا احوال دلکش ہے۔ عراق کی تاریخی' علمی' مذہبی' سیاسی اور جغرافیائی اہمیت جان لینے کے بعد اپنی کم علمی کا اعتراف تو کرنا ہی پڑتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ اگر دنیا میں مہم جو نہ ہوتے تو ... دنیا کو دوسرے خطوں کی خبر کیسے ملتی؟

تقدیر کا آخری باب ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے جب تک کہ ہم خود اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیں۔ کتاب کا یہ [illegible] لکھتے وقت' خاتون کو آخری باب کے احوال کی خبر تھی ... پھر بھی ان کا حوصلہ برقرار رہا ... ایک برے واقعے کے بعد وہ اپنے تمام تر کیمرہ ریکارڈ سے محروم ہو گئیں ... جس کا ذکر' دلگیر ہے!

اور اختتامی نوٹ' تاریخ کی ایک خاص خاتون' ایک تو خاتون اور پھر اتنی خاص' جرٹروڈ بیل کے اوپر ہے ... اس کے کارنامے ایک ہی باب میں تعارف کے طور پر شامل ہیں ... 1868ء میں پیدا ہوئیں ... برطانیہ میں اور بلوغت کی عمر تک مشرق وسطیٰ کے سحر میں جکڑی گئیں ... اور پھر یہیں کی ہو رہیں ... زبانوں پر عبور حاصل کیا ... مقامی کلچر کا جائزہ لیا ... پہاڑ کی چوٹیاں سر کیں اور تقدیر نے ان سے عراق کی بنیاد رکھنے کا کام لیا۔ بانی عراق کہلائیں ... مزید کے لیے کتاب کا مطالعہ فرمائیں۔

تحریر ذریعہ مواصلات تو نہیں مگر یہ آپ کو دور دیس لے جانے کا وصف رکھتی ہے۔ لفظ اس کا ایندھن ہیں اور مطالعہ اس کا ڈرائیور ...!

ہر مسافر اپنے سفر میں دوسروں کو شریک کرنا ضروری نہیں سمجھتا اور اگر کوئی ایسا کرے تو شریک ہونے والوں کو شکریہ ادا کرنا واجب ہے۔ یقین کریں' شکر گزاری بہت خاص بنا دیتی ہے۔ اس کو بھی جس کے پاس بہت کچھ ہے ... اور اس کو بھی جس کے پاس وہ سب نہیں ...!



قارئین سے

علالت اس طویل غیر حاضری کی وجہ تھی ... جو میں پوچھے بغیر بتانے کو اپنا فرض خیال کرتی ہوں۔ بعض اوقات صلاحیت' شوق' وسائل ... ان سب کی موجودگی بھی آپ کو مائل کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ ایسے میں یاد دہانی بند کواڑوں پر دستک جیسا اثر رکھتی ہے۔ ان سطور کے ذریعے ان احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جنہوں نے اپنی محبت اور خلوص سے ... کاغذ اور قلم سے میرے تعلق کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ دعاؤں میں شامل رکھنے کی درخواست کے ساتھ تبصرے پر آپ کی رائے کا انتظار رہے گا ... شعاع' پڑھنے اور لکھنے والوں کے لیے سلامتی اور عافیت ... دعائیں!

(آمنہ زریں)

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

چھبیسویں قسط





وردہ سامنے کھڑے شہزاد کو دیکھ کر لمحہ بھر کو چونک سی گئی۔

"واثق بھائی تو گھر پر نہیں ہیں۔" اس کے تعارف کرانے پر اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "وہ آفس میں ہوں گے۔" وہ رک کر پھر سے بولی۔

وردہ پنک کلر کے سادہ سے سوٹ میں لاپروائی سے دوپٹا کندھوں کے اطراف ڈالے شہزاد کو گلابی شام کا ہی کوئی حصہ لگی۔

اس کے سیدھے سیاہ ریشمی بالوں کی لٹیں چہرے کے دائیں بائیں جھول رہی تھیں۔ آنکھوں میں بچوں کی سی معصومیت اور سادگی تھی۔

شہزاد لمحہ بھر کو بھول ہی گیا کہ وہ یہاں کیا کرنے آیا تھا۔

"تو کیا آپ ویٹ کریں گے بھائی کا۔" اس کی اتنی لمبی چپ سے وردہ نے یہی اخذ کیا تو پوچھنے لگی۔

"آپ کی ماما آئی مین عاصمہ آنٹی تو گھر پر ہوں گی۔" اسے لمحہ موجود میں آنے میں چند ثانیے لگے اور وردہ اس کی اس بات پر مزید حیران سی ہو گئی۔

"ماما۔۔۔ ماما سے آپ کو کیا کام ہے؟" وہ اپنی حیرانی چھپا نہیں سکی تو پوچھنے لگی۔

"ایکچوئلی مجھے آنٹی ہی سے کام ہے، پلیز اگر آپ انہیں جا کر بتائیں کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں اینڈ اٹس ارجنٹ۔"

شہزاد کو زبیر کی التجائیہ نظریں یاد آئیں تو لہجے میں کچھ منت سی سمو کر بولا۔ وہ بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"میں کہتی ہوں جا کر ماما سے، آپ آجائیں، اندر بیٹھ جائیں۔" اسے جاتے جاتے خیال آگیا تو اسے دعوت دیتے ہوئے کہہ گئی۔

"تھینکس۔۔۔ آپ وردہ ہیں نا۔" وہ اس کی دعوت پر نظروں میں پسندیدگی لیے اسے دیکھ کر بولا۔

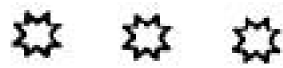
"آپ۔۔۔ کو۔۔۔ میرا نام معلوم ہے؟" وہ کچھ ناپسندیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"واثق کافی ذکر کرتا ہے تو۔۔۔" وہ صفائی دینے والے انداز میں جلدی سے کہہ گیا۔

"آپ پلیز بیٹھیں یہاں، میں ماما کو آپ کا پیغام دے کر آتی ہوں۔" وہ کچھ ناراض سی ہو کر اسے بیٹھنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔

شہزاد احتیاط سے ہاتھ میں پکڑا بڑا سا لفافہ اپنے ساتھ رکھتے ہوئے لاؤنج میں بیٹھ گیا۔

"معلوم نہیں عاصمہ آنٹی کس طرح ری ایکٹ کریں۔" وہ انتظار کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔



"آپ شاید ناراض ہیں مجھ سے۔" پری زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ کچھ دیر بعد بولی۔ واثق نے سختی سے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ جیسے بات ہی نہیں کرنا چاہتا ہو۔ پری اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

"واثق! آپ شاید مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتے، لیکن جس طرح آپ مجبور ہیں اسی طرح میں بھی مجبور ہوں۔ اپنے دل اور اپنے جذبوں کے ہاتھوں۔۔۔ میں بہت کوشش کرتی ہوں۔ میں اپنے دل سے آپ کی خواہش کھرچ کر نکال دوں۔"

بولتے بولتے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔ وہ اپنے جذبات چھپانا تو نہیں چاہ رہی تھی لیکن جانے کیوں دل بھر آرہا تھا۔

میں نے بہت کوشش کی واثق۔۔۔ پلیز آپ مجھے معاف کر دیں ہیں۔ میں آپ کے ساتھ کچھ برا نہیں کرنا چاہتی مگر میں بے بس ہوں رئیلی۔۔۔" اس نے بہت آہستگی سے واثق کے اسٹیئرنگ پر رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

واثق کو جیسے کسی سانپ نے ڈنک مارا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ پرے کھینچا تھا۔

"صرف تمہاری ان ہی باتوں کی وجہ سے میں تمہیں لفٹ نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم باز نہیں رہ سکتیں۔"

وہ نفرت بھرے لہجے میں پھنکار کر بولا۔

"میں بتا چکی ہوں آپ کو نہیں ہے میرا خود پر اختیار۔۔۔" وہ یوں ہاتھ پرے جھٹکے جانے پر زخم خوردہ لہجے میں چیخی تھی۔

"تو بہتر ہے پھر اپنا کہیں سے علاج کراؤ یا جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے وہ کرو لیکن مجھ سے کوئی امید کبھی نہیں رکھنا نہ میرے رستے میں یوں بار بار آ کر میرا دماغ خراب کرو۔" وہ اسی نفرت بھرے لہجے میں غرا کر بولا جیسے پہلے چلایا تھا۔

پری کو شدید ذلت کا احساس ہوا تھا۔

"میں چاہوں تو تمہاری یہ گھٹیا حرکتیں تمہارے فادر کو بتا سکتا ہوں لیکن خدا کی قسم مجھے ان کی عزت کی شرم مار دیتی ہے وہ اتنے اچھے رکھ رکھاؤ والے انسان ہیں اور میرا دل کبھی کبھی یہ ماننے سے بھی انکار کرتا ہے کہ تم واقعی میں ان کی بیٹی ہو بھی یا نہیں۔" وہ حقارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"شٹ اپ۔۔۔ آپ کو مجھے گالی دینے کا کوئی حق نہیں۔" پری کا چہرہ شدید غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

"اگر تم غور کرو تو تم صرف گالی کی مستحق نہیں ہو اوکے۔۔۔" وہ حقارت سے بولا تو پری کا جی چاہا وہیں چلتی گاڑی سے کود جائے۔

"روکیں گاڑی اترنا چاہتی ہوں میں۔" وہ غصے میں کانپتی آواز میں چیخی۔

"میں نے تمہیں گھر تک ڈراپ کر دیا ہے آخری بار تمہیں سمجھا رہا ہوں خود کو سنبھال لو تو زیادہ بہتر ہے ورنہ کسی دن زیادہ بڑا نقصان اٹھاؤ گی۔ اگر تمہیں اپنا نہیں تو اپنے باپ کی عزت کا ہی کچھ خیال کر لو۔" واثق نے جھٹکے سے بریک لگائی تھی۔

پری کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ہوئے بچا تھا۔

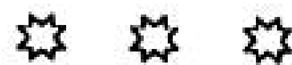
"شاید میں پہلے اس بارے میں کچھ سوچ لیتی لیکن اب چاہے میں فائدے میں رہوں یا بہت بڑا نقصان اٹھاؤں میں پیچھے نہیں ہٹوں گی۔" وہ اسے چیلنج کرنے والے انداز میں غرا کر بولی۔

"اس سے تو بہتر ہے تم خودکشی کر لو اگر ایسا ہی خود کو تباہ کرنے کا شوق ہے تو۔۔۔" واثق نے تمسخر سے اسے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا تھا۔

پری غصے میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

"اس کا فیصلہ آنے والے کچھ دنوں میں ہو جائے گا ہم تینوں میں سے خودکشی کون کرتا ہے۔ آپ میں یا وہ مثال۔۔۔" کہہ کر اسے دیکھتی رہی پھر گاڑی کا دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گئی۔

اور گلی کے موڑ پر آتی مثال سکتے کے عالم میں دور جاتی واثق کی گاڑی کو دیکھتی رہ گئی۔



"جھولا کہہ رہے۔۔۔" دانی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کچھ بھی نہیں ہے یہ رقم' اتنے میں تو آپ ساتھ کے کسی پڑوسی ملک میں نہیں جاسکتے' دبئی وزٹ نہیں کرسکتے' تمہیں تو یار! دنیا کا کچھ بھی پتا نہیں ہے۔" جاوید منہ بنا کر بولا۔

دانی کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

"لیکن میں اتنی بڑی آئی مین اتنی رقم ارینج نہیں کر سکتا۔" اس نے دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔

جاوید اور اس کا دوست اسے تاسف سے دیکھتے رہے۔

"اوکے جیسے تمہاری مرضی۔ میرے پاس تو تین چار اور آپشنز بھی ہیں اور وہ شام سے پہلے مجھے رقم بھی دے دیں گے۔ مجھ سے تو تمہارے اس دوست نے تمہارے لیے بڑی منت سماجت کی تھی تو میں نے تمہارے بارے میں سوچا' اینی وے' ہم نکلتے ہیں۔" جاوید کندھے جھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"یار! تم بہت پچھتاؤ گے' یہ گولڈن چانس تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتے ایڑیاں رگڑتے یہیں پڑے رہو گے اور وہ شہری لوگ تمہیں جینے دیں گے' نہ مرنے۔" اس کا دوست اسے شرمندہ کرتے ہوئے کچھ خوف زدہ کر رہا تھا۔

"جانتا ہوں یار! لیکن یہ رقم۔" دانی ہتھیلیاں مسل کر بولا۔

"یار! طریقہ بتایا تو تھا میں نے' آج شام تک اگر بندوبست نہیں کر سکا تو کھیل ختم' اوکے۔" دانی پریشان سا اسے دیکھتا رہ گیا۔ کھیل تو اسے ختم نہیں کرنا تھا۔



"تمہارے پاپا آفس چلے گئے' اگر ٹھیک نہیں ہوتے تو نہیں جاتے۔" عفت کے چہرے پر لکھی ناگواری صاف پڑھی جا رہی تھی۔

"میری دن میں بھی ان سے بات ہوئی تھی۔ ہی از آل رائٹ۔ مگر ظاہر ہے تمہیں ان کو دیکھے بغیر چین تو ملے گا نہیں' اگر تم یہ سب نہیں کرو گی تو ان کو کیسے پتا چلے گا کہ تم ان سے کتنا پیار کرتی ہو۔" آخر میں اس کا لہجہ طنز اور حقارت سے بھرا تھا۔

"ٹھیک کہا آپ نے عفت ماما! میں جب تک انہیں دیکھوں گی نہیں تو مجھے واقعی میں سکون نہیں ملے گا۔" وہ عفت کو جواب دیتے ہوئے قدرے اطمینان سے بولی۔ عفت جل کر رہ گئی۔

"آج کل تو خیر وہ یوں بھی آفس سے لیٹ آتے ہیں' کوئی بہت خاص پروجیکٹ ملا ہوا ہے انہیں۔" وہ پھر سے ایک نیا بہلانہ گھڑتے ہوئے بولی۔

"اب آئی ہوں تو کچھ انتظار کر لوں گی' انہیں دیکھنا تو ہے مجھے۔" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے میگزین اٹھا کر بولی۔

وہ اب میگزین کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ عفت کوفت سے اسے دیکھتی رہی۔

"مجھے جانا تھا' ایک ضروری کام ہے۔" وہ جیسے منہ میں بڑبڑائی۔

"میں نے آپ کو رکنے کے لیے تو نہیں کہا۔ آپ کو جہاں جانا ہے آپ چلی جائیں۔" وہ سرہلا کر بولی تھی۔ "یا آپ کو لگتا ہے۔ میرا مطلب ہے آپ گھر اکیلا چھوڑ کر میری موجودگی میں نہیں جانا چاہتیں۔" وہ جتا کر کچھ طنز سے بولی تھی۔

"سمجھ دار تو تمہیں نہیں کہوں گی۔"

"بہت ہوشیار۔ چالاک بلکہ مکار سمجھتی ہی نہیں۔ مانتی بھی ہیں آپ مجھے۔" وہ تیزی سے عفت کی بات

کاٹ کر بولی۔

''تم سمجھتی کیا ہو خود کو؟'' عفت کو اس کے اس انداز پر غصہ آگیا۔

''عفت ماما! دلوں کے بھید اللہ سے بہتر کوئی نہیں جانتا تو اور ہمارے اعمال ہماری تقدیر بناتے ہیں۔ اعمال 'نیت کے محتاج ہوتے ہیں' جس کی جیسی نیت ہوتی ہے اسے اس کا پھل اچھی بری تقدیر کی شکل میں ملتا ہے' ہم میں سے کس کی نیت کیسی ہے' اس کا فیصلہ آنے والے چند سالوں میں خود بخود ہو جائے گا' نہ آپ کو بہت انتظار کرنا پڑے گا' نہ مجھے۔ کس کو کیا ملے گا' معلوم ہو جائے گا۔''

وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں عفت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''تم مجھے ذلیل کرنے کے لیے یوں برا بھلا کہنے کے لیے میرے گھر میں آئی ہو کہ میری نیت خراب ہے' میرے اعمال برے ہیں' میری قسمت بہت بری لکھی جا رہی ہے' یہ سب بکواس کرنے آئی ہو تم یہاں۔'' عفت غصے میں تلملا کر رہ گئی تھی۔

مثال تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ آپ.....'' وہ گہرا سانس لے کر قدرے نرم لہجے میں بولنے لگی۔

''بس کرو اپنے باپ سے ملو اور جاؤ یہاں سے۔ مثال! میں تمہیں اپنی برداشت سے بھی بہت زیادہ سہہ چکی ہوں۔ اس لیے زیادہ بہتر یہی ہو گا کہ تم میرا مزید امتحان نہیں لو۔''

عفت مٹھیاں بھینچ کر ضبط کے کن مرحلوں سے گزر رہی تھی' مثال کو اندازہ ہو رہا تھا۔

''مطلب ؟ میں سمجھی نہیں آپ کی بات.....'' وہ شاید عفت کو چڑانے کے لیے پوچھنے لگی۔

''اتنی سادہ نہیں ہو تم..... بہت بار تم سے براہ راست اور بہت بار ان ڈائریکٹ کہہ چکی ہوں۔ مت آیا کرو یہاں۔ چھوڑ دو ہمارا پیچھا۔ بخش دو ہمیں۔'' وہ جیسے پھٹ کر بولی۔

''بہت مشکل ہے۔'' وہ تاسف سے بولی۔

''کیا مطلب.....؟'' عفت پھنکاری۔

''میں اپنے لیے دعا نہیں مانگتی' صرف اپنے پاپا کے لیے مانگتی ہوں' ان کی زندگی' صحت اور سکون کے لیے..... اور جب تک میرے پاپا ہیں' میں یہاں آتی رہوں گی' کیونکہ مجھے یقین ہے اللہ پاپا کے لیے مانگی ہوئی میری کوئی دعا رد نہیں کرے گا۔''

وہ بہت یقین' بڑے مان بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ لحہ بھر کو تو عفت گنگ سی رہ گئی۔

اس نے ایسی بات کہہ دی تھی جو عفت کو لاجواب کر گئی تھی۔ پری زور سے دروازہ بجاتی اندر آئی تھی۔

مثال نے صرف نفرت بھری نظر سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ کالج ڈریس کے ساتھ اس کا انداز' بالوں کا اسٹائل' چہرے کی سنوری نوک پلک اس کی فطرت کی غمازی کر رہے تھے۔

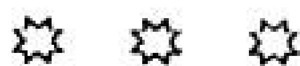
''آپ ہر وقت اس کے ساتھ کیوں سر پھوڑتی رہتی ہیں ماما! یہ لطف لیتی ہے آپ کو' مجھے یوں اذیت پہنچا کر۔ مت بات کیا کریں اس سے۔'' وہ اندر آتے ہی نفرت بھرے انداز میں ماں سے بولی تھی۔

اس کے لہجے میں جو بے زاری اور حقارت تھی' وہ مثال کو چونکا گئی۔ اسے کچھ دیر پہلے کا وہ کریہہ منظر یاد آگیا۔

''میں کب اس سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں' مگر جب یہ خود بار بار آکر ہماری برداشت کا امتحان لے گی تو میں کتنی دیر تک خاموش رہ سکتی ہوں۔'' عفت چہرے پر مظلومیت اور دکھ سجا کر بولی۔

''کب تک آئے گی' مت منہ لگایا کریں اسے' خود ہی تھک کر جان چھوڑ دے گی ہماری۔'' وہ ماں کو جیسے دلاسا دیتے ہوئے بولی۔ دونوں باتیں کرتی باہر نکل گئی تھیں۔

"مجھے جانا ہے کچھ دیر کے لیے گھر سے باہر تم خیال رکھنا۔" عفت اسے ہدایات دے رہی تھی۔
مثال رنجیدہ نڈھال سی صوفے پر گر سی گئی۔
اگر میں واثق سے پوچھوں گی پری کے ساتھ آنے کی وجہ۔ تو ایک نیا جھگڑا جبکہ اس نے مجھے کہہ دیا تھا کہ وہ اس ٹاپک پر نہ تو کوئی آرگومنٹ کرے گا نہ بات کرے گا۔ اگر یہ سلسلہ بڑھتا چلا گیا میرے یوں خاموش رہنے سے تو۔"
وہ سخت پریشان سی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔



"کیا ہے اس میں؟" عاصمہ ناگوار نظروں سے سامنے کھڑے شہزاد کو دیکھ کر بولی۔
شہزاد لفافہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ "آپ کی امانت۔" وہ مختصراً بولا۔
"تمہارے پاس تو میری کوئی امانت نہیں تھی کبھی بھی۔ کیونکہ ہم پہلے سے نہیں جانتے ایک دوسرے کو۔" وہ کچھ رکھائی سے بولی۔ "ہاں واثق کے حوالے سے ہماری کچھ جان پہچان ہے۔" اس کا انداز جتانے والا تھا۔
شہزاد لحہ بھر کو خاموش رہ گیا۔
"آپ کی امانت ہے یہ اور یہ مجھے آپ ہی تک پہنچانی تھی۔ آپ اسے کھول کر دیکھیں گی تو آپ کی سمجھ میں آجائے گا۔" وہ کچھ رک کر بولا۔
"مگر میں یہ نہیں لینا چاہتی۔ بہتر ہے تم اسے واپس لے جاؤ۔" وہ اسی خشک لہجے میں کہہ رہی تھی۔
شہزاد متذبذب سا کھڑا رہ گیا۔
"ایک بات پوچھوں آپ سے آنٹی؟" وہ کچھ دیر بعد قدرے نرم لہجے میں بولا۔ عاصمہ نے کچھ جواب نہیں دیا۔
"آپ میرے پاپا کو جانتی ہیں؟" وہ اس کے چہرے پر نظریں جما کر آہستگی سے بولا۔
"میں اس شخص کا نام نہیں سننا چاہتی بہتر ہے اگر تم اس کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو چلے جاؤ یہاں سے مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔"
وہ اپنے شدید اٹدتے جذبات پر بمشکل بند باندھ کر رخ پھیرے کانپتی آواز میں بولی تھی۔
شہزاد نے چونک کر اسے دیکھا۔
"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔ میں چلتا ہوں خدا حافظ۔" اس نے آہستہ سے کہا اور چلا گیا۔ عاصمہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی پھر آنکھیں صاف کرتی مڑی اور چونک گئی۔ شہزاد جا چکا تھا۔ وہ لفافہ وہیں پڑا تھا۔

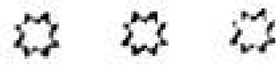


"کیوں، آپ کو بتا کر نہیں گئی مثال؟" واثق کچھ ناگواری سے بولا۔
عاصمہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ خود اس وقت بہت الجھی ہوئی تھی۔
"عدیل بھائی کی طبیعت اچھی نہیں تھی انہیں دیکھنے گئی ہے۔" عاصمہ خود کو سنبھال کر بولی۔
"مگر میری تو انکل سے ایک گھنٹہ پہلے بات ہوئی ہے۔ وہ اپنے آفس میں تھے اور ٹھیک تھے۔"
"مگر تم نے انہیں کال کیوں کی تھی؟" عاصمہ نے چونک کر پوچھا۔
"نہیں کچھ خاص نہیں۔ آفس کے سلسلے میں کچھ کام تھا۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔
"مجھے کہتیں تو رکنے کا۔ میں اسے لے جاتا۔"
"میں نے کہا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ میں بھی ساتھ چلتی ہوں لیکن اس نے کہا کہ وہ زیادہ رکے گی نہیں۔ بس

تھوڑی دیر میں آجائے گی اور تم اتنی ٹینشن کیوں لے رہے ہو۔ آجائے گی کچھ دیر میں وہ۔ تم فریش ہو جاؤ۔ میں چائے بنواتی ہوں تمہارے لیے۔"

عاصمہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

واثق کچھ الجھا ہوا جانے لگا تو میز پر پڑا لفافہ دیکھ کر چونکا پھر سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔



مثال دروازہ کھولے سامنے کھڑے سیفی کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔

سیفی کے چہرے پر بڑی جان دار معنی خیز مسکراہٹ تھی جیسے دونوں میں بڑی مدت کی شناسائی ہو اور اب ایک عرصے کے بعد سامنا ہو رہا ہو۔

"ہاؤ آر یو؟" وہ مسکرا کر اس کے چہرے پر نظریں جمائے بولا۔

مثال نے زور سے ہونٹ بھینچ لیے۔

"کم آن یار! کیا شادیٔ مرگ ہو گیا مجھے یوں اپنے سامنے اتنے ٹائم کے بعد دیکھ کر۔ رئیلی مثال' آئی مس یو یار!" وہ بے تکلف لہجے میں گویا تھا۔

"بہت دنوں تک میں خود کو جھٹلاتا رہا کہ میرے اندر جو یہ ڈپریشن سا ہے یہ یونہی بے وجہ ہے۔" وہ اس کے کچھ اور قریب ہوا۔

"شٹ اپ!" وہ دھیمی آواز میں غرائی۔

"وہ تم تھیں مثال جس نے میرے لیے سب راستے بند کر دیے تھے جس طرف کو بھی بھاگ کر جانا چاہتا تم وہاں میرا رستہ روکے کھڑی تھیں۔" وہ جانے کیا کچھ بول رہا تھا۔ مثال کو لگا اس کا دماغ بھک سے اڑ رہا ہے۔

"تم نے میرے لیے ہر رستہ بند کر دیا' میرے پاس تمہارے پاس آنے کے علاوہ اور کوئی چوائس نہیں بچی یو آئی سیو تو کم ڈیئر۔" وہ بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے لگا۔ مثال کو جیسے ہزار واٹ کا کرنٹ لگا۔

"بکواس بند کرو تم۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی اور مجھ سے یہ ساری بکواس کرنے کی۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔ جیسے اس کا پورا وجود کپکپا رہا تھا۔

"تم نے۔ تمہارے خیال نے۔ اور اگر میں سچ بولوں تو تمہاری محبت کی شدت نے مجھے یہ ہمت' یہ طاقت دی کہ میں نے سب کچھ۔ اپنا فیوچر' اپنا کیریئر' اپنے خواب' اپنے رشتے سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور صرف تمہارے خیال کی طاقت مجھے یہاں تک لے آئی۔ دیکھ لو محبت کا کمال۔"

وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا بول رہا تھا۔ مثال کے کان سائیں سائیں کرتے سن تو رہے تھے مگر اس کا مفہوم وہ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ بس آنکھیں پھاڑے ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے اس بھیانک رات کے منظر تیرنے لگے تھے جب یہ شیطان بدروح کی طرح اس کو برباد کرنے جا رہا تھا۔

مثال نے پوری قوت سے اسے دھکا دے کر باہر نکالنا چاہا۔ سیفی نے بہت مضبوطی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔

وہ شاید اس حملے کی توقع کر رہا تھا سو چوکنا تھا۔

"تو۔ تم نے مزید بکواس کی تو میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ ختم کر لوں گی۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ چلے جاؤ۔" وہ ایک دم جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

وہ کہاں ہے، کس جگہ ہے کیا بات کر رہی ہے۔ سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔

"ارے۔ ارے اتنا غصہ میری جان! میرے چلے جانے کا تمہیں۔ ایسا رنج تھا۔ تم نے مجھے بھی بتایا ہی نہیں۔ میں پہلے ہی بھاگا چلا آتا۔" وہ الٹا اس کے غصے کو دیوانگی قرار دے رہا تھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔ سنا تم نے۔" وہ کانپتی آواز میں چیخی۔

"تمہیں لینے کے لیے آیا ہوں میری جان! میں واقعی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا... نہیں رہ سکتا۔" وہ اس کے ہاتھ زور سے اپنے ہاتھوں میں دبائے جذباتی پن سے کہہ رہا تھا۔

"واؤ انٹرسٹنگ... یہ کون سی فرینڈلی ریسلنگ ہو رہی ہے یہاں پر۔" پری ایک دم سے آ کر ان کے بالکل قریب کھڑے ہو کر بولی تھی۔

سیفی نے ایک دم سے مثال کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ مثال تو ساکت سی کھڑی رہ گئی تھی۔

"میں سفیان ہوں سیفی... سفیان احسن کمال۔" سیفی تھوڑا سا گھبرانے کے بعد فوراً" سنبھل چکا تھا۔

"اوہ تو آپ ہیں وہ سیفی۔" پری ہونٹ سکیڑے دلچسپ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"اور آپ تو شاید پری ہیں، ہیں نا؟" وہ بھی جواباً" ان ہی نظروں کا تبادلہ کرتے ہوئے سراہنے والے انداز میں بولا تھا۔

"آف کورس۔ میرے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ مثال کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے آپ کا۔"

"جھگڑا... تھا اب نہیں ہے۔" سیفی زور دیتے ہوئے بولا۔ مثال اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسی وقت دروازے کے پاس آہٹ سی ہوئی، تینوں نے بیک وقت مڑ کر دیکھا۔

واثق وہاں کھڑا کچھ متذبذب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"آئیے واثق بھائی! آئیے نا، وہاں رک کیوں گئے۔ آئی مین یوں دروازے پر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آئیں نا... آپ کا اپنا تو گھر ہے یہ۔" پری کچھ دیر پہلے والے غصے کے بجائے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے اپنائیت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

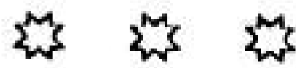
"یہ کون ہیں؟" سیفی بے وجہ ہی الجھا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے کچھ الارم کیا تھا۔

"ارے آپ کو نہیں پتا، مثال نے نہیں بتایا آپ کو، یہ واثق احمد ہیں، مثال آپی کے شوہر ابھی کچھ ہی ماہ پہلے تو شادی ہوئی ہے بڑے ڈرامائی انداز میں دونوں کی۔"

"شادی... مثال کی۔" سیفی کے لیے شاک تھا، دہرا کر بولا۔

"کمال ہے اتنی بڑی نیوز آپ کے علم ہی میں نہیں تھی۔" پری اس کی حیرت کو ہوا دیتے ہوئے بولی۔

"مثال! چلو میں لینے آیا ہوں تمہیں۔" واثق سرد لہجے میں بولا تو مثال کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل گئی۔



دونوں رات کے پھیلتے اندھیرے میں یونہی گاڑی میں سفر کرتے جا رہے تھے دونوں کے چہروں پر گہری سوچ اور فکر مندی سی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔

"اگر میں واثق سے پوچھوں کہ وہ پری کے ساتھ گاڑی میں کہاں سے آ رہا تھا تو یہ مجھ پر برسنے لگے گا۔" مثال نے کن انکھیوں سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے واثق کو دیکھتے ہوئے سوچا مگر کچھ بول ہی نہیں سکی۔

ایسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہونٹ آپس میں سل گئے ہوں وہ اب کبھی ایک لفظ بھی بول نہیں پائے گا۔

اور یہ کمینہ سیفی۔۔۔ یہ کیوں آگیا اور ہو یہ بکواس کر رہا تھا۔ مائی گاڈ اگر کوئی سن لیتا اس پری نے اگر کچھ سن لیا ہوا ۔۔۔ واثق کے کان میں کچھ پڑ جاتا۔''

واثق کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ پریشان سی ہوئی۔

سیفی کی نظریں اس کا انداز جس طرح وہ مثال کو دیکھ رہا تھا اس میں بہت کچھ تھا۔

''لیکن اگر میں مثال سے کچھ پوچھوں گا تو یہ انکار کر دے گی۔ الٹا مجھے جھٹلا دے گی نہیں مجھے مثال سے کچھ نہیں پوچھنا کوئی بات نہیں کرنی۔'' اس نے سر جھٹکا۔

''اگر یہ مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے تو مجھے پتا کیسے چلے گا کہ ان کے دل میں کیا چل رہا ہے۔'' مثال کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں۔'' ایک مسلسل سفر۔ ایک سڑک کے بعد دوسری سڑک۔۔۔ نہ ختم ہونے والے راستوں پر سفر نے جیسے اسے اکتا دیا۔ بہت دیر بعد بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کہیں نہیں۔'' واثق بوجھل آواز میں بولا۔ جیسے وہ بھی اس بے مقصد مسافت سے تھک گیا ہو۔ اس نے ایک دم سے ایک طرف کر کے گاڑی روک دی تھی۔ مثال نے کچھ پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

''یہاں کیوں رکے؟'' وہ رستے کی ویرانی سے خائف ہو کر بولی۔

''پتا نہیں۔'' واثق کو باہر کی ویرانی سے زیادہ اندر کے شور نے ڈسٹرب کر رکھا تھا۔

''گھر کیوں نہیں جا رہے؟'' وہ کچھ دیر بعد اسے احساس دلاتے ہوئے بولی۔

''کیا تمہیں مجھ سے کچھ نہیں کہنا۔'' واثق جتانے والے لہجے میں بولا۔ مثال ہاتھ مل کر رہ گئی۔

''تو وہ لمحہ آن پہنچا اگر واثق نے واقعی سیفی کی کچھ بکواس سن لی ہے تو؟'' وہ کانپ کر رہ گئی۔

''میں تو سمجھی شاید آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے اس لیے اتنی دیر سے ہم یوں ہی چلے جا رہے ہیں۔'' وہ کچھ ہمت کر کے بولی۔

''مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

''کیا مطلب۔۔۔ کیا لگ رہا ہے؟'' وہ پریشان ہو گئی۔

''ہم دونوں بس یوں ہی چلے جا رہے ہیں۔'' وہ کچھ افسردگی اور بے دلی سے بولا۔

مثال اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''کیا۔۔۔ کیا جانتی تھیں تم؟'' واثق بے قراری سے بولا۔

مثال اسے دیکھنے لگی۔

''ابھی سفر شروع ہی ہوگا ہم کچھ ہی دیر ساتھ چلیں گے کہ آپ کو سفر کی رائیگانی کا احساس ستانے لگے گا۔'' وہ بوجھل سی آواز میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' واثق قطعاً ''نہیں سمجھا۔

''ہمیں گھر چلنا چاہیے۔ آنٹی پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' وہ کچھ دیر بعد باہر پھیلتے اندھیرے کو دیکھ کر بولی۔

''تمہیں مجھ سے کچھ نہیں کہنا؟'' وہ کچھ مایوس ہوا تھا۔

''الفاظ سے زیادہ ہمیں ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے واثق! اگر واقعی آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو یہ سفر بے مقصد نہ لگے تو۔'' وہ جانے کیا سمجھانا چاہ رہی تھی۔

واثق اسے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے گاڑی دوڑا لے گیا۔

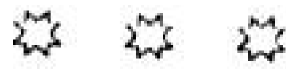


وہ بے یقین نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھتا جا رہا تھا۔
سامنے بیڈ پر پڑے وجود پر اس کی نظریں ٹھٹک گئیں۔
ابھی کچھ ہی لمحے پہلے تو اس نے زبیر کو بتایا کہ وہ اس کی امانت عاصمہ تک پہنچا آیا ہے۔ اسے لگا زبیر کی آنکھوں میں چمک آئی تھی۔ ہونٹوں پر معدوم سی مسکراہٹ مگر دوسرے ہی لمحے سب کچھ جیسے بجھ سا گیا تھا۔
سینے میں رک رک کر چلتی سانسیں تھم سی گئی تھیں۔ آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی۔
"پاپا آپ ٹھیک ہیں نا... خوش ہیں نا... میں وہ دے آیا ہوں عاصمہ آنٹی کو۔" وہ پھر سے اس کا سینے پر رکھا ہاتھ ہولے سے ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
ہاتھ بے جان ہو کر پھر سے سینے پر گر گیا۔
اسی وقت ڈاکٹر اور نرس اندر آئے۔ اسے ہٹا کر ڈاکٹر زبیر کا معائنہ کرنے لگا تھا۔
"یہ اب حیات نہیں ہیں، مجھے افسوس ہے۔" ڈاکٹر نے مختصر معائنے کے بعد ہی مدھم آواز میں گویا اعلان کیا تھا۔
شہزاد کے کان جیسے سننے سے قاصر تھے۔ وہ ناسمجھی سے ڈاکٹر کو دیکھتا جا رہا تھا۔



عدیل گاڑی گھر کی طرف موڑتے ہوئے بے اختیار ٹھٹکا تھا۔ وہ سیفی ہی تھا۔ عدیل اسے پہچانتا تھا۔
کچھ عرصہ پہلے وہ اسے دیکھ چکا تھا جب بشریٰ ——— وہ ایک بار باہر شاپنگ مالز میں، ہوٹلز میں اپنے شوہر اور دوسری بیٹی کے ساتھ نظر آتی تھی تو یہ لڑکا بھی ساتھ ہوتا تھا۔
مثال کو بشریٰ! جس طرح یہاں چھوڑ کر گئی تھی اور جس خوف کا اظہار وہ الفاظ میں نہیں کر سکی تھی، وہ اس کی آنکھوں، اس کے لہجے سے عیاں تھا۔
"وہ چاہتے ہوئے بھی عدیل کو نہیں بتا سکی تھی۔ مگر ایک مرد ہونے کے ناتے تو وہ یہ ساری سچویشن سمجھ چکا تھا مگر بیٹی کا باپ ہونے کی وجہ سے اس نے اس واہمے کو اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں کہیں دفن کر دیا تھا۔
اگر عفت کو پتا چل جاتا تو وہ رائی کا پہاڑ بنا ڈالتی، اس کی معصوم بیٹی کے کیا قصے کیا واقعے بنتے... عدیل نے اس گہرے راز کو دل کی گہرائیوں میں چھپا لیا تھا۔
لیکن آج یہ پھر یہاں کیوں آ گیا؟
اور عدیل کی آنکھوں نے دھوکا نہیں کھایا تھا۔ وہ عدیل کے گھر سے نکل کر آیا تھا۔
اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ گھر میں عفت نہیں تھی۔ پری بظاہر ٹی وی کے چینلز گھمانے میں مصروف تھی مگر اس کی یہ مصروفیت ایک بہانہ نظر آ رہی تھی۔
"رائی کہاں ہے؟" عدیل کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے یہی نکل سکا۔
"پاپا! وہ گھر پر نہیں ہے۔" پری باپ کو دیکھ کر کچھ مؤدب ضرور ہوئی تھی۔
"یہی تو پوچھ رہا ہوں، وہ کہاں ہے۔" وہ کچھ جھنجلا کر بولا۔
"مجھے نہیں معلوم پاپا!" وہ کچھ ڈر کر بولی۔
"ابھی کون آیا تھا یہاں؟" محتاط لہجے میں اس نے پوچھ ہی ڈالا۔
"کوئی نہیں... ہاں وہ مثال آپی آئی تھیں، مطلب پہلے ہی سے آئی ہوئی تھیں پھر واثق بھائی کے ساتھ چلی

گئیں۔" وہ رک رک کر بولی۔
"مثال آئی تھی؟" وہ کچھ حیران سا ہوا "اور چلی کیوں گئی۔"
پری نے کچھ کوفت سے کندھے اچکائے۔
عدیل سیفی کے بارے میں پوچھتے ہوئے رک گیا اور اندر چلا گیا پری پھر سے ٹی وی میں مصروف ہو گئی۔



"یہ کیا کہہ رہی ہو تم مثال!" بشریٰ کے لیے یہ خبر کسی بم بلاسٹ سے کم نہیں تھی۔
اسے تو لمحہ بھر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا اگرچہ سیفی کے پاکستان جانے کی خبر نے اس کا دل ضرور دھڑکایا تھا لیکن اسے ایک فیصد بھی امید نہیں تھی کہ وہ مثال سے ملنے چلا جائے گا۔
"ماما! آپ نہیں جانتیں یہ سب کچھ میرے لیے کتنا شاکنگ تھا اور اس کو دیکھ کر میں کتنا ڈر گئی تھی۔ وہ کیا کچھ بولے جا رہا تھا۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنے دفاع میں کچھ نہیں بول پا رہی تھی۔" وہ سخت پریشان اور ہراساں تھی۔
بشریٰ بھی پریشان ہو گئی۔
"یہی تمہاری غلطی ہے۔ تم بلاوجہ ڈر سے کانپنے لگتی ہو۔ تم نے اس کا منہ کیوں نہیں توڑا؟ اسے دھکے دے کر نکال دینا چاہیے تھا تمہیں فوراً۔" بشریٰ کو مثال کی بزدلی پر اور بھی غصہ آ گیا۔
"اور میں تو یہ شکر کر رہی ہوں وہ ذلیل تمہارے سسرال نہیں پہنچا۔ عدیل کے گھر میں تھیں نا تم۔ واثق کو اگر معلوم ہو جاتا تو بات بہت فکر والی تھی۔" بشریٰ جیسے خود کو تسلی دے رہی تھی۔
"ماما! واثق بھی اس کی موجودگی میں وہاں آ گئے تھے اور......" وہ کچھ دیر بعد رک کر بولی تو بشریٰ کا دل دھک سے رہ گیا۔
"او مائی گاڈ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم مثال؟" مثال لب کاٹ کر رہ گئی۔
"واثق کو کچھ اندازہ تو نہیں ہوا اس کی کمینگی کا؟" وہ بڑی بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔
"مجھے نہیں پتا چلا۔" وہ کچھ بے بسی سے اعتراف کرتے ہوئے بولی۔
"کیا مطلب؟ کیا پتا نہیں چلا؟" بشریٰ ناسمجھی میں بولی۔
"واثق کا لہجہ، ان کا انداز... بہت عجیب سا ہو رہا ہے اس کے بعد۔ انہوں نے مجھ سے بعد میں ٹھیک طرح سے بات بھی نہیں کی۔" وہ نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو مثال! کیا واثق کو کچھ شک ہو گیا ہے سیفی کے آنے سے؟" بشریٰ کی پریشانی بڑھ گئی۔
"معلوم نہیں ماما! ان کے دل میں کیا چل رہا ہے۔ ہمارے درمیان پہلے ہی... میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کس الجھن کے بارے میں آپ کو بتاؤں اور کس کے بارے میں نہیں۔"
وہ تھک کر رہ گئی تھی اب اسے یہ بوجھ کسی نہ کسی سے تو شیئر کرنا ہی تھا۔
"مائی گاڈ مثال! تم نے مجھے سخت پریشان کر دیا ہے، سنو میری بات غور سے۔ یہاں بھی حالات کچھ اتنے اچھے نہیں چل رہے کہ میں جلدی جلدی تم سے کانٹیکٹ کر سکوں۔ احسن کی طبیعت کچھ اتنی اچھی نہیں پھر آئینہ کی شادی کا مسئلہ، احسن کے بزنس کے معاملات۔ گھر کا مسئلہ۔ کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے لیکن میں صرف تمہاری طرف سے مطمئن تھی کہ آخر کار اللہ نے میری بیٹی کی سن لی۔ اسے محبت کرنے والا شوہر اور قدر کرنے والا سسرال ملا لیکن جو کچھ تم اب مجھے سنا رہی ہو، مثال! مجھے یوں لگ رہا ہے۔ میرے قدموں کے نیچے سے زمین

سرک رہی ہے۔" بشریٰ کی پریشانی دوچند ہو چکی تھی۔

"ماما! میں آپ سے یہ سب نہیں کہنا چاہتی تھی لیکن آج اس سیفی کی آمد نے مجھے بہت خوف زدہ کر دیا ہے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"سنو تم اب میرڈ ہو۔ تمہارے ساتھ تمہارا شوہر ہے جو تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری قدر کرتا ہے۔ تم پر بھروسا کرتا ہے۔ تمہیں اس سیفی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کہ اب اگر وہ تمہارے راستے میں آئے تم سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا منہ توڑ دو۔ سختی سے منع کر دو بلکہ مناسب موقع دیکھ کر واثق کو بھی بتا دو لیکن وہ واقعہ ہرگز نہیں۔" وہ تنبیہہ کرتے ہوئے بولی۔

"تم سمجھ رہی ہو نا میں کیا بات کر رہی ہوں۔ مثال اب معاملہ صرف تمہاری ذات کا نہیں۔ میری بیٹی تمہاری پوری ازدواجی زندگی اور تمہارے گھر کا بھی ہے۔ تمہیں ہر حال میں خود کو مضبوط رکھنا ہے۔ سیفی جیسا گھٹیا انسان اگر تم تھوڑی بھی مضبوطی دکھاؤ گی تو زیادہ وقت تمہارے سامنے کھڑا نہیں رہ سکے گا۔" وہ اسے آہستہ سمجھا رہی تھی۔

"مگر ماما! واثق کے دل میں کیا ہے' میں سمجھ نہیں پا رہی اور وہ پری۔ وہ بہت عجیب ہے اور واثق کے ساتھ۔۔۔" اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا لگا۔

اتنی گری ہوئی بات وہ کیسے اپنی ماں سے بھی شیئر کر سکتی ہے' وہ بھی اپنے شوہر کے بارے میں۔" وہ بولتے بولتے رک گئی تھی۔

"کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔ پری کا یہاں کیا ذکر آگیا؟" بشریٰ ایک دم سے چونکی تھی۔

"نہیں۔ وہ بھی وہاں آگئی تھی جب وہ سیفی آیا تھا تو اسی نے واثق سے سیفی کا تعارف بہت عجیب انداز میں کرایا تھا جس کی وجہ سے۔۔۔" وہ رک رک کر بات کو پلٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

"مثال! میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تم اب سیریس رہو' واثق سے تو محبت کرتی ہو نا؟"

"ماما!" اسے بشریٰ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"بیٹا! وہ شوہر ہے تمہارا اور خدا کے لیے اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرو۔ اس سے دور نہیں رہو نہ اسے خود سے دور ہونے دو۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟"

"ہوں!" مثال بے دھیان سی تھی۔

واثق کھانے کے بعد کمرے میں نہیں آیا تھا۔

اس نے بہت دیر تک انتظار کیا تھا۔ ایک بار باہر بھی گئی تھی مگر وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھا۔

وردہ بیٹھی اپنے نوٹس بنا رہی تھی۔ اسے اتنی عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ وہ شرمندہ سی واپس آگئی۔

اور اب کافی رات ہو گئی تھی۔

"کیا آج واثق کمرے میں نہیں آئے گا۔" وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔

"تمہارے پاس اس کی کال تو نہیں آئی؟" بشریٰ پوچھ رہی تھی۔

"نہیں ماما! میرا نمبر چینج ہو چکا ہے۔ میرا نہیں خیال اس کے پاس ہو گا وہ نمبر۔" وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"ٹھیک ہے پھر بھی تم بہت احتیاط کرنا اور پلیز واثق کے ساتھ رہو' خوامخواہ کی الجھن جو بھی ہے اسے تمہیں ہی ختم کرنا ہے' میں پھر کال کروں گی تمہیں۔"

بشریٰ نے کہہ کر فون بند کر دیا مثال یونہی بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆



"عاصمہ بہن!
مجھے آپ کو بہن کہنے کا بھی حق نہیں ہے۔ بلکہ مجھے آپ سے بات کرنے کا کوئی بھی رعایت لینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ جو کہتے ہیں جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے تو بوجھ اتارا کرتے ہیں اور میری زندگی کی کشتی پر تو گناہوں کے اتنے بوجھ ہیں میں چاہوں بھی تو اپنی گردن ان کے عذاب سے آزاد نہیں کرا سکتا۔
اگرچہ آپ کو دھوکا دینے کے بعد سے میں مسلسل گرفتار عذاب ہوں ایک لمحہ بھی میری زندگی میں ایسا نہیں آیا جب مجھے سکون، خوشی یا راحت ملی ہو ایک کرب مسلسل۔ ایک عذاب مسلسل!
پہلے بیوی اور بچوں کی ناگہانی ہلاکت!
پھر سارا بزنس جو بڑی محنتوں اور دھوکے سے اپنے پیروں پر کھڑا کیا تھا کچھ بھی نہیں بچا۔ سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔
میں لوگوں کے لیے ایک عبرت کی تصویر بن گیا تھا! جیتی جاگتی زندہ لاش!
کئی مہینے ہوش و خرد سے بے گانہ رہا لیکن ایک احساس ہمہ وقت دامن سے لپٹا تھا کہ کس طرح سے آپ کا پتا معلوم کر کے آپ کے قدموں میں گر کر آپ کے یتیم بچوں کا دامن پکڑ کر معافی مانگ لوں لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہیں تھا۔
جب تک میں ہوش و حواس کی دنیا میں واپس آیا' آپ کہیں اور شفٹ ہو چکی تھیں۔
پھر لاکھ کوششوں اور تلاش کے باوجود آپ کو تلاش نہیں کر سکا تھا۔
گناہ اور پچھتاوے میرے پورے وجود کو دن رات زہریلے سانپوں کی طرح ڈستے اور میں شرمندگی اور ندامت کی ایسی دلدل میں دھنس چکا تھا کہ میرے ہاتھ نہ دعا کے لیے اٹھتے تھے نہ توبہ کے لیے! سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔
پھر مجھے شہزاد مل گیا۔
دور کے رشتے داروں کا ایک لاوارث، یتیم بچہ شاید یہ میرے گناہوں کو دھو سکے ان کا مداوا بن سکے ایک موہوم سی آس۔ ایک ٹوٹی ہوئی امید کا سرا پکڑ کر پھر سے زندگی کے میدان میں قدم رکھ دیا۔
آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا۔ نہیں ٹھیک ہو سکا تو میرا دل' میری روح! سب زخم زخم تھے اور مرہم کہیں بھی نہیں تھا۔
اتنے سال جو کمایا' لگتا تھا یتیموں کا حق کھا رہا ہوں' نوالے میرے حلق میں اٹکتے تھے۔ کبھی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں ہو سکا اس کے بعد اندر سے بیماریوں کی آماجگاہ بن گیا۔
"میں ٹھیک نہیں ہونا چاہتا تھا' اپنا علاج بھی نہیں کروانا چاہتا تھا۔ لیکن آپ کو تلاش کرنا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنا اور آپ کا قرض..... زندگی کا مقصد تھا جس کے لیے میں اللہ سے مہلت مانگ رہا تھا۔
لیکن اب لگتا ہے' یہ مہلت ختم ہونے کے قریب ہے۔ میرے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ اس خط کے ساتھ جو فائل ہے اس میں کچھ پراپرٹی کے پیپرز ہیں جو میں نے آپ کے بچوں کے نام وقف کی ہے۔
اصل میں تو یہ ان کی ہی ہے۔ میں تو بس.....
اب اور دم نہیں لکھنے کا... دم جیسے گھٹا جا رہا ہے
ایک مرتا ہوا شخص جسے اپنے آگے صرف اندھیرے اور عذاب نظر آ رہے ہوں۔ وہ آپ سے صرف اپنے گناہوں کی معافی ہی مانگ سکتا ہے۔
اگر ہو سکے... اگرچہ یہ ناممکن ہے۔ لیکن پھر بھی ایک آس ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں تو شاید اللہ بھی مجھے معاف کر دے۔ اللہ کے بندوں کو ناراض و ناخوش کر کے اللہ کے گھر سے کچھ بھی نہیں ملتا! اپنے بچوں کا

صدقہ سمجھ کر مجھ گناہوں سے لتھڑے شخص کو معاف کردیں۔

گناہ گار زبیر

واثق نے ہاتھ میں پکڑا خط رکھ دیا۔ عاصمہ تاریک چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی اس کے آگے فائل پڑی تھی۔

واثق فائل اٹھا کر کھول کر دیکھنے لگا۔

اس میں واقعی جس پراپرٹی کے ڈاکومنٹس تھے، وہ اتنے تھے کہ اس نقصان کا کئی گنا ازالہ ہو سکتا تھا جو زبیر نے انہیں کئی سال پہلے پہنچایا تھا۔

لیکن کچھ نقصان ناقابل تلافی ہوتے ہیں۔ وہ ماں کے چہرے کو دیکھ کر سر جھکا کر رہ گیا۔ اس نے بے دلی سے فائل بند کردی۔

"آپ کو شہزاد کو یہ سب کچھ واپس کردینا چاہیے تھا، مطلب لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ہمیں یہ سب نہیں چاہیے تھا۔" وہ کچھ تلخی سے بولا۔

"میں نے اسے منع کردیا تھا صاف، وہ خود ہی یہاں رکھ کر چلا گیا۔ یہ سب کچھ میری برداشت سے بہت بڑھ کر ہے واثق... تم کسی بھی طرح یہ سب ان لوگوں کو واپس کر کے آؤ میں اس بارے میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتی۔"

وہ درد سے کراہ کر بولی۔

"واثق! میں نے دعا کی تھی اللہ سے کہ یہ شخص مجھے دوبارہ زندگی میں کبھی نہیں ملے، کبھی نظر نہیں آئے۔ میں اس کے بارے میں کبھی کسی سے کچھ نہیں سنوں لیکن..."

وہ رخ پھیرے بوجھل لہجے میں رک رک کر کہہ رہی تھی۔

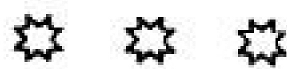
"ایسا تو خیر ماما ہونا ہی تھا۔ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ وہ نشان عبرت بھی بنتا اور آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں ہوتا۔" واثق افسردگی سے بولا۔

"تم بس یہ سب واپس کر کے آؤ۔ میں۔" وہ زور سے سر جھٹک کر بولی جب ہی واثق کا فون بجا۔

شہزاد کی کال تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر گہرا سانس لیتے ہوئے عاصمہ سے نظریں چرا کر کال ریسیو کی دوسرے لمحے اس کے چہرے کا رنگ بدل سا گیا۔

"اوہ انا للہ وانا الیہ راجعون!" وہ ہولے سے بولا۔ عاصمہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"شہزاد کے والد... زبیر صاحب کے انتقال ہوگیا ہے اس کا فون تھا۔" دونوں گم صم سے تھے۔



"مجھے نہیں معلوم میں اسے گھر پر چھوڑ کر گئی تھی بلکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے لیکن وہ رک کر یہیں انتظار کرنا چاہتی تھی تو میں اسے منع تو نہیں کرسکتی تھی کہ وہ یہاں نہیں رکے چلی جائے۔"

عفت پوچھنے پر ناراض لہجے میں کہتی چلی گئی۔

عدیل اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پھر وہ آپ سے ملے بغیر چلی بھی گئی، مجھے پری نے بتایا کہ اسے واثق لینے کے لیے آیا تھا اور وہ لڑکا اس کا یہاں کیا کام تھا بھلا ہم لوگ تو اسے جانتے بھی نہیں... یہ قصہ کیا ہے؟"

وہ متجسس لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"مجھے نہیں معلوم سر درد سے پھٹ رہا ہے میرا پہلے ہی۔" وہ عفت سے یہ سب پوچھ کر پچھتایا اب عفت کو

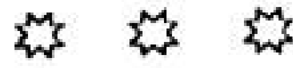
بولنے سے کون روک سکتا تھا۔
"عدیل! کہیں ایسا تو نہیں کہ بشریٰ بھی واپس آچکی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ لڑکا بھی آگیا ہو۔" اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔
عدیل اسے چونک کر دیکھنے لگا۔ یہ بات تو اس نے سوچی ہی نہیں تھی۔



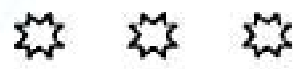
سیفی بستر پر چت لیٹا چہرے پر گہری مسکراہٹ سجائے کچھ سوچ رہا تھا۔
اس کے دماغ میں وہ منظر آتا جب مثال اور واثق کے جانے کے بعد پری اسے دیکھتی رہی تھی۔
"ایسے کیا دیکھتی جارہی ہو۔" اس کی نظروں سے خائف ہو کر اسے کہنا پڑا۔
"مجھے لگ رہا ہے، آپ کو مثال آپی کی شادی کا کچھ زیادہ ہی شاک لگا ہے ویسے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس شادی کے بارے میں پتا نہیں چلا ہو جبکہ ان کی ماما تو ہر پل ان ٹچ تھیں۔" پری جانے کیا معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔
"میں لندن سے آرہا ہوں۔" وہ کچھ کوفت سے بولا۔
"لندن سے مثال آپی کے لیے؟" پری کے بے ساختہ کہنے پر سیفی نے بھی اسے چونک کر دیکھا تھا، فوری طور پر وہ کچھ بول نہیں پایا۔
"میں سمجھ گئی سب کچھ۔" وہ جوش بھرے انداز میں چٹکی بجا کر بولی۔ "تو وہ آپ تھے... مثال آپی کی اداسیوں کی وجہ۔" وہ اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے بولی۔
سیفی نے چونک کر اسے دیکھا۔
فوری طور پر وہ تردید یا تائید نہیں کر سکا تھا۔ پری کو دیکھتا رہا۔
"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا۔ آپ مثال آپی کو پسند کرتے ہیں نا... مطلب محبت کرتے تھے اور اب یہ نیوز آپ کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں ہے۔ میں نے صحیح کہا نا۔" وہ اپنے ٹھیک ٹھیک اندازے لگانے پر بہت خوش تھی۔
"لیکن اب ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں۔" وہ مایوس سا ہو کر بولا اور جانے کے لیے مڑا۔
"ایک بات تو یہ بھی ہے کہ مثال آپی بھی اس شادی سے کچھ زیادہ خوش نہیں۔" پری پیچھے سے بولی تھی "اس وقت کوئی اور آپشن بھی تو نہیں تھا۔" وہ ٹھٹک کر رک گیا۔
"کیا مطلب؟" وہ سمجھا نہیں، پری اس سے کیا کہنا چاہتی ہے۔
"مطلب تو آپ کو خود مثال آپی سے پوچھنا چاہیے۔ کیا معلوم وہ دل میں آپ کے آنے سے خوش ہی ہوں۔" وہ معنی خیزی سے بولی تو سیفی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پری کا آئیڈیا کچھ ایسا فضول بھی نہیں تھا۔
"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔" وہ کچھ الجھ کر پوچھ بیٹھا۔
"میرے کہنے کا مطلب ہے اگر اتنی دور سے مثال کی چاہت میں دوڑے آئے ہیں تو ایک بار کھل کر ان سے بات تو کر لیں مل کر۔" وہ اسے اکساتے ہوئے بولی۔
"مل کر؟" وہ کچھ چونکا۔ "میرے پاس نمبر بھی تو نہیں ہے اس کا۔" وہ مایوسی سے بولا۔
"خیر اتنا سا کام تو میں بھی آپ کا کر ہی سکتی ہوں۔" وہ معنی خیزی سے ہنستے ہوئے سیفی کو مثال کا نمبر لکھوانے لگی۔

"یہ نمبر میرے بہت کام آسکتا ہے۔" وہ سیل میں مثال کے نمبر کو دیکھتے ہوئے خود سے بولا۔
اور پری نے کچھ غلط بھی نہیں کہا جب اتنی دور آ ہی گیا ہوں تو مجھے یوں ناکام ہو کر تو نہیں لوٹنا چاہیے۔
وہ سرہلا کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ ایک نمبر ملا کر سیل فون کان سے لگا کر کال ریسیو ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

"پری! میں سیفی بات کر رہا ہوں' کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں؟" پری کے جواب پر وہ تھینکس۔" کہہ کر آہستہ آہستہ اس سے کچھ بات کرنے لگا۔



دانی نے کچھ مایوسی سے لاکر میں موجود لفافے میں بڑی رقم کو گنا۔
"صرف ڈھائی لاکھ' اس سے کیا ہوگا۔ وہ لوگ چھ لاکھ سے کم پر نہیں مانیں گے۔" وہ مایوس سا تھا۔
پھر وہ لاکر میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔
ایک جیولری باکس میں سے عفت کی کچھ جیولری ملی ہے تو اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔
"اس سے تو میرا کافی کام نکل جائے گا بلکہ میں ان لوگوں کو صرف دو لاکھ..... نہیں ڈیڑھ لاکھ اور جیولری ہی دوں گا کہ میں بس یہی ارینج کر سکا ہوں۔" وہ دل میں پلان کرنے لگا۔
اپنے گولڈن فیوچر کے بارے میں اس نے جو کچھ سوچ رکھا تھا' اسے لگ رہا تھا سب کچھ اس کی مٹھی میں آگیا ہے۔
اس نے بہت محتاط انداز میں سب چیزیں ایک پاؤچ میں ڈالیں اور چابی اسی جگہ پر رکھ کر خاموشی سے باہر نکل گیا۔



آئینہ کی شادی کی ڈیٹ طے ہو گئی تھی۔
بشری عجیب سے اکیلے پن کا شکار ہو رہی تھی۔ ایک نئی جگہ' نیا ملک نئے لوگ..... ولید کی فیملی بیس سال سے آسٹریلیا میں تھی' ان کے لیے کچھ بھی عجیب نہیں تھا شاید..... لیکن بشری کو اپنی بیٹی ایک ایسی جگہ بیاہنا جس سے وہ خود بھی ابھی مانوس نہیں ہو سکی تھی' بہت مشکل لگ رہا تھا۔
اور مشکل تو یہ بھی تھا کہ احسن کی حالت دن بدن ایسی ہوتی جا رہی تھی کہ بشری اس سے کوئی بھی اپنی بات شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ سیفی کی خود سری نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا بزنس جم نہیں سکا تھا۔
آئینہ کی شادی کے بعد ان کا پاکستان واپس چلے جانے کا پلان تھا۔ احسن وہاں بھی کچھ لوگوں سے رابطے میں تھا' گھر اور بزنس کے معاملات کے لیے۔
اور بشری خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ بہت سارے دن وہ مثال کو فون ہی نہیں کر سکی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ سیفی کیسے مثال کی زندگی برباد کرنے چلا ہے۔

(آخری قسط ان شاء اللہ اگلے ماہ)

حنا یاسمین

نصیبوں کے فیصلے ہیں

"ریحان ماموں آرہے ہیں۔" فصیح نے اعلان کیا۔

میں دادی اماں کے کہنے پر حلوہ تیار کررہی تھی۔ صبح سے انہوں نے مجھے حتی الامکان مصروف رکھنے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ تین ماہ بعد میری شادی تھی۔ امی سے زیادہ دادی کو فکر لاحق تھی۔ مجھے سگھڑ بنانے کے لیے جو انہوں نے فہرست تیار کررکھی تھی۔ اس میں ٹاپ لسٹ کام چٹنیاں کونڈی میں کوٹنی ہیں۔ نو گرینڈر مشین۔ کپڑوں کے مختلف چھوٹے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر کس طرح سے نئی کار آمد چادر بنانی ہے۔ مختلف مسالوں کو کس طرح سے علیحدہ علیحدہ کر کے صاف کرنا ہے۔ دھوپ میں کیسے سکھانا ہے۔ مسالوں کی ڈبیوں میں موجود دادی کے ٹوٹکوں نے زبیدہ آپا کو بھی مات دے دی۔ ابو۔ عمر اور ابوبکر کے کپڑوں پر کلف کا نشان نہ ہو' بس کلف لگا ہوا محسوس ہو۔ دادی کاموں کی مائیکرو اسکوپک اسٹڈی کروارہی تھیں۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر گھر آئے ابھی دوسرا مہینہ تھا۔ میں آٹھ آٹھ آنسو رونے پر مجبور ہو گئی۔

مالیکولر بیالوجی میں ایم۔ ایس۔ سی ہونے کا اعزاز ان شاء اللہ میرے شان دار زرلٹ کے نکلنے کے بعد حاصل ہو جانا تھا۔ پر اس گھریلو تعلیم نے طبیعت صاف کردی تھی۔

کتنے سارے خواب سجائے ہوئے تھے۔ گھر جاؤں گی اماں کی گود میں سر رکھے فرمائشوں کی لسٹ جاری کروں گی۔ دادی کے ہاتھ کی مزے مزے کی چیزیں کھاؤں گی۔ آخر اکلوتی جو ہوں۔ عمر اور ابوبکر کے بازاروں کے چکر لگوا لگوا کر کپڑوں کی ڈیزائننگ کرواؤں گی۔ حق ہا! سارے ارمان ہی ختم ہو گئے۔

کفگیر کو حلوے کی کڑاہی میں گھماتے میں انتہائی دکھیاری سی ہو رہی تھی۔ نہ نیٹ پر چیٹنگ نہ دوستوں سے گپیں۔ نہ ڈراموں کی فہرست۔ اف دادی تو انتظار میں ہی بیٹھی تھیں کہ کب حوریہ آئے اور آکر کاموں میں جت جائے۔ امی کو بھی آج کل کمر کا درد۔ سر کا درد۔ گھٹنوں کا درد لاحق رہنے لگا تھا۔

"حوریہ! دوپہر کی ہنڈیا تم بناؤ۔ میں ذرا کمر سیدھی کرلوں۔"

" حوریہ چائے بناؤ۔ سر میں درد سا ہو رہا ہے۔ سبزی بھی کاٹ لینا۔"

"ہائے ہائے آج تو ٹانگیں جواب دے رہی ہیں۔ تمہارے ابا' بھائی آنے والے ہوں گے۔ حوریہ بیٹی! دوپہر کے لیے ہانڈی چڑھا دو۔"

اف یہ مائیں۔ بیٹیوں کے جوان ہونے کی دیر ہوتی ہے کہ ان کے اگلے پچھلے سارے درد جاگ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اتنے سالوں کی ذمہ داریاں بیٹیوں کے سر پر ڈال کر خود بری الذمہ اور بیٹیاں تو ماؤں کی ذرا سی چوں چراں پر بھی پریشان و ہراساں۔ پھر دل بھی نہیں کرتا ماؤں سے کام کروانے کو۔ البتہ میری دادی دنیا کی سب سے نرالی دادی ہیں۔ وہ نہ خود سکون سے بیٹھتی ہیں اور نہ ہی اگلے بندے کو سکون لینے دیتی ہیں۔ کام والی نے کپڑے اچھے نہیں دھوئے۔ دادی سارے درد بھلائے کپڑے دھونے بیٹھی ہیں۔ اگر اسی دوران ابا جی مسجد سے نماز پڑھ کر گھر تشریف لے آئیں۔ تو یقیناً" توپوں کا رخ پہلے امی کی طرف ہو گا پھر سات سلامیاں مجھے بھی پیش کی جائیں گی۔

"بوڑھی دادی کا ذرا جو تم لوگوں کو خیال ہو۔" ابا بس اسی فقرے سے شروع ہوں گے۔

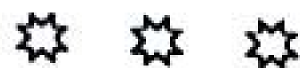
اور اگر بھائی عمر اور ابوبکر جیسے ہوں تو وہ اپنی بہن حوریہ کی درگت بنوانے کے لیے ضرور جلتی پر تیل کا کام کریں گے۔ دادی کو کبھی گملوں کی فکر ہو جاتی۔ دل چاہتا تھا ساتھ والی کالونی میں سارے گملے پھنکوا دوں۔

بھی جو کمروں کے نقص، پردوں کے نقص دور ہوتے تو پھر کچن کی باری آتی اور میری شامت تو خیر سے آج کل آئی ہی ہوئی تھی۔

"عائشہ باجی بلا رہی ہیں۔" فصیح جس نے ماموں کے آنے کی اطلاع ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی دی تھی۔ اب عائشہ کا پیغام دینے چلا آیا۔

میں حلوے کی اجزائے ترکیبی کو دوبارہ تولنے لگی مبادا کوئی کمی بیشی ہوگئی تو حلوہ کھائی دادی نے پھوپھیوں کے گوش گزار بھی کردینی تھی۔ پھوپھیوں میں سے ایک پھپھی کے گھر ویسے بھی میرا بیاہ ہونا تھا۔ اور دادی نے انہیں بتانے سے بھی نہیں چوکنا تھا۔ غلطیاں ہمیشہ وہاں غلطیاں ہوتی ہیں جہاں غلطیوں کو سدھارنے والے ہوں اشتہار لگانے والے نہ ہوں۔

"عائشہ باجی سے کہو' میں آرہی ہوں۔" میں نے عمر سے کہا۔ حلوہ مکمل تیاری کے مراحل میں داخل ہوچکا تھا۔ پانچ سات منٹ ہی مزید چمچ ہلانا پڑا۔ حلوہ تیار ہوگیا۔ میں نے چولہا بند کیا اور عائشہ باجی کی بات سننے باہر چلی آئی۔ وہ انتہائی پریشان تھیں۔ اور ہفتے کے پانچ دن تو وہ پریشان ہی نظر آتیں۔ بعض لوگوں پر پریشانیاں روئی کے گالوں کی طرح اترتی ہیں اور پتھر کی طرح چبھتی ہیں۔ وہ انتہائی پڑھی لکھی لڑکی تھیں۔ اب تو خیر خاتون بن گئی تھیں۔ فیملی سے باہر رشتہ ہوا' ہمارے ہمسائے میں' جو جاہلوں کا گڑھ تھا۔ وہاں بلا ضرورت لڑائی۔ تو تو میں میں۔ جاہلانہ حرکتیں ہوتی رہتیں۔ عائشہ باجی کے شوہر مزمل بھائی کسی حد تک اچھے بھی تھے۔ پر ماں بہن اور باپ کے پیچھے لگ ہی جایا کرتے۔ باپ نیم حکیم تھے۔ روز نت نئے ٹوٹکے۔ ان کے گھر سے اکثر فضول ادویات پکنے کی بدبو آتی رہتی۔ ادھر میری نفیس دادی بڑبڑانا شروع ہوجاتیں۔



"دو دن میں سر کے درد نے میرا برا حال کر کے رکھ دیا ہے۔ اباجی کی فضول پڑیوں سی کوئی آرام نہیں آرہا۔ کوئی سردرد کی گولی ہے تو دے دو۔"

وہ اکثر اپنے سسرال والوں سے چھپ کر کچھ مانگ لیتیں یا منگوالیا کرتی تھیں۔ میں نے عمر سے کہا کہ سردرد کی گولی لادے۔

"عائشہ باجی! آجائیں' چائے بنادیتی ہوں۔"

اتنی پڑھی لکھی لڑکی کی یہ درگت بنتے دیکھ کر میں۔ امی اور دادی اکثر افسردہ ہوجاتے۔ پھر کسی نہ کسی طرح ان کی مدد کرتے رہتے۔



"نہیں حوریہ! تمہیں پتا ہی ہے' ابھی عذرا باجی یا کوئی اور میرے پیچھے تفتیشی ٹیم لے کر آجائے گا۔'
ابھی مسکراتے ہوئے بولیں' عائشہ باجی کے چہرے پر کم ہی مسکراہٹ آیا کرتی تھی۔ جہاں تفکرات کے سائے پھیلے ہوں وہاں مسکراہٹوں کے در کبھی کبھی وا ہوا کرتے ہیں۔

"اچھا۔ میں خود ہی گولی دے جاؤں گی۔" میرے کہنے پر تشکر آمیز آنکھوں سے انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں بس افسوس ہی کر سکتی تھی۔ لوگوں کے پاس دوسروں کو تنگ کرنے کا کتنا وقت ہوتا ہے۔ نہ خود سکون سے رہو نہ کسی دوسرے کو رہنے دو۔

"ارے حوریہ کدھر ہے؟" دادی کی آواز نے مجھے چونکایا۔ میں بھاگتی ہوئی گئی۔

"یہ دیکھو۔" دادی نے مجھے شیشوں' موتیوں والے بہت سارے پراندے دکھائے۔

"ہیں! یہ کہاں سے نکلے۔" میں حیرت کی انتہا پر تھی کہ دادی نے یہ پراندے کون سی صندوقچی سے نکال لیے۔

"یہ میں نے کوثر سے منگوائے ہیں۔" وہ کام والی کا نام بتاتے ہوئے بولیں۔

دادی کے چار بال دیکھ کر میں پریشان ہی ہو گئی کہ وہ بالوں میں لگائیں گی کیسے؟ کہاں۔

"دادی! سارے لوگ باتیں بنائیں گے۔"

"کیسی باتیں؟" دادی نے میرا چہرہ یوں دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔

"اس عمر میں پراندے۔ دادی سب آپ کا مذاق اڑائیں گے۔" میں دادی کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"میرا کیوں مذاق اڑائیں گے۔ عجیب باتیں کر رہی ہو۔ یہ تمہارے لیے ہیں۔"

بس غش کھا کر گرنے کی کسر رہ گئی تھی۔ میں اور پراندے۔ میرے اسٹیپس میں کٹے بال۔

"اف دادی! میں یہ نہیں ڈالوں گی۔" میں نے بدکتے ہوئے کہا۔

"کیسے نہیں ڈالو گی۔ دیکھو تو کتنے خوب صورت ہیں۔" وہ پراندے میرے سامنے لہرا کر بولیں۔

"آپ میرے بال تو دیکھیں ایک ہزار پنیں لگا کر کوئی پراندہ ٹکے گا۔ مجھے کیا ضرورت ہے اتنی مصیبت میں پڑنے کی۔ آپ میرے لیے ایسی چیزیں نہ ہی منگایا کریں۔"

میں احتجاجاً واک آؤٹ کر گئی۔ دادی بیچاری پراندوں کی طرف دیکھ کر اور میری طرف دیکھ کر افسردہ سی ہو کر بیٹھ گئیں۔ امی ہمیں ہی دیکھ رہی تھیں۔

"شرم کرو۔ قسمت والوں کو ملتے ہیں ایسے بزرگ۔ اگر انہوں نے محبت سے تمہارے لیے یہ بنوا بھی لیے ہیں۔ تو کیا تکلیف تھی۔ انہیں نہیں پتا آج کل کے فیشن کا۔ کتنے دن سے وہ کوثر کے پیچھے لگی تھیں۔ مجھ سے زیادہ وہ تمہاری فکر کرتی ہیں۔ خبردار! آج کے بعد ان کا دل خراب کیا۔ ٹانگیں توڑ دوں گی۔ میں تمہاری۔ وہ تمہاری دادی بعد میں اور میری ماں پہلے ہیں۔"

امی نے آکر مجھے کمرے میں اچھا خاصا لتاڑا۔

"واہ مائے واہ۔ جی خوش ہو گیا۔" ابوبکر نہ جانے کب آیا۔ امی کی جذباتی 'دھواں دار ڈانٹ سن کر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ "آپ تو ہماری گریٹ ماں ہیں۔" وہ امی کے گرد اپنے بازو کا حلقہ بنا کر کھڑا ہو گیا۔

"ساس سے اتنی محبت۔ ماں جی۔ اخلاق کی اعلا قسم۔" وہ امی کو گھمانے لگا۔

"دفع ہو' پیچھے ہٹو۔ ساری اولاد ڈرامے کرتی ہے۔ چلو تم باہر آؤ۔ اور آکر اماں جی سے معافی مانگو۔" امی نے ابوبکر کو مصنوعی خفگی سے پیچھے کیا۔ اور مجھے حکم سنا کر چل دیں۔

"کتنی اچھی بات کی ہے امی نے۔ کتنی پیاری دادی ہیں۔ بداخلاق لڑکی۔" وہ مجھ پر چڑھ دوڑا۔

"تم تو منہ بند ہی رکھو۔ میں بداخلاق نہیں۔ بال نہیں ہیں میرے۔ دادی نے اتنے بھاری پراندے بنا ڈالے۔ اور میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے پہنا کر چھوڑیں گی۔" میں منہ بسورنے لگی۔

"تو کیا ہوا۔ تم ان کی خوشی کی خاطر پہن نہیں

سکتیں۔ اس زندگی میں کسی کو ذرا سی بھی خوشی سے نوازنا بہت بڑا صدقہ ہے۔ ڈیئر سسٹر۔"

ابو بکر اکثر کوئی نہ کوئی اچھی بات میرے اور عمر کے گوش گزار تا رہتا۔

میں جھٹ دادی سے سوری کرنے بھاگی۔ اتنے میں عمر مسکراتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ میں۔ امی اور دادی اس کی شکل دیکھ رہے تھے کہ اس کو کیا ہوا ہے؟

"قسم سے دادی! آپ نے آج تک اتنا پیارا دم نہیں دیکھا ہوگا۔" وہ موڑھا گھسیٹ کر دادی کا گھٹنا پکڑے ہنستے ہوئے بولا۔

"کون سا دم۔ کیوں ہوا کیا؟" "امی! میں عائشہ باجی کے گھر گیا سر درد کی گولی دینے۔" وہ پھر کچھ یاد کر کے زور زور سے ہنسنے لگا۔

"اللہ ہی خیر کرے۔ ان کے گھر تو ہر کوئی ڈرامہ ہے۔ پتا نہیں اب یہ کیا دیکھ آیا ہے۔" امی نے تبصرہ کیا۔

"اب بتا بھی چکو۔" مجھے سننے کی جلدی تھی۔

"امی! انکل حفیظ عائشہ باجی کے سر پر دم کر رہے تھے۔ نہ آیت الکرسی۔ نہ سورۃ فاتحہ۔ پتا ہے وہ کیا کہہ رہے تھے۔"

عمر پھر ہنسنے لگا۔ انکل حفیظ کے ذکر نے دادی کے منہ کے زاویے بگاڑے۔ ان کی اور دادی کی بنتی نہ تھی۔ وہ عائشہ باجی کے سسر تھے۔

"اس نیم حکیم نے اب کوئی اور شوشا چھوڑا ہوگا۔" دادی نے برا سا منہ بنایا۔

"دادی! وہ عائشہ باجی کے ماتھے کو پکڑ کر تاؤں کیا کہہ رہے تھے۔"

"دم بھل پیڑے جل' جتھو آئی اوتھے 'ای چل (چلو درد چلو' جہاں سے آئے ہو' وہاں ہی چلو)"

عمر کے بتائے دم نے میری بھی نان اسٹاپ ہنسی شروع کروا دی۔

"لاحول ولا قوۃ" دادی نے زور سے پڑھا۔ "یہ تو باؤلا ہو گیا ہے۔"

"سچ پاگلوں کا ٹبر (خاندان) ہے۔ پتا نہیں ماں باپ نے کہاں بیٹی رول دی؟" امی نے تبصرہ کیا۔

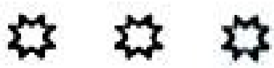
"چلو حوریہ! اب تمہیں بھی درد ہوا میں بھی یہ پڑھ کر تم پر پھونکیں ماروں گا۔" عمر ہنستے ہوئے مجھے چھیڑنے لگا۔

"ہاں تم ایسا ہی دم سیکھ کر آسکتے ہو۔ تمہیں میں نے کہا تھا کہ شام کے وقت قاری مجید کے پاس جایا کرو۔ تم نے قرآن یاد رکھنا ہے کہ نہیں۔" امی عمر کا کان کھینچتے ہوئے بولیں۔

اس نے میٹرک کے بعد حفظ کیا تھا۔ اس لیے امی ابو اس کے پیچھے پڑے رہتے کہ وہ بھول نہ جائے۔ دہرائی کے لیے اسے بھیجتے اور امی کو اس کا ایک دن بھی ناغہ کرنا پسند نہ تھا۔ عمر صاحب بھی کبھی ڈنڈی مار جاتے۔

"عمر! عائشہ باجی نے یہ دم کروایا کیسے۔" میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

"بیچاری کی شکل دیکھنے والی تھی۔ وہ رو دینے کو تھیں۔ اور مجھے دیکھ کر تو اور شرمندہ ہوئیں۔" اس کی بات پر میں بھی افسردہ سی ہو گئی۔



"یہ ہوائیں زلفوں میں میری گم ہو جائیں۔" گنگناتے ہوئے میں تار پر کپڑے ڈال رہی تھی۔ صبح سے مشین لگا رکھی تھی۔ اور قسمت یا نصیب۔ آج ہی موسم نے بھی اپنی کارکردگی دکھا دی۔ بادلوں نے جھٹ سے آسمان پر بسیرا کر لیا۔ میرا دل مچلنے لگا۔

کہ سارے کپڑے چھوڑ چھاڑ کر جلدی سے چائے بناؤں اور موسم کی کا مستیوں کو انجوائے کروں۔ پر امی کا حکم آ گیا۔

"موسم خراب ہے تب تو کپڑے دھونے ہیں۔ ڈرائیر میں خشک کرتی جاؤ۔ اگر بارش ہو بھی گئی تو کمرے میں پھیلا دینا۔ خشک ہو جائیں گے۔ گرمیاں تو ہیں۔" میں نے غصے سے ڈرائیر کو گھورا۔ نہ یہ

معیبت آج ہوتی نہ مجھے کپڑے دھونے پڑتے۔ سائنسی ترقی معیبت اور وبال ہی تو ہے۔ اب کتنے افسوس کی بات ہے۔ اتنا پیارا موسم میں موبائل پکڑ کر Happy Weather کا اسٹیٹس بھی اپ لوڈ نہیں کر سکتی۔ چائے بنا کر چپکے چپکے بارش کی بوندوں سے باتیں بھی نہیں کر سکتی۔ نہ کسی نئے گانے پر اپنی سہیلیوں سے بھرے کر سکتی۔ موسم آوارہ تو دل رنگین۔ ابھی تو ہوا چل رہی ہے۔ کچھ کپڑے اوپر ہی ڈال آئی ہوں۔ میں نے ٹوکری اٹھائی اور چھت پر۔ ہوا کی سرسراہٹیں عروج پر تھیں۔ اکیلے مزہ نہیں آرہا تھا —— نیچے جھانکا۔ عائشہ باجی کو ہی بلا لیتی ہوں۔ پر وہ صحن میں نظر نہیں آئیں۔ گیٹ کے قریب عمر نظر آگیا۔

"عمر!" میں نے وہیں سے ہانک لگائی۔

عمر نے گھور کر میری طرف دیکھا۔ یقیناً" کوئی اور بھی گلی میں ہوگا۔ مجھے صرف عمر نظر آرہا تھا۔ اس کے پیچھے کون تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا۔

میں ویسے ہی واپس پلٹ گئی۔ اویں۔ بے عزتی نہ ہو جائے۔ بھائی چھوٹے ہوں یا بڑے۔ بھائی تو بھائی ہیں نا۔ ڈر تو لگتا ہے۔" خود ہی انجوائے کرلو۔ حوریہ طارق! تم خود سے مخاطب ہوئی۔

"موسم ہے بڑا پاگل۔ نہیں۔ دوسرے والا۔" میری زبان مسلسل چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سرعت سے کپڑے پھیلا کر اوپر کیچر بھی لگا رہی تھی کہ ہوا سے اڑ نہ جائیں۔ "یہ ہوائیں زلفوں میں میری گم ہو جائیں۔"

"ہوائیں تو گم نہیں ہوئیں البتہ تمہارا پراندہ گم ہو گیا ہے۔" میں بجلی کی تیزی سے مڑی اور پیچھے دیکھ کر دق رہ گئی۔ سامنے عبیر کھڑے تھے۔ ہمارے فیانسی صاحب۔ اف اُف مشکل سچویشن 'میرا موتیوں والا پراندہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ ویسے ہی چٹیاں کی ہوئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے اپنے بالوں پر مارا۔ نجانے کب بالوں سے نکل کر زمین بوس ہوا۔

مارے شرمندگی کے کوئی جگہ نہ ملے کہ کہاں منہ چھپاؤں۔

"ہواؤں کو گم کرنے کے لیے بہت ساری زلفیں چاہئیں۔ فی الحال تو آپ کے بال اس گز بھر کے پراندے کو ہی نہیں برداشت کر سکے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"اف دادی آپ کے شوق۔ آپ کو خوش کرنے کے لیے آج پہنا اور آج ہی۔" میں نے تصور میں دادی کے سامنے دہائی دی۔ اب سمجھ میں آیا کہ عمر کے پیچھے کون تھا۔ اور عمر صاحب کیوں گھور —— رہے تھے۔ میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کے ہاتھ سے پراندہ لے لیا۔

"نہیں ادھر آیا تھا کسی کام کے سلسلے میں 'سوچا سب سے ملتا جاؤں۔" میری مسلسل خاموشی پر وہ خود ہی بولے۔ مجھے ایک دم شرمندگی ہوئی۔ میں نے حال چال بھی نہ پوچھا تھا۔

"کیا حال ہے آپ کا۔" میں مسکرائی۔

"تمہارے سامنے ہی ہے۔ الحمد اللہ ٹھیک ٹھاک کھڑا ہوں۔"

"یہ منگنی والا پیریڈ بڑا فضول ہوتا ہے۔ میرے جیسی لڑکیوں کے لیے تو خاص طور پر۔ مائیں گھٹی میں شرافت پلا دیتی ہیں۔ پھر فیملی میں منگنی ہو جائے تو شریف بیٹیاں بے چاری عجیب ہونق سی بن جاتی ہیں اپنے منگیتروں کے سامنے۔ نہ حال چال پوچھنا آتا ہے۔ نہ کوئی بات کرنی آتی ہے۔ کچھ کہو تو فیملی کا ڈر۔ کچھ نہ کہو۔ تو منگیتر صاحب کی غلط فہمیاں۔"

"اور پھپھو کیسی ہیں؟ مونا باجی کا کیا حال ہے؟" میں نے بات سنبھالی۔

"سب ہی ٹھیک ہیں۔"

اتنے میں عمر بھی آگیا۔ میری جان میں جان آئی۔ ورنہ آگے کیا پوچھوں۔ یہی سوچنے میں تین منٹ اور لگنے تھے۔ پھر پچھلی دفعہ کی طرح موصوف نے گھر جا کر اپنی اماں کو یہ کہنا تھا کہ آپ کی بھتیجی مجھ سے بات ہی نہیں کرتی۔ اور پھر پھپھو کی کال امی کو آنی تھی۔ اور امی کی نصیحتیں شروع۔ "جب عبیر آئے تو اچھے

طریقے سے حال چال پوچھا کرو۔ منہ میں گھنگھنیاں ہی ڈال کر بیٹھ جاتی ہو۔"

پتا نہیں ساری عمر شرم و حیا سکھانے والے والدین اس لمحے کیوں کمزور پڑ جاتے ہیں۔ کچے دھاگے۔ نازک رشتے۔ مصلحت پسندی نجانے کون کون سی لفظوں کی دنیا صدیوں کی تربیت پر لپیٹ دی جاتی ہیں۔

میں نے اسٹیٹس اپ لوڈ کر دیا۔

"آئی ہیٹ انگیجمنٹ (مجھے منگنی کے رشتے سے نفرت ہے) منگنی کوئی پائیدار رشتہ تھوڑی ہے۔ بس ایسا ٹائم پریڈ جہاں ذہن یکجا بھی ہو سکتے ہیں اور بکھر بھی سکتے ہیں۔"

میں نے کپڑے دھو کر امی کے ساتھ مل کر کھانا بنایا۔ ابوبکر اور ابو بھی آگئے۔ سب نے عیبو کو پروٹوکول دیا۔ بڑے اچھے خوش گوار موڈ میں کھانا کھایا گیا۔

میں نے پلیٹ میں بریانی ڈالی اور عائشہ باجی کو دینے چل دی۔ وہ حنظلہ کو نہلا رہی تھیں۔ میں کچن سے پلیٹیں پکڑ کر خود ہی بریانی ان میں منتقل کر آئی۔ گھر آئی تو موصوف جاچکے تھے۔ دادی اون سلائیوں پر نجانے کون سا ڈیزائن سکھانے کے لیے بے تاب تھیں۔ پر میری ہمت نہ تھی۔ میں نے امداد طلب نظروں سے امی کی طرف دیکھا۔

"چلو، تم جا کر لیٹ جاؤ۔ تھک گئی ہوگی۔" امی نے جان بوجھ کر ذرا زور سے کہا۔ دادی نے گھور کر معائنہ کیا۔ پھر مسکرا کر بولیں۔

"ہاں، ہاں آرام کرلو۔ کل تمہیں ڈیزائن ڈالنا سکھاؤں گی۔"

میری شکل دیکھ کر امی نے مسکراہٹ دبائی۔ میں آکر کمرے میں لیٹ گئی۔

ہمارے بس میں اگر اپنے فیصلے ہوتے
تو ہم کبھی کے گھروں کو پلٹ گئے ہوتے
قریب رہ کر سلگنے سے تو کتنا بہتر تھا
کسی مقام پر ہم تم بچھڑ گئے ہوتے
کبھی ریت کو ہم مٹھیوں میں بھر لیتے
کبھی ہواؤں سے اپنے مکالمے ہوتے
ہمارے نام پر کوئی چراغ تو جلتا
کسی زباں پر ہمارے بھی تذکرے ہوتے
ہم اپنا کوئی الگ راستہ بنا لیتے
ہمارے دل نے اگر حوصلے کیے ہوتے

عائشہ باجی نے نوشی گیلانی کی نظم مجھے ایس ایم ایس کی۔ آخری مصرع نے میری آنکھیں گیلی کر دیں۔

اتنی پیاری بیٹیاں والدین ایسی جگہوں پر کیوں بیاہ دیتے ہیں۔ کیا سارے مقدروں کے کھیل ہیں۔ اسی ادھیڑ بن میں آنکھ لگ گئی۔ پھر کہیں شام کی اذانوں کے وقت کھلی۔ امی نے سالن پکالیا تھا اور روٹیاں بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

"تمہارے ماموں آج رات کی فلائٹ سے آرہے ہیں۔ فصیح اور ابوبکر کو میں نے انہیں لانے کے لیے کہا ہے۔ تم میرے ساتھ لگو۔ میں نے قورمہ بنالیا ہے۔ کباب بنا کر فریز کر دیے ہیں۔ تم میٹھے میں کچھ بنالو۔"

"عمر تو گھر رہی ہے نا۔" میں نے امی کے کہنے پر ہانڈی کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔ قورمہ کی خوشبو نے بھوک بڑھادی۔

"ہاں۔ میں نے عمر کو گھر پر ہی رہنے دیا ہے، کبھی کوئی چیز منگوانی پڑ جائے۔ فصیح کو اسی لیے ساتھ بھیجا ہے۔" وہ خالہ زیب کا بیٹا تھا اور خالہ دو گلیاں چھوڑ کر قریب ہی رہتی تھیں۔

"مجھے عمر سے پاستا منگوانا ہے۔ ماموں کو بہت پسند ہے۔" میں نے امی کو مطلع دی۔

"پلنگ کی چادر کے نیچے پیسے پڑے ہیں۔ اٹھالو جاکے۔ اور جو منگوانا ہے۔ عمر سے کہہ دو۔"

ریحان ماموں ہم سب کے چہیتے تھے۔ امی اور ماہ زیب خالہ کے اکلوتے بھائی۔ ماموں کے آنے پر امی نے میری ڈیٹ فکس کرنی تھی۔ ماموں تقریباً پونے دو سال کے بعد آرہے تھے۔

"عمر! پاستا لاکر دو۔" وہ ریسلنگ دیکھنے میں مصروف تھا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔ بس دو منٹ۔"

رسلو نے دوسرے کو پٹخ کر نیچے مارا اور عمر صاحب تالیاں بجانے لگے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مار دھاڑ والے کھیل میں تم لڑکوں کو کیا مزہ آتا ہے۔"

"آپی! آپ رہنے دیں۔ طاقت کی دنیا ہے۔ طاقت کی۔" وہ اپنے سلکی بالوں کو ماتھے پر سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی طاقت کی دنیا میں چاہے ٹانگیں۔ ہاتھ پاؤں سب ٹوٹ جائیں۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ اتنی دیر میں عمر نے پھر نعرہ لگایا۔

"یاہو۔" دوسرے والے رسلو نے اب پہلے والے کو پچھاڑ دیا تھا۔

"چلو اٹھو بس کرو، مجھے پاستا لا کر دو۔" میں نے اس کا کان موڑا۔

"اف۔ آپی۔" وہ زور سے چیخا۔ "یہ طاقت کی دنیا ہے۔" کان۔ اچھی طرح سرخ کرکے میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ عمر نے غصے سے گھوری ڈالی۔

"آپ آپی ہیں۔ حد ادب۔ ورنہ میں نے بھی رسلو کی طرح آپ کو اٹھا کر نیچے گرا دینا تھا۔" میں نے عمر کو غور سے دیکھا۔ ماشاء اللہ فرسٹ ایئر میں ہی قد کاٹھ نکالے کھڑا تھا۔ اوپر سے بھرا بھرا جسم مجھے ایک دم عمر بڑا بڑا سا لگنے لگا۔ ایک سرشاری کے احساس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جوان بھائی ہمیشہ تحفظ کا احساس دلاتے ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔ میں نے چپکے سے دل میں دعا کی۔

"اچھا چلو منہ بند کرو۔ خبردار۔ مجھے ایسے کہا۔ جا کر پاستا لا کر دو۔"

میں نے بڑوں والا رعب جمایا اور واپس کچن میں آگئی۔ امی بے چاری پسینے میں نہا چکی تھیں۔ "اب آپ ریسٹ کرلیں۔ میں باقی کا کام کرتی ہوں۔" "نہیں کندھوں سے تھام کر میں پیار سے بولی۔ امی نے نہال ہوتی نظروں سے دیکھا۔

"میری پیاری بیٹی۔ بس چند دنوں کی مہمان۔" وہ آبدیدہ سی ہو گئیں۔ ماؤں کو جتنی جلدی بیٹیوں کی شادیاں کرنے کی پڑی رہتی ہے۔ اتنی ہی جلدی ان کے چلے جانے کا احساس انہیں بے چین کر دیتا ہے۔ میں نے بھی آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے چولہے کا رخ کیا۔

ریحان ماموں رات کو آئے۔ کھانا وغیرہ کھا کر آرام کرنے لگے۔ معمول کے کاموں سے فارغ ہو کر میں عائشہ باجی کی طرف چلی آئی۔ ان کی ساس ان کے سر سے جھگڑا کر رہی تھیں۔ گالیوں کا طوفان۔ عائشہ باجی بے چاری بے زار سی شکل بنائے بیٹھی تھیں۔ میں خود کو کوسنے لگی۔ مجھے کیا ضرورت تھی ابھی آنے کی۔ دونوں میاں بیوی کسی کا لحاظ کیے بغیر اب توپوں کا رخ عائشہ باجی کی طرف کر چکے تھے۔ ان کے ابا۔ بھائی۔ امی۔ سب کو گالیوں سے نوازا گیا۔ وہ بے چاری رونے لگی۔ مجھے تو خیر انہیں کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ تھی۔ میں دل گرفتہ سی ہو کر واپس آنے لگی۔

"تم تو بیٹھو۔ تم کدھر جا رہی ہو۔" ساس صاحبہ کو میری موجودگی کا خیال آ ہی گیا۔

"نہیں میں چلتی ہوں۔ کام کرنا ہے گھر جا کر ابھی۔" ان کے سسر غصے سے باہر جا چکے تھے۔

"تمہارے ماموں آگئے ہیں۔ اب خیر سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔" وہ منٹ پہلے کی لڑائی بھلا کر یوں چسکے لے لے کر۔ پوچھنے لگیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"جی۔" میں نے مختصراً جواب دیا۔

"چلو اچھا ہے اپنوں میں جاؤ گی۔ ساس سسر کا احساس تو کرو گی۔" وہ عائشہ باجی کو سنانے کے لیے کہنے لگیں۔ ابھی وہ احساس نہیں کرتی تھیں۔ سارا دن کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی اور ہم لوگ ہمسلیہ میں رہ کر بھلا ان کی خصلتوں کو نہیں سمجھتے تھے؟ ہمسلیہ آئینے کی طرح ہوتا ہے جو آپ کے کردار و اخلاق کا سچا گواہ ہوتا ہے۔

عائشہ باجی سر جھکائے کدو چھیلتی رہیں۔ ان کی ساس وہاں سے اٹھ کر گئیں۔ تو میں نے ان سے پوچھا۔

"ہوا کیا تھا۔۔۔؟"

"حوریہ! بتانے کی ضرورت ہے ابھی۔۔۔" وہ بے چارگی سے بولیں۔

بات تو واقعی ٹھیک تھی۔ بتانے کی ضرورت تو نہیں تھی۔

"پر پتا میں تو سہی۔ آج کیا نیا ڈرامہ ہوا ہے۔"

"میرے سسر کہہ رہے تھے کہ آلو گوشت بناؤ۔ ساس نے کہا۔ کدو گوشت۔۔۔ میں نے سوچا دونوں ہنڈیاں بنا دیتی ہوں۔ اسی بحث میں دونوں کی تو تو میں میں ہو رہی تھی اور پھر توپوں کا رخ میری طرف اس لیے مڑ گیا تھا کہ میں دو ہنڈیاں بنا کر ان کا بجٹ خراب کرنے لگی ہوں۔"

"او مطلب یہ کہ نہ زندہ رہنے دینا نہ مرنے دینا۔"

میں آزردہ سی ہو گئی۔ ایم اے سائیکالوجی تھیں عائشہ باجی اور بیچ میں پاگلوں کے چنگل میں آکر پھنس گئی تھیں۔ اب ہنڈیا پر، کپڑوں پر، جوتوں پر لڑائی کی تک تو نہ بنتی تھی۔ پر زندگی میں چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر الجھنے والے لوگ کبھی بڑی سوچ نہیں رکھ سکتے۔ کبھی بڑے کام نہیں کر سکتے۔ کبھی اعلا ظرف نہیں ہو سکتے۔ یہ کم ہمت اور احساس کمتری میں جلنے والے لوگ ہوتے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ کر زندگی جیسی حسین چیز کو داغ دار کرنے میں کمال رکھتے ہیں۔ میں نے عائشہ باجی کا دل بہلانے کے لیے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"حوریہ! شادی وہاں کرنا جہاں آپ کو سمجھنے والے ہوں۔" وہ اچانک سے بولیں۔

"عائشہ باجی! مقدر وہ ان دیکھی دیوار ہے جو چھونے پر بھی محسوس نہیں ہوتی۔ آپ اس سے اتنے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔ جتنے بے خبر آپ اپنی موت کے متعلق ہوتے ہیں۔" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں کا عکس ڈھونڈنے کے لیے آسمان میں اڑتی لال۔۔۔ پیلی۔۔۔ رنگ برنگی پتنگوں کو دیکھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

ریحان ماموں کیا آئے گھر بھر میں میلہ سا لگ گیا۔ رونق کا سامان تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر بات۔۔۔ فرمائشی کھانے۔۔۔ ادھر سے فصیح اور فریحہ لوگ بھی آجاتے۔ ماموں ہر دل عزیز تھے۔ آج پھپھو کو تاریخ لینے آنا تھا۔ میں جدھر سے گزروں۔ ماموں۔۔۔ فصیح۔۔۔ فریحہ اور عمر وغیرہ کی چھیڑ چھاڑ عروج پر ہوتی۔ کبھی مسکرا پڑتی۔۔۔ کبھی شرما جاتی۔ زندگی کے یہ دن بھی اپنا ہی حسن رکھتے ہیں۔ امی، دادی کام والی کے ساتھ کمر بستہ۔ فریحہ کو بھی محفل سے اٹھا کر کاموں پر لگایا گیا۔ وہ منہ بسورتی امی کے ساتھ کچن میں لگ گئی۔ ماہ زیب خالہ مجھے نزدیکی پارلر لے گئیں تھریڈنگ وغیرہ کروائی گئی۔

خیر سے پھپھو لوگ چھ بجے آئے۔ خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ فائنل کر دی گئی۔ شگن کے طور پر کچھ پیسے بھی میری ہتھیلی پر رکھے گئے۔ امی۔۔۔ خالہ آب دیدہ بھی ہوئیں۔ عمر نے تان لگا لگا کر (دھیاں رانیاں۔۔۔ کنا جمیاں تے کناں لے جانیاں) "بیٹیاں۔۔۔ رانیاں کن لوگوں نے پیدا کی اور کن لوگوں نے لے جانی۔۔۔ گایا۔ خالص زنانہ آواز میں۔۔۔ عمر کے گانے پر دادی تو رونے ہی بیٹھ گئیں۔ جب کہ فریحہ، فصیح ہنسنے لگے۔ ماحول یونہی روتے ہنستے لمحات کا بنا رہا۔

تھک ہار کر میں رات گیارہ بجے بستر پر آئی۔ دل پر نئی زندگی کی سرشاری۔۔۔ امنگیں۔۔۔ اندیشے۔۔۔ خواب سب براجمان تھے۔

"کیا تم فارغ ہو؟" ابوبکر نے میرے کمرے میں جھانکا۔

"ہاں کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"عمیر بھائی کی کال ہے تمہارے لیے۔۔۔ تم بات کر لو۔"

"کیسی ہو تم؟" میرے ہیلو کہنے پر پوچھا۔

"میں ٹھیک۔ آپ کیسے ہیں؟" گفتگو میں مختصر

دورانیہ آیا۔ خاموشی سی چھا گئی۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہم خوش نہیں رہ سکیں گے۔ کوئی عجیب سا احساس۔۔۔ کوئی عجیب سی بات مجھے محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرح کا سمجھوتا ہی ہے۔" عبھو کی بات نے میری بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

"کک۔۔۔ کیا پچھلے تین سالوں میں اب آکر آپ کو ایسا محسوس ہو رہا ہے؟" میں نے ہکلاتی آواز کو مضبوط کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔

"ہاں، مجھے لگتا ہے کہ ہم خوش نہیں رہ سکتے۔" میں یک دم چپ سی ہو گئی اور فون بند کر دیا۔ زندگی عجیب ہے یا عجیب ہونے جا رہی ہے۔ میں نے برف ہوتے وجود کو لا کر بیڈ پر پٹخا اور پھر ہچکیوں سے رو پڑی۔ ساری رات اذیت کے کالے ناگ ڈستے رہے۔ آج پتا چلا آنکھوں میں راتیں کاٹنا کسے کہتے ہیں۔ دلوں میں بربادی اترنا اور رنگوں کو بکھرتے دیکھنا کیسا لگتا ہے۔ دکھ آپ کے وجود پر اترتے ہیں اور تیز شعاعوں کی مانند روح کے اندر سرایت کر جاتے ہیں۔

پتا نہیں صبح کا سورج کیسا طلوع ہوا۔ فجر کی نماز ادا کر کے میں بھاری سر کو تھامے باہر آئی۔ یہ خبر گھر والوں کے لیے بھی یقیناً" اذیت ناک تھی مگر وجود میں اترتے سناٹے مجھ اکیلی کو سہار رہے تھے۔ میں آج کے دور کی لڑکی تھی۔ وہ زمانہ گیا جب چھپ چھپ کر دکھ سہ کر لڑکیاں بابل کے دیس سے چلی جاتیں۔ ان چاہی زندگی۔۔۔ ان چاہا احساس۔۔۔ مجھے عائشہ باجی نہیں بننا تھا۔ بندہ پڑھائی بھول کے پاگلوں میں پاگل ہو جائے۔

میں نے ساری بات امی۔۔۔ ابو۔۔۔ ماموں کے سامنے جا کر رکھ دی۔ سب کا رنگ فق۔۔۔ فوراً" پھپھو کو فون کھڑکایا گیا۔ آنا" فانا" سب بڑے اکٹھے ہو گئے۔ ادھر سے ماہ زیب خالہ بھی آ گئیں۔ بڑوں کے فیصلے تھے میں اکیلی کیوں اذیت کا شکار ہوتی۔

پھپھو نے غائبانہ عبھو کو صلواتیں سنائیں۔ سب حیران تھے کہ تین سال تک تو سب ٹھیک تھا یہ اچانک اسے کیا ہو گیا۔ موصوف سے پوچھا گیا تو یہ بہانہ کیا کہ میں ابھی اسٹیبلش نہیں۔۔۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتا ابھی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ میں کمپرومائز کر رہا ہوں۔ خیر معافی تلافی ہو گئی بڑے ایک دوسرے سے جدائی کے خوف سے دوچار تھے۔ لوگوں کی خود پر اٹھائی جانے والی انگلیوں کا خوف، معاشرے کا ڈر۔۔۔ یہ ڈر ہمیشہ زندگیاں نگل لیتے ہیں۔ یا تو ڈر کو نکال کر پھینک دینا چاہیے یا پھر ساری عمر روح پر جونک کی طرح چمٹا کر آزادانہ اسے خون پینے کی اجازت دے دینی چاہیے۔

پھپھا جی نے سیدھی سیدھی سنائیں کہ اگر عبھو نے ادھر شادی نہ کی تو گھر سے نکال دیا جائے گا۔ پھپھو ادھر ادھر کی دہائیاں دیتی رہیں۔ ہیں تو وہ اسی کی ماں۔ چاہے میری پھپھی سہی مجھے اکیلے میں بلا کر کہا کہ "تمہیں کیا ضرورت تھی سب کو بتانے کی، وہ تو ایسے ہی بکواس کر رہا ہو گا۔" میں ان کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ یہ تو وہ لوگ تھے جو گلا بھی گھونٹتے اور اوپر سے یہ بھی ڈر ڈالتے کہ چیخنا نہیں۔

خیر تاریخ جوں کی توں رہنے دی گئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دونوں اطراف میں، پر میرا دل جیسے مر سا گیا ہو۔ امی۔۔۔ دادی۔۔۔ لاکھ مجھے کاموں میں یا ادھر ادھر الجھاتیں پر دل عجیب سا ہو گیا۔ عائشہ باجی کو ساری بات بتائی تو انہوں نے جھٹ سے کہہ دیا۔

"حوریہ! یہاں شادی نہ کرنا بس یہ سوچ لو کہ لوگ کیا سوچیں گے۔ تین سالہ منگنی۔۔۔ فلاں فلاں۔۔۔ یہ اذیت بڑی ہے یا پوری عمر کسی کے وجود پر بوجھ بن کر رہنا، وقت سے پہلے خود کے لیے اپنے ہم سفر سے ناپسندیدگی کی سند مل جانا۔۔۔ زیادہ تکلیف دہ ہے۔"

"عائشہ باجی! عمر بھی تو گزرتی جا رہی ہے پورے چھبیس کی ہو گئی ہوں۔"

"تو کیا ہوا؟ لوگ پینتیس پینتیس سال کی عمر میں شادی کرتے ہیں۔ بندہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سوچے کہ دو تین سال آگے پیچھے ہو بھی گئے تو کیا، زندگی تکلیف دہ نہ ہو۔" وہ آنکھوں میں آئی نمی چھپاتے ہوئے بولیں۔

"حوریہ! عزت، ذلت، زندگی، موت سب اللہ کے

ہاتھ میں ہے۔ ساری دنیا بھی تمہاری عزت خراب کرنا چاہے اور مل کر زور لگالیں۔ اگر اللہ نہ چاہے تو کبھی بھی خراب نہیں ہو سکتی۔ اس طرح اگر ساری دنیا بھی تمہیں عزت دینا چاہے اور اگر اللہ نہ چاہے تو تمہیں عزت نہیں دلا سکتی۔ اس وقت سب سے بہتر مشورہ اللہ کا ہے۔ حدیث پر عمل کرو۔ شاباش۔ میری گڑیا۔" وہ کبھی کبھی پیار سے مجھے میری گڑیا کہتی تھیں۔

"جاؤ اور اللہ سے مدد مانگو۔ اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھنے والا۔ والدین کے بعض فیصلے اولاد کو ساری عمر بھگتنے پڑتے ہیں۔ پھر ہم ان فیصلوں پر بجائے نظر ثانی کرنے کے مقدر کی سیاہی کا نام دے دیتے ہیں۔" میں ان کے گلے لگ کر بے تحاشہ روئی۔ دل کی بھڑاس نکل گئی تھی۔ پھر رات میں ماموں کے سامنے بات کی۔ ریحان ماموں نے تحمل سے میری بات سنی۔

"حوریہ! ہو سکتا ہے وہ بعد میں ٹھیک ہو جائے۔"

"ماموں امکان ہی ہے نا۔۔۔ اگر نہ ہوا تو۔۔۔" میں نے روئی روئی آنکھوں سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"یقیناً" اس کا دماغ کسی اور وجہ سے خراب ہوا ہے۔ پچھلے تین سال تو ٹھیک ٹھاک گزرے۔"

"ماموں! اگر اللہ نے پہلے ہمیں خبردار کردیا ہے تو آپ لوگ کیوں جان بوجھ کے مجھے تکلیف وہ زندگی کا حصہ بنانا چاہ رہے ہیں۔"

"حوریہ! میں اس سے اکیلے میں ایک دفعہ بات کرلوں پھر کوئی فیصلہ کرتے ہیں۔" ماموں نے مجھے تسلی دی۔

پھر میں نے رب کے حضور مقدمہ رکھ دیا اور رب کے حضور پیش کیے گئے مقدموں میں انسان ہمیشہ سرخرو ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اللہ کے سامنے رو رو کر التجا کی۔ دنیا میں جنت کا ملنا نیک مرد کو نیک عورت اور نیک عورت کو نیک مرد کا ساتھ ملنا ہے اور دنیا میں آزمائش کا ملنا ایسا ہے کہ نیک عورت کو برے مرد کا مل جانا اور نیک مرد کو بری عورت کا مل جانا۔

"پتا نہیں اللہ پاک۔ میں کتنی خطا کار گناہ گار ہوں۔ بس تو رحم کر۔ فضل کر۔ مجھے "آزمائش" والی زندگی نہ دے۔ مجھے آسان زندگی دے۔ تیری سزاؤں کو سہنے کی ہمت بھی نہیں رکھتی، میرے گناہ معاف کرکے مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور ایک اچھا شخص میری قسمت میں لکھ دے جو زندگی کو پرسکون بنا دے۔" میں نے صبح شام اللہ پاک سے دعائیں کیں۔ جیسے بچے ماں سے ضد کرکر کے مانگتے ہیں۔ میں نے اپنے رب سے رو رو کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مانگا کہ وہ ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرنے والا ہے۔ پتا نہیں ماموں نے عبھو سے کیا بات کی۔ انہوں نے گھر آکر امی ابو کے سامنے یہ عذر دے دیا کہ وہ اس رشتے کے لیے مناسب نہیں۔ تین دن گھر میں بڑوں کی میٹنگ چلتی رہی۔ عمر اور ابوبکر بھی ماموں کے ہمنوا ہو گئے۔

"وہ مردوں جیسا مرد ہی نہیں۔۔۔ کبھی کچھ کہتا ہے تو کبھی کچھ۔۔۔ کبھی کہتا ہے کہ شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کبھی کہتا ہے دو سال بعد کروں گا۔ عجیب ٹال مٹول کرنے والا انداز۔۔۔ ایسا شخص نہ خود خوش رہ سکتا نہ دوسروں کو رکھ سکتا ہے۔"

خیر تین دن بعد امی اور ابو نے پھپھو کو جواب دے دیا۔ پھپھو باقاعدہ لڑنے آگئیں۔ دادی البتہ پھپھو کی ہمنوا نہ بنیں۔ شاید اللہ سے مانگی دعا کا نتیجہ تھا کہ میری عزت پر کوئی حملہ نہ ہوا۔ سارے عبھو کو ہی صلواتیں سناتے رہے۔ پھپھو، امی اور دادی البتہ روئیں بہت۔۔۔ روئی تو میں بھی رہی۔۔۔ تین سال اس شخص کا نام اپنے نام کے ساتھ سنا تھا۔ خیر رب کی مرضی اور اس کی مہربانی۔۔۔ پورا خاندان خبر سن کر افسوس کرنے آیا۔ خاندان کا پہلا واقعہ۔۔۔ خاندان میں ہی منگنی ٹوٹی۔۔۔ چچ چچ۔۔۔ افسوس۔۔۔ اور کچھ خواتین نے آنسو بھی بہائے۔ عائشہ باجی کی ساس نے بھی آکر اپنی فطرت کے مطابق خوب لگا لگا کر سنائیں۔ میں خاموش سنتی گئی۔ بس دعا کو میں نے اپنا ہتھیار بنائے رکھا۔ گھر کی فضا سوگوار سی رہتی۔ اور ایسے ہی پورا مہینہ گزر گیا۔

وہ خزاں کی ایک شام تھی۔ میں نماز مغرب سے فارغ ہو کر جائے نماز تہ کر رہی تھی جب عائشہ باجی اپنی امی کے ہمراہ ہمارے گھر آئیں اور ساتھ خوشی کا پیام بھی لائیں۔ انہوں نے اپنے اکلوتے بھائی زین العابدین کے لیے میرا رشتہ مانگا۔ لڑکا انجینئر تھا اور ابوظہبی میں اچھی پوسٹ پر بھی تھا۔ عائشہ باجی کی امی نے بہت محبت اور اپنائیت سے ہاتھ مانگا۔

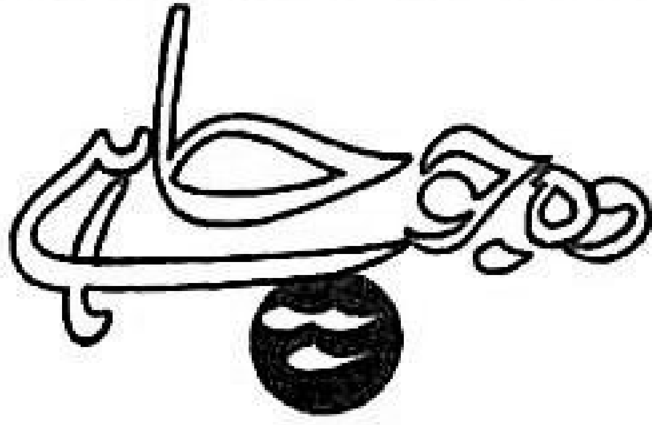
"مجھے عائشہ نے سب بتایا ہے بہن... میں خود جاہلوں کے ہاں بیٹی بیاہ کر عمر بھر کی اذیت سہہ رہی ہوں۔ بات یہ ہے کہ نہ اپنے اچھے ہوتے ہیں نہ پرائے... اچھا ہونا نہ ہونا انسانی فطرت پر منحصر ہے۔ اپنوں میں بھی برے مل جاتے ہیں اور بعض دفعہ غیروں سے بھی اپنے پن کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ میں آج سے پہلے کہیں بھی رشتہ مانگنے نہیں گئی۔ پہلی دفعہ بیٹے کے لیے گھر سے نکلی ہوں۔ مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔" امی پر تو شادی مرگ کی کیفیت تھی۔ دادی البتہ خاموش تھیں۔ عائشہ باجی جاتے ہوئے زین العابدین کی تصویر بھی مجھے دکھا گئیں۔ لمبا اونچا... خوش شکل لڑکا تھا۔ میں خود گم صم سی تھی۔ بڑوں کی میٹنگ بیٹھی۔ پندرہ تاریخ آنے میں تین دن باقی تھے۔ ریحان ماموں نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ دادی نے شور ڈالا۔

"لڑکے کا پہلے پتا کرواؤ۔" امی نے عائشہ باجی سے بات کی۔ انہوں نے تحمل کا مظاہرہ کیا اور جھٹ ان کا پتا لکھ دیا۔ خیر ماموں نے پتا کروایا ہر طرف سے اوکے ملا۔ پندرہ تاریخ بروز جمعہ میرا نکاح زین العابدین سے ہو گیا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد رخصتی... زندگی حیرت انگیز طور پر بدلی تھی۔ اللہ نے میری بے شمار التجائیں سن لیں۔ مجھے دنیا میں نیک مرد کا ساتھ ملا۔ اب میں نے ان کی نیک بیوی بن کر رہنا تھا۔ ہمارے میں اتنی محبت' اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی کہ لوگ پوچھتے آپ دونوں کی لو میرج ہے۔ زین العابدین نے مجھے بے تحاشا چاہا... عزت دی... اور میں نے بھی اتنا ہی ان کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار کیا۔ عائشہ باجی کی امی... مطلب ساس کو ماؤں سے بڑھ کر مان دیا۔ ایک سال میں میری گود میں حمنہ بھی آ گئی۔ جب خوش باش چہرہ لے کر گھر آتی تو امی... ابا اور دادی کھل سے جاتے۔ میرے بھائی اکلوتی بہن کو پُرسکون دیکھ کر سکون میں آ جاتے۔ ایک سال پہلے کا دکھ جیسے منوں مٹی تلے دب گیا۔ اس دوران عنبر کی دو اور منگنیاں ہو کر ٹوٹ گئیں۔ لوگوں سے رسوائی کس کے حصے میں آئی۔ عائشہ باجی کی بات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد تھی کہ اگر اللہ نہ رسوا کرنا چاہے تو ساری دنیا بھی مل کر زور لگا لے' نہیں رسوا کر سکتی۔ انہوں نے اس وقت پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان کر کے میرے دل کو ایک نئی زندگی دی تھی۔ اگر لوگوں کا ڈر... خاندان کی منگنی... بڑوں کی عزت... کا خوف ایک غلط فیصلہ مجھ پر مسلط کر دیتا... تو پھر والدین نے اس پر قسمت کی مہر لگا دینی تھی' کبھی کبھی مقدر کی سیاہی کا کچھ حصہ ہمارے غلط فیصلوں کا نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ میں حمنہ کو دیکھتی تو بے تحاشا پیار کرتی۔ میں نے کبھی نہیں کہا کہ ماں باپ بیٹیوں کے پیدا ہونے سے نہیں گھبراتے بلکہ ان کے نصیبوں سے ڈرتے ہیں۔ میں تو بس یہ ہی کہتی ہوں کہ ماں باپ کبھی بیٹیوں کے نصیبوں سے مت ڈریں۔ یہ ڈر اپنے دلوں سے نکال پھینکیں۔ بیٹیاں تحفے کی طرح رب سے وصول کریں۔ ایک ذمہ داری کی طرح انہیں پالیں۔ بیٹیوں کو اپنا نصیب مانگنا سکھائیں۔ رب پر توکل کرنا خود سیکھیں۔ نصیب دعاؤں کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ دعائیں نصیبوں کے بند قفل کھول دیتی ہیں۔ اللہ کی قدرت ہاتھ اٹھانے پر' زارو قطار رونے پر' زور و شور سے مانگنے پر ضرور جوش میں آتی ہے جس نے نصیب لکھنا ہے بس اس کو بندہ پکار لے۔ لوگوں کے سامنے جھولیاں پھیلا کر کبھی خود کو رسوا نہ ہونے دیں۔

حمنہ کو کارن فلیکس کھلاتے ہوئے میں نے طمانیت سے زین العابدین کا چہرہ دیکھا۔ جہاں میرے لیے صرف محبت ہی محبت تھی۔

☆

قرۃ العین رائے



آج وہ بہت چپ چاپ اور تھکی تھکی سی لگی تھی اسے، وہ اس کی تمام پریشانیوں سے واقف تھی اس لیے فارغ وقت کی منتظر تھی، جب وہ اپنے دل کا بوجھ اس سے کہہ کر ہلکا کرے گی۔

"مس راحیلہ، آپ کو سر بلا رہے ہیں۔" چپڑاسی نے ان کے کیبن کے پاس آکر دونوں کو ہی ان کے خیالات سے چونکا دیا۔

واپسی پر اس کی شکل پر بارہ بجتے دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ پھر غیر حاضر دماغی کے ساتھ کام کرنے پر باس سے ڈانٹ کھائی ہے۔ اس نے کچھ نہیں پوچھا، وہ اس کی عادت سے واقف تھی۔ لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے 'کچھ نہیں' کا جملہ ہی ادا کرنا تھا اور پھر بے حد کام میں مصروف، وہ اچانک ہی بولتی چلی جاتی تب اسے خاموش سامع کا کردار ادا کرنا پڑتا۔ نصیحت اور مشورہ دونوں پر



ہی وہ بھی کان نہیں دھرتی تھی۔ اس لیے اب اس نے انہیں ضائع کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"جم کیسا جا رہا ہے؟" لنچ بریک پر اس کی خاموشی کو توڑنے کے لیے یونہی پوچھا۔

"ہوں۔۔۔! ہاں' اچھا جا رہا ہے لیکن تھک جاتی ہوں۔ آفس چھٹی پر سیدھا جم جاتی ہوں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ مشینوں پر ورزش کر کر کے وجود اور تھکن کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالکل دل نہیں چاہتا یہ سب کرنے کو۔" اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

"ہوں! ویسے تمہیں ضرورت تو نہیں جم جانے کی' اسمارٹ سی تو ہو۔" کئی بار کی کہی گئی بات پھر اس کے ہونٹوں سے ادا ہوئی۔

"ہونہہ! آپ کو ایسا لگتا ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ جم جاؤ۔ خود کو اور اسمارٹ کرو' جتنی پتلی ہو گی اتنی عمر سے چھوٹی نظر آؤ گی ورنہ اماں نے تمہیں دیکھتے ہی یہ کہہ کر صاف انکار کر دینا ہے کہ اتنی بڑی عمر کی بہو میں نہیں لانے والی بس اسی وجہ سے یہ سب کرنا پڑ رہا ہے۔" طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ گویا ہوئی۔

وہ اس موضوع پر اسے کافی سمجھا چکی تھی لیکن نتیجہ صفر۔ اس لیے خاموش ہی رہی۔

"آپ آج لنچ میں کیا لائی ہیں؟ مجھے تو بس یہ پتے ہی کھانے ہوتے ہیں۔ اتنے دنوں سے کچھ ڈھنگ کا کھانا نہیں کھایا۔ صبح صرف ایک براؤن بریڈ' چینی کے بغیر چائے اور انڈا اور اب یہ پتے اور رات کو کچھ بھی نہیں' کچھ فرق پڑا ہے مجھ میں؟" اپنے سلاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

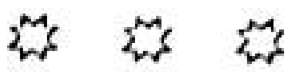
تھکن سے ماند پڑی جلد' آنکھوں کے گرد حلقے اور پچکے سے گال' یہ فرق پڑا تھا اسے۔ وہ بس اسے بغور دیکھ کر دل میں سوچ کر رہ گئی۔

"ہاں کافی فرق ہے اب۔ اسے کہوں نا وہ اپنی ماں کو تمہارے گھر بھیجے اس کی ڈیمانڈز ہی پوری کرتی رہو گی کیا؟ اس نے کہا جاب کر لو اس نے کہا جم جوائن کرو' اس نے یہ کہا اس نے وہ کہا اور تم بس اس کے اشارے پر ناچتی پھرو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے مشورہ دیے بنا رہ نہ پائی۔

ان دو' تین ماہ میں ان کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی اور وہ ویسے بھی کافی نرم دل کی مالک تھی اس لیے راحیلہ کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی۔

"ہائے زارا جی' کیا کروں؟ آپ کو ایسے کوئی مسئلے نہیں' شادی شدہ ہیں' بچے ہیں' گھر ہے۔ صحیح وقت اور صحیح عمر میں سب کچھ ہے آپ کے پاس والدین کے آگے پیچھے فوت ہونے کے بعد میری زندگی بھائیوں اور بھابھیوں کے رحم و کرم پر آ گئی۔ رشتے آتے رہے اور وہ لوگ مین میخ نکالتے رہے۔ کسی نے سوچا ہی نہیں کہ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ رشتوں کے انتظار میں گھر کی چوکھٹ دھول اڑانے لگے گی۔ دل بہلانے سے زیادہ اپنا خرچا اٹھانے کے لیے ایک آفس میں جاب شروع کی۔ کام زیادہ نہیں تھا' سکون تھا اور وہیں امجد سے ملاقات ہوئی جس نے مجھے اس آفس میں جاب کرنے کو کہا۔ یہاں کام بہت زیادہ ہے۔ سیلری میں چند سو کے اضافے کے لیے مجھے کافی دیر کام کرنا پڑتا ہے اور پھر اب جم بھی اور جب تھکی ہاری گھر پہنچتی ہوں تو تین بھابھیوں میں سے کسی نہ کسی بھابھی کا کوئی کام حاضر ہوتا ہے۔"

"اور ڈائٹنگ کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کر رہی ہو۔" زارا نے لقمہ دیا اور پھر خاموشی سے دونوں لنچ کرنے لگیں۔



"راحیلہ تم ٹھیک ہو؟" راحیلہ کو اچانک دوبارہ کرسی پر بیٹھتے دیکھ کر زارا تیزی سے اس کی جانب آئی۔

"ہاں بس چکر سا آ گیا تھا۔" سر کو تھامے راحیلہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

"چکر تو آئے گا' اپنی جان سے زیادہ بوجھ ڈال رکھا ہے تم نے خود پر۔ اوپر سے اتنی زیادہ ڈائٹنگ' تمہیں

پتا ہے یہ کتنی خطرناک ہوتی ہے۔ سارا دن بھوکی پیاسی رہتی امجد کی ڈیمانڈز پوری کرتے کرتے تم نے ختم ہو جانا ہے۔ یہ لو' جوس پیو فریش ہے۔ چینی کے بغیر' تمہارے لیے گھر سے لے کر آئی ہوں۔" زارا نے راحیلہ کو لتاڑتے ہوئے جوس کا گلاس اس کی جانب بڑھایا جو اس نے ساتھ لائی بوتل سے نکالا تھا۔ راحیلہ کی پیلی پڑتی رنگت نے اسے تاؤ ہی دلا دیا تھا۔

"زارا جی' آپ نہیں سمجھیں گی....."

"کیوں نہیں سمجھوں گی' پرابلمز تو ہر کسی کے ساتھ ہیں۔ بقول تمہارے' میری وقت پر شادی ہوگئی۔ شوہر ہے بچے ہیں تو زندگی کا دی اینڈ ہو گیا کیا؟ زندگی جب تک ہے پرابلمز بھی تب تک ہیں۔ میں جاب خوشی سے نہیں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹانے کے لیے کر رہی ہوں' آفس' گھر' بچے۔ سسرال بہت سارے جھنجٹوں میں میری اکیلی جان پھنسی ہوئی ہے اور اس بات کا احساس میرے شوہر کو ہے اور میں دلائے بھی رکھتی ہوں۔

کسی ایک شخص کے نام زندگی کرنے کا مطلب اس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننا نہیں ہے۔ راحیلہ! امجد نے کہا ہے کہ تم جم جاؤ' ڈائٹنگ کرو تاکہ بالکل پتلی ہو کر اپنی عمر سے چھوٹی نظر آسکو اور اس کی ماں تمہیں بہو کی طور پر قبول کرلے اور تمہاری بڑھتی عمر اس رشتے میں رکاوٹ نہ بنے حالانکہ تم موٹی نہیں ہو۔ بس بھرے جسم کی مالک ہو اور اس میں تم اچھی لگتی تھیں۔ امجد اگر واقعی تم سے مخلص ہے تو اسے اپنے گھر والوں کو تمہارے لیے منانا چاہیے' تمہاری پرابلمز کو سمجھنا چاہیے نہ کہ تمہیں اپنی انگلیوں پر بلاوجہ کی ڈیمانڈز بتا کر نچاتا پھرے۔" زارا نے ایک بار پھر پیلی رنگت کی ماری راحیلہ کو سمجھانا چاہا مگر اس کی مہر بہ لب کیفیت نے اسے باور کرا دیا کہ زارا کی باتیں راحیلہ کے دماغ پر دستک دے پا رہی ہیں اور نہ دل پر۔

راحیلہ کے لیے امجد اس کی آنے والی خوشحال زندگی کا آخری سہارا بن چکا تھا۔ اول تو رشتے آتے نہیں تھے اور جو اکا دکا آتے وہ رنڈوے یا طلاق شدہ مردوں کے ہوتے۔ جو اس سے عمر میں بھی دگنے تھے اور انہیں بیوی سے زیادہ آیا کی ضرورت تھی۔ اپنے لیے یا اپنے بچوں کے لیے' وہ اب امجد کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔



سامنے کا منظر دیکھ کر زارا سے حیرت سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ ایک بار تو اسے راحیلہ کی دماغی حالت پر شک گزرا۔ اس نے اپنی آنکھیں دو تین بار جھپکیں' کہیں اسے یہ وہم تو نہیں لیکن آنکھوں کے ساتھ ساتھ جو خوشبو اسے آرہی تھی وہ اس کا ہرگز وہم نہیں تھی اتنے مہینوں کی محنت کو راحیلہ اتنے اطمینان سے برباد کر رہی تھی۔ ابھی پچھلے ہفتے جب وہ ڈائٹنگ کی وجہ سے چکرا کر گرنے لگی تھی لیکن ایک نوالہ منہ میں جانا نہیں دیا تھا اور اب..... ؟

"راحیلہ! یہ سب کیا ہے؟" لنچ بریک میں زارا نے اپنا لنچ بکس راحیلہ کی ٹیبل پر رکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ اتنا ہیوی کھانا اور وہ بھی راحیلہ!

"دیسی مرغا ہے۔ دیسی گھی میں پکا ہوا اور اس کے بعد مجھے آدھا درجن کیلے بھی کھانے ہیں اور تھوڑی دیر بعد پھر کچھ اور۔ آج آپ کی میری طرف دعوت ہے۔ میں آپ کے لیے بھی بنا کر لائی ہوں۔" مرغی کی ٹانگ کو مزے سے کھاتے ہوئے راحیلہ نے مزے سے جواب دیا۔

"کیا فائدہ جم جا کر ایک دو گھنٹے مشقت کرنے کا اگر تم اتنی ہیوی ڈائٹ لو گی۔" زارا نے کرسی ٹیبل کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"جم سے چھٹی' اب مجھے بالکل ورزش نہیں کرنی' کھانا ہے اور بس کھانا۔" راحیلہ جھٹ بولی۔

"خیریت! یہ انقلاب کیسے آگیا؟" زارا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"پرسوں ہفتے کو امجد کی والدہ آئی تھیں ہمارے گھر'

اس دن تو بس مل کر چلی گئیں پھر امجد نے فون پر بتایا کہ وہ اس کے منانے پر رشتہ ڈالنے تو چلی آئیں لیکن انہیں میں کمزور سی پسند نہیں آئی۔ میرا مطلب باقی تو سب ٹھیک ہے امجد کی ضد کے آگے انہوں نے ہار مان لی ہے لیکن ان کی ایک شرط ہے کہ میں اپنا وزن بڑھالوں۔ دیہاتی سی خاتون ہیں انہیں بھاری بھر کم وجود کی لڑکیاں پسند ہیں۔ کمزور اور لاغر نہیں اور انہوں نے مجھے ایک ہفتہ دیا ہے لہٰذا اب ڈائٹنگ وائٹنگ بند اور آج سے کھانا اور بس کھانا۔" راحیلہ نے زارا کی حیرت دور کرتے ہوئے ساری بات بتائی۔

ساتھ وہ مسلسل کھاتی چلی جا رہی تھی۔ "قسم سے کھانا کھانے کی بالکل عادت نہیں رہی۔ سینے میں جلن شروع ہو جاتی ہے۔ معدہ میں تیزابیت سی ہے۔ لیکن میرے پاس دن تھوڑے ہیں۔ اس لیے ہر بات کو نظر انداز کیے اپنی ساری تنخواہ اب کھانا کھانے پر خرچ کر رہی ہوں۔" راحیلہ نے بے چارگی سے کہا۔

"لیں ناں، آپ بھی لیں۔"

"اور امجد کو تو اسمارٹ لڑکیاں پسند ہیں۔ شادی کے بعد کیا کروں گی۔" زارا نے چھوٹا سا پیس اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

"پھر ڈائٹنگ اور جم جاؤں گی اور کیا کر سکتی ہوں۔" راحیلہ نے ترنت جواب دیا۔

"بس جو وہ چاہے وہی ہو' والی بات ہے۔" راحیلہ نے قدرے وقفے بعد دل گرفتگی سے کہہ کر خود کو کھانا کھانے میں مشغول کر لیا۔

"ایسا نہیں ہے کہ جو امجد چاہے گا راحیلہ کو ویسا ہی کرنا ہو گا۔ یہ تو تمہاری سوچ نے خود کو اس کے تابع کر لیا ہے خوامخواہ۔ بے شک عمر بڑھ رہی ہے' شادی کی عمر نکل رہی ہے' اچھے رشتوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے مگر ہے تو سہی' ابھی پچھلے دنوں میرے شوہر نے اپنے ایک کولیگ کا ذکر کیا تھا۔ میں بھی مل چکی ہوں بہت اچھی نفیس شخصیت کے مالک ہیں۔ تم سے ذکر کیا تو تم نے اتنی بڑی عمر کا مرد کہہ کر رشتہ ٹھکرا دیا لیکن اصل وجہ یہ نہیں تھی۔ اصل وجہ تو تمہاری یہ اندھی محبت ہے۔ ایسی محبت جس میں تم نے اپنی شخصیت' اپنی سوچ امجد کے ہاتھ گروی رکھ دی ہے۔ اپنی شناخت اس کے حوالے کر دی ہے تو بس پھر جو وہ چاہے کیے اور کرائے۔

کاش' ہم لوگ اللہ پر توکل کرنے والے بن سکیں۔ جب ہمارا ایمان ہمارا یقین اللہ پر کمزور ہوتا ہے تو اپنی زندگی' اپنی تقدیر سنوارنے کے چکر میں بگاڑتے چلے جاتے ہیں اگر ہم یہ کامل یقین رکھیں کہ جو اللہ ہمارے لیے چاہے گا وہ بہترین ہو گا تو پھر یوں اپنی زندگی کسی دوسرے انسان کے ہاتھ کھلونا نہ بنانی پڑے۔"

زارا دل میں "صم' بکم" کی تفسیر بنی راحیلہ سے مخاطب ہوتی' اپنے کیبن کی جانب چلی آئی۔ دل پر ایک بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا۔

"اللہ ہم سب کو ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھے' آمین۔" زارا کے بلند آواز میں ادا کیے گئے اس جملے پر راحیلہ نے نا سمجھی سے اس کی جانب دیکھا اور سر جھٹک کر کولڈ ڈرنک کی بوتل غٹاغٹ چڑھا گئی۔

"یہ زارا جی بھی نا' کبھی کبھی عجیب ہی بات کرتی ہیں۔ بھلا اس وقت اس دعا کی کیا تک ہے۔" راحیلہ نے ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ سے سوچا۔

ہائے بالکل دل نہیں چاہ رہا اب کھانے کو اور کولڈ ڈرنک پینے کو' ڈائٹنگ کے دوران اس کے اتنے سائیڈ ایفکٹ پڑھے تھے کہ توبہ' دل اچاٹ ہو گیا تھا لیکن یہی سب چیزیں مجھے جلد از جلد موٹا کر سکتی ہیں بس اللہ میاں جی اتنا موٹا کر دے کہ میں امجد کی ماں کو پسند آجاؤں (آمین)۔" راحیلہ نے جھٹ سے دعا مانگی اور ٹیبل سے لنچ بکس سمیٹنے لگی۔

لنچ ٹائم ختم ہو چکا تھا اور اب اسے شام تک بس فائلوں میں سر کھپانا تھا' اپنے مستقبل کے امجد کے سنگ سہانے خواب دیکھتے ہوئے' یہ سوچے سمجھے بغیر کہ جن خوابوں میں دل کا سکون شامل نہ ہو' وہ پورے ہو کر بھی آپ کو بے چین کیے رکھتے ہیں۔

سمیرا حمید

ہماری کہانی

ناولٹ

میں نے اپنی زندگی میں ہمیشہ اس سنسنی کو مس کیا تھا جس کا شکار ہر وہ لڑکی ہوتی ہے جو اپنے منگیتر کے بارے میں بات کرتی ہے۔

سنسنی مثبت معنی میں، نہ کہ میری طرح منفی میں کہ جیک کا خیال آتے ہی میرا سر ایسے چکرانے لگتا ہے جیسے بہت ساری چمگادڑیں میرے سر میں گھس کر آپس میں پکڑم پکڑائی کھیل رہی ہوں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ ایک منگیتر میں آخر ایسا کیا ہوتا ہے کہ اتنے اہتمام سے اس کے بارے میں بات کی جائے جیسے اسکول میں، کالج میں لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔ اس کے لک کی، اس کے سحر کی، اس کے اسٹائل کی، اس کی مسکراہٹ کی حتی کہ اس کے سنائے لطیفوں کی بھی۔ جن کی منگنی نہیں ہوئی ہوتی انہیں فکر لاحق رہتی ہے کہ ان کا "وہ" کیسے ان کی محبت میں مبتلا ہو گا یا دراصل اسے کیسا ہونا چاہیے۔ اس کے لیے وہ باقاعدہ فلموں کے سین ذہن میں رکھ کر ان میں سے چھانٹی کرنے لگتی ہیں کہ کون سا "بیسٹ فالنگ ان لو سین" ہے۔ انہیں یہ سوچیں بھی گھیرے رکھتی ہیں کہ اس خاص انسان کو انہیں پرپوز کیسے کرنا ہو گا، فون پر باتیں کیسے کرنی ہوں گی، سالگرہ پر کہاں ڈنر کے لیے لے کر جانا ہو گا اور گفٹ کو کس خاص انداز سے ان کے دربار میں پیش کرنا ہو گا۔ مجھے حیرت ہوتی کہ ایک منگیتر کو لے کر اتنا کچھ کیسے سوچا جا سکتا ہے۔ منگیتر کیا کوئی اور ہی مخلوق ہوتی ہے جو آپ کی زندگی کو غباروں، پھولوں، کینڈل لائٹ ڈنر اور گفٹس سے بھر دے یا وہ آپ سے ایسی بات کہے جو کسی نے بھی نہ کی ہو۔ یعنی کون سی ایسی بات ہے جو کسی نے کبھی کی نہ ہو؟ میں سوچنے پر مجبور ہو جاتی یا آس پاس کی لڑکیاں مجھے سوچنے پر مجبور کر دیتیں اور پھر اگر کسی دوست سے پوچھ ہی لیتی تو وہ ہنس کر کہہ دیتی۔

"یو آر اے آنٹ" (تم پاگل ہو)

میری انگلش اچھی ہے لیکن پھر بھی میں نٹ کو





اخروٹ کے معنی میں لیتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں مجھ نٹ سے اخروٹ ہی یاد آتا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ کہا جارہا ہے۔

تم اخروٹ کی طرح ہو۔ سخت اور تھوڑی سی نمکین' زیادہ کھالینے پر کچھ کچھ کڑوی بھی۔ ایسی لڑکی جسے زیادہ نہ کھایا جاسکتا ہے روزانہ اور یہ بھی کہ تم اخروٹ کے خول میں بند ہو۔ مجھے گھٹن ہونے لگتی ہے کہ کیا میں اخروٹ کے خول میں بند لڑکی ہوں؟ اتنے چنے منے سے اخروٹ کے خول میں بند۔۔۔۔ اف۔۔۔ لیکن کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ میں ایک نارمل منگیترانہ لائف نہیں گزار رہی۔ میں یہ معلوم نہیں کرپائی کہ منگیتر کیسے ہوا جاتا ہے یا منگیتر کو کیسے رکھا جاتا ہے۔ یعنی منگیتر کا مصرف کیا ہے؟ جہاں تک غباروں' پھولوں اور ڈنر کی بات ہے تو میں اب تک ان معاملات میں "تباہ شدہ نہیں بلکہ آفت زدہ" ہوں۔ جہاں تک گفٹس دینے اور لینے کی بات ہے تو اس میں دونوں طرف سے دھاندلی کی جاتی ہے اور ہر بار کی جاتی ہے۔ فون کرنے کی بات تو ایسی ہی ہے جیسے چاند پر جاکر ٹاٹا کرنے کی۔ ہم دونوں کے والدین نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ ہم کم سے کم فون پر ہی بات کرلیا کریں لیکن ہم دونوں نے اپنی پوری سی کوشش کی کہ "بھاڑ میں جائے یہ" مجھے کوئی ضرورت نہیں اس کے منہ لگنے کی۔ جو سامنے سے اچھا نہیں لگتا وہ فون پر کیا اچھے لگے گا۔ ہم دونوں نے کبھی سیدھے منہ ایک دوسرے سے بات نہیں کی پھر بھی ہم "منگیتر" کے عہدے پر فائز ہیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے جان چھڑانے کا کوئی ایک بھی موقع جانے نہیں دیا' پھر بھی ہم "منگنی شدگان" ہیں۔ بلاشبہ یہ کھلا تضاد ہے۔ اسی لیے بچپن سے اب تک کے تلخ تجربات سے اپنے منگیترانہ فیز میں' میں نے تو یہی جانا ہے کہ منگیتر ازاے آنٹ۔"

اب جبکہ میں کالج کی اسٹوڈنٹ ہوں اور جلد ہی یونی ورسٹی جانے والی ہوں تو میں یہ پلان کرنے لگی ہوں کہ میں اپنے بچوں کی بچپن میں ہرگز منگنی نہیں کروں گی۔ بلکہ چند غیر ملکی فلموں نے تو مجھے اتنا باغی کردیا ہے کہ میں نے سوچنا شروع کردیا ہے کہ میں اپنے بچوں سے کہوں گی کہ "شادی کا دن طے کرلو تو بتا دینا میں شادی میں شرکت کرلوں گی۔ یعنی میں اپنی نٹ آزادی کا بدلہ اپنے بچوں کو کھلی چھوٹ دے کر لینا چاہتی ہوں۔

میری تاریخ کافی لمبی ہوگئی ہے نا۔ جبکہ میری تاریخ میں ہے ہی کیا؟ میں پیدا ہوئی' اتفاق سے خوب صورت بھی تھی اور اس سے بڑے بلکہ برے اتفاق سے ان ہی دنوں میرے کینیڈا والے انکل ہمارے گھر قیام پذیر تھے اور ان کا چار سالہ لمبو' یعنی تنبو اور جمبو۔۔۔ اُفف۔۔۔ ہاں وہی جیک بھی ان کے ساتھ تھا بلکہ آج تک ان کے ساتھ ہی ہے۔ ہمت ہے ان کی جو اسے اپنے ساتھ رکھا ہے' شاید اسی لیے والدین کا رتبہ اتنا عظیم ہے کہ وہ ایسی آفات کو بھی جھیل جاتے ہیں۔

ویسے مجھے ابھی بھی یقین نہیں آتا کہ انکل ایسے پینڈو بھی ہوسکتے ہیں۔ اگر انکل کو ایسا ہی دیسی ٹائپ ہونا تھا تو وہ اتنے ماڈرن ملک کینیڈا گئے ہی کیوں؟ یہ دیسی لوگ ذرا نہیں بدلتے۔ اپنے بیٹے کا نک نیم کسی انگریزی فلم کے ہیرو پر جیک رکھ دیا اور اس انگریزی ہیرو کے لیے پنجاب کی لڑکی "عروہ" کا ہاتھ مانگ لیا۔ جبکہ ابھی اس بے چاری کو گلا پھاڑ کر رونے سے فرصت نہیں تھی۔ دودھ کو پی کر الٹ دیتی تھی اور کوئی نرم غذا اس کے پیٹ میں زیادہ دیر تک ٹھہرتی نہیں تھی۔ ایسی نومولودگی کے ٹریک سے ہٹی ہوئی لڑکی کو انہوں نے اپنی "بہو" کے طور پر پسند کرلیا۔ دفع کرتے پھر کینیڈا کو' یہاں پنجاب میں "دیساتوں" کی کمی تھی کیا۔ یہیں رہتے اور کرتے بچپن کی منگنیاں' بلکہ نکاح بھی کردیتے۔ ویسے دس سال کی عمر میں میرے ذہن میں یہ پلان پرورش پانے لگا تھا کہ اگر میرا نکاح کرنے کی کوشش کی گئی تو میں پولیس بلالوں گی۔ مجھے بہت شوق تھا کہ اخباروں میں میری خبر آئے کہ "دس سالہ بچی کا نکاح' مولوی اور ساس سسر کو دولہے سمیت حوالات

میں بند کردیا گیا۔ انہیں سرخ کھونمٹ میں ایک عرصہ اپنی تصویر اخبار میں دیکھتی رہی۔ میں نے پولیس کا نمبر بھی یاد کرلیا تھا لیکن انکل آئے ہی نہیں کینیڈا سے اپنی کینڈی اور جیکی میرا مطلب "مسٹر جیک" کو نکاح کے لیے لے کر۔

آواز کے بعد میری اس سے پہلی ملاقات ویڈیو کے ذریعے ہوئی تھی' جب میں نے اسے چلتے پھرتے' کودتے پھاندتے دیکھا۔ پاپا کینیڈا گئے تھے اور کینڈی کی والی بال کھیلتے ہوئے کی ویڈیو بھی بنا کرلائے تھے۔ کیا چھوٹی سی نیکر پہنی ہوئی تھی اس نے۔

"اتنے چھوٹے کپڑے پہنتے ہیں یہ لوگ۔" میں جتنا بنا سکتی تھی اتنا منہ بنا کر کہا۔

"وہ لڑکا ہے' لڑکی نہیں۔۔۔ والی بال پلیئرز کا یہی ڈریس ہوتا ہے۔" پاپا بھی جتنا بنا سکتے تھے اتنا ہی منہ بنا کر کہا۔

میں وہیں چپ ہوگئی' میں نے تو بس ایک ذرا سی کوشش کی تھی انہیں اس کینڈی سے متنفر کرنے کی لیکن وہ مجھ سے ہی متنفر ہو رہے تھے۔ بہت لاڈلا تھا وہ پاپا کا۔۔۔ ممی کا بھی کم لاڈلا نہیں تھا۔ اگلی بار پاپا گئے تو اس کی فل ٹریک سوٹ میں سوئمنگ کرتے ہوئے ویڈیو بنا کر لائے۔

"اب ٹھیک ہے؟" پاپا نے مجھ سے پوچھا۔ جواب میں اس بار میں نے منہ بنا بھی لیا اور سوچا بھی لیا۔

پاپا نے میری ویڈیو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن میں مانی ہی نہیں۔ جسے ملنا ہے وہ گھر آجائے۔ آئے دن میں سنتی رہتی تھی کہ فلاں ملک گھومنے گئے' فلاں ملک فلاں میچ دیکھنے گئے۔ ایک ہمارے ہی ملک نہیں آرہے تھے وہ۔ ویسے پاپا نے ایک بار انہیں کرکٹ میچ کے لیے بلایا تھا۔ وہ کینڈی آ بھی رہا تھا لیکن پھر اس کا کوئی اسکول کا میچ آگیا اور وہ ہمارے یہاں کا میچ دیکھنے آ نہیں سکا۔

"کہاں ہمارا پاکستان ٹو انڈیا ہوم گراؤنڈ میچ اور کہاں اس کا اسکول والی بال میچ' اتنی انسلٹ۔" میں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔ پاپا کو بھی غصہ آیا۔

"جو لوگ باہر چلے جاتے ہیں ان میں حب الوطنی ختم ہو جاتی ہے۔" میں نے غصے کو اور ہوا دینی چاہی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔۔۔" پاپا نے میری تائید کی اور فون اٹھا کر انکل کو حب الوطنی یاد دلائی۔ انکل کو حب الوطنی ۔۔۔ یاد آ بھی گئی اور وہ آنٹی کے ساتھ حب الوطنی نبھانے پاکستان آگئے۔ میچ دیکھا' شہر گھوما' شاپنگ کی اور چلے گئے۔ آنٹی مجھے تصویریں دے گئی تھیں' اس ٹیڈی بیئر کی۔ شرم کے مارے میں نے کچھ کو تو فوراً" جلا ہی دیا۔ یہ کیا طریقہ ہے ریچھ کی کھال پہن کر پوز بنانا اور خرگوش بنی لڑکیوں کے پیچھے بھاگنا۔ ویسے پتا نہیں ایسی خرگوشنیاں کس جنگل میں پائی جاتی ہیں جو ایسی چھوٹی چھوٹی فراکیں پہنتی ہیں۔ میری خالہ کی چار سال کی بیٹی بھی اس سے بڑی فراکیں پہنتی ہوگی جو اس کی خرگوشنیوں نے پہنی تھی۔ ننھی منی فراکوں سے ڈھکی خرگوشنیوں کو میں اسکول لے کے گئی' میرا مطلب ایک تصویر کو اور پھر تقریباً" پورے دو ہفتے تک ہم توبہ توبہ کرتے رہے تھے۔ میری کلاس میں وہ تصویر خوب گھومی۔ اب جو لڑکیوں نے ان لڑکیوں کی فراکوں پر جہنم کے دروازے کھولے کہ میں بھی دو ہفتے خوف سے سو نہیں پائی۔ بعد میں ہم دوستوں نے مل کر مار کر کلرز سے ان بے چاریوں کو پورے کپڑے پہنائے' انہیں لباس یافتہ کیا۔

اگلی بار جو تصویریں آئیں وہ پہلے سے زیادہ شرمناک تھیں۔ کوئی میچ تھا اس کا۔ جیک کافی شوخا ہو رہا تھا اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ۔ وہ اب ایک دوسرے کو کھینچ رہے تھے' ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ چلا رہے تھے' اچھل رہے تھے' بڑے بڑے منہ کھول کر ہنس رہے تھے' بلکہ ہنستے ہنستے مر رہے تھے۔ ایک تو عین اس کے سینے پر گرتے ہوئے مر رہی تھی۔ ممی کو دکھایا تو ہنسنے لگیں۔

"بیٹا یہ دیکھو وہ گر گیا ہے۔ میچز میں ایسا ہی ہوتا ہے' وہ میچ جیت گیا ہے تو۔"

"تو جیتنے والے پر لڑکیاں کودتی ہیں؟"

ممی ہنسیں۔۔۔ ''وہ پھدک نہیں رہی' عروہ وہ گرنے سے بچنے کے لیے۔۔۔''

''گرنے سے بچنے کے لیے وہ پھر سے اسی پر گر رہی ہے۔''

''یہ تصویریں مجھے دو۔۔۔ تم اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ بھول جاؤ جیک کو۔''

''یعنی منگنی ٹوٹ گئی۔'' مجھے وہ یاد ہی کب تھا جو اسے بھولتی۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''آپ نے ہی کہا بھول جاؤ جیک کو۔۔۔''

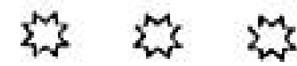
''بھول جاؤ مطلب اس کے بارے میں نہ سوچا کرو۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے جنمی لوگوں کے بارے میں سوچنے کی۔''

''بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو۔'' ممی نے خاص طاقت صرف کی مجھے گھورنے میں۔

مجھے یہ تو ٹھیک سے یاد نہیں کہ مجھے کب معلوم ہوا تھا کہ وہ میرا منگیتر ہے۔ ہاں لیکن مجھے یہ یاد ہے کہ یہ منگیتر مجھے کب زہر لگنا شروع ہوا تھا۔ تب جب اس نے فون پر میری پوئمز سننی شروع کی تھیں۔ اسی وقت سے میں نے اسے سخت ناپسند کرنا شروع کر دیا تھا۔ ممی کچھ بھی کہتی رہیں لیکن ایک بات تو صاف ہے کہ۔۔۔

''وہ میرا منگیتر نہیں ہے۔۔۔ بس۔۔۔''



کچھ بھی کہیں لیکن انسان چاہ کر بھی اپنا بچپن تفصیل کے ساتھ یاد نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر اسے یہ یاد نہیں آسکتا کہ فلاں وقت پر اس کے ساتھ فلاں زیادتی کیوں کی گئی تھی۔ مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ جس چھوٹی سی لڑکی کے مسلسل رونے سے تنگ آکر میں نے کھینچ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ مار دیا تھا بدلے میں وہ پوری کی پوری ہی میرے منہ آلگے گی۔

ہونہہ۔۔۔ پہلے پتا ہوتا تو شاید میں اس کا گلا دبا دیتا۔ ویسے بھی ایک چار سال کے بچے کو دنیا کی کوئی عدالت سزا نہیں دے سکتی۔ اپنا سارا بچپن میں اس کی تصویریں دیکھتا رہا کیونکہ مجھے مجبور کیا جاتا تھا کہ میں اسے دیکھوں۔ کبھی کبھی ماما میری اس سے فون پر بات کروانے کی بھی کوشش کرتیں۔ وہ مجھ سے کہتیں۔

''سنو' عروہ کتنی کیوٹ پوئم سنا رہی ہے۔''

''پوئم؟ ریلی ماما۔۔۔'' میرا منہ خود بخود بگڑ جاتا' کیونکہ پوئم تو مجھے کبھی سنائی نہیں دی' البتہ پھس پھس کی آوازیں بہت آتی تھیں۔ ماما تو مسلسل ہنس رہی ہوتیں اور میں اپنے نتھنے پھلا رہا ہوتا تھا کہ کیا مصیبت ہے کہ مجھے اس کی پھس پھس سننے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اسی پھس پھس کی وجہ سے میری ناک کافی پھول گئی تھی اور میرے اسکول کے لڑکوں نے مجھے عجیب و غریب ناموں سے بلانا شروع کر دیا تھا اور وہ بھی کہ باز ہی نہیں آرہی تھی۔ آئے دن اس نے کسی نہ کسی کوے' ہاتھی' چڑیا' طوطے کی نظم سیکھی ہوئی تھی۔

''ماما کیا یہ پورے جنگل کی پوئمز مجھے سنائے گی؟''

''اتنی ہی پیاری بچی ہے تو پھس پھس کیوں کرتی ہے؟''

''شٹ اپ! کتنے بدذوق ہو تم؟''

''شٹ اپ ٹو ممی۔۔۔ بہت بدذوق ہوں میں۔ پلیز مجھے دوبارہ فون مت پکڑایئے گا۔'' میں نے ماما سے کہا جو ظاہر ہے ماما نے نہیں سنا اور اگلی بار پھر سے مجھے فون پکڑا دیا۔ اس بار وہ ٹرین پر پوئم سنا رہی تھی۔ اگلی پوئم یقیناً ''ٹرین کے مسافروں پر آنے والی تھی' اس سے اگلی ٹرین اسٹیشن پر اور اس سے اگلی ٹرین ڈرائیور پر اور پھر اور پھر۔۔۔ پھر شاید یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

''آنٹی! کیسی لگی آپ کو میری پوئم؟'' شاید وہ سمجھی کہ ماما سن رہی ہیں۔ ''بہت بری' انتہائی بکواس اور تمہارے منہ کی بدبو یہاں کینیڈا تک آرہی ہے' کون سا پیسٹ یوز کرتی ہو تم؟''

''پتا نہیں! ممی برش پر لگا کر دیتی ہیں۔'' اس کی رندھی ہوئی آواز آئی۔ اب کیوٹ لگ رہی تھی وہ۔

''برش پر کیا نیل پالش لگاتی ہو۔۔۔ ڈفر۔۔۔''

''نہیں! توتھ پالش۔'' اس دن میری معلومات میں اضافہ ہوا کہ ٹوتھ پیسٹ کو ٹوتھ پالش بھی کہا جاسکتا ہے۔ آخر یہ بات مجھے کیوں نہیں سوجھی۔ اس سے سوسائٹی میں تھوڑا چینج بھی آجاتا اور ڈکشنری کو ایک نیا لفظ بھی مل جاتا۔

''جب تم پالش لگاتی ہو تو کیا دانتوں کو تاول سے ڈرائے کرتی ہو؟''

''نہیں! می تو کہتی ہیں دانت خود بخود ڈرائے ہوجاتے ہیں۔''

''خود بخود ڈرائے نہیں ہوتے۔ اچھا تمہاری ماما کے پاس ہیئر ڈرائیر ہے؟''

''ہاں ہے!''

''ابھی جاؤ دانت پالش کرو اور پلگ لگاؤ اور ڈرائیر بٹن آن کردو۔ پورا منہ کھول کر ٹھیک سے ڈرائے کرنا' پھر پوئم سنانا مجھے۔''

پتا نہیں اس دن اس کے دانت ٹھیک سے ڈرائے ہوئے یا نہیں لیکن پھر دوبارہ ماما نے مجھے فون پکڑا کر یہ نہیں کہا کہ ''سنو سنو! کتنی کیوٹ لگ رہی ہے۔'' مجھے لڑکیاں صرف اس وقت ہی بار کیوٹ لگتی ہے۔ جب وہ حلق پھاڑ کر روتی ہیں۔ اور کیوں روتی ہیں کیونکہ ہم لڑکے گھونسے مار کر ان کا بھرکس نکال دیتے ہیں۔

ہم دو دوستوں نے مل کر ایسے کئی گھونسے ان ''پاپاز ڈولز'' کو اس وقت تک مارے جب تک مجھے ایک ہفتے کے لیے کمرے میں بند نہیں کردیا گیا۔ میرے مام ڈیڈ کو میرا یہ مشغلہ پسند نہیں آیا تھا۔ مجھے اعتراض تھا کہ مجھے ان کی پسند ناپسند کی پروا نہیں لیکن ایشو صرف ایک تھا' میں ابھی تک ان ہی کے گھر سے کھاتا تھا اور اتفاق سے میرا کمرہ بھی ان ہی کے گھر میں تھا اور بدقسمتی سے میرے سارے کپڑے' جوتے ڈیڈ کے پیسوں سے آتے تھے۔ اگر یہ بدقسمتی ــــ ہم بچوں کے نصیب میں نہ لکھی ہوتی تو ہم ان ''پاپاز ڈولز'' کا صفایا کرکے دنیا کو جنت بنادیں۔

فون پر نظم کے ساتھ ساتھ اس کی تصویریں بھی گاہے بگاہے لہرا آتی رہتی تھیں۔ کیسی عجیب بچی تھی' جیسے روبوٹ' بھی درخت کے پاس کھڑی ہے' بھی کرسی پر بیٹھی ہے' کبھی گڑیا ہاتھ میں لیے اپنے بیڈ پر نیم دراز ہے' زیادہ ہوا تو سائیکل چلا رہی ہے۔

''ماما از شی الائیو؟''

''تو تمہیں یہ مردہ لگتی ہے؟''

''اس کی ہر تصویر کسی مجسمے کی طرح ہے۔ پوری پچاس تصویریں اس درخت کے پاس دیکھ چکا ہوں۔ آخر کیا خاص ہے ـــ اس درخت میں' کہاں پایا جاتا ہے یہ درخت؟''

''وہ لڑکی ہے' تمہاری طرح اچھل کود کر تصویر نہیں بنواسکتی۔ یہ دیکھو کتنی کیوٹ لگ رہی ہے۔''

''اوہ.... آہ....'' میں کتنی دیر تک ماما کو دیکھتا رہا کہ کیا میری ماما کے دماغ کے ساتھ کوئی مسئلہ شروع ہوچکا ہے۔

''اسے اور کسے؟'' ماما نے ہاتھ میں پکڑی تصویر کو میرے سامنے لہرایا۔ اس تصویر میں وہ سرخ دوپٹا اوڑھے اپنی ماما کی بڑی سی جیولری پہنے ہوئے تھی۔ سرخ لپ اسٹک سے اس نے اپنے ہونٹوں ـــــ کو کانوں تک شفٹ کرلیا تھا اور آنکھوں کو قلوپطرہ کی طرح کھینچ کر لمبا کرلیا تھا۔

''ماما یہ کیوٹ نہیں بھوت ہے۔'' ٹھیک ہے کہ میرا کمرہ ماما' پاپا کے گھر میں ہے لیکن میں اتنا بڑا سچ چھپا نہیں سکا۔

ماما نے ایک زوردار پنچ میری کمر پر رسید کیا۔ یہ پنچ میں نے ہی انہیں سکھایا تھا کہ اگر ان کا سامنا کسی چور اُچکے سے ہوجائے تو انہیں کیا کرنا چاہیے۔ مجھے نہیں معلوم تھا ماما نے میری دی ہوئی ٹریننگ اتنی سنجیدگی سے سیکھی ہے اور اس کے بروقت استعمال سے بھی واقف ہیں۔ اس کیوٹ تصویر کو میں اسکول لے گیا اور رائن کو دکھائی۔

''یہ لو دیکھو! دنیا کے قدیم قبیلوں میں سے ایک قبیلے کے باشندے کا تصویری نمونہ.... نادر نہیں بھی ہے تو.... ''نایاب'' ضرور ہے۔''

''کہاں سے ملی تمہیں یہ؟''

"پاپا کو ٹریول کا بہت شوق ہے نا۔۔۔ افریقہ گئے تو لے لی ہوگی کہیں سے۔"

"تمہارے پاپا کو دیکھ بھال کر ٹریول کرنا چاہیے۔ ایسے علاقوں سے نہیں گزرنا چاہیے جہاں ایسے لوگ رہتے ہوں۔" اس نے آنکھ مار کر کہا۔

رائن کی بات میں مجھے پوائنٹ نظر آیا اور میں نے سوچا کہ مجھے پاپا کو بٹھا کر سنجیدگی سے سمجھانا چاہیے کہ انہیں ایسے علاقے کا سفر نہیں کرنا چاہیے جہاں "وہ" رہتی ہے۔ لیکن مجھ سے پہلے ماما' پاپا نے مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ ایک خطرناک علامت تھی۔ وہ دو موقعوں پر مجھے خاص ایسے اپنے پاس بٹھاتے' جب اسکول سے میری کوئی شکایت آئی ہوتی یا انہیں معلوم ہو جاتا کہ میں ان کی کار میں اپنے دوستوں کو ٹھونسا کر اسے دوڑاتا رہا ہوں۔ ساتھ ہی مجھے رائن یاد آیا جو مجھے بتا چکا تھا کہ کچھ دن پہلے اس کے والدین نے بھی اسے ایسے ہی اپنے پاس بٹھایا تھا اور انہوں نے تفصیل سے اس سے پوچھا کہ وہ ڈرگ میں دلچسپی تو نہیں لے رہا۔ پھر وہ باتوں باتوں میں اس سے پوچھنے لگے کہ اسے انسانی خون کو پینے کی پیاس تو محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے مام ڈیڈ تو ویمپائر سیریز کے دیوانے تھے۔ اس لیے وہ یہ پوچھ سکتے تھے لیکن میرے والدین تو اینمل پلانٹ کے شوقین تھے تو کیا میرا سوال سیکشن جانوروں کے متعلق ہوگا۔

"تمہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔" پاپا نے کہا۔

"مجھ میں رینگنے کی صلاحیت نہیں ہے' نہ ہی میں برفانی طوفان میں بھوسے میں چھپ کر چوہا کھانا چاہتا ہوں' آئی ایم نارمل پاپا۔"

"تم اپنے دوستوں کی سنائی کہانیوں سے باہر آجاؤ تھوڑی دیر کے لیے۔" پاپا کا ذہنی گھونسا میری کمر پر پڑا۔۔۔ میں نے کراہ کر ماما کو دیکھا کہ انہوں نے پاپا کو بھی سکھا دیا۔ بس یہی نقصان ہوتا ہے گھر والوں کو ٹریننگ دینے کا۔ یہ فری ٹیوشن مجھے فوری بند کرنی ہوگی۔

"ریلیکس۔۔۔" ماما نے پاپا سے کہا۔ میں نے کمرے فارغ ہو کر گردن گھما کر دونوں کو باری باری دیکھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔

"تمہارے چچا کی بیٹی عروہ۔" کہتے ہوئے پاپا نے اپنا کان کھجانا شروع کر دیا' آخری مرتبہ یہ کان ان کے باس کے مرنے پر کھجایا گیا تھا۔

"اوہ! اٹس واز کیوٹ۔۔۔" مرنے والوں کو کیوٹ کہہ دینے میں کوئی گناہ نہیں۔ اب مجھے سمجھ میں آیا ماما' پاپا اتنے سنجیدہ کیوں ہیں۔ وہ ہاتھی گھوڑے کی نظم سنانے والی گزر گئی ہے۔

"واز؟" پاپا ایک دم سے اچھلے۔

"آپ مجھے یہی نہیں بتانے والے تھے کہ وہ مر گئی ہے؟" ماما نے فورا" اپنا ہاتھ پاپا کے ہاتھ پر رکھا اور پرسکون رہو' پرسکون رہو کے انداز میں ہاتھ تھپکنا شروع کر دیا۔

"تمہیں یہی کیوں لگا کہ وہ مر گئی ہے۔" مجھے نظر آرہا تھا کہ اب پہلے سے زیادہ ہیوی "میچ جیٹ" میری کر کے رن وے پر اترنے ہی والا ہے۔ پر کیوں؟ میں نے ایسا کیا کہہ دیا آخر؟

"آپ مجھے میرے روم سے اٹھا کر لائے ہیں۔ اینمل پلانٹ اس وقت ٹی وی پر بند ہے' جسے میں نے اپنی اب تک کی لائف میں کم ہی بند دیکھا ہے۔ مام نے کھانا جلدی بنا لیا ہے' جو کہ وہ نہیں بناتیں' جب تک آپ پانچ سو بار چلا کر یہ نہ کہہ دیں کہ۔۔۔ مجھے بھوک لگی ہے' خدا کے لیے کھانا لگا دو۔" اور آپ دونوں میرے دائیں بائیں بیٹھے ہیں اور آپ اپنا کان بھی تو کھجا رہے ہیں۔ آپ کو یہ لگتا ہے کہ شاید وہ میرے بچپن کی دوست ہے' اس لیے مجھے اتنے اہتمام سے بتا رہے ہیں۔ لیکن میں کلیئر کردوں کہ ایسا نہیں ہے' اس کی آواز اچھی ہو سکتی تھی اگر وہ زیادہ تر چپ رہا کرتی۔ اس کی تصویریں بھی اچھی ہو سکتی تھیں جن میں وہ کیوٹ لگ سکتی تھی لیکن اینی وے۔۔۔" پاپا نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ لیا اور اینمل پلانٹ آن کر لیا۔

"دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔" وہ پوری قوت سے چلائے۔

"اوہ۔۔۔ لیکن آخر ایسا کیا ہوا ہے؟"

"تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" ماما نے مجھے میرے کمرے میں بھیج دیا۔ ان دونوں نے مجھ سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ کون سی بات؟ میں نے تھوڑی دیر تک سوچا' پھر اس بات کو "دفع" کر کے میں پنچنگ بیگ پر پنچ مارنے لگا' لیکن کچھ ہی عرصے بعد مجھے یہ پنچ اپنے منہ پر مارنے پڑے' اس بار ماما' پاپا میرے کمرے میں آئے۔ دونوں ایک ساتھ' ماما مسکرا رہی تھیں۔ وہ مسکراتے ہوئے اچھی لگتی ہیں' ظاہر ہے وہ میری ماں ہیں' اس لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ایسے تب مسکراتی ہیں جب انہوں نے پاپا سے کوئی بھاری رقم نکلوانی ہو لیکن میرے پاس ایسا کیا ہے جسے نکلوانے کے لیے وہ ایسے مسکرا رہی ہیں اور پاپا وہ پھر سے بار بار اپنا کان کھجا رہے ہیں۔ اب آخری بار یہ کان تب کھجایا گیا تھا جب برف کا طوفان آیا تھا اور اتفاق سے ہم تینوں روڈ پر کار میں بند طوفان کے گزر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے؟" پاپا نے پوچھا۔

میں حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی سیاسی سیلبرٹی ہوں اور کسی "آفت شدگان" کے اسپتال بیڈ پر جا کر پوچھ رہے ہوں اور کیا ہو رہا ہے؟ کیسے ہو؟ اوہ ایک ٹانگ کٹ گئی؟ اوہ! دوسری بھی کٹنے والی ہے' اینی وے گیٹ ویل سون۔"

"میں کہہ چکا ہوں میں ڈرگز نہیں لیتا۔ مجھے میری کار لے دیں' میں آپ کی کار یوز نہیں کروں گا۔"

"ریلیکس۔" ماما نے کہا' کسے کہا یہ معلوم کرنا تھا' کیونکہ ماما اکثر خطرناک باتوں سے پہلے ریلیکس کہتی ہیں۔ میرے دماغ کے اندر چھوٹا سا الارم بجا۔

"تمہارے چچا کی بیٹی عروہ سے ہم تمہاری منگنی کر چکے ہیں۔" پاپا نے فوراً" کہا جیسے ایک بالٹی پانی غٹاغٹ پی گئے۔ معلوم ہو گیا' وہ ریلیکس مجھے کہا گیا تھا۔

"منگنی؟" میں نے بیگ کو اتنی زور سے پنچ مارا کہ وہ پاپا کے خارش زدہ کان کو چھو کر واپس آیا۔

"جب تم چار سال کے تھے تب سے۔"

"کیا میں نے اس منگنی کی تقریب میں شرکت کی تھی؟"

"ہاں۔ ظاہر ہے۔"

"واؤ۔ گڈ' یہ کوئی رسم ہے وہاں۔"

"وہاں؟ پاکستان میں؟ ہاں رسم ہی سمجھ لو۔"

"آئی لائیک اٹ۔ جب میں شادی کروں گا تو آپ عروہ کو بھی بلائیے گا۔ میں اپنی دلہن کو دکھانا چاہوں گا کہ میری منگنی کی رسم اس کے ساتھ ہوئی تھی۔"

"جس سے منگنی ہوتی ہے اسی سے شادی ہوتی ہے۔"

"لیکن منگنی تو چار سال کی عمر میں ہوئی تھی' اب میں چار سال کا نہیں ہوں' اب شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"جب تم چوبیس سال کے ہو جاؤ گے یا اٹھائیس کے یا بتیس کے۔"

"مجھے تین شادیاں کرنی ہوں گی۔ چوبیس' اٹھائیس' بتیس۔"

"بند کرو یہ مذاق۔"

"یہ مذاق میں نے تو شروع نہیں کیا پاپا۔"

"عروہ تمہاری منگیتر ہے' تمہاری شادی اسی سے ہو گی' بس بات ختم۔"

"اوکے۔ بات ختم۔" وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ اسی لیے سال میں دو بار اس کی تصویروں کا البم آتا تھا اور اسی لیے وہ سارے جنگل کی نظمیں مجھے سناتی تھی اور ماما مجھے اس کی ہر چھوٹی بڑی بات بتایا کرتی تھیں۔ اسی لیے انکل آ کر میری ویڈیو بنا کر لے جاتے تھے اور اسی لیے پاپا مجھے ہر بار اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ اینی وے پاپا خود ہی بات ختم کر چکے ہیں۔ اب کسے پروا ہے۔

"شی از ناٹ مائی فیانسی۔"

وہ پہلی بار پاکستان آیا تھا۔ اس کا آنا اچانک ہوا تھا۔ دو دن پہلے ممی کو معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے تعلیمی ٹور پر جن ملکوں پر نکلے ہیں ان میں سے ایک پاکستان بھی ہے۔ اس کے ۔۔۔ کچھ دوست بھی ساتھ تھے۔ ممی

کافی پرجوش تھیں' اس کی آمد کا سن کر۔۔۔ مجھے کافی لمبی چوڑی ہدایات دی گئی تھیں جنہیں میں نے سنا تو تھا لیکن یاد نہیں رکھا۔ اس دن میری فرینڈ رائنا میرے ساتھ تھی۔ اسے شام تک میرے ساتھ رہنا تھا۔ ہمیں ٹیسٹ کے لیے مل کر اسٹڈی کرنی تھی۔ پاپا اسے لینے ایئرپورٹ گئے تھے۔ ویسے وہ چار افراد تھے۔ چار لڑکے' لیکن وہ ایک گاڑی میں پورے نہیں آرہے تھے۔ ان میں سے ایک اتنا موٹا تھا کہ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر بمشکل ـــــ بیٹھا تھا' اس لیے ان میں سے دو کو آگے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنا پڑا تھا۔

"یہ ہے تمہارا کزن؟" جیسے جیسے وہ کار سے نکلتے جارہے تھے رائنا پوچھتی جارہی تھی۔

"پتا نہیں!" مجھے تو خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون سا والا وہی ہے۔ میں نے اس کزن کے اپنے منگیتر ہونے کی بات ابھی تک کسی کو نہیں بتائی تھی۔ بھلا یہ کوئی بات تھی بتانے والی۔

"مجھے یہ کچھ کچھ پاکستانی لگ رہا ہے۔" رائنا نے کار میں سے نکلنے والے آخری لڑکے کو دیکھ کر کہا جو موٹے کے ساتھ پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور کافی پچکا ہوا لگ رہا تھا۔ رائنا منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ کیوں ہنسنے لگی کیونکہ اس کچھ کچھ پاکستانی کے بال پورے پورے پاکستانی لڑکیوں کی طرح کافی لمبے تھے۔ گھنے تھے' سیاہ تھے اور ہیئر بینڈ میں قید پیچھے پونی صورت جھول رہے تھے۔ وہ ماماز بوائے لگ رہا تھا نہ پاپاز ڈیوڈ' وہ گرلی فیوز میرا مطلب "گرلی کنفیوز" لگ رہا تھا۔ میں اس کی تصویریں دیکھتی رہی تھی' پھر بھی مجھے کچھ وقت لگا اسے پہچاننے میں۔ ہاں یہ وہی تھی یعنی تھا۔۔۔ جیک۔

"ایسے لڑکوں کی بہنوں کے بہت مزے ہوتے ہیں۔ ان کی ڈریسنگ ٹیبل سے ان کی بہنیں بھی استفادہ کرسکتی ہیں۔" رائنا کھی کھی کرنے لگی۔

"تم بھی تو اس کی بہن ہی لگیں نہ۔ ایسا کرو اسے رہنے کے لیے اپنا کمرہ دے دو' کیا یاد کرے گا بے چارا کیسا پونی ٹیلز اور ہیئر بینڈ سے بھرا ہوا ڈریسنگ ٹیبل ملا تھا میزبانوں کے گھر' ہوسکتا ہے یہ میک اپ بھی کرتا ہو' تم اپنا میک اپ بھی سجا کر رکھ دینا۔" اپنی شرمندگی کو چھپاتے ہوئے مجھے نیچے جانا پڑا اس سے ملنے کے لیے۔

"ہائے عروہ! آئم سرپرائزڈ۔۔۔ تم تو کیوٹ نکلیں۔" اس نے رائنا کی طرف مسکرا کر کہا۔

"میں رائنا ہوں۔" رائنا ہنسنے لگی جیسے اس نے اس کے ہاتھوں میں چوڑیاں بھی دریافت کرلی تھیں۔

"میں عروہ ہوں۔" میرا منہ بن گیا اور اس کا بھی بنا رہے میری بلا سے۔

"یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔" اگلے دن وہ میرے کمرے میں آیا اور ایک ڈبہ میرے آگے کیا۔

"شکریہ!" میں نے ڈبے کو لاپروائی سے ٹیبل پر اچھال دیا۔

"اسے کھولو' دیکھو اور مجھے بتاؤ تمہیں کیسا لگا؟" اس نے ایسی آواز میں کہا جو میں سننے کی عادی نہیں تھی۔ وہ ابھی ابھی شاور لے کر نکلا تھا اور اس کے لمبے گھنے بالوں کی لٹوں سے پانی ٹپ ٹپ ٹپک رہا تھا۔

"تمہیں ڈرائیر چاہیے؟" میں نے اس کے گیلے بالوں پر طنز کیا۔

"میرے پاس ڈرائیر ہے۔۔۔ میں زیادہ یوز نہیں کرتا بال خراب ہوجاتے ہیں۔"

"اوہ! تمہیں تو کافی کچھ معلوم ہے۔ دیکھو ذرا تم نے تو اپنی شرٹ کے ساتھ میچنگ ہیئر بینڈ لگایا ہے۔ اچھا ہوتا اگر تم بالوں کے دو حصے کرکے ان پر پنیں بھی لگالیتے۔ فیشن میں ان ہے۔"

وہ چلتا ہوا میری ڈریسنگ ٹیبل تک گیا اور میرا ہیئر برش پکڑ کر بالوں کے درمیان میں سے دو حصے کیے اور میری گلابی بٹر فلائی پنیں جن کے پر ہمہ وقت "اڑان" بھرنے لگتے تھے کو اٹھا کر دونوں طرف سامنے لگالیا۔

"اب ٹھیک ہے؟" وہ مسکرا کر پوچھ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ وارڈروب کھول کر اسے اپنا دوپٹا بھی دے دوں' بلکہ دے کیا دوں اس کے سر پر اوڑھا دوں۔ پھر پاپا کے پاس لے کر جاؤں کہ یہ لیں یہ آگئی آپ کی بہو۔ اس کا

گھونگھٹ اٹھائیں اور دیں اسے سلامی۔
"کھولو اسے۔۔۔" ہٹو فلائز اس کے گیلے بالوں میں کھڑی کھڑی اڑ رہی تھیں۔
میں نے اسے کھولا۔ وہ ایک تصویروں کا البم تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں۔ تصویریں سب ہی اچھی تھیں لیکن ان میں کچھ عجیب تھا۔ کیا عجیب تھا' مجھے غور کرنے پر بھی نظر نہیں آیا۔
"یہ ایک نایاب البم کی کاپی ہے جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ تم بھی مجھے اپنی نایاب تصویریں بھیجتی تھیں نا۔ تمہاری تصویروں کے مقابلے میں تو یہ تصویریں کچھ بھی نہیں ہیں' لیکن پھر بھی تھوڑا بہت مقابلہ کر ہی رہی ہیں تمہاری تصویروں کے ساتھ۔" وہ میری تعریف کر رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی لیکن پھر بھی بات کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ ایک کے بعد ایک تصویر دیکھنے کے بعد میرے احساسات عجیب ہوتے گئے۔ ایک بوڑھے کی تابوت میں لیٹے ہوئے کی تصویر نے تو میرے ہاتھ کپکپا دیے' بوڑھا خوف ناک حد تک موت کے قریب لگ رہا تھا۔
"یہ سب کیا ہے؟"
"ہاؤ ڈو فریو آر۔۔۔ یہ مردہ لوگوں کا زندہ لوگوں کے ساتھ فوٹو سیشن ہے۔" البم میرے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ میرے لیے ایک ایسا البم لایا تھا اور اس نے میری تصویروں کو "مردہ" سے تشبیہہ دی تھی۔ اس نے جھک کر البم اٹھایا تو اس کے لمبے بال فرش کو چھونے لگے۔
"تم ایسی نایاب چیز کے لائق ہی نہیں ہو۔"
"ایسا کیا نایاب ہے اس میں؟"
"جس لڑکی نے اپنا سارا بچپن ایک درخت کے نیچے گزار دیا ہو وہ یہ کبھی نہیں جان سکتی کہ کیا نایاب ہے اس میں۔"
"درخت کے نیچے بچپن گزارنا کم سے کم چھوٹے کپڑے پہننے والوں کے ساتھ گزارنے سے بہتر ہے۔"
"کس نے پہنے چھوٹے کپڑے؟" اگر وہ ذہن میں سوچ رہا تھا تو بلند آواز سے سوچ رہا تھا اور اگر وہ بول رہا تھا تو اپنا پول آپ کھول رہا تھا۔
"تمہاری فرینڈز نے۔۔۔" وہ چونکا کہ میں نے اس کا ذہن کیسے پڑھ لیا۔ جبکہ اپنے ذہن کو وہ خود ہی بلند آواز سے پڑھ رہا تھا۔
"ریلیکس جیک۔" اس نے خود کے لیے خود کے کانوں میں سرگوشی کی جو کے سن لی گئی۔
"ہونہہ۔۔۔ جیک۔۔۔ جیکی کہو خود کو۔۔۔ آنٹی کو تمہارا نام ہیرو پر نہیں' ہیروئن پر رکھنا چاہیے۔" وہ بغور میری شکل دیکھنے لگا' ایسے ہی بغور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے چہرے کو میرے چہرے کی طرف جھکا رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی انگلی اٹھائی اور میری ناک تک لایا اور اسے ناک کے قریب رکھ دیا' پھر یک دم اس ایک انگلی کے ساتھ اس کی باقی چاروں انگلیاں بھی آملیں اور وہ پانچوں انگلیاں متحد ہو کر میرے ناک پر پڑیں اور میں وہیں فرش پر ڈھیر ہو گئی۔
"یہ میری اس کے ساتھ آخری ملاقات ہے۔۔۔ بس میں نے کہہ دیا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"کیا عمر ہے تمہاری؟"
"عمر؟"
"ہاں عمر؟ ایج؟ کتنے سال کی ہو تم؟"
"تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس کی بھنویں آسمان سے باتیں کرنے کی تیاری کرنے لگیں۔ "کیونکہ تمہیں دیکھ کر یہ تو لگتا ہے کہ تم بچی نہیں ہو لیکن یہ یقین نہیں ہوتا کہ بڑی بھی ہو رہی ہو۔"
"تمہیں بھی دیکھ کر یہ تو لگتا ہے کہ تم بڑے ہو رہے ہو لیکن یہ یقین نہیں ہوتا کہ بڑے ہو رہے ہو یا بڑی ہو رہی ہو۔" بے اختیار میرے ہونٹ سکڑ گئے۔ اوہ یہ کیا۔۔۔ میں تو اپنا کان کھجا رہا تھا۔۔۔ کیا مصیبت ہے یہ موروثی بیماریاں بھی نا۔۔۔
"کانوں میں بالی' ہاتھوں میں کنگن' ماتھے پر جھومر کب پہنو گے؟" اس نے سر کو ترچھا کر کے پوچھا۔
اف۔۔۔ مجھے اپنا کان کاٹ ڈالنا چاہیے۔۔۔ نہیں اس کی

زبان۔۔۔

یہ میری اس سے پہلی ملاقات، پہلی بات چیت تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہو سکتی تھی اگر اس کی زبان اتنی نہ چلتی۔ میں بھی اس سے اچھی طرح پیش آسکتا تھا اگر وہ مجھے "جیکی یا کینڈی" نہ کہتی۔ ویسے میں نے کوئی کوشش نہیں کی کہ وہ مجھے اچھی لگے۔ میں نے یہ کوشش بھی نہیں کی کہ میں اسے اچھا لگوں۔ مجھے وہ بوجھ لگتی تھی جسے اس کے پیدا ہوتے ہی میرے سر پر لاد دیا گیا۔ بچپن کی منگنی کم سے کم میرے لیے تو کسی مصیبت سے کم نہیں ہے۔ خیر۔۔۔ تو جب میری انگلیاں اتحادی بن کر عین اس کی ناک پر حملہ آور ہوئیں تو وہ فوراً" سے پہلے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ اچھی اداکارہ تھی وہ لیکن غلط جگہ پر اپنی پرفارمنس دے رہی تھی کیونکہ نہ اس کا کمرہ اسٹیج تھا اور نہ میں تماشائی جو اس کے لیے تالیاں بجاتا، حتیٰ کہ اس کے گھر والوں نے بھی اس کے ناک آؤٹ ہونے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا، کیونکہ بچے تو آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں، اس لیے میرا پنچ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں بنا۔ ویسے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ صرف ایک پنچ کھا کر دو دن بستر پر ڈھیر رہی۔ وہ اتنی بیمار تھی کہ بستر سے ہل نہیں سکتی تھی۔ اچھا ہوتا اگر وہ ایک دن بیمار رہتی اور دوسرے دن فوت ہو جاتی۔ لیکن اس کا فوت ہونے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ مجھے اس کے روم میں جانا پڑا۔ البم میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کی ہم عمر ایک لڑکی کی تصویر اسے دکھائی جو مرچکی تھی اور اپنی زندہ سہیلیوں کے ساتھ ایسے کھڑی تھی جیسے وہ خود بھی زندہ ہو۔

"تم اپنی فرینڈز کو بلا کر ایسی ہی ایک تصویر لے لو۔ اس سے پہلے کہ تم مرجاؤ اور ہمیں یہ کہنا پڑے۔ زندہ ہوتے تو تم نے کوئی یادگار تصویر لی نہیں، کم سے کم تمہارے بستر مرگ کی تصویر یادگار ہونی چاہیے۔"

"ممی۔۔۔" وہ زور سے چلائی۔

"چلاؤ مت۔۔۔ ورنہ تمہاری شکل اس قابل بھی نہیں رہے گی کہ مرنے کے بعد ہی تمہاری تصویر لی جاسکے۔"

"ممی ی ی ی ی۔۔۔" وہ پھر زور سے چلائی، مجبوراً" مجھے اس کے منہ پر تکیہ رکھنا پڑا۔ میں نے تو مذاق میں تکیہ رکھا تھا، میرا اسے مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اتفاق سے مرجاتی تو الگ بات تھی بلکہ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی تھی لیکن اس نے مذاق کے بغیر میرے بال پکڑ لیے۔ دونوں مٹھیوں میں۔۔۔ مجھے واپس جا کر اسٹیج پلے میں حصہ لینا تھا اور اس کے لیے لمبے بال چاہیے تھے نوچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے بال نہیں۔

"ریلیکس۔۔۔" میں بڑبڑایا اور اس سے پہلے کہ میں انگلی کو اس کی ناک تک لے جاتا اور باقی انگلیوں کو متحد کرتا، میرا دوست مجھے ڈھونڈتا ہوا کمرے میں آگیا اور ریسلنگ کا ایسا شاندار مظاہرہ دیکھ کر جہاں کھڑا تھا وہیں جامد ہو گیا۔

"ڈبلیو ڈبلیو جیک۔۔۔ واہ۔۔۔" رائن جوش سے چلایا۔ رائن کے جوش نے اس میں اور جوش بھر دیا اور اس نے میرے بالوں کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور آسمان سے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر میری آنکھوں کے آگے آکر کودنے پھاندنے لگے۔ میں نے چیخ ماری، رائن نے کمرے کی طرف دوڑ لگائی اور واپسی میں وہ اپنے ساتھ کیمرہ لیتا آیا اور ڈبلیو ڈبلیو جیک کی فلم بندی کرنے لگا۔

"بند کرو کیمرہ رائن۔۔۔" جیسے ہی میں چلایا عروہ نے اور شدت سے میرے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

"تم مووی بناؤ رائن۔۔۔" وہ بھی چلائی اور اس کی میرے بال کھینچنے کے انداز میں شدت آگئی۔ جیسے ماما اکثر پاپا کی کسی بہت ہی گندی شرٹ کو غصے میں ہاتھ سے مل مل کر دھوتی ہیں، ایسے ہی وہ میرے سر کو بالوں سے پکڑ کر مل مل کر رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔

"آنٹی۔۔۔" اب مجھے چلانا پڑا۔ "آنٹی ی ی ی ی۔۔۔" تکیہ اس کے منہ پر رہا اور میرے بال اس کے ہاتھ میں۔ بعد میں تکیہ فرش پر پڑا اور اس کے ہاتھوں سے میرے سر کے جنگل کی کٹائی ہوتی رہی۔

"یہ کیا کیا تم نے عروہ۔۔۔" آنٹی نے میرے بالوں کو جڑ سمیت عروہ کی مٹھیوں سے برآمد کیا۔ میں اپنا سر

پکڑ کر بیٹھتا چلا گیا اور ایسے کراہنے لگا جیسے مشین گن کے سارے راؤنڈ میرے سر پر خالی کر دیے گئے ہوں۔

"اوہ جیک۔۔۔ ادھر آؤ بیٹا۔۔۔ معاف کر دو عروہ کو۔۔۔ یہ ایسے ہی پاگل ہو جاتی ہے غصے میں۔۔۔" اس نے تکیہ میرے منہ پر رکھ دیا تھا' یہ مجھے مار رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر عروہ بھی کراہنے لگی' بلکہ باقاعدہ رونے لگی۔

"آنٹی بدستور میرا سر سہلاتی رہیں۔"

"تم نے اسے مار ہی کیوں نہیں دیا بیٹا۔" آنٹی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔ "پتا نہیں آنٹی آفر کر رہی تھیں کہ افسوس۔۔۔" لیکن مجھے افسوس ہوا۔ اچھا بھلا اسے قتل کرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ مقتول ہوئی تھی یا نہیں لیکن میں ضرور ذلیل ہونے والا تھا۔ "ڈبلیو ڈبلیو جیک" مووی کے ہاتھوں۔ اب مجھے اس کیمرے کی فکر تھی جو رائن نے جلدی سے بھاگ کر سوٹ کیس میں لاک کر دیا تھا۔ سوٹ کیس کا وہ لاک کینیڈا جا کر کھلا۔ نارتھ کیرولینا کے اگلے ٹرپ کی شرط پر جو مجھے افورڈ کرنا تھا اور ہاں مجھے یہ افورڈ کرنا ہی تھا' ورنہ پھر مجھے دوستوں کے ہاتھوں ہونے والی "ذلالت" کو تاعمر افورڈ کرتے رہنا تھا۔ یہ میری اس کے ساتھ آخری ملاقات تھی۔۔۔ یہ میرا خیال تھا۔



اگر ٹی وی پر اداکاری کرنے کا موقع سب کو مل جایا کرے تو دنیا بھر کے اماں' ابا اس موقع سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ایسی جان توڑ اداکاری کرتے ہیں کہ اولاد جیوری بنی انہیں ایوارڈ دیتے دیتے تھک جاتی ہے۔ مجھے پاپا کو ابھی ایک ایوارڈ دینا پڑا۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیونکہ ان کی کار کا ایکسیڈنٹ ہو گیا' کار ساری کی ساری تباہ ہو گئی تھی۔ یہاں تک تو سب حقیقت ہے۔ ایوارڈ تب آیا جب پاپا نے اس کار کی تصویر تو بھیج دی کینیڈا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا' کار تباہ ہو گئی ہے لیکن اپنی سلامتی کی نہیں بھیجی کہ میں زندہ سلامت ٹھیک ٹھاک ہوں اور پھر فون پر انکل سے ایسے بات کی کہ میں عین سامنے صوفے پر بیٹھی ان فریکچرز کو ڈھونڈنے لگی جو ان کے جسم پر تو تھے لیکن کسی انسانی آنکھ کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"خوف زدہ ہو گیا ہوں۔۔۔ شاید اب کبھی کار کا سفر نہ کر سکوں۔ دل بہت سہما ہوا ہے۔" پاپا کہہ رہے تھے جبکہ ابھی ابھی وہ ممی کے ساتھ ڈنر کر کے آئے تھے۔ کار میں۔۔۔

"چلتے چلتے لڑکھڑا کر گر جاتا ہوں۔ ہاں شاید اعصابی کمزوری ہو گئی ہے۔ دماغ میں بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ جی۔۔۔ نہیں آپ کو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔ دماغ کے ٹیسٹ کا کہا ہے ڈاکٹر نے۔۔۔ نہیں نہیں میں ٹھیک ہوں۔ دل کے ٹیسٹ بھی کروانے ہیں۔ ارے نہیں بھائی جان ایسے کیوں گھبرا رہے ہیں آپ۔۔۔ اچھا۔۔۔ کب۔۔۔"

"یہ لیں پاپا۔۔۔" میں نے اسکول میں جیتی اپنی ٹرافی لا کر پاپا کو دی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ مسکرانے لگے۔ اس لیے نہیں کہ ٹرافی ملی' اس لیے کہ انکل آ رہے تھے۔

"آپ نے اتنی اچھی اداکاری کی' ایوارڈ تو بنتا ہے۔" ممی میری پشت پر آئیں اور میرے بال کھینچے۔ اگر ہماری اس دنیا میں ایسی ممیاں نہ ہوا کریں تو ایشیائی لڑکیوں کے بال بھی اتنے لمبے نہ ہوا کریں۔ کچھ چیزیں صرف روایت سے ہی ملتی ہیں' نہ تیل سے' نہ شیمپو سے' صرف "بال" کھینچنے کی روایت سے۔

"بھائی ہیں ان کے بلا سکتے ہیں بہانے سے۔ بہن' بھائیوں میں یہی لاڈ پیار' مذاق کا رشتہ تو ہوتا ہے۔"

"مجھے کیا پتا بہن بھائیوں میں کیسا رشتہ ہوتا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی تو یا سوتا رہتا ہے یا کرکٹ کھیلتا رہتا ہے۔ اسے تو اکثر یاد کروانا پڑتا ہے۔ میں تمہاری بہن ہوں۔ میرا نام عروہ ہے۔ یاد آیا کچھ؟"

"تم میری بہن ہو' تمہارا نام عروہ ہے۔۔۔ دفع کرو ایسی یادداشت کو۔۔۔" یہ میرے بھائی کا حال ہے۔ ویسے پاپا کی ایسی جاندار اداکاری کا یہ نتیجہ ہوا کہ انکل اور آنٹی اور مس جیکی ہفتے کے اندر اندر ہمارے گھر تھیں

موجود تھے۔ اس بار پھر سے مجھے مس جیکی کو پہچاننے میں وقت لگا۔ اب وہ گنجا ہو چکا تھا۔ عام گنجا نہیں ہوا تھا وہ۔ جیسے کھیتوں میں ہلا چلاتے ہیں تو زمین ہو جاتی ہے ایسی ہی اس کے سر کی زمین تھی۔ مجھے خیال آیا کہ پچھلی بار میں نے جو اس کے بالوں کو جڑوں سمیت اکھاڑا تھا کہیں یہ ہل اس وجہ سے تو اس نے اپنے کھیت میں نہیں چلوایا؟ اگر ایسا ہے بھی تو کسے پروا ہے۔۔۔ میری ناک بھی ہر سال سردیوں میں سرخ ہو کر سوج جاتی ہے اور مجھے سانس لینے میں مسئلہ درپیش رہتا ہے۔

اس بار میرا ارادہ دو قدم آگے رہنے کا تھا۔ جن میں بائکنگ، رائٹنگ، سوئمنگ کر رہی تھی۔ کچھ دوستوں کے ساتھ پکنک کی تصویریں بھی تھیں۔ درخت کے پاس کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ کچھ بکس بھی تھیں، جو میں نے جلدی سے لا کر اپنے روم میں سجا دی تھیں۔ ایک بک کو کھول کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ گیمز کی سی ڈیز کو نمایاں جگہ سجا کر رکھ دیا تھا۔ پہلے اس نے سرسری نظروں سے لاؤنج میں لگی میری تصویروں کو دیکھا۔ پھر وہ چونک گیا تھا۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ جیلس ہو گیا ہو گا۔ پھر وہ باقی تصویروں کو ذرا اور قریب جا کر دیکھنے لگا۔ پھر وہ میرے کمرے میں آ گیا اور وال پر لگی میری تصویروں کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ زیادہ ہی غور سے معائنہ کر رہا تھا۔ پھر وہ اتنے غور سے دیکھنے لگا کہ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔

"تصویریں بہت اچھی ہیں یہ۔۔۔ کون ہے؟" اس نے کسی چہرے پر انگلی نہیں رکھی تھی۔

"کون؟ یہ رائنا ہے میری دوست' سوئمنگ چیمپئن۔"

"اچھا۔۔۔ لیکن میں تو اس فوٹو شاپ والے کا پوچھ رہا ہوں۔ بہت ماہر ہے وہ اپنے کام میں۔ کبھی گھوڑے کو قریب سے جا کر بھی دیکھا ہے یا نہیں؟ ہاہاہا۔۔۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا اور اس کے سر کی کھیتی میں سے گندم کے خوشے پھوٹنے لگے اور زیادہ زور سے ہنستا تو "خربوزے" کی بیل بھی پھوٹ نکلتی۔

"دیکھا بھی ہے اور اس کے بال بھی نوچے ہیں' جڑوں سمیت۔۔۔" اس کی ہنسی یک دم تھم گئی اور اس نے دانت پر دانت جمائے۔ یقیناً" اسے اپنے سر کی تکلیف پھر سے یاد آ گئی تھی۔

"اینی وے۔۔۔ تم نے وہ درخت کیوں کٹوا دیا؟ انکل بتا رہے تھے کہ تم نے بہت ضد کی تھی اسے کٹوانے کی؟ ایسا کیوں کیا تم نے؟"

میں غور سے اس کی شکل دیکھنے لگی' پھر میں نے اپنے منہ کو ذرا قریب کیا اور زیادہ غور سے دیکھنا شروع کیا۔ انگلی کو اٹھا کر اس کی ناک کے قریب کیا اور قریب کیا۔ وہ چوکنا تھا' وہ جانتا تھا کہ میں چیخ ماروں گی جسے وہ ڈج کر دے گا۔ لیکن میں نے چیخ نہیں مارا بلکہ دو انگلیوں سے میں نے اس کی ناک پکڑ کر مروڑ دی۔ لڑکے ہمیشہ یہ بھول جاتے ہیں کہ لڑکیاں گھونسے مارتی ہیں' نہ کک کرتی ہیں۔ وہ چٹکی بھرتی ہیں اور بال کھینچتی ہیں اور یہ گھونسے اور لاتوں سے زیادہ کارگر ہتھیار ہے' زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ زود اثر ررر ر۔۔۔" اس کی ناک سے خون نکلنے لگا۔ "کیا تم ویمپائر ہو؟" وہ چلایا۔

"تھی نہیں، لیکن ہو گئی ہوں۔" اس کی بہتی ناک کو دیکھ کر میں نے اطمینان سے کہا۔

"تو لو پھر یہ میرا خون پی لو۔" اس نے اپنی ناک کا خون جو اس کے ہاتھ میں لگ چکا تھا میرے آگے کیا۔

ناک پر اس نے اتنی بڑی بینڈیج کروالی تھی کہ ممی' پاپا مجھے ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکالنے تک کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ انہیں ایسی ویمپائر اولاد گھر میں نہیں رکھنی تھی جو گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتی تھی۔ مجھے اس کے کمرے میں جا کر سوری کہنا پڑا۔ پھر کہیں مجھے گھر میں اور رات کا ڈنر کرنے کی اجازت دی گئی۔ ساتھ ساتھ ممی مجھے مخصوص انداز سے گھورتی رہیں۔ اس گھوری کے کئی مطلب تھے' بلکہ ان میں چھپی کئی دھمکیاں تھیں۔ جیسے کہ "مہمانوں کو جا لینے دو' پھر تم سے پوچھتی ہوں۔" "اب لے کر دکھانا مجھ سے اپنی پاکٹ منی' شاپنگ پر میرے

ساتھ جاسکتی ہو لیکن بیگز اٹھانے کے لیے۔ خبردار جو تم نے کسی کپڑے' جوتے' بیگ' جیولری کی طرف انگلی کی تو۔ انگلی کاٹ دی جائے گی۔" گھر میں جو بچے گا وہ کھانا پڑے گا۔ اور گھر میں ان دنوں پھر ٹھنڈے اور بینگن ہی بنیں گے اور ان سب میں سب سے خطرناک دھمکی یہ تھی کہ میری کوئی بھی دوست مجھ سے ملنے گھر آئے گی تو اسے میری بدتمیزی کی ساری کہانی بمع مبالغہ سنائی جائے گی۔ ظاہر ہے میری وہ اچھی دوست یہ کہانی باقی اچھی دوستوں کو سنائے گی اور پھر سب اچھا اچھا ہوتا ہی چلا جائے گا اور میری شہرت کو چار اچھے اچھے چاند لگتے چلے جائیں گے۔

وہ اگلے دن پھر میرے کمرے میں آیا۔ ظاہر ہے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میری ممی کے ہاتھوں کافی عزت ہو چکی ہے اور اب وہ "اس عزت" کو اور عزت دینے آیا تھا۔

"تمہارے کمرے میں بہت بکس ہیں' سوچا ان کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔" اس نے ناک پر انگلی رکھ کر اپنا رخ کتابوں کے ریک کی طرف موڑا۔ یعنی وہ کتابوں کا جائزہ آنکھوں سے نہیں "ناک" سے لینے والا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا اس کی ناک کو کھینچ کر ہاتھی کی ناک بنا دوں' پر ممی کی زمانہ ماضی کی گھوری نے مجھے روک لیا۔ وہ بکس کے ریک کے پاس گیا اور اس کے ٹائٹل پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ایک کتاب کو نکالا اور اسے سونگھا' پھر اس نے انگلی کو سونگھا۔

"کیچپ لاؤں' ان پر ڈال کر کھا بھی لو۔" مجھے اس کا سونگھنا برا لگا۔

"نئی کتابوں کی خوشبو بہت اچھی ہوتی ہے۔ ویسے تم اتنی بکس پڑھتی ہو۔ واؤ۔" اس نے بکس کے ریک پر انگلی رکھی اور اسے دور تک گھسیٹتا ہی چلا گیا۔

"ہاں! ان سب کو تو میں کب کا پڑھ چکی ہوں۔" میں نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"اچھا۔ مثلاً" یہ بک کیسی ہے؟" اس نے "لیٹ اٹ اسنو۔" کو آگے کیا۔

مجھے پتا تھا وہ یہ سوال کر سکتا ہے۔ میں شارٹ نوٹس پر یہ سب بکس اٹھا کر اسٹور سے لائی تھی۔ گوگل سے میں نے ان سب کی سمری پڑھ لی تھی۔

"اچھی ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھی ہے۔" میں نے کہا اور یاد کرنے لگی کہ اس کے کرداروں کی کہانی کیا تھی۔ ایک نقصان جو ہمیشہ ہر شوخی مارنے والے کو بھگتنا پڑتا ہے وہ یہ کہ وہ کہیں نہ کہیں غلطی کر جاتا ہے۔ میں نے آٹھ دس کتابوں کی سمری پڑھ لی تھی اور اب وہ سمریاں ایک دوسرے میں مکس ہو رہی تھیں' بس یہی گڑبڑ ہو رہی تھی۔

"مجھے یہ کتاب اچھی لگ رہی ہے لیکن میں ہر کتاب نہیں پڑھتا۔ ویسے یہ جولی۔ یہ کیا ہے اس میں؟" اس نے ورق گردانی کرتے ہوئے پوچھا۔

"جولی۔" ساری سمریاں جو میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں' ان میں میں جولی کو ڈھونڈنے لگی۔

"مل جا جولی۔ مل جا۔"

"اوہ۔ کیوٹ۔" وہ بڑبڑایا جو میں نے سن لیا اور فوراً" بولی۔

"یس کیوٹ کیٹ۔" مجھے یاد آگیا تھا۔ جولی ایک بلی کا نام ہے اور جولی ہو ہی کیا سکتی ہے۔

"کیٹ؟ جولی بلی ہے؟" اس نے ناک سے کھلی کتاب پر غور کیا' پھر اپنی ناک کو صفحے پر ٹکا دیا اور پھر سر اٹھا کر اپنی ناک سے مجھے تاڑا۔

"تم خود پڑھ لو۔" یہ کہنا زیادہ محفوظ تھا' اس لیے میں نے کہہ دیا۔

اس نے ساری کتابوں کو ریک سے نکالا اور ان سب کے پہلے صفحے میرے سامنے کیے۔

"یہ سب کتابیں ایک ہی دن خریدی گئی ہیں' یہ دیکھو اسٹیمپ۔ اسٹور کا نام اور تاریخ۔ ہمارے آنے سے ٹھیک ایک دن پہلے۔ تم نے دو دن میں پوری بیس کتابیں پڑھ لیں۔ تم نے گینیز بک ریکارڈ کو ٹری کیا۔ تمہیں ضرور اپنی انٹری وہاں بھیجنی چاہیے۔"

"انٹری بھیجنے کے لیے مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"مشورے تو عقل والے لیتے ہیں جو تمہارے پاس نہیں- ویسے تم نے یہ سب کیوں کیا... جو بلی... ؟"

اس نے اپنی ناک پہ لگی ـــــ بینڈ ایج کو جھٹکے سے اتار دیا اور ناک سمیت مسکرانے لگا- میں اپنی ایکس رے آنکھوں سے اسے گھور رہی تھی' اس کی ناک تو بالکل ٹھیک تھی- مجھے متاثر کرنے کے لیے؟ وہ اپنی چیک شرٹ کے بازو فولڈ کرنے لگا اور میرا دل چاہا کہ میں ایک بار پھر سے اس کی ناک کو فولڈ کردوں-"

"میں تم سے متاثر ضرور ہو جاتا... مس جو بلی... اگر مجھے کتابی کیڑے اچھے لگتے-" اب وہ اپنے سر کے کھیت میں ہل میرا مطلب ہاتھ چلانے لگا تھا-

"تمہیں متاثر کرنا' مائی فٹ؟"

"تو پھر یہ بکس کیوں رکھی ہیں یہاں؟"

"یہ سب میں پڑھنے کے لیے لائی تھی... میں اتنی ہی بکس پڑھتی ہوں... ہر ہفتے..."

"تم نے کہا' تم یہ سب پڑھ چکی ہو-"

"میں نے کب کہا یہ؟ میں نے کہا مجھے یہ بکس پڑھنی ہیں-"

"اوہ... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ تم جھوٹ بھی بول سکتی ہو- اگر جو بلی کو معلوم ہوا کہ اسے بلی بنادیا گیا ہے تو وہ یقیناً" ناراض ہوگی' کیونکہ وہ ایک لڑکی ہے' اچھا چھوڑو... منہ کھولو اپنا' دانت دکھاؤ' ٹاول سے ڈرائے کرتی ہو یا ڈرائر سے؟" اور یہ وہ سب سے خراب بات تھی جو اس نے کی تھی- تازہ تازہ برش کیے ٹھنڈے دانتوں پر گرم ڈرائر کیا کام کرتا ہے' یہ وہی جانتا ہے' جس نے یہ کیا ہو- میرے دانت تو ویسے بھی حساس تھے-

"کھولو منہ دکھاؤ دانت... ٹوتھ پالش ٹھیک سے یوز کرتی ہو نا؟"

"بکواس بند کرو اپنی..." میں چلائی- وہ بھی چلایا لیکن قہقہہ لگا کر اور اپنی ناک پر بینڈ ایج ٹھونک کر چلا گیا-

"میں مر جاؤں گی' اس سے شادی نہیں کروں گی-"



پاپا... انکل کو اپنے ساتھ کینیڈا لے آئے تھے- انہیں لگتا تھا کہ ایسے وہ جلدی ٹھیک ہو جائیں گے- جبکہ مجھے انکل کہیں سے بھی بیمار نہیں لگتے تھے- جب وہ بیمار تھے ہی نہیں تو ٹھیک کیسے ہوں گے- بعد میں انکل بجن کا کہنا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو بہت مس کر رہے ہیں' انہوں نے اسے بھی بلالیا-

"تم یہاں ساری زندگی کے لیے رہنے آئی ہو؟" میں نے اس کے سامان کو دیکھ کر کہا-

"مائی فٹ یہاں رہنا- میں صرف اپنے پاپا کے لیے آئی ہوں-"

"اتنا سامان لے کر؟"

"ہمارے کپڑے بڑے بڑے ہوتے ہیں نا- چھوٹے چھوٹے نہیں ہوتے- تو بڑے بڑے کپڑے بڑا سامان ہی لگتے ہیں- چنے منے ہوں تو ایک چھوٹے سے بیگ میں آجائیں-"

"او آئی سی... لیکن اس سامان کو رکھنے کے لیے ہمارے پاس بڑے بڑے کمرے نہیں ہیں-"

"جب تم اس موٹو کو لے کر ہمارے گھر آئے تھے تو ہم نے تو نہیں کہا تھا کہ اس سانڈ کو لے کر نکل جاؤ ہمارے گھر سے- پورے مہینے کا راشن وہ ایک ہفتے میں کھا گیا تھا-" میں نے اس کی زبان کی رفتار کو دیکھا- وہ بہت زیادہ زبان دراز تھی- ایک تو یہ وجہ تھی کہ مجھے وہ بہت ہی زیادہ بری لگتی تھی- اتنی بری کہ میں اسے اپنے گھر سے دو کلو میٹر دور واقع ٹھنڈے پانی کی جمی ہوئی جھیل میں پھینکنے کے لیے تیار تھا اور جھیل پر پہرا دینے کے لیے بھی تیار تھا کہ وہ کہیں خود سے ہی باہر نکل کر اپنی جان نہ بچالے- وہ نکلے تو میں اسے پھر سے دھکا دے دوں- اس کا نکلنا میرا دھکا' میرا دھکا اس کا نکلنا کہ جو بلی کی طرح جان بچا کر نکل ہی نہ آئے- ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ جب وہ غصے میں تیز آواز میں بولتی تھی تو اس کی آنکھیں ٹیڑھی ہو جاتی تھیں اور مجھے اس سے تھوڑا سا خوف محسوس ہونے لگتا تھا کہ

کہیں وہ کوئی ڈیمپائر تو نہیں۔
"میں اپنے انکل کے گھر رہنے آئی ہوں تمہارے نہیں۔"
"تمہارے انکل، میرے پاپا ہیں۔"
"لیکن تم ان کے صرف بیٹے نہیں ہو۔ کبھی بیٹی، کبھی بیٹا، کبھی جیک، کبھی جیکی، ویسے آج کل تم کیا ہو؟"
"اوہ!" وہ میرے ناموں پر طنز کر رہی تھی جو ماما مجھے بہت پیار سے دیتی ہیں" آئی لو مائی مام۔
"آج کل میں جیکی چن۔" میں نے جیکی چن کی طرح کراٹے کا ایک وار اس کی گردن پر کیا۔ بس اتنا ہی اور اس نے نیک کالر پہن لیا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا اور ان سے اس کی "گردن کے حالات" ڈسکس کیے۔
"نیک کالر کی تو بالکل کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ انہوں نے کالر کیوں پہنا ہے؟" ڈاکٹر پوچھ رہے تھے۔
"تاکہ میری گردن ٹھیک نہ رہے۔" میں نے اپنی گردن کو مسلا۔
"میں ڈاکٹر سے پوچھ آیا ہوں۔ تم یہ ڈرامہ بند کرو۔ اتارو یہ نیک کالر۔" میں گھر آیا اور سیدھا اس کے پاس گیا۔
اس نے نیک کالر تو نہیں اتارا لیکن اپنے حلق سے ایک دل دوز چیخ اپنے منہ کے راستے سارے گھر میں اتار دی۔ ماما بھاگی ہوئی لاؤنج میں آئیں۔ ابھی میری نظر ماما کی شکل پر پڑی ہی تھی اور پاپا کی نظروں کے تعاقب میں وہاں اس طرف آئی تھی جس طرف وہ ابھی۔۔۔ ہاں بالکل ابھی کھڑی تھی۔۔۔ لیکن اب وہ وہاں کھڑی نہیں تھی۔۔۔ وہ فرش پر پڑی تھی۔۔۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔۔۔ مجھے چھ دن گھر سے باہر رہنا پڑا۔ میں ساری زندگی گھر سے باہر رہ سکتا تھا' اگر وہ میرے ماما' پاپا' میرا کمرہ گھر میں سے نکال کر میرے منہ پر دے مارتے۔ فریج سے کچھ پھل اور اپنے والٹ سے کچھ پیسے بھی۔۔۔ تیز بارش میں' میں گھر سے باہر کھڑا رہا اور کھڑکیاں بجاتا رہا لیکن کچھ دیر بعد جب دروازہ کھلا تو باہر کیا آیا؟ میرا رین کوٹ۔۔۔ وہ بھی وہ پرانا والا جس میں جگہ جگہ سوراخ تھے۔ کہاں جاتا' کیا کرتا۔ میں نے تو صرف سچ بولنا چاہا تھا کہ اسے نیک کالر کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا سچ بولنے کی اتنی بڑی سزا ملتی ہے؟ ٹھیک ہے' میں اس سزا کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے سوراخ زدہ رین کوٹ پہن لیا اور ایسی دکھیاری رات میں اپنے دوستوں کے دروازوں کو بجاتا رہا۔
"کیوں نا مووی دیکھی جائے۔" میں مائیکل کے گھر کے باہر کھڑا کانپ رہا تھا۔
"ایسی بارش میں' ایسے پھٹے ہوئے رین کوٹ کو پہنے تقریباً" سارا بھیگے ہوئے میں تم سے مووی دیکھنے کے لیے کہہ رہا ہوں چشمش۔"
"تمہارا پہلے تو ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔" اس نے اپنے چشمے کو اتار کر غور سے مجھے دیکھا' صرف مائیکل ہی یہ کر سکتا تھا۔ "چشمے کو اتار کر دیکھنا۔"
"تم نے پہلے تو کبھی اتنے سوال نہیں کیے؟" اسے دھکا دے کر میں خود ہی اس کے گھر کے اندر گھس گیا اور کچن کی طرف لپکا۔
"تم پہلے کبھی ایسی سوالیہ شکل کے ساتھ میرے دروازے پر بھی نہیں آئے۔" کچن ٹیبل پر رکھے ادھ کھائے سینڈوچ کو جا کر اس نے بمشکل میری پہنچ سے بچایا۔
"سنو مووی ریڈی کرو۔۔۔ میں کچھ کھا کر آ رہا ہوں۔"
"تم ڈنر کر کے نہیں آئے گھر سے۔۔۔"
"اپنا منہ بند کرو اور جا کر مووی ریڈی کرو۔۔۔"
یہ تھی میری۔۔۔ "مووی نائٹ ٹرپ" کی پہلی نائٹ۔ میں مووی نائٹ کا بہانہ کر کے اپنے دوستوں کے گھر رات کو مووی دیکھتا اور پھر وہیں سو تا بن جاتا۔ ساتویں دن مجھے رائن نے جس کے گھر میں میری یہ تیسری مووی نائٹ تھی' ہاتھ پکڑ کر باہر نکال دیا۔
"اگر تم آج بھی یہاں رہے تو مجھے بھی تمہاری طرح مووی نائٹس پر ایک پورا ہفتہ گزارنا ہوگا۔

افسوس مجھے کسی اور کے بیڈ پر نیند نہیں آتی اور صوفے پر میں پورا نہیں آتا۔"

"کیسے دوست ہو تم؟ صرف تین دنوں میں ہی تمہیں یہ سب یاد آگیا۔"

"میں تو تمہارا دوست ہوں لیکن میرے مام ڈیڈ تمہارے دوست نہیں ہیں۔"

"لیکن تم انہیں قائل کر سکتے ہو۔"

"انہوں نے مجھے قائل کرلیا ہے کہ یا تم یہاں رہو گے یا مجھے بھی جانا ہوگا۔"

"تم ان کی اولاد نہیں ہو کیا؟ ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ تمہارے ساتھ... تمہارے دوست کے ساتھ..."

"جیسے تمہارے مام ڈیڈ نے تمہارے ساتھ کیا۔ تم ان کی اولاد نہیں ہو کیا؟"

"وہ تو میری ایک کزن آئی ہوئی ہے، مجھے اس کی شکل نہیں دیکھنی اس لیے..."

"یا اس کی شکل کو ماسک پہنا دو یا خود کالا چشمہ لگا لو لیکن اب چلے جاؤ۔ میری مام نے تو وارڈروب لاکڈ کردی ہے۔ میں ایک ہی ڈریس میں ایک ہفتہ کیسے گزاروں گا؟ تمہیں تو رین کوٹ مل گیا' مجھے ٹین پیپر بھی نہیں ملے گا۔"

"ڈینس ٹھیک کہتا ہے تم کسی کام کے نہیں ہو۔"

"ڈینس مجھے بھی ٹھیک کہہ گیا ہے کہ اسے کک مار کر باہر کرو۔"

اس سے پہلے کہ میں رائن موٹو کی "ڈائنو سار سائز کک..." کھاتا، مجھے گھر واپس آنا پڑا۔ وہ کچن ٹیبل پر بیٹھی سیب کھا رہی تھی اور مجھے دیکھ کر ایسے مسکرا رہی تھی' جیسے اسے دنیا میں کوئی غم نہیں۔ اسے کوئی غم ہو بھی نہیں سکتا تھا' کیونکہ سارے غم اس نے میری طرف منتقل کردیے تھے۔ اسے سوری کہا۔ پھر کہیں جا کر اس کا نیک کالر اترا۔



پاپا کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ ہر روز صبح میرے کمرے میں آتے مجھے مخصوص انداز سے گھورتے۔ کیونکہ ابھی حال ہی میں... میں "مووی نائٹ ٹرپ" سے واپس آیا تھا' اس لیے میں اس گھوری سے ڈر جاتا۔ میں انکل کے کمرے میں جاتا ان کا حال پوچھتا۔ ان سے ہلکی پھلکی باتیں کرتا۔ اکثر انہیں اپنے ساتھ چہل قدمی کے لیے لے جاتا اور "اس" سے دور ہی رہتا جیسا کہ ماما نے کہا تھا۔ "عروہ سے دور رہنا' ورنہ ہم سے بھی دور ہو جانا۔" ماما... پاپا سے دور ہونے کا مطلب تھا' صبح کے ناشتے' رات کے کھانے' اپنے روم' اس روم کے باتھ روم اور پاپا کے والٹ میں موجود پیسوں سے دور رہنا۔ اتنی ساری چیزوں سے دور رہنے سے بہتر تھا کہ میں "اس" سے دور رہ لیتا۔

اکثر وہ مجھے دیکھتے ہی اپنی گردن مسلنے لگتی۔ یہ ڈنر ٹیبل پر ہوتا۔ اس کی گردن میں درد ہونے لگتا۔ وہ ماما سے کسی بام کا پوچھنے لگتی۔ پھر وہ کراہ کراہ کر ایک ایک نوالہ کھاتی۔ پاپا مجھے گھورتے۔ مجھے افسوس ہوتا۔ بہت افسوس ہوتا' مجھے ایک کاری وار کرنا چاہیے تھے کہ اس کی گردن ہی ٹوٹ جاتی' نہ ہوتی گردن نہ نکلتی آہ... کراہ... اب وقت گزر چکا تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے' جو کام وقت پہ نہ ہو سکے' پھر وہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی گردن توڑنے والا کام بھی پھر کبھی نہیں ہوا۔

لیکن...

گھر میں ایک موٹا ہو تو' تو دو تین اور موٹو نکل ہی آتے ہیں۔ جو سانڈ اس کے گھر سے سارا راشن کھا آیا تھا' اسی سانڈ کی ایک چھوٹی بارہ سال کی موٹی بہن بھی تھی' جو جب ہمارے گھر آتی ماما کو پیلا پیلا کروا دیتی تھی۔

"آنٹی میں یہاں سے گزر رہی تھی کہ بیکنگ کی خوشبو نے مجھے روک لیا۔" ممی کا گلابی رنگ پیلا پڑ جاتا۔

"ہاں... بیٹا میں آج کیک اور کوکیز بیک کر رہی ہوں۔"

ماما جانتی تھیں وہ جھوٹ نہیں بول رہی۔ ماما ہفتے میں ایک دن کیک' کوکیز اور بریڈ بیک کرتیں۔ وہ ٹھیک اسی دن گھر آتی۔ ماما نے دن بدل کر بھی دیکھے پر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیسے ٹام اینڈ جیری میں جیری' چیز کا

خوشبو پر سوتا ہوا بھی چیز کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی وہ شہر کے کسی بھی حصے میں ہوتی وہ ٹھیک اسی جگہ پہنچ جاتی جہاں کچھ پک رہا ہوتا اور جہاں سے پکا ہوا اسے مل بھی جاتا۔

"کیا تم ماما کو بتا کر آئی ہو؟" ماما ہر بار یہ کمزور سا جواز تلاش کرتیں کہ شاید اسے گھر جانے کی جلدی ہوگی۔

"میں نے سائیکل شیڈ میں پارک کر دی ہے۔ مام کو میں فون کر دیتی ہوں۔ ویسے بھی مام کو میری کوئی پروا نہیں ہے۔ ان کے خیال میں جب میں کمزور ہو جاؤں گی تو ہی اچھی بچی بنوں گی۔ میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ وزنی لوگ بھی اچھے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں میں شروع سے باغی رہی ہوں۔ اگر دنیا میں اسی فیصد تعداد ایسے لوگوں کی ہے، جو "فٹ" ہیں تو مجھے ان اسی فیصد کا حصہ نہیں بننا۔ میری ایک الگ پہچان ہونی چاہیے' آپ کیا کہتی ہیں آنٹی؟"

"تمہاری طرح اور بھی بہت لوگ موٹے ہیں۔ یہ تمہاری الگ پہچان تو نہیں ہوئی نا۔"

"میں ہزاروں بھیڑوں میں ہونے کی نسبت۔ دس بھیڑیوں میں ہونا پسند کروں گی۔"

"لیکن بھیڑوں کو پسند کیا جاتا ہے مشعل۔"

"میں ناپسند کیے جانے کے لیے تیار ہوں۔"

گوشت کا گولہ اپنے بازوؤں کو لہرا کر کہتا۔

ماما کو ناچار اس کے آگے سب رکھنا پڑتا۔ ویسے بھی ماما اور ہم سب جان گئے تھے کہ "موٹا" اپنے موٹا ہونے کے کئی جواز تلاش کر لیتا ہے۔ وہ "کھانے کے کار خیر" پر ایسی ایسی دلیلیں دیتا ہے کہ "اسی فیصد فٹ عوام" ان دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

سولیٹ موٹا زمور موٹا...

اب جب اس نے ہمارا نمک کھا ہی لیا تھا تو اسے حلال بھی کروانا چاہیے تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ اسٹور لے گیا اور جو جو اس نے کہا' اسے کھانے کے لیے لے کر دیا۔ بدلے میں اس نے بس اتنا کیا کہ وہ عروہ کو اپنے ساتھ چہل قدمی کے لیے لے گئی اور واپسی میں عروہ کو ماما بمشکل اٹھا کر اپنے ساتھ گھر لائیں' بلکہ گھر...

سے ڈاکٹر کے پاس۔ چھوٹی موٹو لڑکھڑا کر گری تھی اور ٹھیک عروہ کے اوپر گری تھی جو گراؤنڈ پر ہاتھ سر کے نیچے رکھے پر سکون انداز میں آسمان کا نظارہ کر رہی تھی۔

"ہو گیا نظارہ۔ چلو اب اپنے گھر واپس... میں تمہیں اپنے اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

☼ ☼ ☼

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اوپر کوئی پہاڑ آ گرا۔ میری آنتیں اگر باہر نہیں آئی تھیں تو اس کا مطلب صاف تھا' وہ اندر ہی ٹوٹ کر گر گئی تھیں اور اب کسی اور راستے سے باہر آنے والی تھیں' پورے دو منٹ تک میں پیٹ کے بل اپنا درد قابو میں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ مشعل بھاگ کر گئی اور گھر سے آنٹی کو بلا لائی۔ ایک ہفتے تک میں نے جو کھایا وہ کھاتے ہی باہر آیا۔ درد جس چڑیا کا نام ہے وہ میں نے چڑیوں کے جھنڈ سے جانا۔ مجھے کئی دن تک بیڈ ریسٹ کرنا پڑا اور ظاہر ہے کہ بارہ سال کی بچی یہ سب برداشت نہیں کر سکی اور اس نے احساس جرم کے اثر کو زائل کرنے کے لیے بہت زیادہ کھانا شروع کر دیا' ساتھ ہی اگلنا بھی شروع کر دیا۔

"جیک نے کہا تھا مجھ سے یہ کرنے کے لیے۔" اس نے اگل دیا۔

"ہاؤ کیوٹ..." میں نے مشعل کے گال پر پیار کیا۔ دل تو کر رہا تھا دانت سے گال کاٹ لوں لیکن بچی تھی اور پھر میں اس بچی کے دیس میں تھی۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"تم نے اسے منع کیا تھا؟"

"نہیں میں منع نہیں کر سکی... وہ مجھے اسٹور میں لے گیا اور جس جس چیز پر میں نے ہاتھ رکھا اس نے وہ مجھے لے دی۔ پھر سب بھگز اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس نے کہا۔ ایک ہاتھ لو ایک ہاتھ دو۔" میں نے اپنا لینے والا ہاتھ بڑھا دیا اور اس نے میرا دینے والا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اگر میں مر جاتی تو؟"

"میں گاڈ سے معافی مانگ لیتی گاڈ بہت اچھے ہیں' وہ معاف کر دیتے ہیں اور جیک نے کہا تھا' موٹے لوگوں کے نیچے آکر کوئی نہیں مرتا۔"

"تم گاڈ سے معافی تو مانگ لیتیں' لیکن میری جان تو واپس نہ آتی نا۔" میری جان کے زباں پر اس کے کتنے نادر خیالات تھے۔ راز اُگلنے کے انعام کے طور پر میں نے اسے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ دیا جسے لے کر وہ میری شکل دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا' تم یہ چاکلیٹ نہیں کھاتیں؟"

"میں نے آپ کی جان بچائی ہے۔ اگر میں مزید دو منٹ تک آپ پر گری رہتی تو آپ اس وقت بیڈ پر نہیں تابوت میں لیٹی ہوتیں۔ اب آپ بدلے میں مجھے یہ ننھا منا پیکٹ دے رہی ہیں۔ یہ تو میں اسکول بس میں بیٹھے بیٹھے کھا جاتی ہوں۔" ابھی کچھ دیر پہلے وہ شرمندہ ہو رہی تھی اور اب وہ مجھے شرمندہ کر رہی تھی۔ ان موٹے لوگوں کا کوئی دین ایمان ہے یا نہیں؟

"فی الحال تو میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے کہ تمہیں کھانے کے لیے دوں۔ البتہ تم کیچپ لگا کر مجھے کھا سکتی ہو۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

اس نے منہ بنا لیا۔ "میں صرف اچھے کھانے کھانے کی شوقین ہوں۔"

توبہ توبہ! یہ موٹے لوگ تو منہ پھٹ بھی ہوتے ہیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ مجھے گھر بھی جانا تھا۔ پاپا پہلے ہی جا چکے تھے۔ جس دن میری فلائٹ تھی اس دن میں نے کچھ وقت جیک کے کمرے میں گزارا۔ جیک کالج جا چکا تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا لیکن کمرے میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ وارڈ روب... وارڈ روب میں کپڑے... کپڑوں میں مہنگے کپڑے اور مہنگے کپڑوں میں "اس کے پسندیدہ کپڑے۔"

ایک یورپین کنٹری میں رہنے والے کے پاس گھر کے بعد سب سے زیادہ قیمتی کیا ہوتا ہے؟ ایک ایسا ملک جہاں سردیوں میں درجہ حرارت منفی ہو جاتا ہے۔ وہاں سب سے قیمتی کیا ہوگا؟ گھر کے ہیٹنگ سسٹم کے علاوہ؟ باڈی ہیٹنگ سسٹم نا؟ اس کے گرم کپڑے' مہنگے نفیس کوٹ' برفانی طوفان میں ٹھنڈ سے بچانے والے ہڈ' رنگ برنگے سوئیٹر' مختلف شیڈز کی لیدر جیکٹس۔ کینیڈا جیسے ٹھنڈے برفانی ملک میں سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ کیا ہوگا؟ یہی سب نا؟

بس میں اس اثاثے کا ایک ایک بازو کاٹ لائی۔ ہر شرٹ کا' ہر کوٹ کا' ہر سوئیٹر کا' ہر ہڈ کا۔ اتفاق سے سوئیٹروں کو درزی ٹھیک نہیں کرتے اور کوٹ کمپنیوں کے پاس واپس نہیں جاتے کہ جی ہم سے اس کا ایک بازو کٹ گیا ہے' اب یہ لے لیں اور دونوں بازوؤں والا دے دیں اور اتفاق سے سوئیٹر' شرٹس' کوٹ بنانے والی کمپنیاں "ایکسٹرا کپڑا" بھی کسٹمر کو نہیں دیتیں کہ اگر کوئی آستین کاٹ کر لے جائے تو اسے جوڑ لیجیے گا۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میں نے اس کا کافی نقصان کیا ہاں لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ میں نے اس کا "ٹھیک" نقصان کیا۔

میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہی تھی کہ وہ اپنے "ملبے" پر بیٹھا چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ یہ میں نے کیا ہے لیکن اس کی بات کا یقین کون کرتا؟ آنٹی اور انکل یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ سب اس نے کیا ہے اور وہ نام "بے چاری عروہ" کا لگا رہا ہے۔

میرے چند قریبی دوستوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں منگنی شدہ ہوں۔ اب یہ منگنی کیسی چل رہی ہے' یہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ منگنی لولی لنگڑی تھی اور یہ میرے اور جیک کی طرف سے وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ یہ صرف ہم دونوں کے ماں' باپ کے لیے تھی۔ مجھے وہ قطعاً "پسند نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سے شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر ہو بھی جاتی تو بہت جلد طلاق تک نوبت آجاتی۔ ایسی شادی کا فائدہ جس کے فوری بعد عدالتوں کے چکر لگانے پڑیں۔ مجھے یونیورسٹی جانا تھا اور پھر مجھے یہ اعلان کرنا تھا کہ مجھے کسی بھی صورت اس جیکی سے شادی نہیں کرنی۔ جو یہ طے ہی نہیں کر پا رہا کہ اسے کیا بنے رہنا ہے۔ وہ خود بھی اسی انتظار میں لگتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم سے فارغ ہو اور

منگنی کو توڑنے کا اعلان کرے اور اس نے یہ اعلان کردیا۔ پاپا اور انکل کے فرسٹ کزن کی اکلوتی بیٹی کا نکاح تھا اور وہ سب اس میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

"السلام علیکم محترمہ عروب۔" یہ اس کا ابتدائی انداز تھا مجھ سے بات کرنے کا جو کافی مہذب تھا۔ ممی' پاپا انہیں لینے ائیرپورٹ گئے تھے۔ صرف میں اور رخشان ہی گھر میں تھے۔ وہ کار سے باہر نکل کر سب سے پہلے چلتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔

"وعلیکم السلام محترم جیک۔"

"میں جیک نہیں ہوں' مجھے عمار کہا جائے۔"

تو وہ اپنے پیدائشی نام کو استعمال کرنے کے لیے تیار ہوچکا تھا۔ اس بار وہ کافی انسانی حلیے میں ملبوس آیا تھا۔ نہ بالوں میں کوئی بل پڑا ہوا تھا' نہ کوئی کرنٹ دوڑایا گیا تھا لیکن اس نے جو نئی شرٹ پہن رکھی تھی وہ کافی انقلابی سی تھی۔۔۔ اس کی ایک آستین کسی اور ہی فیبرک کی تھی۔ وہ آستین اس شرٹ کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ وہ کسی اسٹیریو فیشن کو فالو کررہا ہے یا وہ کسی اسٹیریو فیشن کو سیٹ کررہا ہے۔ اس کی شکل جتنی سنجیدہ ہورہی تھی اس کی شرٹ اتنی ہی اس کے خلاف جارہی تھی۔ وہ ان ہی شرٹوں میں سے ایک تھی جس پر میں نے قینچی چلائی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اس کی شرٹ کو دیکھ کر اپنی ہنسی دبانے کی کوشش کررہی ہوں۔

"اچھا ہے نا یہ نیا فیشن۔ میرے دوستوں میں کافی مقبول رہا ہے۔"

"مقبول اور یہ۔۔۔؟" میں نے خود کو کھل کر ہنسنے کی اجازت دی اور شرٹ کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

"ہاں۔۔۔" اس نے خود کو اپنی ہنسی غائب کرنے کی تنبیہہ کی اور دانت پیس کر کہا۔ دانت کو دانت پر ایسے جماتے ہوئے وہ کچھ ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے دانتوں پر ایلفی چپکادی گئی ہو اور اب وہ اس ایلفی سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے ہکلانے لگا ہو۔

"ایک عرصہ ہوا مجھے ایسے مقبول ہوئے۔"

"تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔۔۔ مس جیکی۔۔۔"

"میں ضرور تمہارا شکرادا کرکے جاؤں گا مس ہائی جیک۔" انکل اسے گھورتے ہوئے قریب سے گزر گئے۔ شاید وہ اس سے خائف تھے۔ آنٹی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہاں آنے سے پہلے جو لیکچر تمہیں مل چکے ہیں انہیں یاد رکھنا۔" گو آنٹی نے سرگوشی کی تھی لیکن آنٹی کو کسی نے بتایا نہیں تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح "بلند آواز" میں سرگوشی کرتی ہیں۔ میں نے بمشکل اپنی ہنسی قابو میں کی۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب لڑکوں کو لڑکیوں کے سامنے ڈانٹ پڑتی ہے۔ انہیں پھٹکارا جاتا ہے۔ انہیں 'الو گدھا' کہا جاتا ہے۔ آہ۔ اب وہ لڑکا اپنے اسکول کے تھیٹر کا جانی ڈیپ ہو یا ریسلنگ رنگ کا "ہوگن" لڑکیوں کے سامنے وہ پھس پھسا کر زیرو ہوجاتا ہے۔

"مجھے تو تمہاری حیثیت وہی پرانی کی پرانی لگ رہی ہے۔" میرا اشارہ آنٹی کی سرگوشی کی طرف تھا جس میں وہ چپکے سے اسے پھٹکار گئی تھیں۔

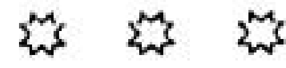
"لیکن تمہاری شکل مجھے نئی نئی لگ رہی ہے۔۔۔ کیا کرتی رہتی ہو تم اپنی شکل کے ساتھ۔۔۔ پہلے اچھی خاصی لومڑی جیسی لگتی تھی اب ایک دم سے چھپکلی سی ہوگئی ہو۔ دیواروں پر رینگ رینگ کر تمہارے ہاتھ بھی خراب ہوگئے ہیں۔ اگر تمہیں جانوروں میں دلچسپی ہے تو کوئی اچھا جانور بنو جیسے چمگادڑ۔۔۔ یا۔۔۔"

"شٹ اپ!" مجھے اپنے جسم کا سارا خون ابلتا ہوا محسوس ہوا۔ "اپنی شکل دیکھی ہے تم نے؟ پچکی ہوئی رگبی بال۔"

"اوہ!" وہ محفوظ ہوا۔ "کبھی رگبی بال ہاتھ میں پکڑ کر بھی دیکھی ہے؟ یا بس ٹی وی سے رگبی کا نام ہی سیکھا ہے؟ تم جیسی لڑکیاں دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے گوگل سے فلموں' کھلاڑیوں' شہروں' ہوٹلوں' کھانوں' آرٹ کے نمونوں کے نام دیکھ کر یاد کرلیتی ہیں۔ پھر

ایسے ظاہر کرتی ہیں جیسے ہم سے زیادہ تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ رگبی کے ایک آدھ کھلاڑی کا نام بھی تم نے یاد کیا ہوگا۔ دس بارہ فٹ بال کے کھلاڑیوں کے نام، کچھ سائنس دانوں کے نام، چند کلاسک فلموں اور کتابوں کے نام۔ ہو گئی امپریسو لسٹ تیار۔ ویسے اس بار تم نے "کتنی کتابیں" لا کر اپنے کمرے میں رکھی ہیں؟"

"اس بار ڈریکولا ان پاک لینڈ رکھی ہے۔" میں چلا اٹھی۔ میرے اعصاب جواب دے گئے تھے اور میرا خون ابل ابل کر اب سوکھنے لگا تھا۔ اس سے پہلے میں اپنا سارا خون خشک کروالیتی میں اس سے دور ہو گئی۔



مجھے زندگی میں دو بڑے صدمات سے گزرنا پڑا۔ ایک بچپن کی منگنی کا، ایک میری وارڈروب کے "معذور" ہو جانے کا۔ دونوں صدمات جان لیوا تھے۔ دونوں صدمات کے واقع ہونے کے دن، میری زندگی کے بلیک ڈے تھے۔ کمرے میں بند ہو کر میں نے "آدھے گھنٹے" کی خاموشی اختیار کی اور موم بتیاں جلا کر وارڈروب کے سامنے رکھ دیں اور خود ان کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" ماما کمرے میں آئیں۔

"تعزیتی تقریب۔"

"کیوں کیا ہوا؟" پھر تمہاری الماری میں چوہا گھس گیا اور تمہارا کوئی نیلا پیلا ماسک کھا گیا۔

"ماما! ایک تو اب میں ماسک نہیں پہنتا دوسرا چوہیا آئی تھی چوہا نہیں۔۔۔ وہ کتر کر نہیں گئی کاٹ کر گئی ہے۔"

"اوہ! ویسے مجھے کتنے منٹ کی خاموشی اختیار کرنی ہوگی؟"

"آپ کو میرے یونی ورسٹی جانے تک خاموشی اختیار کرنی ہوگی۔" میرا مطلب عروہ سے تھا کہ اب کوئی اس کا نام بھی میرے سامنے نہ لے۔

"اپنی تقریب جاری رکھو۔" وہ ہنسنے لگیں۔

کتنی بے فکری سے ماما ہنس رہی تھیں۔ کیا وہ دیکھ نہیں ر... تھیں کہ میں نے وارڈروب کے سامنے ایک نہیں دو نہیں پوری تین درجن کینڈلز جلا رکھی ہیں۔ کیا انہیں نظر نہیں آرہا کہ میں نے غم میں لنچ بھی نہیں کیا اور میں کوئی ایک ہزار بار اپنے کپڑے نکال کر دیکھ چکا ہوں کہ شاید کسی کا کچھ ہو سکے۔ جن کا اب یہی ہو سکتا تھا کہ یا میں خود "ٹیلر" بن جاؤں اور ان سب کو کسی نہ کسی طرح سے پہننے کے قابل کروں یا پھر پارٹ ٹائم جاب کروں اور اپنے لیے نئے کپڑے خرید لوں۔

"میں ٹیلر بھی بنا اور مجھے پارٹ ٹائم جاب بھی کرنی پڑی، پھر بھی نقصان وہیں کا وہیں رہا۔"

رائن کی ماما اکثر رائن کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہیں۔ "کچھ عذاب اتنے وزنی ہوتے ہیں کہ انہیں چھوٹی موٹی دعائیں ٹال ہی نہیں سکتیں۔" ٹھیک کہتی ہیں وہ۔ کچھ عذاب اتنے وزنی ہوتے ہیں کہ انہیں چھوٹی موٹی تدبیریں ٹال ہی نہیں سکتیں۔ مجھے بھی اب کوئی بڑی ہی تدبیر آزمانی ہوگی اور یہ رہی وہ تدبیر۔

میں کشف کے نکاح میں شرکت کرنے کے لیے آیا ہوں۔ ابھی فنکشن شروع نہیں ہوا۔ کسی مقامی سنگر کو گانے کے لیے بلایا گیا ہے لیکن ابھی تک وہ آیا نہیں۔ ہم سب اپنی اپنی آوازیں نکال کر ساؤنڈ سسٹم کو چیک کر رہے ہیں۔ شایان، میرے کزن کے کسی انکل نے اپنے بیٹے کے میڈیکل میں انٹری ٹیسٹ میں پاس ہونے کی خوشی میں اگلے ہفتے اپنے گھر دعوت کا اعلان مائیک پر آکر کیا اور سب کو شرکت کی دعوت دی۔

"تمہیں کوئی اعلان نہیں کرنا؟ شایان مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ اس کا اشارہ شاید میری شادی کی طرف ہے۔"

"ہاں! کیوں نہیں۔۔۔ جلد ہی میں تمہیں اپنی منگنی میں انوائیٹ کروں گا۔"

"منگنی کرنے کی کیا ضرورت ہے نکاح کرنا یا شادی۔۔۔ ویسے ہی تمہاری منگنی کا دورانیہ کافی لمبا ہو گیا ہے۔"

"کب منگنی کا دورانیہ لمبا ہوا ہے؟ منگنی تو ابھی میری ہونی ہے۔"

"میں عروہ سے تمہاری منگنی کی بات کر رہا ہوں۔"

"کون عروہ؟ میں کسی عروہ کو نہیں جانتا۔"

"تم مذاق کر رہے ہو؟" وہ حیران ہوا۔

"مجھے مذاق کی عادت نہیں ہے۔ اس سے منگنی کا اعلان کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی خودکشی کا اعلان کردوں۔ اگر میری کوئی منگنی ہوئی بھی ہے تو میں اسے توڑتا ہوں۔"

میرا پلان کچھ اور تھا لیکن ہو کچھ اور گیا۔ جو ہو گیا وہ بھی کچھ ایسا برا نہیں تھا۔ کافی مہمان آچکے تھے، لیکن ابھی لڑکے والے نہیں آئے تھے۔ مائیک پر شایان کا دس بارہ سالہ کزن کھڑا نیم مزاحیہ انداز میں وہاں موجود اپنے رشتے داروں کی آوازوں کی نقل اتار کر سنا رہا تھا اور سب محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ میرے اور شایان کے درمیان جو مکالمہ چل رہا تھا وہ اس کے کان سے گزر رہا تھا۔ اس نے گردن میری طرف موڑ کر شرارت سے پوچھا۔

"یہ والا اعلان بھی کر دوں مائیک پر۔۔۔" میں نے بچے کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھا اور گردن کو ہاں میں ہلا دیا۔

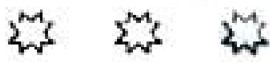
"عروہ سے منگنی کا اعلان کرنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی خودکشی کا اعلان کردوں۔ اگر میری کوئی منگنی ہوئی بھی ہے تو میں اسے توڑتا ہوں۔" لڑکے کی یادداشت بھی اچھی تھی اور اس نے میرے انداز کی نقل بھی ٹھیک ٹھیک اتاری تھی۔ اس کا اندازہ مجھے ہال میں یک دم پھیل جانے والے سناٹے سے ہوا۔ خوش قسمتی سے خاندان میں ایک ہی عروہ تھی اور اس سے بھی زیادہ خوش قسمتی سے بہت سے لوگ یہ پیش گوئی پہلے ہی کر چکے تھے کہ "ہم دونوں کی منگنی" شادی تک نہیں پہنچے گی۔ اعلان بھی ہو گیا، ان کی پیش گوئی بھی سچ ہو گئی۔ شایان نے بڑھ کر اس لڑکے کے ہاتھ سے مائیک لیا۔

"بچہ ہے، مذاق کر رہا ہے۔" شایان نے مائیک میں کہا۔

"نہیں یہ سچ ہے۔" میں نے مائیک کے آگے منہ کر کے کہہ دیا۔

اتنی سی ہمت کی بات تھی اور بس بات ختم۔

پاپا کی جیب میں اس وقت اگر کوئی پسٹل ہوتی تو میری لاش مائیک کے پاس پڑی ہوتی۔ اگر پسٹل نہیں بھی تھی تو بھی وہ دونوں ہاتھوں کے حملوں سے مجھے لاش بنانے آرہے تھے لیکن انکل نے میری جان بچالی۔ انہوں نے پاپا اور ماما دونوں سے کہہ دیا کہ فیصلہ دونوں بچے ہی کریں گے، ہمیں انہیں مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اس وقت بات کو بڑھانے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میں واپس کینیڈا آگیا۔ میں اب خوش تھا اور مطمئن بھی۔ اس سب سے میں نے یہ سبق سیکھا کہ "تھوڑی سی ہمت آپ کو بڑی مصیبت سے بچا سکتی ہے۔" اور ہاں میں بتانا بھول گیا۔ وہ میرے چچا کی بیٹی عروہ ہے نا، اس کے کمرے میں مجھے کچھ دیر رکنا پڑا۔ کمرے میں، ایک میں تھا، ایک وارڈروب تھی اور میرے ہاتھ میں ایک بلیک آئل پینٹ باکس تھا۔ میں نے اس کے کپڑوں کو بیڈ پر پھیلایا، باکس میں برش بھگویا اور کود کود کر گیلے برش کے وار ان قیمتی ملبوسات پر کیے۔ جو اس کے کہنے کے مطابق بڑے برانڈ اور مہنگے مہنگے تھے۔ "اب وہ کپڑے دنیا کے کسی بھی لانڈری ہاؤس میں جاتے وہاں سے ویسے ہی واپس آتے جیسے گئے تھے۔"



میں اس وقت ریسٹ روم میں تھی۔ لڑکے والے آنے ہی والے تھے۔ ہم سب لڑکیاں اپنے اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہی تھیں کہ انکل نیاز کا چھوٹا بیٹا بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"عمار بھائی کہہ رہے ہیں کہ وہ مرجائیں گے، عروہ آپی سے شادی نہیں کریں گے،" انہوں نے مائیک پر کہا ہے یہ۔" لڑکیوں کے میک اپ کرتے ہاتھ رک گئے اور وہ میرا منہ دیکھنے لگیں۔

"وہ مذاق کر رہا ہو گا۔" میری ایک کزن نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا۔

"لیکن انہوں نے کہا' وہ سچ بول رہے ہیں۔"
میں جان گئی کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ "مجھے کون سا اس گدھے سے شادی کرنی ہے۔" میں نے غصے سے چلا کر کہا۔
میری کزنز استہزائیہ مجھے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے خیال میں' میں پاگل تھی' جو عمار کو گدھا کہہ رہی تھی۔ ان سب کے نزدیک کینیڈا میں رہنے والا انکل کا اکلوتا ڈیشنگ بیٹا گدھا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی گدھا ہو سکتا تھا تو وہ میں تھی۔ الٹا مجھے گدھا بنا کر ایک دم سے ہی ساری لڑکیوں کا میک اپ ہو گیا۔ ایک دم سے ہی انہیں جلدی سے باہر جانا تھا۔ ایک دم سے ہی انہیں یہ بھول گیا کہ انہیں مجھے بھی ساتھ لے کر باہر جانا تھا اور ایک دم سے ہی سارا ریسٹ روم خالی ہو گیا اور میں اکیلی کھڑی رہ گئی اور میرا خالی دماغ جیسا کہ ممی کو لگتا ہے' وہ عمار کے لیے شدید غصے سے بھر گیا۔
تقریب کے بعد جس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھا مووی دیکھ رہا تھا اور ساتھ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا' میں وہاں جا دھمکی۔
"تم اس غلط فہمی میں کیوں تھے کہ میں تمہیں اپنا منگیتر سمجھتی ہوں۔" میں نے ہاتھوں کو اس کی گردن سے دور رکھنے کی باقاعدہ تگ و دو کی۔
"یہ غلط فہمی ہمارے والدین کو تھی۔" وہ دیکھ سکتا تھا کہ میں کیسے اپنے ہاتھوں کو سنبھال رہی ہوں اور وہ محظوظ ہو رہا تھا۔
"تو تمہیں یہ غلط فہمی مائیک پر ہی دور کرنی تھی؟"
"یہ مجھ سے غلطی ہوئی۔ دراصل اس کا اعلان مجھے اس سے بھی بڑی جگہ پر کرنا چاہیے تھا۔" وہ ابھی بھی ڈھیٹ ہی بنا ہوا تھا۔
"میں تم سے اپنی منگنی بہت پہلے توڑ چکی ہوں۔"
"لیکن تم نے اس کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اعلان میں نے کیا ہے۔"
"تو تم اب یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"میں اپنے چچا کے گھر موجود اپنے کمرے میں بیٹھا' ٹی وی دیکھ رہا ہوں۔ ویسے تم اتنے غصے میں کیوں ہو؟ تمہیں تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ میں نے خود کو تو مصیبت سے بچایا ہی ہے' تمہیں بھی بچا لیا۔"
"تو تم مان رہے ہو کہ تم مصیبت ہو جس سے میں بچ گئی؟"
"میں تمہیں احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں میں مان رہا ہوں کہ تم نے مجھے متاثر نہیں کیا' اس لیے مجھے تمہارے لیے مصیبت بننا پڑا۔"
"اوہ!" میرے گال غصے سے سرخ ہو گئے اور ہونٹ نیلے۔ کاش میں سانپ ہوتی اور اسے ڈس لیتی اور اسے نیلا کر دیتی لیکن کیونکہ میں سانپ نہیں ہوں اور اسے نیلا نہیں کر سکتی' اس لیے میں اپنے کان غصے سے سرخ کر رہی ہوں۔
"مجھے تمہیں متاثر کرنا بھی نہیں تھا' کشف کے نکاح میں تمہیں کافی لڑکیوں نے امپریس کیا تھا۔"
"تم ان لڑکیوں سے جیلس ہو؟"
"میں ہر لڑکی سے جیلس ہوا کرتی تھی کہ وہ کیوں اتنی خوش قسمت ہیں کہ تم جیسا لڑکا ان کا منگیتر نہیں ہے لیکن اب ہر لڑکی مجھ سے جیلس ہوا کرے گی۔" میں کہہ کر جانے لگی۔
"تمہیں یہ دکھ تو ہو گا کہ مجھ جیسے ہینڈسم لڑکے نے تمہیں چھوڑ دیا۔"
"دکھ؟ ہاں بہت دکھ تھا لیکن پہلے کہ تم جیسے ابنارمل لڑکے سے میرے ماں' باپ نے میرا رشتہ طے کر دیا۔"
"تو تم خود کو نارمل سمجھتی ہو۔"
"تمہیں تو کافی دکھ ہو رہا ہے اپنے ابنارمل ہونے کے بارے میں سن کر۔ ان فیکٹ تمہیں یہ برا لگ رہا ہے کہ میں نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی۔"
"گھاس چرنے سے تو تمہیں ہی فرصت نہیں تھی۔ اب جاؤ مجھے غصہ نہ دلاؤ۔ ورنہ تمہیں سزا دینے کے لیے میں اس رشتے کے لیے ہاں بھی کہہ سکتا ہوں لیکن یہ سزا ساتھ مجھے بھی بھگتنی ہو گی۔"
"ہاں! یہ سزا تمہیں ہی بھگتنی ہو گی۔" یہ وہ خیال تھا جو میرے ذہن میں آیا اور پھر بھی ذہن سے نکلا ہی

نہیں۔



مجھے ڈر تھا کہ جیسے ہی ہم لوگ کینیڈا واپس آئیں گے ماما' پاپا دونوں مجھ پر حملہ کردیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دونوں کا رویہ بہت اچھا رہا' بلکہ ایک دن تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ "تم ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کردینا لیکن پہلے اچھی طرح سے سوچ لینا۔" گو میں اپنے فیصلے سے وہاں سب کو آگاہ کرچکا تھا اور بہت ہلکا پھلکا تھا پس مجھے مزید سوچنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن پھر سے ایک دم سے جیسے مجھ پر بہت وزنی بوجھ آ گرا۔ یعنی ابھی مجھے پھر سے سوچنا ہے۔ ٹھیک ہے میں سوچ لیتا ہوں۔ کل رات سوچوں گا' کل میں فری ہوں۔ کل کی رات آئی تو میں نے سوچا کہ آج کل میرے ایگزامز چل رہے ہیں' مجھے ایگزامز کے بعد سوچنا چاہیے۔ ایگزامز کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ میرے انجوائے منٹ کے دن ہیں' مجھے ہر چیز بھلا کر صرف انجوائے کرنا چاہیے۔ انجوائے منٹ کے دن ختم ہوئے تو پھر سے کلاسز شروع ہوگئیں اور میں اسٹڈی میں بزی ہوگیا۔ پھر سے ایگزامز آگئے اور یونی ورسٹی کے آخری سال کی ٹف اسٹڈی شروع ہوگئی۔ اتفاق سے اگر مجھے کچھ وقت فری ملتا بھی تو میں کوئی نہ کوئی مووی دیکھ لیتا۔ کچھ نہ کچھ پکا کر کھانے لگتا یا رائن کے ساتھ گھومنے نکل جاتا۔ پھر میری جاب بھی بہت ٹف تھی۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ میں "سوچتا" ڈنر ٹیبل پر جیسے ہی پاپا مجھے غور سے دیکھتے میں جلدی سے کھانا ختم کرکے اپنے کمرے میں آجاتا۔۔۔ کیوں؟ کیا میں ڈر رہا ہوں کہ وہ مجھ سے میرے فیصلے کے بارے میں نہ پوچھ لیں' جس کے بارے میں ابھی میں نے ابھی تک سوچا ہی نہیں؟ اس فیصلے کے بارے میں جس پر میں بہت کلیئر ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں ڈر نہیں سکتا۔ یہ بھی پاپا کی کوئی ٹرک ہے۔ وہ مجھے الجھا رہے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر میرے ذہن پر بوجھ ڈال رہے ہیں۔ جو بھی ہے فیصلہ تو ہوچکا ہے' بس ایک بار پھر سے اس پر سوچ کر انہیں آگاہ کرنا ہے۔ چھوٹا سا معمولی سا کام لیکن بس مجھے وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔

"تمہیں وقت کی کیا ضرورت ہے' بس جھٹ جاکر کہہ دو کہ تمہیں نہیں کرنی عروہ سے شادی۔" میرے اندر سے آواز آئی۔

یہ چیٹنگ ہوگی۔ پاپا نے کہا ہے ایک بار اچھی طرح سے سوچ لو۔

پاپا کو کس نے بتانا ہے کہ تم نے چیٹنگ کی ہے۔ کہہ دینا اچھی طرح سے سوچ لیا ہے۔

میں گلٹ کا شکار رہوں گا۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔

دراصل تم عروہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ ہاں تم یہ چاہتے ہو۔ اب جب واقعی اسے چھوڑنے کا وقت آیا ہے تو تمہارے دل پر بوجھ ہے۔

ایسا نہیں ہے' زہر لگتی ہے مجھے وہ۔

اسی زہر کے لیے تم نے دو سال لیے ہیں سوچنے کے لیے۔ اگر ایسی ہی زہر ہے وہ تو جاؤ' جاکر انکار کردو ابھی۔

ابھی میں جاب کے لیے اپنے انٹرویو کی تیاری کررہا ہوں۔

"دیکھا۔ ! پھر تم کہو گے' تم انٹرویو دینے جارہے ہو' پھر تم کہو گے تم اپنی نئی جاب میں بزی رہتے ہو۔ پھر یہ وہ پھر وہ۔۔۔ تم ابھی جاؤ' ابھی کہو۔"

"ٹھیک ہے میں ابھی جارہا ہوں۔۔۔ ابھی ابھی۔۔۔"

میں پاپا کے روم میں آیا۔ وہاں ماما بھی تھیں۔ دونوں میری طرف ایسے دیکھنے لگے جیسے میں بوری میں بند وہ بونا تھا جو اسٹور روم میں قید تھا اور اب وہ بونا ان کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا ہے اور وہ سوالیہ بونے کو دیکھ رہے ہیں کہ "بول اے بونے! تجھے کیا چاہیے؟ تو اپنی بوری سے باہر کیوں آیا؟"

"پاپا مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" بونا اس لیے بوری سے باہر آیا۔

"ہاں بولو۔۔۔"

"وہ میں۔۔۔ وہ مجھے آپ کی گاڑی چاہیے۔۔۔ کل میرا انٹرویو ہے۔"

"کیا میں تمہیں ڈراپ کر دوں؟"
"میں خود چلا جاؤں گا۔" اپنی بات کہہ دینے کے بعد بھی جب میں وہاں سے نہیں گیا تو پاپا نے پوچھا۔
"اور کچھ کہنا ہے تمہیں؟"
"نہیں۔۔۔ آپ کو ایسا کیوں لگا؟"
"تمہاری شکل پر لکھا ہے کہ تمہیں کچھ کہنا ہے۔"
"نہیں مجھے کچھ نہیں کہنا۔" میں اپنے کمرے میں آگیا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا "یہ میں نے کیا کیا۔" سامنے آئینے میں میرا عکس مجھ پر قہقہے لگا رہا تھا۔ "میں نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ ضرور میرے دماغ کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔" میں نے اپنے کان بند کیے اور انٹرویو کے لیے اپنی فائل تیار کرنے لگا جو تیار ہی تھی لیکن اسے پھر سے تیار کرنے میں کیا مسئلہ تھا۔ کہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا تو پھر مسئلہ تھا کہاں؟ میرا انٹرویو ہو گیا۔ مجھے جاب مل گئی۔ پاپا اب روز میری شکل کی طرف دیکھتے ہیں۔
"آپ ایسے مجھے کیوں دیکھتے ہیں؟"
"کیا تمہیں مجھ سے کچھ کہنا ہے؟"
"آپ بہت اچھے ہیں۔۔۔ مجھے یہی کہنا ہے۔۔۔" اتنا کہہ کر میں کھسک گیا اور کیوں کھسک گیا' یہ بھی معلوم نہیں کر سکا۔ اب جب جب میں پاپا کو اور پاپا مجھے دیکھتے ہیں مجھے یہی لگتا ہے کہ ابھی وہ مجھ سے کہیں گے۔
"تمہیں کچھ کہنا ہے؟ ہے نا؟ کہہ دو۔"
لیکن تم ڈر کس بات سے رہے ہو؟ میں نے خود سے پوچھا۔
"تمہارے انکل' عروہ کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔" پاپا کمرے میں آئے اور فوراً" سے کہہ دیا۔
"اوہ!" تو وہ بات یہ تھی جس سے میں ڈر رہا تھا۔ عروہ کی شادی سے۔۔۔ یعنی مجھ سے اس کی شادی نہ ہونے سے پلس کسی اور سے ہو جانے سے۔۔۔ ان دونوں باتوں سے میں ڈر رہا تھا۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا' کبھی نہیں' وہ تو مجھے "نٹ" لگتی ہے۔
"تم اپنا فیصلہ بتاؤ۔۔۔ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو یا نہیں' تاکہ وہ کہیں اور کر سکیں۔"
"انکل نے عروہ سے پوچھ لیا؟" پتا نہیں کیسے میری زبان سے یہ نکل گیا۔ اف میری زبان۔۔۔ کیسے سلپ ہو جاتی ہے نا۔
"تم عروہ کو چھوڑو' تم اپنی بات کرو۔۔۔"
"میری بات۔۔۔"
"ہاں تمہاری بات۔۔۔ کیا تم دوبارہ سننے لگے ہو۔۔۔ بہرے ہو گئے ہو تم کیا۔" پاپا پتا نہیں کیا' کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔
"سن رہے ہو مجھے؟" پاپا نے میری آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا۔
"میری بات یہ ہے کہ جو عروہ کا فیصلہ ہو گا وہ مجھے منظور ہو گا۔" مجھے اپنی زبان کو کاٹ ڈالنا چاہیے۔ ایسی سلپنگ ٹنگ کو رکھ کر کیا کرنا ہے۔
"اچھا۔۔۔" پاپا نے گھور کر مجھے دیکھا اور پھر وہ مسکرانے لگے۔
یہ پاپا آخر کیوں مسکرا رہے ہیں۔ ارے میں بھی مسکرا رہا ہوں لیکن کیوں؟ اوہ میرے خدایا' یہ میں نے کیا کر دیا۔



اپنے ڈریسز کا غم کیسے میں نے کم کیا' یہ میں ہی جانتی ہوں۔ میرا خیال تھا اب وہ بڑا ہو گیا ہو گا لیکن کشف کے نکاح میں جو اس نے کیا اس نے اس کی ساری تمیز' بدتمیزی میں بدل دی۔ یہاں تک بھی سب ٹھیک تھا' اچھا ہی ہوا کہ اس نے منگنی توڑ دی۔ اس میں منگیتر بنے رہنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔ تھا کیا اس میں؟ میں بہت مطمئن ہوں۔ ممی میرے روم میں آئیں اور انہوں نے مجھ سے کہا۔
"تمہیں عمار پسند نہیں ہے؟"
"نہیں!" میں نے فوراً" کہا۔
"ٹھیک ہے۔۔۔ تم یونی ورسٹی جاؤ۔۔۔ اپنی اسٹڈی مکمل کرو' پھر ہمیں سوچ کر بتا دینا۔"
"لیکن میں بتا چکی ہوں۔"

”ابھی نہیں۔۔۔ ابھی تم چھوٹی ہو۔“
”اس سے زیادہ چھوٹی تھی‘ جب آپ نے میری منگنی کردی تھی۔ اب تو کافی بڑی ہو چکی ہوں‘ اب منگنی ختم کردیں۔“
”ہوگا وہی جو تم چاہو گی۔ کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔ ہم نے اپنی طرف سے اچھا فیصلہ کیا تھا لیکن خیر‘ تم وقت لے لو۔“
”وقت لینے سے کیا ہوگا؟“
”وقت اور تجربے سے بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں اور بہت سے لوگ اچھے لگنے لگتے ہیں۔“
”اچھا اور وہ۔۔۔ ہونہہ۔۔۔“ میں نے دل میں سوچا۔ میں نے رانیا کو بتادیا کہ میری منگنی ٹوٹنے ہی والی ہے بس۔
”گڈ۔۔۔ مبارک ہو۔“ اس نے دانت نکالے‘ جو مجھے بہت برے لگے۔
”کسی کی منگنی ٹوٹ رہی ہے اور تم مبارک باد دے رہی ہو؟“
”تو اور کیا کہوں؟“ تمہیں وہ پسند نہیں۔ تم اس سے نفرت کرتی ہو۔ ایسے انسان سے جان چھوٹنے پر تمہیں مبارک باد نہ دوں؟
”نہ دو۔۔۔ ہمارے یہاں یہ روایت نہیں ہے کہ منگنی ٹوٹنے پر مبارک باد دی جائے۔“ مجھ پر ابھی ابھی یہ انکشاف ہوا تھا کہ ہمارے یہاں یہ روایت نہیں۔
”روایت۔۔۔“ وہ بڑبڑانے لگی اور اس کا منہ بن گیا۔ بنا رہے منہ‘ کم سے کم اسے بات کرنے کی تمیز ہونی چاہیے۔ چند دن گزرے تو ہی رانیا اپنے ایک کزن کے بارے میں مجھے بتانے لگی۔ میں جانتی تھی اس کے کزن کو مل بھی چکی تھی کئی بار۔
”یہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔“ ساری بات بتا کر اس نے اپنی طرف سے بہت سرپرائز دینے والے انداز میں میرے کان میں سرگوشی کی۔
اس کا کزن بھی اچھا تھا اور یہ بھی اچھا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتا تھا لیکن مجھے یہ سب جان کر اچھا کیوں نہیں لگا۔ حیرت انگیز طور پر میں نے فوراً ”رانیا کے کزن کو مسترد کردیا۔
”تم عمار کو پسند کرتی ہو نا؟“
”نہیں‘ مجھے نفرت ہے اس سے؟“
”پھر میرے کزن کے لیے انکار کیوں کررہی ہو؟“
”کیونکہ تمہارا کزن مجھے پسند نہیں۔“
”میرے کزن میں ایسی کیا خامی ہے؟“
”خامی کا مجھے نہیں معلوم‘ بس وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔“
”بغیر خامی کے کوئی کیسے بُرا لگ سکتا ہے۔“
”لگ سکتا ہے۔۔۔ جیسے مجھے تمہارا کزن۔۔۔“
”تم اپنی منگنی توڑنا ہی نہیں چاہتیں۔“
”میری منگنی ٹوٹ چکی ہے‘ اب بس اس کا باقاعدہ اعلان ہونا ہے۔ ماما نے کہا ہے کہ میں اسٹڈی مکمل کرلوں‘ پھر اعلان ہوگا۔“
”ماما نے اعلان کرنے کے لیے تمہیں اتنا وقت نہیں دیا۔ تمہارا دل عمار کی طرف پھر جائے اس لیے وقت دیا ہے اور وہ پھر چکا ہے۔“
”میرا دل کیا پھر کی ہے؟“
”سب کا دل ہی پھر کی ہوتا ہے۔۔۔ مجھے سائنس دان بننا تھا لیکن اب میں آرٹس پڑھ رہی ہوں‘ دیکھا میرا دل پھر کی۔“
”دل پھر کی۔۔۔ دل پھر کی۔۔۔“ اف کانوں میں یہ فقرہ گونجتا رہا لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ خاندان سے میرے لیے چند پرپوزل بھی آئے‘ ظاہر ہے سب کو معلوم ہو چکا تھا کہ عمار نے کشفہ کے نکاح کی تقریب میں کیا کہا ہے۔ ممی نے انہیں فی الحال ٹال دیا کہ ابھی میں پڑھ رہی ہوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ جب وہ پرپوزل والی فیملی آئی تو میں اپنے کمرے میں خوف سے چھپ گئی۔
کیسا خوف؟ مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔ ”میں ڈر کیوں رہی ہوں؟“ میں خود سے پوچھنے لگی۔
”تم ایک دم سے کیسے بیمار ہو گئیں‘ ضرور تم نے اپنی اسٹڈی کی ٹینشن لی ہے۔“ ممی میرے ایک دم سے بیمار ہو جانے پر حواس باختہ سی ہو گئیں۔ میں خود

بھی حواس باختہ ہی تھی کہ میں ایک دم سے بیمار صرف اس لیے ہوگئی کہ میرا خاندان سے ایک رشتہ آیا ہے لیکن آخر کیوں میں خوف زدہ ہوں؟ کیوں؟ اس سے زیادہ خوف زدہ میں اس وقت ہوگئی تھی جب میرا آخری پیپر تھا۔

"لوگ ایگزمز سے فارغ ہوتے ہیں تو مزے کرتے ہیں، تمہیں ڈریپ پر ڈیپ لگ رہی ہے۔" میری فرینڈز مجھے تنگ کر رہی تھیں۔

میں مزے کیوں نہیں کر رہی؟ کیا وجہ ہے آخر؟

"بیٹا تمہارے انکل پوچھ رہے ہیں کہ عروہ کا کیا فیصلہ ہے؟ ممی ایک دن میرے پاس آئیں اور نرمی سے پوچھنے لگیں۔ اوہ تو یہ وجہ تھی لیکن یہی وجہ کیوں تھی؟ میرے ہاتھ میں ایک فوٹو البم تھا، جسے میں دیکھ رہی تھی۔ "مردوہ لوگوں کا فوٹو سیشن۔"

"کیسا فیصلہ؟" میں جانتی تھی کہ وہ کیا پوچھ رہی ہیں لیکن پھر بھی میں نے پوچھا۔

"عمار تمہیں پسند ہے یا نہیں؟"

"نہیں، وہ مجھے نہیں پسند۔"

ماما نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر اب تمہارا کیا فیصلہ ہے؟ اچھی طرح سوچ لیا ہے نا؟

"اچھی طرح تو نہیں سوچا لیکن....."



ہم پاکستان آچکے ہیں۔ بارات لے کر جا رہے ہیں۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ میں نے اس شادی سے انکار کیوں نہیں کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ میں خوش ہوں۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ مجھے خوش ہونا بھی ہے یا نہیں۔ میں خوش کیوں ہوں، کیونکہ میری شادی ہو رہی ہے یا اس لیے خوش ہوں کہ عروہ نے شادی سے انکار نہیں کیا۔ ویسے اس نے شادی سے انکار کیوں نہیں کیا۔ یہ بات مجھے خوف زدہ کر رہی ہے۔ میں بہت خوف زدہ ہوں، لیکن کیونکہ میں جان گیا ہوں کہ وہ عین نکاح کے وقت انکار کردے گی۔ جیسے میں نے مائیک پر جا کر منگنی کے ٹوٹنے کا اعلان کیا تھا، ایسے ہی وہ کرے گی لیکن نہیں اس نے نکاح کے وقت انکار نہیں کیا، بلکہ اب تو وہ میرے ساتھ آکر بیٹھ چکی ہے۔

"تو اب یہ ضرور رخصتی کے وقت بھاگ جائے گی۔ ہاں یہ ہی کرے گی۔" میں نے اسے دیکھا، وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہی ہے۔ اس کا چہرہ بھی میری طرح پیلا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خوف ہے۔ وہ بھی ڈری سہمی نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

"تم ایسے مجھے کیوں دیکھ رہی ہو؟" میں نے اپنا خوف دبا کر پوچھا۔

"تم ابھی بھاگ جاؤ گے نا؟" اس کی آواز کانپ رہی ہے۔

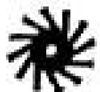
"نہیں! لیکن تم ایسا ضرور کرو گی۔" میری بھی آواز کانپ رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ پٹ پٹ مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں بھی پٹ پٹ اسے دیکھ رہا ہوں۔

"تم نے شادی سے انکار کیوں نہیں کیا؟" میں نے الٹا اس سے پوچھا۔

"میں بیوی بن کر ساری زندگی تمہیں سزا دینا چاہتی تھی۔" اس کی آنکھوں سے سارا خوف، وسوسے رخصت ہوگئے اور اس نے دلیری سے کہا۔

"اب تم بتاؤ....." اس کی بڑی بڑی آنکھیں ساری کی ساری سمٹ کر مجھ پر مرکوز ہوگئیں۔

"میں شوہر بن کر ساری سزائیں بھگتنا چاہتا تھا۔" میں نے بھی اسی کی طرح دلیری سے کہا اور اپنی آنکھوں کو اس پر سمیٹ کر مرتکز کردیا۔ میں کوئی اس سے ڈرتا تھا جیسے وہ مجھ سے نہیں ڈرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے نہیں ڈرتے، ہم دونوں ایک دوسرے سے نہیں ہارتے۔ ہم دونوں بچپن سے اب تک ایک تعلق میں بندھے رہے ہیں..... ہم دونوں کو اب بڑھاپے تک بھی ساتھ رہنا چاہیے..... ہے نا؟





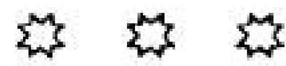
آئینہ ملک

ہزاروں خواہشیں ایسی

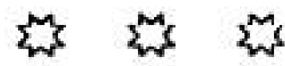
"آپ کا افسانہ پڑھ لیا ہے۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ آپ مزید کچھ اور لکھیں۔ یہ افسانہ تو شائع نہیں ہوگا۔" اللہ جھوٹ نہ لکھوائے تو ہم نے اس میسج کو پہلی بار پڑھتے ہی ڈیلیٹ کردیا۔

حد ہوگئی یعنی کہ یہ افسانہ بھی ردی کی نوکری کا رزق ہوا اور ہمیں کیا ملا' صلاحیت کا لالی پاپ۔ وہ بھی پیپرز سے عین دو دن پہلے اور افسانہ بھجوانے کے ٹھیک دو ماہ بعد۔ اب بندہ کیا پوچھے اور کیا بتائے۔ یہ قصہ زیادہ نہیں بس دو چار سال پرانا ہے درمیان میں وقفہ ہماری پڑھائی اور کچھ ہماری معصوم سی خودساختہ ناراضی کی

وجہ سے آیا مگر اب ہم بھی ڈھیٹ ہو چکے ہیں۔ ہر دفعہ ناراض ہونے کے بعد پھر سے کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔



پہلی بار ہم نے خط لکھا۔ ہمارا خط سراہا گیا۔ ہمیں عقلمند قارئین میں عقل مند ترین کا خطاب ملا۔ پھر یہ ہوا کہ کہانیوں کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی کرتے کرتے ہمیں لگنے لگا کہ فلاں کا اینڈ ایسے ہونا چاہیے تھا اور فلاں کا ویسے اور کبھی کوئی ناولٹ پڑھ کے لگتا یہ خیال تو ہمارے ذہن سے بھی گزرا تھا۔ پھر افسانے پڑھتے پڑھتے گمان ہونے لگتا۔ ارے یہ تو ہم بھی لکھ سکتے ہیں۔ پھر کیا تھا کتنے ہی پلاٹ سوچے جاتے اور ریجیکٹ کیے جاتے کاغذ قلم تک نوبت نہ آتی۔



نویں جماعت میں تھے کہ پہلا افسانہ لکھ ہی ڈالا' اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو وہ ڈائجسٹ کی تاریخ کا سب سے مختصر مگر جامع افسانہ ہوتا اگر جو شائع ہوتا۔

ان دو صفحوں میں ہیرو اور ہیروئن کے ملنے سے بچھڑنے اور نئے ہیرو کی انٹری سے اس کے ساتھ ہیروئن کی ہنستی بستی زندگی۔ سب ہی کچھ تھا' لکھ کر تنقیدی جائزہ لیا' کچھ زیادہ ہی "کم" لگا۔ خیر افسانہ تو ہوتا ہی چھوٹا ہے۔ تسلی دی اور افسانہ بھیج دیا۔

پھر کئی مہینے اس کے شائع ہونے کا انتظار کرنے کے بعد اناللہ پڑھ کے ایک طرف ہو گئے۔ اگلے تین سال تک بندہ بن کر پڑھائی کی (رسالوں کی) اور پھر میڈیکل میں ایڈمیشن نہ ہونے کی خوشی میں ایک اور افسانہ لکھا۔ وہ تھا تو افسانے جیسا پر اس کے اینڈ میں جب ہمیں کوئی محبوب نہ ملا تو "جنت کے پتے" کو محبوب بنا دیا۔ اس بار جواب آیا کہ "اس طرح کے افسانے شائع نہیں ہو سکتے۔"

اگلی دفعہ نئے جوش و ولولے کے ساتھ یونی میں ایڈمشن لیتے ہی نیا افسانہ لکھ ڈالا۔ جواب ملا۔

"اس میں نصیحت زیادہ ہے۔ آپ کی عمر کم ہے۔ آپ کوئی ہلکی پھلکی تحریر لکھ کر بھیجیں۔" گل ہی کٹ گئی اور ساتھ ہی لالی پاپ کہ آپ میں صلاحیت ہے آپ کسی اور موضوع پر لکھیں۔

اب بندہ کیا پوچھے اور کیا بتائے۔

خیر ہم نے بتایا کہ "ہم نے جو کچھ شعاع سے سیکھا وہی لکھا ہے۔" جواب ندارد۔

پھر پوچھا "شعاع کا دفتر کراچی میں کیوں ہے؟"

فٹ جواب آیا "کیونکہ شعاع شائع (____) کرنے والے کراچی میں رہتے ہیں۔"

ہم نے بتایا "ہم کراچی آگئے ہیں۔ کبھی تو آپ کے دفتر ضرور آئیں گے (اور آپ کی ردی کی ٹوکری چرا لائیں گے) جس میں ہمارے اور ہمارے جیسی بہت سی قاری بہنوں کے ادھورے ارمان (مصنف نہ بن سکنے کے) موجود ہوتے ہیں۔ ہم سوچ سوچ کر خوش ہوتے رہے۔ ان کا ٹھکا ٹھک "موسٹ ویلکم" آیا۔



اس دن ہم بہت خوش خوش گھر لوٹے' جی بھر کر رسالے پڑھے۔ پھر سوچا اب تو ہم محبت پر لکھیں گے۔ پر کیا کرتے ہم نے تو آج تک صرف محبت کو پڑھا ہی پڑھا تھا اور جو پڑھ کر لکھا تھا وہ تو نا قابل اشاعت ٹھہرا تھا پھر سوچا۔

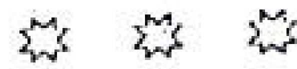
تجھ سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
ہم بھی محبت کے بارے میں لکھیں گے۔ ضرور شائع ہو گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ کس کی محبت کے بارے میں' کس سے محبت کے بارے میں؟

سب سے پہلے اپنی بہترین مصنفین کو ذہن میں لائے۔ جی! نمرہ احمد اور عمیرہ احمد ان کے سارے ناولز گھول کر پی لینے کے باوجود نہ تو ہم ان جیسا ہیرو اپنے تخیل میں لا سکے نہ ہیروئن اور الفاظ تو ویسے بھی ہمیں اپنے لکھنے تھے ہم کوئی نقال تھوڑی ہیں۔ عنیزہ سید' آسیہ رزاقی' راحت جبیں' بشریٰ سعید اور دیگر معزز مصنفین کے جیسا بھی ہمیں پتا تھا ہم نہیں لکھ

سکتے۔

آج کل کی مصنفین سمیرا حمید، سمیرا افضل، مصباح، ایمل رضا، جیسا لکھنا بھی ہمارے اختیار سے باہر، پھر بھی سوچا لکھنا تو ہے۔ کسی کو پسند آنے جوگا نہ سہی ڈائجسٹ میں شائع ہونے جوگا سہی۔

خیال آیا اپنے اردگرد سے کسی کی محبت کو قیامت کی نگاہ سے تاڑتے اور اپنے لفظوں کا لباس پہنا کر کاغذ کی زینت بنا دیتے ہیں۔ بس اتنی سی بات تھی ہم ایویں ہی پریشان ہو رہے تھے۔



سب سے پہلے اپنی بہن کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا آخر ان کا ایک عدد جائز منگیتر ہے۔ پر یہ کیا ان کی سوچ تو ان کی بکس سے لے کر بکس پر ختم ہوتی نظر آئی۔ ویسے بھی ان دنوں وہ بورڈ کے ایگزامز میں مصروف تھیں۔

پھر بھیا کی محبت کا جائزہ لیا۔ ہاں بھئی! یہ ٹھیک ہے۔ پھر ان کی منگیتر کو دیکھا۔ ان کی منگنی کے حالات یاد کیے کہ کس طرح انہوں نے اماں کو اور اماں نے ابا کو واسطے دے کر منگنی کے واسطے راضی کیا تھا۔ واہ جی واہ! مل گیا افسانہ۔ لکھا، بھیجا اور پھر وہی بے تحاشا انتظار، جان لیوا انتظار۔



اب ہم نے باقاعدہ دھمکایا کہ اگر شعاع کا دفتر ملتان میں ہوتا تو ہم وہاں آ کر فرش گھسا دیتے، جواب ندارد۔

خیر سب کو مارجن دینا ہمارا مشغلہ ٹھہرا۔ ہم صبر سے انتظار کرتے رہے، پھر ہماری چھٹی حس نے ہمیں خبردار کرنا شروع کیا، ہو نہ ہو ردی کی ٹوکری اس دفعہ بھی ہمارا حق غصب کر گئی۔ خیر غلطی بھی ہماری تھی۔ ہم نے نہ برا نہ سمجھا اٹھا کر لکھ دیا۔

"محبت کیا دیتی ہے؟ بے خودی، بے پروائی، بے نیازی اور کبھی کبھی بے عزتی بھی یعنی ہر وہ چیز جو بے سے شروع ہو۔ بے جو نفی کی علامت ہے۔ کیا محبت واقعتاً" ہر چیز کی نفی کر دیتی ہے۔"

حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم نے تو اردو سیکھی ہی ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے تھی اور بھلے ہماری عمر کم ہو۔ ہم نے شعاع اور خواتین تو بہت زیادہ پڑھے ہیں۔ پھر بھی لوگ ہماری ذہنی پختگی پر اعتبار نہ کریں، ہک ہاہ۔

ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے (بس اپنے الفاظ یاد کر کے ذرا جذباتی ہو گئے تھے۔)



ہماری چھٹی حس کا کہا درست نکلا۔ صبح صبح شعاع کا جو پیغام موصول ہوا وہ تو ہم آپ کو پڑھوا ہی چکے ہیں۔ اب ہم اپنے الفاظ کو برتیں گے۔ اس جذبے کو جسے سب محبت کہتے ہیں محسوس کریں گے اور پھر افسانہ لکھیں گے۔ ہم نے تصور میں ردی کی ٹوکری کو لاتے ہوئے سوچا۔ اور اپنے اردگرد نظریں دوڑائیں۔

سب سے پہلے خاندان پر بھئی "اول خویش بعد درویش" پر نہ جی، اول تو ہم سے بہت بڑے یا چھوٹے لڑکے موجود تھے اور اگر کوئی برابر کا تھا بھی تو انگیجڈ۔

پھر محلے پر نظر دوڑائی۔ سامنے والے گھروں میں تو سارے انکلز اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے موجود تھے۔ ساتھ والا۔۔۔ ہم عمر تو ہو گا پر کلاس میں پیچھے تھا اور پیچھے والے انتہائی کچھورے۔ بہت سوچنے کے بعد ہم نے دو گلیاں چھوڑ کر رہنے والی اپنی سہیلی کے بھائی کے متعلق سوچا۔

چند دن بعد اس سے ملے' باتوں باتوں میں بھائی کا تذکرہ ہوا۔ کہنے لگی "وہ اپنی کلاس فیلو میں انٹرسٹڈ ہے

اور اماں جان اپنی بھانجی میں "صد افسوس" ہم اور کیا کہتے۔ ہمیں تو اپنا افسوس تھا۔

پھر ہم نے اپنی ڈھارس بندھائی کہ ہم کون سا سچ مچ اس کی ہیروئن بننے والے ہیں صرف یہی تو محسوس کرنا ہے کہ جب محبت ہوتی ہے تو اندر کا خوش گوار موسم' باہر کے حبس کو کس حد تک کم کرتا ہے۔ ایسے میں اے سی چلانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے یا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ حرکت پھر بھی معیوب لگی سو ہم نے سہیلی کے بھائی کو بھی اس فہرست سے نکال باہر کیا۔ بھئی کسی کی محبت میں مبتلا ہونے کی کوشش نامعقول تو ہے ہی مگر کسی اور کی محبت سے محبت تو معیوب بھی ہے۔



اب صرف ایک option (آپشن) ہی رہ گیا تھا جو ہم نے ناگزیر حالات میں استعمال کرنے کا سوچا تھا۔ آپ سمجھ گئے ہنہیں! چلو ہم بتاتے ہیں۔ ہمارے کلاس فیلوز۔۔۔ ویسے تو ہم ان کے بارے میں سوچنے کے مکمل طور پر خلاف ہیں۔ کیونکہ ہیرو کبھی بھی ہیروئن کا ہم عمر نہیں ہونا چاہیے (ذاتی خیال) پر تایا نا' ہم ہیروئن نہیں 'مصنفہ بننا چاہتے تھے وہ بھی محبت کی۔

تو بس' روزین! ہاں یار یہ ٹھیک ہے۔ ہنستا بھی تو کتنا ہے۔۔۔ پر یار یہ تو شکل سے ہی معصوم سا بچہ لگتا ہے۔ اوہ یہ موٹو اس کے تو گال پہ چٹکی بھرے "بندہ" تو جی یہ دو لوگ تو ہم نے خیالوں میں ہی ریجیکٹ کر دیے اور باقی سب کو اگلے دن جب میم کنزیٰ حاضری لینے لگیں تو رول نمبر 12 یہ تو اتنا سڑا ہوا ہے۔ ناں بابا ناں' رول نمبر 16 یہ تو اتنا لمبا ہے اب بندہ سیڑھی لگائے کیا؟ رول نمبر 18 یہ تو مغرور ہی اتنا ہے جیسے پورا ڈپارٹمنٹ اس کے کندھے پر کھڑا ہے۔ غرض اسی طرح ہم نے ہر بندہ ریجیکٹ کیا۔

جو چار پانچ لوگ ذرا معقول لگے تو ان میں سے ایک کو تو لڑکیوں سے بات کرنے کی ہی تمیز نہ تھی تو تڑاک

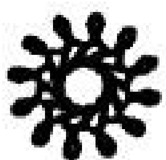
کر کے بولتا۔ دوسرے کا نام میرے بھیا جیسا لگتا جیسے کلاس میں بھی بھائی موجود تیسرا کلاس کا ہینڈسم ترین لڑکا اور سنگر خیر اس پر تو ہر لڑکی کا کرش تھا۔ ہم کیونکر ایسے مقبول ترین لڑکے کے لیے خوار ہوں اور پھر کلاس فیلوز اب جتنے بھی اچھے بن چکے ہوں۔ گرومڈ' ویل ڈریسڈ ان کا پہلے دن والا اجڈپن بھلا کر' ان کے مارکس سے جیلس ہوتے ہوئے ان کی معلومات سے متاثر تو ہوا جا سکتا ہے۔ ان سے محبت نہیں کی جا سکتی۔

اسی لیے ہم کلاس کے جتنے لڑکوں سے متاثر تھے انہیں بھی اس فہرست سے نکال دیا۔ اب کیا بچا؟ میرا مطلب ہے کون بچا؟



یوں ہمارا آخری آپشن بھی ختم ہوا۔ اب ہم کیسے اور کب کسی کی محبت میں مبتلا ہوں گے؟ یا پھر کب اس مفروضے (محبت 'مصنف' بننے کی لازمی شرط ہے) کو کالعدم قرار دیں گے۔ ہم نہیں جانتے۔

مگر جب بھی ایسا ہوا۔ ہم ایک اور افسانہ لکھیں گے۔ جس میں ہم ردی کی ٹوکری کی شرانگیزیوں کی تفصیل لکھیں گے۔ اور اس کا نام ہو گا۔ ردی کی ٹوکری یا پھر ناکام مصنفہ۔



آسیہ رزاقی

تم میری آس ہو

زندگی۔۔۔ اندازہ ہی نہ تھا اتنی مشکل ہوگی۔ ہر لمحہ امتحان سے سابقہ ہوگا۔ اور پتا چلتا ہی نہیں کہ اس کا رزلٹ کب آئے گا۔ انتظار بھی حوصلہ شکن ہے۔ رزلٹ کے انتظار میں کہیں سارے جذبے ہی نہ سو جائیں۔ کم سنی میں ہی اتنے تجربات ہوئے۔ یقین ہی نہیں آتا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے اور اگر یہ بھی امتحان ہے۔ تو اس کا رزلٹ۔۔۔ کیسا ہوگا؟ یا پھر۔۔۔ سب بے نتیجہ۔

خالہ بی اس وقت باتھ روم میں تھیں۔ اور دروازے پر دستک کسی بے قرار روح کا اشارہ کر رہی تھی۔ گھنٹی بھی ساتھ ساتھ میوزک کا کام دے رہی تھی۔ ویسے تو گھنٹی کی آواز باتھ روم میں بھی سنی جاسکتی تھی آسانی سے۔ لیکن۔ اگر خاموشی ہو تو خالہ بی جب کسی سے گفتگو کر رہی ہوں تو باہر کی آواز سننے سے قاصر اور دروازہ۔۔۔ بدرجہ مجبوری۔ اسی کو کھولنا پڑا۔ یہ بھی خیال کہ دستک دینے والا نہ جانے کتنا

مکمل ناول



ضروری پیغام لایا ہو۔ پھر خالہ بی کی ڈانٹ اسے ہی سننی پڑے گی۔ دروازے پر شناسا صورت نظر آئی۔

''او ہیلو۔ آہا۔ تم؟ کیسے؟ آجاؤں؟'' مختصر سوال۔

''ہاں۔ آجاؤ۔'' بدرجہ مجبوری اجازت دی ورنہ خالہ بی کی ڈانٹ کون سنتا کہ گھر آئے مہمان کو بھگا دیا۔ برکت سے منہ موڑ لیا۔ رحمت کو دھتکار دیا۔

''تمہارے ہاں سلام کا رواج نہیں؟'' تمسخر اڑا رہا تھا۔ اس کی شکل کا جو بارہ بجا رہی تھی۔ وہ بھی رات کے بارہ۔

''سلام۔ اب خوش؟'' وہ کب خوش تھی۔

(ارے لڑکے کو بلا کر بٹھا لیا۔ اکیلا لڑکا۔ شرم و حیا تو گھول کر پی لی۔ میں آجاتی۔ کھول دیتی دروازہ اور اگر کوئی ڈاکو ہوتا۔ صبر نہیں ہے آج کل کی لڑکیوں میں۔ ارشادات خالہ بی)

''تمہارے گھر میں خاطر تواضع کا بھی دستور نہیں ہے۔ اتنی گرمی میں آیا ہوں۔'' اسے یوں ہی ایستادہ دیکھ کر حیران ہوا۔

''اچھا۔'' کہہ کر اندر گئی۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس پکڑا لایا۔

''یہ۔ آواز کس کی آرہی ہے۔ کوئی مہمان آیا ہوا ہے کیا؟''

''نہیں۔ خالہ بی ہیں۔''

''پتا ہے۔ تم اکیلی ہوتیں تو بھلا دروازہ کھولتیں؟ کس سے باتیں کر رہی ہیں؟''

وہ چپ رہی۔ گلاس خالی ہونے کا انتظار تھا۔

''بتاؤ نا۔ کون آیا ہوا ہے؟ تمہارے سسرال والے؟ یا بتانا نہیں چاہتیں۔''

وہ ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی گلاس لینے کے لیے۔ ہاتھ گرا کر سامنے کرسی پر ڈٹ گئی۔

''ابھی آتی ہیں۔ خود پوچھ لینا۔''

''تم بتادو گی تو قیامت آجائے گی؟'' انگارے چبا رہا تھا۔ (ہاں شاید۔ آبھی سکتی ہے۔ بتادوں تو کیا سمجھے گا اور خالہ بی کو پھر بتائے گا۔)

''تم چاہتے ہو کہ آجائے؟''

قیامت نہیں۔ خود خالہ بی آگئیں۔ بولتی باتیں کرتی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ سلام کیا۔

''آئیں؟ اچھا؟ تم کب آئے؟ وعلیکم السلام۔ کتنی دیر سے بیٹھے ہو؟'' ترچھی نظر بھانجی پر بھی ڈالی۔ مطلب (نہیں مانا تم نے۔ کھول دیا دروازہ۔ کتنی دفعہ کہا ہے۔ یہ وہ)

''ابھی دو منٹ پہلے۔ گرمی بہت ہے باہر۔ اس لیے دروازے کو زور سے دھکا دیا۔ وہ ھل گیا کھٹ سے۔ آپ کو آواز دی تو تھی۔'' جھوٹ کے طومار باندھ رہا تھا۔

''آ۔ رے۔ ہاں۔ کمبخت کی چٹخنی ڈھیلی ہو گئی ہے۔ زور زیادہ لگایا ہو گا۔''

''مگر خالہ بی۔ خطرناک بات ہے۔ کوئی بھی زور لگا کر آجائے۔ ٹھیک کروالیں۔''

''میرے پاس کون بیٹھا ہے۔ جو ٹھیک کروانے والے کو بلواؤں اور کس کی مجال ہے کہ میرے دروازے کے پاس آکر پھٹکے بھی۔ جان نہ نکال لوں اس کی۔ ٹیڑھی نظر بھی کسی نے دروازے پر ڈالی۔ سمجھو۔ اپنی شامت کو آواز دی۔ اچھا خیر۔ تم بتاؤ۔ کیسے آنا ہوا۔ رفیعہ کیسی ہے اور وہ کیا نام تمہاری شیخوپورے والی بہن۔''

''سب ٹھیک ہیں۔ امی نے آپ کی خیریت پوچھنے بھیجا ہے اور یہ۔'' پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر لمبا سا لفافہ نکالا۔

''یہ۔۔۔ کیا ہے؟'' ناک چڑھالی۔ ہاتھ نہ بڑھایا۔

''یہ۔ مراد بھائی امریکہ سے آئے ہیں۔''

''اے مراد وہی نا۔ تمہارا چچازاد جو اپنی کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا۔ اس کی کہیں اور شادی ہو گئی۔ نامراد امریکہ چلا گیا۔''

''جی۔ تو ضرار بھائی نے آپ کے لیے خط بھیجا ہے۔ خط اور ڈالر بھی ہیں۔''

خالہ بی تن کر کھڑی ہو گئیں۔ ''اچھا۔ کیا سمجھا ہے

مجھے میں فقیر ہوں محتاج ہوں جو خیرات لیتی پھروں۔ لے جاؤ لفافہ اور کہنا مراد سے۔ ابھی میں اتنی محتاج نہیں ہوئی۔ شکر ہے پروردگار کا۔ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔ میری تمام ضرورتیں' حاجتیں وہی پوری کردیتا ہے۔ اسے لے جاؤ۔ لفافے کی طرف اشارہ کیا۔

"خالہ بی! خط تو پڑھ لیں۔ شاید کوئی ضروری بات..."

"خط کیوں پڑھوں؟ جب اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو اس لفافے کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں۔ جا بیٹا۔ گھر جا اور اس سوغات کو بھی ساتھ لے جا۔"

"اچھا۔ اچھا۔ جاتا ہوں۔ چھوڑیں لفافے کو۔ گرمی بہت ہے۔ کوئی ٹھنڈا شربت مل سکتا ہے۔"

"ہاں ہاں۔ اے کیوں نہیں۔" خالہ بی کے چہرے کے تاثرات یک دم تبدیل ہوئے۔

"اصباح۔ اے یہ نہ ہوا بچے کو شربت ہی پلا دیتی۔ گرمی اس بلا کی ہے۔ انار کا شربت برف ڈال کر لے آ۔ شاباش۔" اب ظاہر ہے اٹھنا پڑا۔ کتاب میز پر رکھی۔ خالی گلاس اٹھایا اور باہر چل دی۔

"آپ' ابھی میں آیا تو کسی سے باتیں کررہی تھیں۔" افوہ تجسس۔

"اے ہاں۔ وہ باتھ روم میں ایک کیچوا گھس آیا۔ اس کو ہی کہہ رہی تھی کہ بھئی۔ بھاگ جا نالی کے رستے۔ جدھر سے آیا ہے۔ مگر ڈھیٹ ایسا۔ اے ایسی اچھل کود مچائی۔

"اچھا' تو پھر کیا کہتا تھا۔ جائے گا کہ نہیں؟"

"لو۔ وہ کیا بولے گا۔ میں ہی بول رہی تھی۔ ہرگز نہیں گیا۔ کونے میں سکڑا پڑا ہے۔ اب میرے گانگوڑا۔ جب باتھ روم میں کوئی کیچوا آجائے۔ سمجھ لو اس کی موت لے آئی ہے یہاں۔ جسم کے ذرا ذرا سے ٹکڑے نامراد جدھر سے گزرتا ہے گراتا جاتا ہے۔ بس۔ پھر اگلے دن دیکھو مرا پڑا ہے۔"

"ویسے خالہ بی! آپ کیڑے مکوڑوں پر اتھارٹی ہیں۔ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں ہم دیکھا کرتے تھے۔ آپ چیونٹوں سے خوب باتیں کیا کرتی تھیں۔ مینڈک بھی آپ کے آس پاس گھوما کرتے تھے۔" اعزاز کو بچپن کی باتیں یاد ہیں؟

"ہٹ شریر۔ برسات میں کیڑے مکوڑوں کا راج ہوتا ہے اور کیچوے تو برسات میں ہی نکلتے ہیں مگر یہ جو باتھ روم کی نالی ہے' یہاں بارہ مہینے برسات رہتی ہے۔ اس لیے..."

شربت آگیا۔ خوب ٹھنڈا میٹھا۔ لذیذ۔

"اچھا خالہ بی! چلتا ہوں۔ ثریا کی شادی پر ضرور آیئے گا۔"

"اچھا۔ کہاں ہو رہی ہے۔ اللہ نصیب والی کرے۔"

"کارڈ چھپ جائیں تو بھیجیں گی امی! چلتا ہوں خالہ۔ السلام علیکم۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ خالہ بی غالباً" کیچوے کی اچھل کود سے خاصی تھک گئی تھیں۔ بیٹھی رہیں۔ اصباح سے کہا۔

"جا بیٹا۔ دروازہ اچھی طرح بند کر کے آنا۔"

یعنی۔ اسے دروازے تک جانے کی اجازت۔

دروازے کے پاس پہنچ کر اعزاز نے جیب سے وہی لفافہ برآمد کیا۔

"لو۔ یہ رکھو۔ اس میں خط بھی ہے پڑھ لینا۔ شاید کوئی کام کی خبر ہو۔" اصباح ہچکچا کر لفافہ پکڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں کیوں پڑھوں۔ اپنی اماں کو لکھا ہوگا۔"

"اچھا تو وہیں کہیں رکھ دینا۔ پڑھ ہی لیں گی اور تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو؟ حالت دیکھو اپنی۔ سسرال والے دیکھیں گے تو سمجھیں گے۔ خالہ بی فاقے کراتی ہیں۔"

"وہ۔ اصل میں امتحان کی تیاری کے لیے جاگنا پڑتا ہے۔ اس لیے۔"

"بھئی، ہم تو امتحان کے زمانے میں خوب ڈٹ کر کھاتے تھے اور جی بھر کر سوتے تھے۔"

"اچھا!" حیران ہوگئی۔

"ہاں اور کیا' جب بھی رات کو پڑھنے بیٹھتا۔ امی دودھ کا گلاس رکھ دیتیں وہ پیا اور وہیں میز پر سر رکھ کر۔ ٹن۔ کیسا جاگنا۔ کہاں کا پڑھنا۔"

وہ منتظر تھی کہ وہ باہر جائے تو دروازہ بند کرے' مگر اعزاز ایک باتونی۔ واپس آئی تو خالہ بی نے سر اٹھا کر کہا۔

"اتنی دیر کیوں لگی۔ باتیں کرنی تھیں تو یہیں کرلیتیں۔ بتاؤ۔ کیا کہہ رہا تھا۔" تحقیقات ضروری....

اس نے جھٹ لفافہ سامنے کیا۔ "یہ۔ یہ دے رہے تھے۔ میں نہیں لے رہی تھی۔"

سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ سرد آہ بھری۔ "رکھو اپنے پاس۔ صبح بینک میں لاکر میں رکھ آنا۔ ایک نہیں دو ڈالر.... سوسو کے چینج کرالینا۔"

"یہ... خط...."

"پھاڑ دو۔" آرڈر۔ اور فوری عمل کرنا لازمی۔ ان کے سامنے اس نے پھاڑ کر ڈسٹ بین میں ڈال دیا۔ لمبا سا کاغذ نہ جانے اس میں کیا کچھ لکھا ہوگا۔ معافی تلافی۔ حال چال یا گزارش۔ خط پھاڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ کتاب سامنے تھی۔ بیٹے سے نالاں۔ فون اسی لیے کٹوا دیا کہ اس کی آواز سننے کی خواہش نہ تھی ایک شخص کی خاطر اتنی اہم ضرورت سے پیچھا چھڑا لیا۔

اب صوفے پر آڑی ٹیڑھی لیٹی چھت گھور رہی تھیں۔ ظاہر نہیں کرتی تھیں۔ کبھی ذکر بھی نہیں کیا۔ کوئی بات۔ کوئی یاد۔ پتا نہیں کیسی ماں تھیں اور کیا سوچا کرتی تھیں۔ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی رہتیں۔ بولنے پر آتیں تو وقفہ نہ آنے پاتا۔

اعزاز... پرانے محلے میں جہاں اصباح کے والد کا گھر تھا۔ پڑوس میں رہتا تھا۔ اعزاز کی امی سے اصباح کی امی مصباح کی قریبی رشتے داری تھی۔ وہ لوگ تو اب بھی اپنے اسی گھر میں رہتے تھے ہاں اصباح اب وہاں نہ تھی۔ وہاں کیا نہ تھی بلکہ کہیں نہ تھی۔

اسے تو لگتا تھا۔ اس کا کوئی گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ سارے ٹھکانے عارضی ہیں اور خالہ بی بھی تو کہتی ہیں دنیا تو عارضی ٹھکانہ ہے اصل ٹھکانے پر پہنچنے اور خود کو اس اعلا مقام کا جائز وارث ثابت کرنے میں بھی تو اپنا ٹھکانہ ہونا چاہیے۔ یہ تو خالہ بی کی محبت اور اخلاص تھا کہ وہ اسے لے آئی تھیں۔ ورنہ کہاں جاتی۔ اعمال کی درستی کی کوشش بھی کرتی تھی۔ خالہ بی کی ہدایت کے مطابق۔ جتنا اس کی سمجھ میں آتا تھا۔

لڑکوں سے بالکل بات نہیں کرنی۔ لڑکوں کو نظر انداز کردینا۔ لڑکیوں کا زیادہ بولنا چیخ کر بات کرنا برا سمجھا جاتا ہے۔ وہ گھر میں بھی خاموش رہتی۔ کہیں جاتی چپ کا روزہ رکھ کر۔ کوئی مہمان آتا اس کے سامنے بت بن جاتی۔ گونگی کا کردار بہت اچھے طریقے سے ادا کرتی۔ کوئی اعتراض کرے تو خالہ بی اس کے سامنے ڈھال بن جاتیں۔ یہ تو کبھی نہیں جتاتیں کہ ان ہی کے فرمودات پر عمل کرکے وہ گونگی بنی ہے۔ فوراً کہتیں۔

"اے بھئی' اچھا ہے۔ خاموشی بہت بہتر ہے۔ بندہ گناہوں سے بچا رہتا ہے اور لڑکیوں کو باتیں بنانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ گھر میں بڑے ہیں وہ ہی بولنے کے لیے کافی ہیں۔"

"بڑے کون؟" خالی بی۔ اکیلی خالہ بی سب کو ہرا

سکتی تھیں۔ چپ رہ کر نہیں۔ بول بول کر اور خالہ بی بھی زبردستی یا "مجبوراً" یا "ضرورتاً" اس کی ذمہ داری بن گئی تھیں۔ وہ بہت کم کسی سے ملتی تھیں۔ رشتے داروں سے ملنا جلنا ان کے میاں کو پسند نہ تھا، مگر وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ تو جب اصباح پر افتاد۔ ایسی ویسی۔

ابا کے گزرتے ہی وہ اس اذیت رساں زمانے، تکلیف دہ دنوں کو یاد کرنا چاہتی تھی نہ یاد رکھنا۔ خاموشی میں پناہ لے لی تھی اس نے۔ خالہ بی اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئی تھیں۔ کبھی کبھی خالہ بی کی کوئی نند بھول بھٹک کر ان کے پاس آتیں ان سے ہمدردی کے اظہار میں، لیکن موقع ملتے ہی تنہائی میں اصباح سے سوالات بھی ضرور کرتی تھیں۔

"تم سے برتاؤ کیسا ہے؟ سختی تو نہیں کرتیں؟"

وہ نا سمجھی سے انہیں دیکھتی۔

"شکر کرو بھئی۔ ظالم جلاد عورت ہیں۔"

وہ حیران ہو جاتی۔ "میری خالہ ہیں۔ مجھ سے برا برتاؤ کیوں کریں گی؟"

ان کی آنکھوں کے زاویے بدل جاتے۔ بھنویں چڑھا کر۔ "نہ پوچھو۔ کب کسی سے بنا کر رکھی ہے انہوں نے۔ میاں کیوں چھوڑ بھاگے۔ بتاؤ۔ بیٹا کیوں بدل گیا ہے۔ کوئی وجہ؟ تمہیں تو مجبوری میں رکھا ہوا ہے۔ اکیلی جو رہ گئیں چلو۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ نہ تم اجڑتیں۔ نہ یہ بستیں....."

ایک لفظ سمجھ میں نہ آتا۔ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہتی، لیکن یہ پہلے کی بات تھی۔ اب وہ بہت کچھ جان گئی تھی۔

"ان لوگوں کی نظریں میرے گھر پر ہیں۔" خالہ بی نے ایک دن بتایا تھا۔

"کیوں؟ اس پر ان کا کیا حق ہے۔ یہ تو نانا کا گھر ہے۔"

"انہیں اس سے کیا غرض۔ ادھر میں میری ادھر یہ قبضہ کرنے آئیں۔ بھئی تاک میں ہیں۔ حق سے کیا۔ قبضہ جا۔ دعوا جھوٹا۔ یہ ہے ان کا مقصد۔"

گھر نانا کا تھا۔ اولاد نرینہ نہ ہونے کے باعث یہ گھر انہوں نے دونوں بیٹیوں کے نام کر دیا، لیکن ہوا یہ کہ خالہ بی کی شوہر سے بنی نہیں۔ وہ عیاش طبع تھے۔ لڑائی ہوتی رہتی۔ ایک بیٹا تھا۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ خالہ بی کو علم ہو گیا۔ شوہر کی دوسری بیوی بھی ہے۔ خالہ بی کا زیور وہ بہانے بہانے سے لے کر ٹھکانے لگا چکے تھے یا اس کلموہی کے حوالے کر چکے تھے۔ اب گھر فروخت کرنے کی بات کرنے لگے تو بات آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد۔ وہ سنا کہ کینیڈا چلے گئے۔ جہاں دوسری بیوی کے بھائی تھے۔ بیوی بھی چلی گئی۔

بیٹا بھی ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ خالہ بی کے حالات خراب ہوتے گئے تو اصباح کے ابا کے مشورے پر مصباح گھر سے دست بردار ہو گئیں۔ پورا گھر خالہ بی کو مل گیا۔ بہت عرصہ ہوا، مگر بے چارے ابا کو کیا علم کہ وہ اپنے گھر سے بھی بے دخل ہونے والے ہیں۔ وہ تو خیر پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی پہلی بیوی کے بیٹوں نے عرصہ دراز سے اپنے حصے کا دعوا کر رکھا تھا۔ باپ سے لڑائی کرتے اور بحث مباحثہ۔ اسی وجہ سے ان کا دل کمزور ہوتا گیا۔ خالہ بی نے اپنی سہولت کے لیے گھر کے ایک حصے کو کرائے پر چڑھا دیا۔ درمیان میں دیوار بنوا دی۔ کچھ دن کرائے دار نے کرایہ دیا۔ اب نہ گھر خالی کرتے نہ کرایہ دیتے۔ خالہ بی پر اس کا بہت برا اثر ہوا، مگر وہ محاذ پر ڈٹی رہیں۔ مقدمے کی نوبت آگئی۔ اصباح کو لگتا۔ ایک اس کے ہی خاندان کو شامتوں نے گھیر رکھا ہے۔

دائیں جانب کے پڑوسی کے بیٹے کو ساتھ لے کر اصباح صبح ہی ڈالر چینج کروا لائی۔ "شاہد کو روک لیتی۔ چائے وائے پلا دیتی۔ بے چارا اتنا کام کر دیتا ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھی کہ وہ شاہد ہے، مگر وہ زاہد تھا۔ وہ چائے نہیں پیتا۔ اس نے خود بتایا کہ میں زاہد ہوں۔ پھر میں نے اسے سو روپے دے دیے کہ جا کر بوتل پی لو۔"

"اے ہاں۔ یہ ثمینہ کے جڑواں بیٹے۔ کوئی گل ضرور کھلائیں گے۔ دیکھنا پتا ہی نہیں چلتا۔ کون زاہد۔

کون شاہد۔"
"خالہ بی۔ شاہد کی کنپٹی پر تل ہے۔ ثمینہ آنٹی اسی سے پہچانتی ہیں۔"
"سب کو اس بات کی خبر کہاں ہے۔ ویسے بھی ٹوپی منڈھ لیتا ہے تل چھپانے کے لیے۔"
"تل چھپانے کے لیے؟" اصباح حیرت سے خالہ بی کی تحقیق پر انہیں دیکھنے لگی۔
"ہاں' شرارت کرکے زاہد پر تھوپ دیتا ہے۔ خود معصوم بن جاتا ہے۔ زاہد شریف بچہ ہے۔"
"تو لوگ ٹوپی سے پہچان نہیں لیتے؟"
"پہچانیں تو تب۔ جب انہیں اس چالاکی کی خبر ہو۔ خیر بھئی۔ اللہ انہیں زندگی اور ہدایت دے۔ بیٹے ہیں' مگر آج کل کا زمانہ۔ بیٹوں پر بھروسا کرنے کا نہیں ہے۔ جسے دیکھو ماں باپ کو شرمندہ کررہا ہے۔ نالائق۔ ناخلف اولاد۔" انہیں شاید اپنا بیٹا یاد آگیا تھا۔
"خالہ بی۔ پھر لوگ لڑکوں کی دعا کیوں کرتے ہیں۔ ان پر فخر کیوں کرتے ہیں؟"
"پاگل پن اور کیا۔ جانتے نہیں کہ..... اولاد فتنہ ہوتی ہے۔ اور یہ لڑکے توبہ!!"
"تو لڑکیاں..... اچھی ہوتی ہیں۔" خوش ہوگئی۔
"ہاں۔ مگر کوئی ان کے لیے دعا نہیں کرتا۔ بس اللہ کی مہربانی سے رحمت برس جاتی ہے۔"

☼ ☼ ☼

آج کل وہ چپ رہنے لگی تھیں۔ ذریعہ آمدنی کچھ رہا نہیں۔ بیٹے کے پاس سے جو ڈالر کبھی کبھار آتے تھے۔ سخت ضرورت پر ان میں سے ایک دو سو کے نوٹ لے کر سب لاکر کی نذر۔ ڈالروں کو خود ہاتھ نہیں لگاتی تھیں۔ ہاں جب وہ پاکستانی کرنسی کے روپ میں آجاتے۔ تو..... مجبوری۔ پھر اللہ کی کرنی ان کے ایک دیور آگئے۔ گو کہ خالہ بی ان سے کھنچی کھنچی سی تھیں' مگر وہ بے حد اخلاق اور محبت سے باتیں کررہے تھے۔ انہوں نے اصباح کے سر پر ہاتھ پھیرا' نصیحت کی۔
"دیکھو بیٹا! اچھا برا وقت سب پر آتا ہے' مگر اللہ کی طرف سے کبھی مایوس نہ ہونا اور اپنی خالہ کا ساتھ نہ چھوڑنا۔ دنیا مطلبی اور خود غرض لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ تمہاری خوش نصیبی ہے کہ بھابھی نے تمہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ بھابھی بہت مضبوط اور کھری خاتون ہیں۔ اللہ نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا بننے کا موقع دیا ہے۔ دنیا میں اچھے برے کی پہچان اسی طرح ہوتی ہے۔"
وہ سر ہلاتی رہی۔ کہہ نہ پائی۔ "آپ کی بہنیں تو کہتی ہیں کہ اپنی تنہائی سے تنگ آکر بھانجی کو بلا کر رکھا۔ اپنے مطلب کے لیے۔ جب گھر اپنے نام کروایا تھا۔ تب نہ بہن یاد آئی نہ بھانجی۔"
انہوں نے پھر اپنے اوپر گزرنے والی واردات سنائی۔ برسوں پہلے سعودی عرب گئے تھے۔ وہاں سے امریکا' کوشش کی تو انہیں وہاں کی شہریت مل گئی' بیوی بھی مل گئی۔ مطلب شادی کرلی۔ پھر۔ ایسا ہوا کہ وہ پیدل کہیں جارہے تھے تو ایک گاڑی بے قابو ہوکر ان پر چڑھ گئی۔ زخمی حالت میں بھی انہوں نے گاڑی کے نمبر ذہن نشین کرلیے۔ ذرا صحت مند ہونے کے بعد پولیس کو ایکسیڈنٹ کی رپورٹ کی۔ بارے انہیں وہاں کے قانون کے مطابق جرمانہ ادا کردیا گاڑی والے نے' جرمانہ اتنا تھا کہ وہ اسے تائید غیبی سمجھ کر واپس پاکستان آگئے۔ گو کہ اس میں بھی چند وجوہات۔ یا رکاوٹوں کی وجہ سے کئی سال لگے۔
یہاں آکر وہ ایک ٹرسٹ قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ جب سعودی عرب گئے تھے تو بھائی کینیڈا جارہے تھے' بعد میں بھتیجے کی روانگی کی خبر سے ازحد افسوس ہوا۔
سعودی عرب جانے کے لیے ایجنٹ کو دینے والی رقم انہوں نے بھائی سے قرض مانگی تھی۔ انہوں نے بھابھی کے زیور تھیا کر فروخت کیے اور چھوٹے بھائی کو ممنون احسان کردیا۔ وہ قرض انہیں ادا کرنے کا اب خیال آیا۔ بھابھی کی حالت پر افسوس ہوا۔ وہ ان کے حالات سے بے خبر تھے۔ ایکسیڈنٹ۔ اس سے ملنے والی رقم۔ شاید اللہ نے انہیں اس قرض کی ادائیگی اس

طرح کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ٹرسٹ سے ہونے والی آمدنی بھی وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کرتے اور اب۔ قرض بھی اسی طرح ادا ہوگا۔ بھابھی کی عنایتوں کا قرض۔

خالہ بی پہلے تو سختی سے انکار کرتی رہیں، مگر انہوں نے اس قدر دلیلیں دیں کہ مجبور ہو گئیں۔ ان کے ان دنوں کے زیورات۔ کی قیمت اب دس گنا سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

"میں آپ کی محبت، خلوص کی قیمت تو ادا نہیں کر سکتا۔ جو آپ نے میرے ساتھ سلوک کیا وہ کوئی بس نہیں کر سکتی، لیکن شاید آپ کی تکلیفوں کا تھوڑا سا ازالہ ہو جائے۔"

انہوں نے کرائے دار سے بات کرنے اور مقدمے سے نپٹنے کا بھی وعدہ کیا۔ بھتیجے کو سمجھانے اور واپس آنے کی تلقین کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ دراصل پہلے وہ خالہ بی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

ان صاحب کی باتوں سے خالہ بی کو تو جو بھی یاد آیا، مگر اصباح کو اپنی افتاد یاد آ گئی۔ اس کے زخموں کے کھرنڈ چھل گئے اور خون رسنے لگا۔ جب وہ... سراسیمہ۔ جواس باختہ اکیلی تن تنہا۔ گھر کے لان میں کھڑی اپنا گھر لٹتا دیکھ رہی تھی۔ پولیس۔ عدالت کے لوگ۔ کمروں میں گھس کر سامان نکال رہے تھے۔

تب ایک لیڈی پولیس انسپکٹر نے اس کا بازو ہلایا۔

"تم اپنا سامان لے سکتی ہو۔ باقی سامان نیلام ہوگا۔ یہ گھر اب فروخت کر دیا گیا ہے۔"

اس کے اوپر جو پہاڑ آ گرا تھا۔ اس کے بوجھ سے وہ گرنے لگی۔ پڑوس میں رہنے والی رفیعہ خالہ ہی گھبرائی ہوئی آئی تھیں۔ انہوں نے ہی عدالت کے بیلف سے مذاکرات کیے۔ سر تھام کر اس کے پاس آئیں۔

"بچی! یہ گھر تو گیا۔ تمہارے بھائیوں نے پورا گھر اپنے نام کروا لیا ہے اور اب اس پر تمہارا یا مصباح کا حق نہیں۔ ستم ہے۔ ایسا ظلم۔ خون سفید ہو گئے۔"

انہوں نے خود اس کے کمرے سے الماری سے اس کا سامان نکالا۔ کپڑے، جوتے، کتابیں، کھلونے، چادر میں باندھ کر رکھ دیا۔ وہ تو برف کی مانند جمی کھڑی تھی۔ منجمد چٹان۔ وہ ظالموں کو کوستی بھی جا رہی تھیں۔ جن کی وجہ سے مصباح اسپتال پہنچ گئی اور بچی بے سائبان۔

جب افراز اور اعزاز اس کا سامان اٹھا کر لے گئے۔ تب بھی وہ وہیں کھڑی رہی۔ رفیعہ خالہ پولیس والوں سے لڑ رہی تھیں۔ سوتیلے بیٹوں نے ماں بیٹی کو بے سہارا کر دیا۔ ماں تو گھر کے بکنے کی خبر سن کر ہی اسپتال جا پہنچی اور یہ بچی۔ ارے اسی کا خیال کر لیتے باپ تو ایک ہی تھا۔ دیکھنا۔ دنیا میں ہی انہیں کیسی سزا ملے گی۔ اللہ کو ایسا ظلم پسند نہیں۔ یتیم بچی کا سر چھپانے کا ٹھکانہ چھین لیا۔ آدھے گھر کی حصہ دار ہیں ماں بیٹی۔ اور تم لوگوں کو بھی اس ظلم کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ تم بھی شریک ہو۔"

وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگے رہے۔ ان کی ڈیوٹی تھی۔ مصباح کے کمرے سے بھی کچھ اٹھانے نہیں دیا۔ تصویریں البتہ انہوں نے دے دیں۔ مہربانی۔

"یہ کیسا قانون ہے بھئی۔ اس بچی کی ماں اسپتال سے آ کر کیا کپڑے نہیں پہنے گی۔ تمہارے کس کام کے ہیں یہ۔" بمشکل حجت کر کے انہوں نے الماری سے کپڑے نکالے۔

قانون اندھا ہی نہیں۔ گونگا بھی ہے۔ بہرا بھی۔ ظالم تو ہے ہی۔ دو دن وہ رفیعہ خالہ کے گھر رہی۔ عجیب مدہوشی کی، بے یقینی کی سی کیفیت رہی۔

رفیعہ خالہ صبح شام اسپتال جاتی تھیں۔ افراز وہیں رہتا تھا پھر۔ نہ جانے کس نے مصباح کو گھر کے بارے میں خبر پہنچائی۔ افراز تو برابر سب ٹھیک ہے کی خبر انہیں دے رہا تھا اور پھر۔ ایمبولینس پر وہ رفیعہ خالہ کے گھر ہی آ گئیں۔ اصباح تو ہونق بنی۔ برآمدے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ رفیعہ خالہ نہ جانے کس انتظام میں لگی ہوئی تھیں۔ ثریا بھی مصروف۔ دریاں چاندنیاں، کرسیاں۔ افراز پانی بھر کر بڑے تپیلے میں لے جا رہا تھا۔ اعزاز فون کیے جا رہا تھا۔ پھر ایمبولینس آئی۔ ساتھ ہی خالہ بی۔ آتے ہی اصباح کو لپٹا کر بیٹھ گئیں۔

یکایک صحن۔۔۔ عورتوں سے بھر گیا۔ رشتے دار۔۔۔ پڑوسی۔ سعیدہ ممانی سیدھی ادھر آئیں۔ اصباح کو لپٹا کر پیار کرنے اور خالہ بی سے سوالات کرنے لگیں۔ وہ بدحواسی کے عالم میں صحن میں ہوتی کارروائی دیکھ رہی تھی۔

"بھئی۔ مجھے تو خبر نہ تھی۔ رفیعہ نے فون کیا میں اسپتال چلی گئی اور پھر۔۔۔ لے آئی اسے۔ رفیعہ آتی ہے تو اسی سے پوچھنا۔" خالہ بی سب کو یہی جواب دے رہی تھیں۔

محلے والیاں صبر کی تلقین کر کے اسے گلے لگاتیں۔

ہاں جب صحن میں ایک پلنگ لا کر رکھا گیا اور اس پر سفید لباس، سفید چادر نظر آئی۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ چھلانگ لگا کر پلنگ کے پاس پہنچی۔ ہاں۔ اس کی پیاری ماں۔ سفید چہرے۔ بند آنکھوں کے ساتھ۔۔۔ سو چکی تھیں۔

صبح اس نے رفیعہ خالہ سے کہا تھا۔ وہ اسپتال جائے گی، مگر۔۔۔ نہ جانے کیوں۔ کسی نے اس کی بات نہیں مانی افراز بھائی سے کہا انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور چلے گئے۔ اب۔۔۔ وہ حیران کھڑی تھی۔ دائیں بائیں خالہ بی اور رفیعہ خالہ۔ اس نے کسی کی سسکیوں کی آواز سنی۔ منہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا پھر رفیعہ خالہ سے کہا۔

"کیا ہوا ہے؟" انہوں نے آنسو بھری آنکھیں آنچل سے رگڑ لیں۔

"مل لو ماں سے آخری بار۔" کہہ کر خود ہی بلکنے لگیں۔ خالہ بی نے اسے زور سے لپٹا لیا۔ پھر۔۔۔ کوئی عورت بلبلائی۔

"ارے ختم ہو گئی مصباح۔ ہائے ظالموں نے جان لے لی۔"

وہ لڑکھڑا کر گری مگر۔۔۔ پھر۔۔۔ ایک دم بہت سے مرد آ گئے اور وہ پلنگ اٹھا کر لے گئے۔

وہ چیخی۔ "کہاں لے جا رہے ہیں امی کو۔ آپ ابھی تو آئی تھیں اسپتال سے۔ پلیز مجھے بات تو کرنے دیں۔" مگر اس کی آواز کلمۂ شہادت کی صدا کے درمیان کھو گئی۔ وہ سب جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ لمحہ بھر میں پلنگ غائب اور جگہ خالی۔ وہ اس کے بعد گونگی ہو گئی۔ سعیدہ ممانی ان کی بیٹیاں اسے پیار کرتی رہیں۔

اور پھر۔۔۔ خالہ بی اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئیں۔ اس گھر میں جو نانا کا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹیوں حفصہ اور مصباح کو دے دیا تھا۔

کئی دن سب آتے رہے۔ رفیعہ خالہ، ان کی بیٹیاں، بیٹے، پھر سب کچھ معمول کے مطابق ہو گیا۔



وقت گزرتا گیا وہ اسکول سے کالج پہنچ گئی۔ خالہ بی ہمت والی تھیں۔ اکیلی رہ گئی تھیں۔ گھر کے دو حصے کر کے کرائے پر اسی لیے دیے تھے کہ آمدنی قائم ہو جائے۔ اور۔۔۔

"کم بخت مسٹنڈوں کی وجہ سے مجھے تسلی رہے کہ گھر میں مرد موجود ہیں۔ میں اکیلی نہیں۔"

درمیان میں جو دیوار بنوائی تھی اس میں کھڑکی لگوالی تھی کہ ادھر سے ادھر آنے جانے میں آسانی رہے، مگر وہ تو کب سے بند پڑی تھی۔ خالہ بی نے سب جگہ کرائے داروں کو خوب بدنام کیا تھا۔ وہ لوگ صفائی دیتے رہتے۔

"اجی ہمارے حالات ذرا خراب ہو گئے تھے تو ہم نے کہا جوں ہی کچھ معاملات درست ہوئے۔ آپ کا کرایہ باقاعدگی سے دیں گے۔ بس ہمارا بھروسہ کریں۔ اور کچھ دن انتظار، مگر انہوں نے ہماری بجلی کٹوا دی۔ نل کٹوا دیے۔ پانی بند کر دیا تو ہمیں بھی ضد ہو گئی۔ اوپر سے سب جگہ ہمیں بدنام کرتی ہیں۔"

اب اصل معاملہ کیا تھا۔ یہ ظاہر نہ ہوا۔ خالہ بی سے کسی نے پوچھا کہ کیا حالات خراب ہوئے۔ تو بگڑ گئیں۔

"بھئی ان ہی سے پوچھو۔ کرائے دار منحوس ٹرک تلے آ گیا ہوگا۔ بیٹا چوری کرتے جیل جا پہنچا۔ اللہ معاف کرے۔ مجھے کچھ خبر نہیں، مگر ہوا یہی ہوگا۔"

نہیں تو جوان بیٹے کے ہوتے کیا حالات خراب ہوں گے اور کیا پتا۔۔۔ خیر اللہ معافی۔“

اپنے بیٹے کا بھی خیال آتا ہوگا۔ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ان کے بھی تو حالات خراب ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھار ڈالر بھیجتا۔ تو۔ ”میں تو ہاتھ بھی نہ لگاؤں منحوس کے روپے کو۔“ مگر پاکستانی نوٹ کی صورت میں آتے ہی قبضہ کرلیتیں۔ انہیں اپنے دیور کی طرف سے بہرحال معقول رقم مل جایا کرتی تھی۔

آج کل وہ اصباح کی طرف سے پریشان تھیں۔ اس کا کالج میں آخری سال تھا۔ اب اسے سسرال جانا چاہیے۔ کب تک کریں انتظار۔ ہتھیلی کا چھالا بنا کر پالا۔ دنیا کی ہر برائی سے گرد و غبار سے بچا کر۔ ہر طرح کی تمیز' سلیقہ سکھا دیا۔ سارے خاندان کو معلوم تھا وہ ایک اچھے کالج میں پڑھ رہی ہے۔ جاہل نہیں ہے۔ اللہ نے حسن بھی دیا ہے۔ گوکہ وہ اپنی اس اضافی خوبی سے لاعلم ہی تھی۔

خالہ تھالی میں دال ڈالے انگلی سے ادھر ادھر ٹہلا رہی تھیں۔

”لگتا ہے۔ سعیدہ تو جیسے۔۔۔“ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔ اصباح کا رواں رواں بے تاب تھا۔ اگلی بات سننے کے لیے۔

”خیر بھئی۔ اب۔۔۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔“ پھر چپ۔

”کیا ہوا خالہ بی؟“ وہ ڈر گئی۔

”ہوا تو نہیں' مگر ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ سعیدہ کا کہہ رہی تھی۔ کچھ بدل گئی ہے۔ پہلے جیسی نہیں رہی۔ دو برس سے تو ادھر آئی بھی نہیں۔ ہاں بھئی! اب غریب رشتے داروں سے ملنے میں ہتک محسوس ہوتی ہے۔ سنا ہے گھر میں روپے کی ریل پیل ہوگئی ہے۔ بھائی کی نوکری بھی اور بیٹے جو کما کر گھر بھر رہے ہیں۔“

”خالہ بی! آپ کب ملی تھیں ان سے؟“

”آج۔ تمہارے کالج جانے کے بعد زرو کی طرف جا گھسی تھی۔ اس کے بیٹے کی خیریت کو۔ ٹائیفائیڈ ہوگیا ہے بے چارے بچے کو۔ وہاں وہ بھی آئی بیٹھی تھی۔ زرو کی اماں سے شیخی ہانک رہی تھی۔ دولت۔ شان۔ نیا گھر بھی خرید لیا ہے۔ مجھے وہیں جا کر پتا چلا۔ میں نے سلام کیا تو دو انگلی ماتھے پر لگا کر گردن ہلا دی من بھر کی۔ زبان نہ ہلائی۔ کیوں کہ زبان تو کوا لے گیا تھا۔ شیخی خوری۔“ تھالی اٹھا کر چلی گئیں۔

”آپ سے۔۔۔ بات نہیں کی؟“ اس نے کچن میں جھانک کر پوچھا۔

”یہی بتا رہی ہوں۔ یوں ظاہر کیا جیسے جانتے نہیں۔ پہچانتے نہیں۔ بات کرنا تو در کنار۔“

وہ گم صم ہوگئی۔ سعیدہ ممانی۔ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ خالہ بی بھی دم سادھ کر بیٹھ گئیں' مگر دل میں ان کے خلاف مواد جمع ہو چکا تھا۔

”یہ سعیدہ جو ہے۔۔۔ مجھ سے چھوٹی ہے۔ آپا کہتی تھی۔ بھائی واجد مجھ سے بڑے ہیں۔ ان کی بیگم کیا بنی کہ خود کو بہت بڑا سمجھنے لگی۔ واہ۔ چلو جی ہم نے بھی بڑا مان لیا' لیکن اس کا یہ تو مطلب نہ ہوا کہ چھوٹوں کو اپنی سمجھنے لگو۔ بھئی۔ اب تمہارے پاس چار پیسے کیا آگئے کہ ریل پٹری سے اتر گئی۔ واہ بھئی واہ۔ خیر۔ تم دیکھنا۔ میں بھی ایسا بدلہ لوں گی کہ عقل ٹھکانے آجائے۔“

”بدلہ۔“ اصباح ہکا بکا رہ گئی۔ ”کس کا بدلہ؟ کیسا بدلہ؟ کیسے اور کیوں لیں گی؟ صرف بات نہ کرنے کا۔ یہ جرم اتنا بڑا تو نہیں۔ اب پتا نہیں وہ کیوں ایسی ہوگئیں۔ خالہ بی کی کوئی بات ضرور بری لگ گئی ہوگی۔ ورنہ ایسی ہیں تو نہیں۔ دل بے چین ہوگیا۔



صبح ہی صبح ناجیہ آئی۔ ثمینہ آنٹی کی بیٹی۔ زاہد' شاہد کی بہن۔ ہونق چہرہ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی۔ حواس باختہ۔

”خالہ جی۔ خالہ جی۔ پتا ہے کیا۔ صبح نماز کے ٹائم۔ ابھی ابا اور دادا مسجد گئے تھے کہ امریکا سے بڑے بھائی آگئے۔ اور پتا ہے کیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم۔

گوری ہی جھک۔ سفید ایک دم۔ مکئی کے بھٹے جیسے بال۔ ہاتھ جیسے روئی گلابی ہی ہی۔"

"اری او داستان گو! یہ بتا۔ ثمینہ نے لگائے دو تھپڑ بیٹے کو کہ نہیں۔" خالہ بی نے اس کی روانی میں خلل اندازی کی۔ وہ سہلا کر پھر شروع ہو گئی۔

"تا جی نا۔ خالہ جی! امی تو ایک دم خوش بے خوش۔ بے حال۔ ایک تو مفت میں بہو آ گئی۔ نہ زیور رینا نا پڑا نہ کپڑے۔ نہ بارات کا ٹنٹنا۔ پیسہ لگا نہ کوڑی۔ اور بہو بھی جیسے قازقستان کی پری۔ یہاں تو چراغ لے کر ڈھونڈیں تب بھی نہ ملے۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا کہ اسے گود میں اٹھا کر ناچیں۔ سچی۔"

"کوہ قاف کی پری کہ قازقستان کی۔" اصباح نے اس کی اصلاح کی۔

"ہاں۔ وہی وہی۔" گردن ہلائی۔ "کل سب کی دعوت ہے گھر پر۔ ولیمہ تو بعد میں ہوٹل میں کریں گے۔ بھائی نے بہت سارے نوٹ دیے ہیں امی کو اور ایک ڈائمنڈ کا چم چم کرتا سیٹ۔ ابا کی جیکٹ۔ موبائل اور دادا کا۔۔۔"

"اری برساتی نالے کی طرح بہے جا رہی ہے۔ یہ تو بتا، تجھے کیا دیا۔"

خالہ بی کا حملہ اچانک ہوا تھا۔ اس کا منہ فق ہو گیا۔ ہونٹ سکیڑ لیے بچے کی طرح۔

"خاک دھول مٹی۔ مجھے؟ ہاہ۔ بس ایک سو کا نوٹ باجی کو بھی وہی۔ شاہد، زاہد کو ٹھینگا۔"

"وہ سو کا نوٹ نہیں۔ ہزاروں کا نوٹ ہے پگلی۔"

"اچھا! میں نے تو سمجھا۔ اوہ۔ امی نے کہا۔ جب گورے گورے بھتیجے بھتیجیاں گود میں کھلائے گی۔ تو سمجھو۔ دولت مل گئی۔ کسی کی بہو اتنی گوری نہیں ہے۔ اور انگریزی ایسی فرفر۔۔۔"

"چل بھاگ۔ بی بی سی کی رپورٹر۔" خالہ بی نے اسے بھگا دیا۔

ثمینہ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ سب سے قریب ان کا گھر تھا۔ اور خالہ بی کہتی تھیں۔ ثمینہ میرے ہر موقع پر موجود ہوتی ہے۔ یوں بھی رشتے دار بعد میں آتے ہیں۔ پڑوسی ہی وقت پر کام آتے ہیں۔ پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے۔ ناجیہ کے جانے کے بعد ایک سرد آہ بھری۔

"اچھا۔ دیکھتے ہیں۔ کیسی گوری بہو ہے۔" شاید بیٹا یاد آ گیا۔

ثمینہ کا صحن آرائشی جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ ساتھ ہی ثمینہ کی بہو بھی مشرقی لباس میں چاند کی طرح چمک رہی تھی۔ کھڑے ہو کر سب کا استقبال اور "السلام علیکم" بہت ہی عربی لحن کے ساتھ۔

"مسلمان ہو؟" خالہ بی بھلا کیسے چپ رہتیں۔ اصباح سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"او یس۔ الحمدللہ۔۔۔" گوری بہو نے جھک کر کہا۔ خالہ بی نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"یہیں رہو گی یا واپس امریکا جاؤ گی؟" تحقیقات۔

"ہیں۔۔۔ ادھر۔۔۔ ہی رہوں۔۔۔ گی۔" بہت خوش تھی۔ اردو؟ واہ بھئی۔ سب نے اس گوری ہی ہی۔۔۔ بہو کی تعریف کی۔ کھانے کے بعد ایک گانے والی آ گئی۔

"میواتی زبان کا گانا ہے جی۔ غور سے سننا۔" اس گھنے گھیر کے لہنگے والی نے تاکید کی۔ ڈفلی بجا کر سماں پیدا کیا پھر اونچی پاٹ دار آواز میں گانا شروع کیا۔ لڑکی ماں سے پوچھتی ہے۔

"ماں بھیا کہاں بیاہو۔ جابو کنا۔"

ماں کہتی ہے۔ "بیٹی بیاہو لندن سہر۔ جابو کنا۔"

"ماں بھابو کیسی آئی۔ جابو کنا۔ "بیٹی آئی گھر کی شوبھا۔ جابو کنا۔"

"بیٹی ناک چناسی۔ منہ بٹوا سا۔ نوچک چوندر دھبلا میں بھر لائی۔ جابو کنا۔"

قہقہے لگے خوب۔ تشریح یہ تھی کہ "نوچک چوندر" یعنی چھچھوندر۔ یعنی کہ اولادیں۔

"بٹی آئی گھر کی شوبھا۔ جابو کنا۔" اب یہ جابو کنا کیا تھا اس کی تشریح نہ ہوئی، مگر بہو کی تعریف پر جہاں مہمان ہنس رہے تھے۔ گوری بھی تالیاں بجا کر داد دے

رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

شروع میں جب خالہ بی اصباح کو اپنے ساتھ لائی تھیں۔ انہوں نے اسے برقعہ پہنایا۔ پھر اسے الجھن ہوئی تو چادر پر اکتفا کیا۔ ہدایات ساتھ میں۔ سر جھکائے رہنا۔ ادھر ادھر راستے میں بالکل نہیں دیکھنا۔ اور گلی میں ہنستے کسی سے بات کرنے پر تو سخت پابندی۔

جب وہ کالج گئی تو دیکھا۔ ثمینہ آنٹی کی بیٹی بھی اسی کالج میں پڑھتی ہے۔ خالہ بی کو بہت اطمینان ہو گیا۔ کالج کے گیٹ سے ذرا آگے بس مل جاتی تھی۔ دونوں ساتھ آجاتیں۔ مین روڈ پر، گلی کے سامنے بس اسٹاپ تھا۔ ایک دو دکانیں بھی۔ آئمہ کے دادا ایک دکان پر بیٹھے ہوتے۔ دونوں کو بس سے اترتا دیکھ کر خود بھی ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑتے۔ ایک لاٹھی ان کے ہاتھ میں ہوتی۔ اسے زمین پر مارتے۔ ٹھک ٹھک۔ گویا ان کے چوکیدار ہوں۔ گھر کے دروازے پر رک جاتے۔ جب خالہ بی دروازہ کھولتیں۔ وہ اندر جاتی۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر میں گھستے۔

خالہ بی نے ایک دن ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔ تو بولے۔

"بہن! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ نہ زحمت۔ فائدہ بہت ہوا۔ گھر میں پلنگ توڑا کرتا تھا پڑے پڑے، اب گھر سے نکلتا ہوں۔ دکان تک آتے آتے میری چلائی ہو جاتی ہے۔ دکان پر بیٹھتا ہوں سانس تیز چلتی ہے تو دکان دار بھلا مانس ٹھنڈا پانی پلاتا ہے۔ کوئی بسکٹ بھی دے دیتا ہے۔ لوگ وہاں آتے ہیں۔ بات چیت بھی کر لیتا ہوں۔ خبریں مل جاتی ہیں۔ بچیوں کے انتظار میں بیٹھا تلاوت کرتا رہتا ہوں۔ لوگوں کو نصیحت بھی کر لیتا ہوں۔ دکان دار بہت ہی شریف بندہ ہے۔ کہتا ہے باباجی۔ آپ نے جب سے میری دکان پر آنا شروع کیا ہے میری دکان بہت چلنے لگی ہے۔ یہ آپ کے تلاوت کرنے سے برکت ہوئی ہے۔ اب بتاؤ۔ اس کا فائدہ ہوا۔ میرا یہ فائدہ ہوا کہ گھر پڑے پڑے پوتوں کو ڈانٹ ڈپٹ۔ بہو سے لڑتا تھا۔ جب بیٹے نے کہا۔ اباجی۔ آپ آئمہ کو بس تک پہنچا دیا کریں۔ "برا تو بہت لگا کہ مجھے اپنی بیٹی کا چوکیدار بنا رہا ہے مگر باہر نکلا تو تازہ ہوا نے اچھا اثر ڈالا۔ صحت بہتر ہوئی، مزاج بھی۔ صبح بھی ساتھ جاتا ہوں۔ پھر انہیں لینے کے لیے بھی۔ تفریح ہو جاتی ہے۔"

باباجی تقریر کے ماہر۔ خالہ بی سننے پر مجبور اور یہ حقیقت تھی کہ پہلے جو گھر میں بہو کے ساتھ بدمزاجی کے جوہر دکھاتے تھے۔ بیٹے سے شکوے۔ پوتوں سے ناراضی۔ اب کافی خوش مزاج ہو گئے تھے۔ ثمینہ کو سکون ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار گھر کا سودا بھی لے آتے تھے۔ فارغ وقت میں شاہد، زاہد کو اردو گرامر اور انگلش بھی پڑھاتے۔ ناجیہ کو شعروں کی تشریح سمجھاتے۔ اب تو دونوں گھروں کی ضرورت بن گئے تھے۔ خالہ بی یوں تو پورے محلے میں بہت مقبول تھیں۔ ان کی بہت قدر و منزلت تھی۔ خود وہ اپنے سب سے قریبی پڑوسی یعنی اپنے کرائے دار سے کسی بھی برائی کی توقع کر سکتی تھیں۔ بس وہی ایک گھر ان کے لیے تشویش کا باعث تھا۔

زیادہ فکر اصباح کی تھی کہ کہیں شرارتاً" اس کو راستے میں تنگ نہ کرے۔

کرائے دار کا ایک جوان بیٹا تھا۔ ہٹا کٹا۔ اسی سے خطرہ تھا۔ اسی لیے شروع میں اسے برقعہ پہنایا۔ پھر چادر بھی بے حد تاکید کے ساتھ۔ بھئی کتنی بھی قریبی سہی۔ تھی تو پرائی ذمے داری۔ اور یہ سعیدہ بیگم ہیں کہ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھی ہیں۔ بھائی واجد ہنکارا تک نہیں بھرتے۔ بابا اپنی امانت کی خود حفاظت کرو۔ میں کب تک اسے دنیا کی تپتی دھوپ سے بچاؤں گی۔ غلطی ہو گئی مصباح کے بعد۔ فوراً" ان سے تقاضا کرنا چاہیے تھا کہ بھئی۔ اپنے ذمے داری خود اٹھاؤ، لیکن اس زمانے میں بچی کا ذہن عجیب ہو رہا تھا۔ کھوئی کھوئی۔ ماں کی موت کے علاوہ گھر سے بے دخلی۔ بے سہارا ہونے کا احساس۔ بے یقینی کی

کیفیت۔ رفیعہ بھی یوں تو اسے رکھنے پر تیار تھی، مگر اس کے گھر دو جوان لڑکوں کی موجودگی۔ مناسب نہیں لگا۔ اپنی کم مائیگی کے باوجود اللہ کے بھروسے پر ساتھ لے آئیں۔ پھر کسی نے بتایا۔

"واجد بھائی کا بیٹا کینیڈا چلا گیا ہے۔ پڑھائی کرے گا۔ اور پھر کمائی کرے گا۔ ابھی رخصتی سے انکاری ہے۔" چلو بھئی۔ اس کی کمائی کا انتظار کر لیتے ہیں، مگر کسی نے کہا۔ "وہ بچپن کے رشتے کو مانتا نہیں۔ اسی لیے بھاگ گیا۔"

ارے۔ لگاتے چار چوٹ کی مار۔ پہلے قبول ہے قبول ہے کہتے ہوئے تو منہ پھسلا نہیں اب سی کر بیٹھ گیا بدذات۔ منحوس اولاد۔ کہیں نظر آئے ایسی خبر لوں گی کہ بس۔"

"کہاں نظر آئے گا اب آپا! وہ کینیڈا جا چکا ہے۔" رفیعہ نے کہا۔ "ماں باپ کو اولاد کی مرضی بھی دیکھنی پڑتی ہے۔"

"واہ۔ یہ کون سی منطق ہے۔ اولاد کی مرضی بدلتی جائے۔ تو ماں باپ بھی بدلتے رہیں۔ ارے بلائیں اسے۔ کریں ٹھکائی۔"

اصباح دیکھتی تھی۔ روز کہیں چلی جاتی تھیں۔ نہ جانے کس کس سے مشورے کر رہی تھیں۔ نتیجہ تو ظاہر ہوتا نہ تھا۔ فکر مند نظر آتی تھیں۔

کبھی اصباح کے ابا کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتیں۔ جو پہلے ہی بیٹوں کے حوصلے دیکھ کر پست ہو رہے تھے۔ جب واجد بھائی نے ان کی پریشانی دیکھی۔ اپنا بیٹا پیش کر دیا کہ کم از کم بیٹی کے مستقبل کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ انہوں نے بھی فوراً" مان لیا۔ ابھی چودہ سال کی تھی اور نکاح کر دیا۔ لڑکا بیس برس کا تھا۔ مناسب جوڑ بھی تھا۔ اپنی صحت اور بیٹوں کی ریشہ دوانیوں سے تنگ۔ ڈرے ہوئے تھے۔

گھر کو تقسیم کر دیا۔ آدھا حصہ بیٹوں کے حصے میں۔ آدھا اصباح اور اس کی ماں کے لیے۔ اس تقسیم کو بیٹوں نے ٹھوکر سے اڑا دیا۔ باپ پر مقدمہ کر دیا۔ کئی رشتے داروں کو ہم خیال بنا لیا۔ کئی نے باپ کا ساتھ دیا، مگر پھر۔ ابا گزر گئے۔ دباؤ برداشت نہ کر سکے۔ ابا کے جنازے پر بیٹے آئے۔ بہن کو دلاسا دیا۔ مصباح کے پاس آکر بھی چند الفاظ تسلی کے۔ جب ضرورت ہو۔ ہمیں بلا لینا۔ وغیرہ۔

اصباح کو بھائیوں کے سینے سے لگ کر بڑی تقویت ملی۔ وہ کم سن اور ناتجربے کار تھی۔ دوغلی پالیسی تو بڑے بڑوں کی سمجھ سے بھی اوپر ہے۔ وہ سمجھتی تھی۔ دونوں بھائی جو ابا سے ناراض ہو کر اپنے ننھیال میں رہنے لگے تھے۔ ان کی تقویت کے لیے آجائیں گے، مگر انہیں پروا نہ تھی۔ مصباح بہت ڈر گئی تھیں۔ یوں تو کوارٹر میں ایک فیملی رہتی تھی۔ گھر باہر کے کاموں کے لیے۔ اور چوکیداری بھی، لیکن خوف تو بڑھتا گیا۔

اور مقدمے کا فیصلہ جب بیٹوں کے حق میں ہو گیا تو مصباح کا کمزور دل جواب دے گیا۔ علاج جاری تھا کہ پھر۔ اسپتال کے بغیر چارہ نہ رہا۔ اور..... جس دن معلوم ہوا۔ گھر فروخت کر دیا گیا ہے۔ عدالتی احکام کے تحت خالی کرنے کا نوٹس آگیا۔ پھر کہیں اٹکی ہوئی سانس بھی واپس نہ آئی۔

اصباح کو اب بھی یقین نہیں آتا تھا۔ بھائی تو بہنوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ انہوں نے تو اسے تپتی دھوپ میں کھلے آسمان تلے کھڑا کر دیا تھا۔ خالہ بی تو اس کے ابا سے بھی ناراض تھیں۔ اپنی زندگی میں گھر فروخت کر کے سب کو جائز حصہ دے دیتے۔

انہیں اصباح کے ددھیال والے پسند نہ تھے۔ منافق۔ دوغلے۔ باتیں بنانے میں اول نمبر۔ کام کے معاملے میں صفر۔ اگر سب بڑے لڑکوں کو سمجھاتے۔ بہن کی یتیمی کا ہی احساس دلاتے۔ درمیان میں پڑ کر مصباح کے لیے کوئی راستہ نکالتے مگر نہیں۔ یوں تو بھتیجوں کو مصباح کا قاتل، ظالم وغیرہ کہتے رہے۔ یقیناً" بھتیجوں کی خوشامد میں ان کی پیٹھ ٹھونکتے ہوں گے۔

سب کو علم ہو گیا تھا کہ اصباح اپنی خالہ کے گھر ہے۔ مگر کوئی اس کے سر پر ہاتھ رکھنے نہ آیا۔ ذمے داری تو کون قبول کرتا، سب مطلب پرست۔ اصباح

خالہ بی کے تجزیے سن کر شرمندہ ہو جاتی پتا نہیں مصباح بھی کیسا نصیب لے کر آئی تھی۔ ساری عمر شادی کے بعد کی۔ سوتیلے رشتوں سے ڈر ڈر کر گزاری۔ دیکھ لو پھر۔ ان ہی لوگوں نے قبر تک پہنچا دیا۔ بے چاری نے کوئی خوشی نہ دیکھی۔ اصباح کے نکاح سے کچھ سکون ملا بھی تو میاں چلتے بنے۔ وہ بھی بیٹوں کے شور شرابے سے ڈر گئے گو کہ انہوں نے مصباح کو بہت محبت سے رکھا۔ بہت قدر کی، مگر... نہ جانے ابا میاں نے کیا دیکھ کر مصباح کو دو بیٹوں کے باپ سے بیاہ دیا۔ کاہے کی جلدی تھی، مگر جلدی تو تھی۔ تب ہی اپنی زندگی میں اسے گھربار کا کر کے آنکھیں بند کر قبر میں جا سوئے۔

رفیعہ کی بیٹی اجیہ نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔

''خالہ بی! مصباح خالہ تو اتنی خوب صورت تھیں اور خالو ابا۔ وہ تو مصباح خالہ کے ابا لگتے تھے۔ پھر ان کی شادی کیوں ہوئی ان سے۔ کسی نے منع بھی نہیں کیا کہ دگنی عمر کے آدمی سے کیوں کر رہے ہو۔''

''کون منع کرتا۔ اے بھئی ہمارے ابا میاں۔ توبہ!! اس قدر غصے کے۔ ہتھ چھٹ تھے۔ منع کرنے والے کے ہاتھ پیر توڑ دیتے یا جبڑا۔ یا گالیاں دے کر کہتے۔ چل، پھر لے آ، کوئی کم عمر لڑکا۔ سب ابا میاں سے ڈرتے تھے بھئی۔''

خالہ بی نے تفصیل بیان کی۔

''تو کیا۔ خاندان میں کوئی ان کے جوڑ کا نہ تھا۔''

''بس بیٹا۔ قسمت میں یہی تھا۔ ابا میاں کو یقین تھا۔ کوئی بھتیجا بھانجا ان کی بیٹی کا نصیب بنے گا۔ مگر۔ سب اپنی پسند کی یا ماں کی پسند کی کر لائے۔ یہاں بھی غربت حائل تھی۔ ابا میاں ہر کسی سے تو لڑ پڑتے تھے۔ مقدموں میں سارا پیسہ لٹا دیا۔ پھر بڑھاپے کا خوف۔ جو رشتہ ملا۔ بھگتا دیا۔ میں تو شادی میں گئی بھی نہیں غصے کے مارے۔ اصباح کی پیدائش پر گئی تو دیکھا بہت خوش ہے۔ عیش آرام، میاں کی چاہت حاصل ہے۔ مگر بیٹے خار کھاتے تھے۔ انجام بھی پھر... چلو خیر، اب کیا شکوہ۔ اصباح کی فکر ہے اب۔''

''تو خالہ بی! اگر اصباح کے ددھیال والے برے ہیں تو ننھیال والوں نے کیا انعام دیا۔ نکاح کر کے بھول گئے۔ پوچھتے بھی نہیں۔'' اجیہ نے نازک مسئلے کو چھیڑ دیا۔

''ہاں خیر۔ دیکھتے ہیں۔ یہ سعیدہ بیگم آخر جائیں گی کہاں اور میں بھی بکری نہیں ہوں جو شیر سے ڈر جاؤں گی۔ ایسی خبرلوں گی کہ پیار کروں گی۔ بس دیکھنا۔'' نہ جانے وہ کیا کرنا چاہتی تھیں۔

''آپ ہمیشہ سعیدہ ممانی کو کیوں کہتی ہیں۔ واجد ماموں بھی تو ذمہ دار ہیں۔''

''ارے بچی۔ تم عورتوں کی سیاست نہیں سمجھ سکتیں۔ سعیدہ چاہے تو سب ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی آنکھوں پر دولت کی پٹی چڑھی ہوئی ہے۔ ہم اسے غریب غربا نظر آتے ہیں۔''

اصباح کو تو یقین نہ تھا کہ اب اس رشتے سے کوئی خیر کی خبر ملے گی۔ جو شخص رشتے سے منکر ہو گیا ہے۔ کسی گوری کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہو گا بس پھر قصہ ختم۔ آئمہ نے سمجھایا۔

''نہیں۔ ایسے قصہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ جو خاندان ہوتے ہیں۔ اتنی آسانی سے ختم نہیں ہونے دیتے معاملہ۔ لمبا چکر ہوتا ہے۔''

اصباح سوچنے لگی۔ خاندان؟ کون سا خاندان۔ وہ تو ایسے کسی خاندان سے واقف نہ تھی جو اس کے معاملے میں مددگار ہوتا۔ ننھیال ان ہی لوگوں کا ساتھ دے گی۔ ددھیال کو اس کی فکر ہی نہیں۔ خبر تک نہیں لیتا کوئی۔ پھر... خاندان کہاں سے آئے گا۔

خالہ بی اپنی تگ و دو میں لگی ہوئی تھیں۔ بس خبریں۔ جو اس تک آئیں لڑکا کینیڈا بھاگ گیا۔ اسے رخصتی نہیں کروانی۔ بچپن کی شادی۔ گڈے گڑیا کی شادی ہو گئی۔ ہائیں۔ بیس برس کا جوان مرد کیا بچہ تھا؟ نِھا دودھ پیتا۔ خالہ بی تو اسے ہر خبر سے بے خبر رکھنا چاہتی تھیں، مگر اسے کچھ نہ کچھ علم ہو ہی جاتا تھا۔ ثریا کی شادی کا کارڈ آ گیا۔ مہندی میں بھی بہ اصرار بلایا تھا۔ خالہ بی نے اسے اچھی طرح تیار ہونے کا حکم دیا۔

"وہ پیلا جوڑا پہن لینا جس پر اودی بیل لگی ہے۔"

"وہ تو بہت بھاری ہے۔ افراز بھائی کہہ رہے تھے بہت سادگی سے گھر میں مہندی ہوگی۔ خاندان کے ہی لوگ آئیں گے اور کچھ پڑوسی۔ دولہا والے نہیں آئیں گے۔"

"نہ آئیں۔ ہمیں تو خاندان والوں کو بھی دکھانا ہے۔"

مجبوری۔ ان ہی کی پسند کے کپڑے پہننے پڑے۔ انہوں نے موتیوں کی لمبی لڑیوں والے بندے بھی پہنا دیے۔ بلکہ آثمہ کو بلا کر اس کا میک اپ کرایا۔ اصباح کو بڑی شرم آئی۔ کبھی میک اپ کیا نہ تھا اس کے انکار پر آثمہ نے ڈانٹا۔

"چپ رہو۔ تم شادی شدہ ہو۔ میک اپ کا حق ہے۔"

"اچھا جی۔ مجھے کیا کیا حق ہے بتانا اور جو نہیں ہے۔ وہ میں بتاتی ہوں۔" اصباح کو غصہ آ گیا۔ "مجھے بولنے کا حق نہیں۔ ہنسنے کا حق نہیں۔ گلی میں یا کہیں بھی راستے میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے کا حق نہیں۔ چھت پر جانے کا حق نہیں۔" آثمہ کو ہنسی آ گئی۔

"ارے۔ حق اسے نہیں کہتے۔ اسے کہتے ہیں اجازت۔" اصباح منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔

"اب تم میرے کیے کرائے پر پانی نہ پھیر دینا' منہ بنا کر۔ اتنی اچھی شکل بگاڑ رہی ہو۔" اس نے آئینہ سامنے رکھا۔ آہا۔ اسے اپنی صورت کبھی اتنی پیاری نہیں لگی تھی۔

"ایک بات بتاؤ۔ اس میک اپ کا۔ اتنے اچھے کپڑے پہننے کا۔ اوپر سے یہ لمبے بندے' مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ آج یہ نیا فرمان جاری ہوا ہے۔ اس کا مقصد کیا ہے؟"

"تم تو ہو گھامڑ۔" آثمہ پھر ہنسی۔ "وہاں آئیں گی تمہاری ساس۔ انہیں تم آؤ گی پسند۔۔۔ وہ بیٹے کو بتائیں گی کہ اصباح اتنی حسین' پری چہرہ ہے کہ کینیڈا کی بھوری بندریاں اس کے سامنے گھاس چرتی ہیں۔ پھر دیکھنا۔"

"وہ مجھے ہزار بار دیکھ چکی ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"اس طرح۔ اس حلیے میں کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ روتی بسورتی دیکھا ہے اور ان کے سامنے ہنستی رہنا۔ یہ جتانے کے لیے کہ تمہیں ان کی پروا ہے نہ ان کے بیٹے کی۔"

"ہائیں! یہ۔۔۔ یہ خالہ بی نے کہا ہے؟"

"یہ مابدولت کے ارشادات ہیں۔" فخر سے سینہ تان کر بولی۔ اصباح مسکرا دی۔

ثریا زعفرانی کپڑوں میں ہلدی کی گانٹھ بنی بیٹھی تھی۔ بہت خوش ہوگئی۔ اپنے پاس بٹھا کر اس کے نئے روپ کی تعریف کی۔ کافی رشتے دار جمع تھے۔ اصباح سب سے ملی "وہ" مگر نظر نہ آئیں۔

سب نے اصباح کی تعریف کی۔ "کتنی پیاری ہوگئی ہے اصباح۔ ہائے۔ بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وغیرہ۔

"اپنی اٹریا پہ گڑیاں کھیلن تھی۔ ساجن نے بھیجے کہار ری۔

اے ری سکھی گڑیاں کھیلن نہ پائی' سیاں کے پہنچے کہار ری۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مہوا۔ کہ ساون کی آئی پھوار رے۔"

لڑکیاں امیر خسرو کا کلام بے حد سر اور لحن سے سوز کے ساتھ گا رہی تھیں۔

اپنے باغیچے میں پھلوا چنت تھی' ساجن نے بھیجے کہار ری۔

اے ری سکھی پھلوا چنن نہ پائی سیاں کے پہنچے کہار ری۔

اپنے محلوا میں جھولا جھولت تھی' ساجن نے بھیجے کہار ری۔

اے ری سکھی جھولا جھولن نہ پائی سیاں کے آئے کہار ری۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مہوا کہ ساون کی آئی پھوار رے۔"

"ارے یہ کیا ساون شروع ہوگیا۔ شادی مہندی کے گیت گاؤ۔" کسی نے کہا۔

"خالہ! سسرال میں ایسے ہی دل مار کر رہنا پڑتا ہے لڑکیوں کو۔ اپنی مرضی کب چلتی ہے۔"

"اور ساجن کم بخت کو دیکھو۔ ڈولا بھیجنے کی آفت پڑی تھی۔ نہ بچاری جھول سکی نہ پھول پہن سکی۔ ساون تو منانے دیتا۔ مگر بچاری لڑکیاں۔"

"وہ بھی بیگم کے ساتھ ساون منانا چاہتا ہوگا۔ بیگم کو دیکھو رستے میں ہی ڈولا رکھوا کے ساون کی پھوار کا لطف لینے لگیں۔ تب ہی سسرال والے بہو سے نالاں ہوتے ہیں۔ من موجی۔ بے کہے کی۔"

"توبہ ہے۔ اب سسرال سے ڈراؤ تو نہیں بچاریوں کو۔ چلو وہ گاؤ "اماں میرے ابا کو بھیجوری۔" لڑکیاں فوراً" شروع۔

اماں میرے ابا کو بھیجوری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا ابا تو بڈھاری کہ ساون آیا
اماں میرے بھیا کو بھیجوری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھیا تو بالاری کہ ساون آیا
اماں مرے چچا کو بھیجوری کہ ساون آیا
بیٹی تیرا چچا تو بانکاری کہ ساون آیا۔

"لو دیکھا! میکے میں کون سی قدر ہے۔ ماں ہے کہ صاف انکار کر رہی ہے کہ بھئی اب تم گھربار کی ہو۔ سسرال میں دل لگا کر رہو۔ ساون بھادوں کا زمانہ گیا' میکہ بھی تمہارا اغلام نہیں۔"

"ہاں ماں بھی کتنی ظالم۔ بیٹی رہ سسرال۔ چاہے جتنی پابندیاں ہوں وہاں۔"

"اُفوہ شمیلا' نہ دہلاؤ لڑکیوں کو۔ کل سب کو جانا ہوگا۔ اور ساون میکے میں کرنے کی اسے ضرورت کیا ہے۔ میکہ ہو کہ سسرال۔ ساون سب جگہ ایک جیسا کیچڑ پانی۔ سیلن۔ حبس۔"

"اور کیا۔ سسرال میں جھولا ڈال کر میکے کا مزا لو۔ اتنا شوق ہے تو۔"

"وہاں جھولے جھولتی رہو۔ گھر کی فکر نہ کرو نہ بچے سنبھالو۔ نہ میاں کو دیکھو۔ بھئی عقل مند ماں یہی سمجھانا چاہ رہی ہے کہ بہت جھولے جھول لیے۔ ساون منالیا۔ اب گھر سنبھالو۔ دل لگاؤ سسرال میں۔"

"اماں ڈر رہی ہوگی کہ بیٹی کہیں میکے میں ہی نہ آن براجے۔ ماں کے سینے پر مونگ دلنے۔"

"یا اللہ یہ مہندی کی رسم بھی ہوگی کہ سب دل کے پھپھولے پھوڑنے آئی ہیں۔ چلو بچیوں ثریا کو لے کر آؤ۔ یہ امیر خسرو بھی۔ عورتوں کے دل چیرنے والے گانے ہی بھلا کیوں بناتے تھے۔ چلو سب وہ گاؤ شادمانی ہو۔ شادمانی۔"

اب موسم اور ماحول بدل گیا۔ اب قہقہے تھے۔ چہچہے تھے اور چھیڑخانیاں۔

"ارے۔ رفیعہ! سعیدہ نہیں آئی۔" خالہ بی نے موقع دیکھ کر پوچھ لیا۔ "بلایا تھا؟" کان میں منہ ڈال کر کہا۔ شور بہت تھا۔ ہاؤ ہو۔

"بلایا تھا آپا! منہ چراتی ہیں سب سے۔ سنا ہے چار سال بعد بیٹا بھی آگیا ہے کینیڈا سے۔ بہت کما کر لایا ہے۔ شادی وادی کا تو پتا نہیں۔ لایا تو نہیں کسی کو۔" خالہ بی کا بوجھ ہلکا ہوا۔

"حنا گوندھ لائی ہیں پریاں۔ تیرے لیے۔ بنو میری تیرے لیے
ماتھے پہ ترے چمکیں ستاروں کی لڑیاں' ترے لیے۔
بنو میری ترے لیے۔"

لڑکیوں نے نیا گانا شروع کر دیا۔ خالہ بی نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ سب سے الگ اصباح کونے میں بیٹھی تھی۔ ہاہ۔ دل دکھ گیا۔ بچی کا دل کیسا مردہ ہو گیا ہے۔ نہ ہنستی ہے نہ بولتی ہے۔ نصیبوں والی ہو۔ ابھی تو سب بادلوں میں گم ہے۔ خوشیاں بھی۔ مستقبل بھی۔ نصیب بھی۔

اچانک بادل آئے۔ پھوار شروع ہوئی۔ بڑی عمر کی خواتین اندر آگئیں۔ لڑکیاں صحن میں ہی چہلیں کرنے لگیں۔ اصباح بھی ثریا کے ساتھ اندر آگئی۔

"اے بی! ثریا نے کیا پتیلی چاٹی ہے۔ بے موسم برسات شروع ہوگئی۔"

"اللہ کی رحمت ہے۔ نیک شگون ہوتا ہے۔ مبارک ہو۔ بیٹی نصیبوں والی ہے۔" کسی نے کہا۔

کھانا جلدی لگا دیا گیا۔ بارش کی وجہ سے سب

مہمان بھی جانے لگے۔ افراز، خالہ بی اور اصباح کو گھر چھوڑنے آیا۔ خالہ بی کو اس پر بہت پیار آیا۔ بہت ذمہ دار بچے ہیں رفیعہ کے۔ کیا رنگ نکالا ہے۔ مرنے والے بہنوئی پر غصہ آیا، پاس کے پاس۔ پڑوس میں رہنے والے لڑکے نظر نہ آئے۔ اتنی دور واجد بھائی مل گئے۔ ارے، ذرا عقل کے گھوڑے دوڑاتے، ساتھ ہی تو گھر تھا۔ ہم خود رفیعہ سے کہتے۔ مصباح سے رفیعہ کی دوستی بھی تھی۔ ہاہا۔ کیسا اچھا موقع نکل گیا۔



شادی کے دن بھی اصباح کو بنا سنوار کر گلابی سوٹ پہنا کر لے گئیں۔ آج تو سعیدہ کے سینے پر سانپ لوٹیں گے ضرور۔ ایسی نرالی چھب ہے کہ نظر ہٹتی نہیں۔ جب وہ شادی ہال پہنچیں۔ تو وہاں سعیدہ نظر نہ آئیں۔ مردانے میں واجد بھائی بھی نہ تھے۔ اگر آج بھی نہ آئیں تو ان کی مجوزہ اسکیم ناکام ہو جائے گی۔

بارات آگئی۔ خواتین لائن سے گزرنے لگیں۔ لڑکیاں انہیں ہار پہنا رہی تھیں پھر ایک خاتون کے پیچھے سعیدہ نظر آئیں۔ رفیعہ نے ہنس کر کہا "بھابھی! بارات کے ساتھ آئی ہو کیا؟" وہ کھلکھلائیں۔

"ارے بھئی، باراتی ہوں تو نہیں۔ دیکھو تمہاری لڑکیوں نے ہار پہنا کر باراتی بنا دیا۔" خالہ بی سکھ کا سانس لے کر کرسی پر ڈٹ گئیں۔ نکاح ہو گیا۔ کھانا ہو گیا۔ اب تصویریں بن رہی تھیں۔

سعیدہ جو گم ہوئیں تو اب ملیں۔ خالہ بی فوراً لپکیں۔

"اے جی۔ ادھر تو آؤ۔ کہاں چھپی چھپی پھر رہی ہو۔ تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"آ... اے نا بابا۔ جو بات کرنی ہے۔ اپنے بھائی سے کرنا۔ مجھے کچھ خبر نہیں...." صاف دامن بچا رہی تھیں۔ بوکھلائی ہوئی تھیں۔

"کیوں۔ ننھی چوزہ ہو۔ ارے بھئی تم سے ہی جواب لینا ہے۔"

"جو بھی آپ سمجھیں۔ میں کچھ کہہ کر بُری نہیں بنوں گی۔ اپنے بھائی سے بات کریں۔"

"میں تمہیں بُرا کیوں بناؤں گی۔ بلاؤ اچھا بھائی کو۔"

"وہ نہیں آئے۔ انہیں شادی کے شور شرابے سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔" آگے بڑھ گئیں۔ گویا ان کے گھر جا کر ان ہی سے بات کرنی ہوگی۔ اگر لڑکا مل گیا تو اس کو تو.....

ثریا کی رخصتی کے بعد وہ رفیعہ کے اصرار پر ان ہی کے گھر آئیں۔ ثمینہ کو فون کر دیا کہ ان کے جڑواں بچے وہاں سو جائیں۔ گھر کی ایک چابی ثمینہ کے پاس ہوتی تھی۔ احتیاطاً"۔

اصباح کو اجیہ نے ثریا کے دھلے ہوئے کپڑے رات کو سونے کے لیے دے دیے۔ باتیں کرتی رہی۔ مہمانوں پر تبصرے۔ دولہا کا ذکر۔ پھر ایک دم کچھ یاد آیا۔ "رخصتی کے بعد میں جب دوسرے مہمانوں کو خدا حافظ کہنے باہر کھڑی تھی۔ تو.... میں نے وہاں واجد ماموں کے بیٹے کو دیکھا۔ وہی.... تمہارا والا معیز۔ گاڑی سے اتر کر اندر آرہا تھا۔" اصباح نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "نہیں۔ کوئی اور ہوگا۔ وہ یہاں کہاں؟"

"وہی تھا بھئی۔ لمبا گورا گولڈن بال اور ہاں اسی وقت سعیدہ ممانی میرے پیچھے سے نکل کر آگے گئیں اور اسے دھکیلتی ہوئی گاڑی کی طرف لے گئیں۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اسے اندر آنے سے روک رہی تھیں اور پھر دونوں ایک گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ہائے بچی۔ اگر وہ اندر آجاتا۔ تمہیں دیکھ لیتا پھر تو.... افوہ! آج تم اتنی حسین لگ رہی تھیں کہ بس۔ وہ بے ہوش ہو جاتا۔ بھول جاتا گوری لڑکیوں کو۔"

"نہیں۔ دوسرا والا ہوگا۔ تم نے کیا ان کے تینوں بیٹوں کو دیکھا ہے۔ پہچانتی ہو؟"

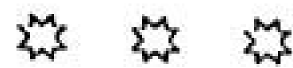
اصباح بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے گردن ہلائی۔ "ہاں.... پہچانتی ہوں۔ وہ جب کینیڈا سے آیا۔ زرو خالہ نے دعوت کی تھی۔ میں زرو خالہ سے کراس اسٹیچ کی کاپی لینے گئی تھی۔ اس دن سب کو

دیکھا۔ زرو خالہ کی بیٹی نے بتایا کہ معیز آگیا ہے۔ اس کی دعوت ہے۔"

اصباح گم صم ہوگئی۔ یہ کم عمر لڑکی سوچ سکتی ہے کہ وہ اندر آتا تو مجھے دیکھ کر... تو... سعیدہ ممانی نے یہ کیوں نہیں سوچا۔ نہ جانے کب آیا اور... آج بہانے سے ہی آکر دیکھ لیتا۔ کیا سعیدہ ممانی واقعی مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں؟ آج وہ بہانے بہانے سے ان کے پاس سے گزری۔ مسکرا کر سلام بھی کیا۔ انہوں نے خشک لہجے میں جواب دے کر منہ موڑ لیا۔ نہ پہلے کی طرح گلے لگایا نہ پیار کیا۔ دوسری دفعہ پھر وہ ان کے پاس گئی۔ وہ کسی خاتون سے مخاطب تھیں۔ شاید اپنے دوسرے بیٹے کے لیے جو دبئی میں ہوتا ہے۔ کسی گوری حسین امیر گھر کی لڑکی بتانے کا کہہ رہی تھیں۔ دوسرا کیوں؟ پہلے کے لیے بھی تو ہو سکتا ہے۔ اس وقت وہ یہی سمجھی کہ دوسرے بیٹے کا ذکر ہوگا۔

اجیہ تو سو گئی لیکن اس کی نیند اڑ چکی تھی۔ تکیہ کب آنسوؤں سے تر ہوا۔ اسے خبر نہ ہوئی۔ اپنی قسمت پر۔ کم مائیگی پر۔ تنہائی پر۔ نہ جانے کس کس پر آنسو بہتے رہے۔ ماں باپ بہت ضروری ہوتے ہیں۔ بغیر ماں باپ کے... زندگی بے کار کیوں ہوتی ہے؟

دنیا کے اتنے بہت سے لوگ۔ ان میں کوئی اس کے ماں باپ کیوں نہیں ہیں۔ دو بھائی تھے۔ اگر ابا کے رشتے سے ہی اس کا خیال کر لیتے۔ وہ یوں ذلیل تو نہ ہوتی۔ اب اندازہ ہو گیا حسن صورت جوانی سب بے کار۔ ماں باپ ہوں اور کچھ مضبوطی یعنی پیسہ۔ آج کل وہی کام آتا ہے جیسے ممانی دولت مند لڑکی کا کہہ رہی تھیں۔ رشتہ خاندان خوب صورتی سب گئے بھاڑ میں۔



شادی کے لیے تین دن کی چھٹی لی تھی مگر طبیعت کچھ اتنی سست ہوئی کہ چوتھے دن بھی نہ جا سکی۔ بستر سے اٹھا ہی نہ گیا۔ کیسی کمزوری تھی یا اداسی۔ جسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ نام کے سوا کچھ علم نہیں۔ واجد ماموں ہمیشہ ٹرانسفر کے چکر میں دوسرے شہروں میں رہتے رہے۔ بیٹیوں کی شادیاں بھی کسی اور شہر میں کر دیں۔ لڑکے غالباً" کراچی میں پڑھتے تھے۔ کسی خاندان کی شادی وغیرہ میں بھی نہیں دیکھا۔ وہ اگر... مجھے دیکھنا نہیں چاہتا۔ ملنا نہیں چاہتا تو مجھے بھی اس کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ کہتے ہیں۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ تو صرف میرا دل ہی اس کی طرف کیوں ہمکتا ہے۔ اس ایک نام پر دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ اسے کیوں میری طلب نہیں ہوتی۔

"تم نے یہ چار دن ضائع کر دیے۔" آئمہ نے اس سے کہا۔ "امتحان کے اتنے قریب ایک دن کا ناغہ بھی نقصان کا سبب بن جاتا ہے۔"

وہ جانتی تھی مگر شادی بھی ضروری تھی۔ "ہاں یہ آخری دن ضائع ہو گیا۔ زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔"

ایک دن گھر آتے ہوئے آئمہ نے سرگوشی میں کہا۔ "میں نے نوٹ کیا ہے۔ کچھ دنوں سے ایک لڑکا ہمارا پیچھا کرتا ہے۔ کالج سے یہاں تک۔" اصباح ڈر کر رک گئی۔

"افوہ۔ چلتی رہو۔ ورنہ دادا پوچھیں گے کیا ہوا۔"

"لیکن... وہ کون ہے؟"

"پتا نہیں۔ گلی کے پاس رک کر موٹر سائیکل پر جھک جاتا ہے جیسے خراب ہو گئی ہو۔ میرا خیال ہے۔ وہ دادا کی لاٹھی سے ڈر کر وہیں رہ جاتا ہے۔ پیچھے نہیں آتا۔"

"ہوں ہوں۔" دادا نے ہنکارا بھرا۔ "یہ کیا کھسر پسر ہو رہی ہے۔"

"کچھ نہیں دادا ایسے ہی۔ بس۔" "لو جی اب دادا بھی پابندی لگا رہے ہیں۔"

"ایسے ہی کیا۔ میں نے سنا تھا تم لاٹھی کا ذکر کر رہی تھیں۔" بہرے تھے مگر اتنے بھی نہیں۔

"دادا! اصباح کہہ رہی تھی دادا کی لاٹھی بڑے مزے کی ہے۔ ٹھک ٹھک کرتی ہے۔ کسی کے سر پر لگ گئی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔" آئمہ نے بات بنائی۔

دادا نے بلند بانگ قہقہہ لگایا۔ "تو کھائے گی؟ مزا لینا ہے۔"



"وہ کھمبے کی اوٹ میں کھڑا ہے۔" اگلے دن پھر آثمہ نے سرگوشی کی۔

"محلے کا ہے؟" اس نے بھی زیر لب پوچھا۔

"نہیں۔ غیر ہے۔ ورنہ دادا تو پہچان لیتے۔"

"تمہارے لیے آتا ہوگا۔" اصباح نے کہا۔

"لگتا تو نہیں، وہاں کھڑے ہو کر۔ تمہاری طرف دیکھتا رہتا ہے۔"

"ہائے۔ نہیں بھئی۔" اصباح کا تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ لڑکھڑا گئی۔

"ہاں۔ میں بس سے اترتے ہی اسے غور سے دیکھتی ہوں۔ اسے مجھ سے نہیں۔ تم سے وہ ہے۔"

"مجھے کیوں نظر نہیں آتا۔" وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔

"تم کو نظر آتا بھی ہے کچھ۔ منہ ڈھانک کر ناک کی سیدھ میں چلتی ہو۔"

"مجھے یوں اندازہ ہوا کہ تم جب شادی میں گئی تھیں۔ دادا نے پوچھا۔ تمہاری کسیلی نے کتنے دن کی چھٹی لی ہے۔ میں نے کہا۔ دادا تین دن کی۔ وہ تین دن نہیں آیا۔ چوتھے دن آیا۔ بے چارا۔ تم نے اس دن بھی چھٹی کرلی تھی۔" دادا کو سمجھانے کے لیے زور سے بولی تھی۔

"خالہ بی کو نہ بتانا۔ وہ میرا کالج جانا بند کردیں گی۔"

"میرا خیال ہے انہیں بتا دو۔ وہ کوئی حل نکال لیں گی۔ بعد میں کوئی بات ہوئی تو خفا ہوں گی کہ مجھے کیوں نہیں بتایا۔"

مگر وہ خالہ بی سے کہہ کر اپنی شامت بلانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ واقعی ادھر ادھر دیکھے بغیر بس سے اتر کر گلی میں گھس جاتی تھی۔ دادا اپنی لاٹھی ٹھک ٹھکاتے پیچھے ہوتے ہی تھے۔ اب یہ نئی آفت۔ دروازہ خالہ بی نے کھولا۔ سلام کیا۔ جواب دے کر اندر آتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔ "کیا بات ہے۔ رنگ کیوں اڑا ہوا ہے۔"

(اف۔ اسے کہتے ہیں اڑتی چڑیا کے پر گننا۔)

"کچھ نہیں۔ وہ گلی میں پیر مڑ گیا تھا۔" بیٹھ کر ٹخنے سہلانے لگی۔

"دونوں مڑ گئے تھے؟" (اللہ جی۔ کدھر جاؤں۔ حماقتیں تو پھر چونکاتی ہیں۔)

"نہیں۔ اس میں تو... کھجلی ہو رہی ہے۔" دوسرے ٹخنے سے ہاتھ ہٹایا۔

"اچھا بیٹھو نہیں۔ منہ دھو لو۔ مٹر بگھار دیے ہیں۔ چاول بھیگے ہوئے ہیں۔ چولہا جلا کر پانی چڑھا، پک جائے تو چاول ڈال کر ڈھکن بند کردینا۔ سارا مسالا میں نے ڈال دیا ہے۔ رائتہ، سلاد بنے رکھے ہیں۔ میں ذرا یہ رضائی پوری کرلوں۔"

اب غور کیا۔ برآمدے میں بچھی چادر پر رضائی پھیلی ہوئی تھی۔

"ہا۔ کتنی خوب صورت ہے۔ خالہ بی کس کی ہے؟" رک کر دیکھنے لگی۔

"تمہیں اچھی لگی۔ لے لینا۔" مسکرائیں۔

"میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی۔ زعفرانی اور اودا رنگ کتنا کھل رہا ہے۔"

"کپڑا رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ چلو رضائی سی لوں۔ جہیز میں رکھ دوں گی۔" وہ کچن کی طرف مڑ گئی۔ "آپ ہی لے لیں۔ کیا ضرورت ہے جب کچھ ہونا ہوانا نہیں۔"

"پاگل ہو۔ میں یہ شوخ شوخ رنگ کی رضائی استعمال کروں گی اس عمر میں۔"

وہ کچن میں مصروف ہوگئی۔ خالہ بی متفکر۔ نہ جانے کچھ سن گن مل گئی ہے یا کیا۔ اس دن کے بعد سے تو وہ اور بھی محتاط ہوگئی۔ آثمہ نے ہنس کر بتایا۔

"اوہو۔ منہ ذرا سا کھول لو بھئی۔ اس وقت دوپہر میں گلی خالی ہوتی ہے اور وہ تمہیں دیکھ چکا ہے۔"

"ہیں؟ کب؟ مجھے ڈراؤ تو نہیں۔" اور وہ تین دن تک بقول آثمہ کے وہ آیا نہیں تھا پھر کب دیکھا؟ آثمہ نے اصرار کے باوجود اس بات کا جواب

نہیں دیا۔

وہ چاہتی تھی۔ اس سے پوچھے۔ کون ہو۔ کہاں کے ہو۔ یہاں کس کی تلاش میں آتے ہو اور اگر آئمہ کے لیے آتے ہو تو.... چلو پھر۔ لیکن میں.... نکاح کے چند بولوں کی قیدی ہوں (بے شک اس نے مجھے اور میں نے اسے نہیں دیکھا)۔ لیکن.... ہمت کہاں سے لاتی۔ ذہن بے سکون ہو گیا تھا اور امتحان کی سختی۔

"کتنے پیپر رہ گئے ہیں اب تمہارے۔" خالہ بی نے پوچھ لیا۔

"دو.... شکر ہے۔" اس نے نیند سے مغلوب آنکھیں کھولیں۔ جمائی لی۔

"اس طرح جمائی نہیں لیتے۔ یہ شیطان کی کارستانی ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے، بندہ سو جائے اور نماز سے غافل ہو جائے۔"

اصباح شرمندہ ہو گئی۔ وہ بھی نماز ٹال کر سونے کی فکر میں تھی۔ خیر۔ شکر کہ پیپر اچھے ہو گئے۔



خالہ بی، ثمینہ آنٹی کے گھر کسی کو فون کرنے گئی تھیں۔ منہ لٹکائے واپس آئیں۔ متفکر اور مشتعل۔

اگلے دن آئمہ نے فون کا عقدہ کھولا۔ "تمہارے واجد ماموں کو فون کیا تھا۔ انہوں نے کہا ہم اسے بہت سمجھا رہے ہیں۔ سمجھا سمجھا کر تنگ آ گئے ہیں۔ اسے یعنی ان کے بیٹے کو بچپن کے رشتے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے چھ سات سال جو کینیڈا، امریکا وغیرہ میں گزارے ہیں تو اس کا آج کل کی لڑکیوں سے اعتبار اٹھ گیا ہے۔ وہاں سے اسی لیے آ گیا کہ کسی لڑکی کا کیریکٹر صحیح نہیں لگا۔ اب یہاں.... اگر شادی کرے گا تو دیکھ سمجھ کر۔ کیوں کہ یہاں بھی اسے بہت آزادی نظر آ رہی ہے۔"

واجد ماموں کی بات خالہ بی نے ثمینہ آنٹی کو۔ انہوں نے آئمہ کو، آئمہ نے اس کو سنائی۔

"پھر خالہ بی نے ان کو دھمکیاں اور طعنے دیے۔ یہی کہ تم لوگوں کی آنکھوں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ غریب سمجھ کر یتیم بچی سے نظر چرا رہے ہو۔ اس کی زندگی تباہ کر کے پھر تمہارا بیٹا بھی آباد نہیں ہو گا وغیرہ۔"

اصباح اداسی کے طوفان سے گزر رہی تھی۔ نہ جانے وہ اسے دیکھنے پرکھنے آ کیوں نہیں گیا مہبانو، شہر بانو ہی اسے لے آتیں۔ سعیدہ موہانی۔ شاید وہ ہی نہیں چاہتیں۔

امتحان کا آخری دن آ گیا۔ دروازے کی بیل بجائی مگر دروازہ ہنوز بند۔ دستک دی۔ ہائے اللہ۔ خالہ بی دروازہ کیوں نہیں کھول رہیں۔ انہیں کچھ ہو نہ گیا ہو۔ کہتی رہتی تھیں۔ زندگی کا کیا اعتبار۔ آدمی بلبلا ہے پانی کا۔ ایک ہچکی اور زندگی تمام۔ گھبرا کر گھنٹی پر انگلی زور سے دبائی۔ دادا پیچھے کھڑے لاٹھی سے ٹھک ٹھک کر رہے تھے۔

"آ رہی ہوں۔ آ رہی ہوں۔ صبر کرو۔" اُف ان کی آواز۔ دل ٹھکانے آ گیا۔

"چلو۔ اچھا ہوا تم آ گئیں۔" کہتی ہوئی دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئیں۔ "میں نکلنے ہی والی تھی۔ چلو تم کو ثمینہ کے گھر چھوڑ دوں۔ ایک جگہ جانا ہے۔"

"نہیں۔ وہ آئمہ تو جاتے ہی سو جائے گی۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ آپ کتنی دیر میں آئیں گی۔"

"گھنٹہ تو لگ جائے گا یا کچھ زیادہ۔ کہہ نہیں سکتی۔ اکیلے میں ڈرو گی تو نہیں۔"

"سو جاؤں گی تو ہوش کہاں رہے گا۔ جاگ جاگ کر۔ برا حال ہے آپ آئیں تو گھنٹی زور سے بجا دیں۔ ہاں میں دروازہ اچھی طرح بند کروں گی۔ بغیر معلوم کیے کھولوں گی نہیں۔"

خالہ بی اصل میں کرائے داروں سے کسی بھی برائی کی توقع کر سکتی تھیں۔ گو کہ آج تک ان بے چاروں نے کوئی نازیبا حرکت کی تو نہیں تھی، مگر دشمنی۔ مخالفت میں کبھی بھی کچھ ہو سکتا ہے۔

"اچھا۔ پھر بھی احتیاطاً" اطمینان کر لینا۔ فوراً "نہ کھول دینا کنڈی۔" بڑی تیار شیار نظر آ رہی تھیں۔ چکن کا سوٹ پہنے، سفید پرس۔ سفید سینڈل واہ۔ میچنگ۔ اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کیا۔ وہ وہیں

کھڑی رہیں باہر سے زور لگاتی رہیں بار بار کہ کھل تو نہ جائے گا دروازہ۔

جب وہ مطمئن ہو گئیں۔ تو اصباح دونوں چٹخنیاں چڑھا کر اندر آئی۔ کپڑے بدلے۔ کچن سے ایک سیب اٹھا کر کھایا اور کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ اب صرف فراغت کا احساس تھا۔ نہ کوئی سعیدہ موہانی۔ نہ کوئی منکوح۔ نہ گلی میں کھڑا لڑکا۔ تکیے پر سر رکھتے ہی نیند کے جھولے جھولنے لگی۔ آہ۔ آزادی گھنٹی کی کرخت آواز۔ اووف۔ کس نے ایجاد کی ہے یہ خوف ناک آواز والی چیز اور جب صور پھونکا جائے گا۔۔۔ میرے اللہ۔ توبہ۔ زبردستی آنکھیں کھول کر لڑکھڑاتی۔ ڈگمگاتی پہنچی پھر گھنٹی۔۔۔ پھر صور پھونکا گیا۔

"کیا ہے۔ کون ہے بھئی؟"

آواز آئی۔ "میں ہوں۔ ضرار محی الدین۔"

"کون؟ میں نہیں جانتی۔ اگلا دروازہ کھٹکھٹائیے۔"

"ارے میں ضرار ہوں۔ یہاں جو حفصہ بیگم رہتی ہیں۔ ان کا بیٹا۔ امریکا سے صبح ہی پہنچا ہوں۔ سامان نکلوانے میں دیر ہو گئی ورنہ صبح ہی آ جاتا۔ اماں کو بتادو۔ ان کا بیٹا ہے اور اگلا دروازہ بھی اسی گھر کا ہے۔ یہ گھر میرے نانا کا ہے۔ کھولو۔" "یا اللہ مشکل آسان کرنا۔ دھ۔ وہ تو اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔ آ۔۔۔ آپ پھر آ جائیں۔"

"ارے واہ۔ اتنا سامان لے کر کہاں جاؤں۔ کھولو دروازہ ورنہ میں دھکا دے کر توڑ دوں گا۔ میں ضرار محی الدین باڈی بلڈر بھی ہوں۔" "کہیں واقعی۔۔۔ نشانیاں بھی صحیح بتا رہا تھا۔ اللہ کا نام لے کر دروازہ کھولا۔ سامنے سوٹ کیسوں، مختلف سائز کے بیگوں اور تھیلوں کا جمعہ بازار لگا تھا۔ ایک مسٹنڈا سامنے۔ دوسرا سائڈ میں ادھر نظر جمائے نظر آئے۔ وہ اپنا کام کر کے بگٹٹ اندر بھاگی۔ کمرے میں گھس کر سانس درست کرنے لگی۔

آنے والے نے ایک اچٹتی نظر ہی اس پر ڈالی تھی۔ اتنا سامان؟ پھر دو مردوں کے بولنے کی آواز اور سامان کی اٹھا پٹخ۔ اور پھر۔ سچ مچ قیامت آ گئی۔ صور پھونکے بغیر ہی۔۔۔ خالہ بی آ گئی تھیں۔ اور ان کی آواز صور سے کم نہ تھی۔

"ارے۔ ارے۔ اے بھیا۔ تم ہو کون۔ کیسے میرے گھر میں گھسے چلے آئے۔ قبضہ کرنا ہے؟ اور مطلب کیا ہے۔ ہٹو۔ نکلو۔ بلواتی ہوں پولیس کو۔ ابھی میری ایک آواز پر محلہ دوڑا آئے گا اور یہ لڑکی کدھر ہے۔ اس نے دروازہ کھولا کیسے۔ جب میں منع کر کے گئی تھی۔ دفع ہو اپنے بیگ شیگ لے کر۔ ارے۔ ارے کہاں چڑھا چلا جا رہا ہے منحوس۔" وقفے کے بغیر ایک سانس میں بولتی گئیں۔

"اماں، میری اماں، پیاری اماں۔" اصباح نے کھڑے ہو کر بند دروازے کی جھری سے جھانکا برآمدے میں سوٹ کیس بے ترتیبی سے رکھے تھے۔ ایک تنومند نوجوان خالہ بی سے لپٹنے کو تھا۔

"دو موئے۔ خبردار۔ ہٹ پرے۔ میں نہیں جانتی تو ہے کون۔ مردود نہ ہو تو۔"

سرخ آنکھیں آگ اگلتی آواز۔ اور وہ لڑکا ان سے لپٹے جا رہا تھا۔ "اماں معاف کر دو۔ میری اماں۔ میں ضرار ہوں۔ آپ کا اپنا بیٹا۔ صبح پہنچا ہوں امریکا سے۔ سامان نکلوانے میں دیر ہو گئی۔"

"جو بھی ہو۔ کالے چور کی اولاد۔ میری اجازت کے بغیر میرے گھر میں گھسا کیوں؟ غضب خدا کا۔ دن دیہاڑے ڈاکا۔ ڈاکو آ گئے۔"

"اچھا۔" نومی یار! شکریہ۔ تم جاؤ، میں اماں کو منالوں گا۔" دوسرا لڑکا گردن ہلاتا باہر کی سمت مڑ گیا۔ ضرار ماں کے جملوں کے بیچ میں بولے جا رہا تھا اور اماں کمر پر ہاتھ رکھے خونی نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔

"وہ۔ آپ کی نوکرانی۔ دروازہ کب کھول رہی تھی۔ پھر میں نے اسے دھمکایا۔ تو۔۔۔ آپ نے بہت ٹائٹ رکھا ہوا ہے اسے۔" پھر آگے بڑھا۔ اماں پیچھے ہٹیں۔ بدک کر۔

"ارے ہٹ منحوس۔ پاس نہ آنا۔ یہی بہت سمجھ کہ زندہ سلامت کھڑا ہے۔ یہ۔۔۔ یہ ڈنڈا دیکھ رہا ہے؟

اس سے سر پھاڑ دیا کرتی ہوں، نہیں تو اتنے سال سے اکیلی کیسے رہتی۔ تیرے جیسوں سے نپٹنے کے لیے۔۔۔ ارے ہٹ مردود۔۔۔"

ہانپ رہی تھیں۔ وہ جھکا ہوا ان کی ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ اب آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ شاید اس کے آنسو خالہ بی کے پیروں پر گرے۔ کچھ نرم پڑیں۔

"اچھا۔ چھوڑ مجھے، وہ سامنے والا کمرہ خالی ہے۔ اس میں اپنا یہ کباڑ لے جا کر رکھ۔"

"اماں! معافی۔۔۔ پہلے معاف کرو۔" وہ ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔ چل ادھر۔ اتنے برسوں کی معافی۔ ایک دن میں نہیں ملا کرتی۔ سنا۔۔۔ اللہ کے آگے بھی ماتھا گھسنا۔ ناک رگڑنی ہوتی ہے۔ پھر اس کی مرضی۔"

"میں بھی ماتھا رگڑتا ہوں اماں! سچی۔ نماز پڑھتا اور غلطی کی معافی مانگتا ہوں۔ بہت بڑی خطا کی تھی میں نے۔ بہت یاد آتی تھیں آپ۔ آپ کے ہاتھوں کا بنا ہوا حلوہ اور کرارے پراٹھے۔ اور۔۔۔ اچار۔ اب بھی بناتی ہیں؟ سچ صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں۔ خوشی کے مارے کہ اماں کے ہاتھ کا کھانا کھاؤں گا۔"

خالہ بی نے ہاتھ سے گویا مکھی اڑائی۔ زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔ کمرے میں سامان رکھ دے۔ کھانا لاتی ہوں۔" وہ مڑیں۔ وہ مسکرایا۔

"اچھا۔ تو آپ کو امید تھی میرے آنے کی۔ تب ہی میرا کمرہ ابھی تک خالی ہے۔"

"سوچ رہی تھی اس کمرے کو کام میں لے آؤں۔ ایک کتا لا کر باندھ دوں۔" سختی سے کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھیں۔

"مگر۔ اب ضرورت نہیں۔ ایک خچر آگیا ہے۔"

پھر کچن کا ارادہ چھوڑ کر دوسری طرف چلیں اب ان کا رخ اصباح کے کمرے کی طرف تھا۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔ دروازہ کھول کر اسے گھورنے لگیں۔ "یہ کیا حرکت تھی تمہاری؟"

وہ ڈر گئی۔ بہت غصہ تھا چہرے پر۔ "کتنا ہی منع کرو۔ تم پر اثر نہیں ہوتا۔ کیوں کھولا دروازہ؟ جوان جہان دو دو مردوئے گھسا لیے گھر میں۔"

"خالہ بی! وہ بہت زور سے دروازہ بجا رہے تھے۔ گھنٹی بھی۔ کہہ رہے تھے توڑ دوں گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ ضرار محی الدین ہیں۔ تو۔۔۔ ہاں۔ کہا حفصہ بیگم کا بیٹا۔ تو پھر۔"

"اچھا۔ کوئی کتا آگر بھونکے کہ میں حفصہ کا بیٹا ہوں، تو۔ اگر جو وہ خبیث کرائے دار کا بیٹا یہ کہہ کر آجاتا گھر میں۔ قبضہ کر لیتا پورے گھر پر۔ پھر کہاں جاتیں تم اور کہاں جاتی میں۔"

"سوری خالہ بی! مگر۔۔۔ میں اتنی پاگل بھی نہیں ہوں۔ انہوں نے۔۔۔ پھر آپ کہتیں میرے بیٹے کو باہر کیوں کھڑا رکھا۔"

"وہ میرا بیٹا ہو۔ یا کالے چور کا۔ تمہیں کھولنا نہیں چاہیے تھا۔ نیند پوری ہوئی؟"

"ابھی نہیں۔"

"خیر۔ کھانا پکا رکھا ہے۔ گرم کرو۔ بعد میں سو جانا۔ کھانا کھا کر۔"

نہ اس کا دل کھانے کو چاہ رہا تھا۔ نہ گرم کرنے کو، مگر نیند کا خیال دور بھگا کر کچن میں آگئی۔ واہ۔ قورمہ اور کھٹی دال خشکہ۔ ایک بوٹی تو اس نے گرم کرنے سے پہلے ہی منہ میں ڈال لی۔ ہرا دھنیا کتار رکھا تھا۔ وہ دال اور قورمے میں ڈالنا تھا۔ ڈشوں میں نکال رہی تھی تو خالہ بی آگئیں۔

"میں لے جاتی ہوں۔ تم یہیں کھا لینا۔ اچار لینے آئی ہوں۔ نامراد کو پہلے اچار کی طلب ہے اور اس کا چکھتا بھی چار پانچ پھانکوں کا۔ دو دن میں ختم کر دے گا۔" لبوں پر دبا دبا تبسم بھی تھا۔ ماں آخر ماں ہی ہوتی ہے۔ سالوں سے امریکا کے تلوے چاٹ رہا تھا۔ آتے ہی ماں کے قدموں پر گرا۔ پتا نہیں خالہ بی نے کتنا معاف کیا۔ اتنی آسانی سے تو معاف کرنا ان کی سرشت میں نہ تھا۔

اس نے کچن سمیٹا۔ پھر اسٹول کھینچ کر بیٹھ گئی۔ سلیب پر پلیٹ رکھ کر کھا رہی تھی تو خالہ بی برتن رکھنے آئیں۔

"کھانا کھا کر نماز پڑھ لینا' پھر سو جانا میں ذرا اچھی طرح اس کی خبر لوں۔ سارا قورمہ' دال اور اچار چٹ کر گیا۔ نہ جانے امریکا میں فاقے کر رہا تھا کیا؟ دو وقت کا کھانا تھا۔ سب ختم۔"

برتن دھو کر کچن سمیٹ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ نماز پڑھ کر بستر پر گری اور بے سدھ ہو گئی۔ شام کو آنکھ کھلی۔ سستی سی تھی۔ عصر کا وقت تنگ ہو رہا تھا جلدی سے اٹھی نماز سے فارغ ہو کر کچن میں آئی۔ خالہ بی بریانی کی تیاری کر رہی تھیں۔ بیٹے کی خاطر داری۔ وہ چاول دھو رہی تھی تو جمائی لیتا' بولتا ہوا آگیا۔

"کیا پک رہا ہے۔ اتنی خوشبو... اماں چائے مل جائے گی کڑک۔" یک لخت ٹھٹک گیا۔ اصباح پر نظر پڑی۔ سیٹی بجانے اور آنکھیں مٹکانے لگا۔

"واہ اماں! افوہ۔ نوکرانی تو بڑی شان دار رکھی ہوئی ہے۔" کہیں سے لگتا نہ تھا کہ امریکا کی ہوا اس کو لگی ہے۔ ایسی اردو۔ لہجہ بھی خالص۔

اصباح کو جلال چڑھا۔ اس نے خالہ بی کی پروا کیے بغیر کہا۔ "شٹ اپ۔"

"اوہ... انگلش جانتی ہے۔ واہ..." خالہ بی نے گرم کفگیر اس کے بازو پر لگایا۔ "بی اے کر چکی ہے۔" اچھل پڑا۔ گرم کفگیر بازو کو سرخ کر رہا تھا۔

"اماں جی۔ اتنا ظلم تو نہ کرو۔ برسوں کے بعد بیٹا آیا ہے اس کو یہ..." انگلی پھیر رہا تھا بازو پر۔

"جیسا کرو گے۔ ویسا پھل پاؤ گے۔ سن لو۔ پانچ برس بعد آئے ہو۔ یا دس برس بعد۔ مجھ پر احسان نہیں ہے۔ شریفوں کی طرح زبان قابو میں رکھو۔ ورنہ... جہاں جی میں آئے چلے جاؤ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" خالہ بی صاف بات کرتی تھیں۔

"نہیں... میں۔ چلا جاؤں؟ آ... آپ یہ کہہ رہی ہیں۔ اس... اس نوکرانی کی خاطر۔"

اصباح کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ وہاں سے باہر آگئی۔ اب گرم چائے کا مگ اس کے بازو کو مزید سینک رہا تھا۔ اچھل پڑا۔ غنیمت تھا کہ چائے گری نہیں۔

"اور سن لو۔ پرائی لڑکی میری ذمے داری پر رہ رہی ہے۔ بیٹی ہے میری۔ کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو انجام کے خود ذمے دار ہو گے۔"

"اماں۔ آتے ہی یہ سلوک۔ بیٹا ہوں۔"

"بھول چکی ہوں کہ میرا کوئی بیٹا تھا۔ آگئے ہو تو اپنا خون اور رشتہ ثابت کرو۔ نکلو یہاں سے۔ کمرے میں جاؤ۔"

جھاڑ کھا کر کمرے میں گھس گیا۔ اب وہ سوچ رہی تھیں اسے رہنے کی اجازت دے کر۔ غلطی تو نہیں کردی۔ اصباح کی موجودگی۔ چھ سال میں عادات بدل جاتی ہیں۔ آزاد ماحول کی چکاچوند۔ آنکھیں چندھیا دیتی ہے۔ اصباح نے خود حماقت کی۔ نہ کھولتی دروازہ' پانچ منٹ بعد میں آ ہی گئی تھی۔ ہر گز اندر آنے نہ دیتی۔ اصباح کا بندوبست کرنے کے بعد۔ بلاتی۔ اب کل کچھ کرنا پڑے گا۔

وہ ماں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔ اصباح پلیٹ میں بریانی لے کر کمرے میں آگئی۔ خالہ بی نے آکر کہا۔

"آج تم میرے کمرے میں سو جانا۔" اکثر وہ اسے اپنے کمرے میں سلا لیتی تھیں۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔

"میں نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ کچھ پڑھنا ہو تو کتاب لے آنا۔" مزید ہدایت۔ کتاب؟ اف! بمشکل تو جان چھوٹی ہے کتاب سے۔

وہ بھی نماز کی تیاری کرنے لگی۔ خالہ بی کی نماز کی چوکی برآمدے میں تھی۔ زیادہ سردی ہوتی تو اپنے کمرے میں چوکی رکھ لیتی تھیں۔ جب تک خالہ بی وضو کر کے چوکی تک پہنچیں اس کی نماز ختم ہو چکی تھی۔ ان کے کمرے میں جانے کے لیے اپنا تکیہ اٹھا رہی تھی کہ ضرار نے اندر جھانکا۔

"کھانا کھا لیا تم نے؟ آؤ ذرا واک کرتے ہیں۔ پتا نہیں کیسے بھاری دل سے پکائی تھی۔ بہت بھاری پن ہو گیا بریانی سے۔"

"نہیں۔ وہ خالہ بی نے مجھے بلایا ہے۔ میں... خالہ بی نے دیکھ لیا تو مسٹر تم ہی بھگتو گے۔"

"وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔ جب تک ہم واک کرتے

ہیں بھئی' مجھے کمپنی چاہیے۔ یہاں تو جگہ۔ کم ہے چلو۔ چھت پر ٹھنڈی ہوا ہوگی۔"

اسے دروازے میں جماد دیکھ کر وہ رک گئی۔ "نہیں جی۔ اوپر میں نہیں جاتی۔ میں واک نہیں کروں گی آپ جائیں۔"

وہ یک دم آگ بگولہ ہوگیا۔ "کیسے نہیں کروگی۔ تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔ مجھے کوئی انکار کرے۔ میں برداشت نہیں کرتا۔ غصے سے۔ بچو میرے۔ سنا۔ آؤ۔" ہاتھ بڑھا رہا تھا اس نے جھانکا۔ خالہ بی نیت باندھ چکی تھیں۔

"دیکھیے۔ مجھے خالہ بی بلا گئی ہیں اور میں چھت پر نہیں جاتی۔" نرمی سے کہا اور اگر اسے پھر غصہ آگیا۔ نہ جانے کیا کرے گا۔

"آہاہا۔ اچھا۔ تو چلو۔ میرے کمرے میں سہی۔ بہت سارے تحفے لایا ہوں جو تمہیں اچھا لگے۔ لے لینا۔"

اندر آگیا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ "نہیں۔ نہیں چاہیے کچھ۔"

وہ پھر غصے میں آگیا۔ اب اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ "نہیں کیسے۔ تمہیں پتا ہے وہاں امریکا میں لڑکیاں میرے پیچھے پاگل تھیں۔"

"آپ میرا ہاتھ چھوڑیں۔ بری بات ہے۔"

"کیسے چھوڑوں؟ امریکا میں کیسی کیسی لڑکیاں ہیرے جواہرات جیسی چمکتی دمکتی چھوڑ آیا۔ تمہاری اوقات کیا ہے۔ انکار کرتی ہو۔" اس کی گرفت نے اصباح کو بے بس کر دیا۔ پھر بھی ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ ہٹا کٹا۔۔ آخری کوشش۔

"خالہ بی۔ خالہ بی۔" سیٹی جیسی آواز حلق سے برآمد ہوئی۔ ضرار کو شاید اس کھینچا تانی میں لطف آرہا تھا۔ وہ ہاتھ کھینچتے ہوئے پلنگ پر گرا مگر ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اصباح کو لگا اس کی آستین پھٹ گئی ہے۔ وہ دوہری ہو کر طاقت لگا رہی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ پر کاٹنے کی بھی کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا۔ اصباح کا بازو سن ہو گیا تھا۔ پھر یکدم کھڑے ہو کر اس نے ایک لات اس کے پیٹ پر جمائی۔ وہ اٹھنے لگا تکلیف سے۔ اسی وقت خالہ بی اندر گھسیں۔ مدد آگئی تھی۔

"چھوڑ۔ چھوڑ اس کا ہاتھ گھٹیا ذلیل انسان۔"

خالہ بی شیرنی کی طرح اس پر حملہ کر چکی تھیں۔ اصباح کو کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ ہاتھ چھڑا چکی تھی اور وہاں سے نکل کر بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچ گئی۔ اسے اس شخص کے درد میں ڈوبی ہائے سنائی دی' مگر رکنے کا موقع نہ تھا۔ گھبراہٹ میں دروازے کی چٹخنی بھی کھل نہیں رہی تھی' مگر۔۔ کھل گئی۔

وہ گلی میں نکل آئی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ کھمبے کا بلب تاریکی دور کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اس وقت اسے نہ اندھیرے سے ڈر لگا نہ سناٹے سے۔ وہ ثمینہ آنٹی کے گھر کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا سا تھا۔ دروازہ ناجیہ نے کھولا۔ وہ اندر گھسی بلکہ تقریباً" گر پڑی۔ آئمہ نے آکر اٹھایا اور ثمینہ کو آواز دی اور اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ اب آئمہ' ناجیہ' ثمینہ کچھ کہہ رہی تھیں۔ پوچھ رہی تھیں۔ اصباح کا گلا بند ہوگیا تھا۔

"اصباح آباجی کہاں ہیں؟" اسے ثمینہ کی آواز سنائی دی وہ نڈھال وہیں پلنگ پر گر گئی۔ ناجیہ گلوکوز پانی میں ڈال کر لے آئی۔ پانی پی کر اوسان بحال ہوئے۔ ثمینہ اس پر آیات پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ پھر اس نے کچھ انہیں بتایا' مگر وہ خود نہیں جانتی تھی وہ کیا کہہ رہی ہے۔

ثمینہ سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ ایک آدمی۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔ پھر۔۔ وہ بھاگی۔ آخر باجی کہاں تھیں۔ آدمی کہاں سے آیا۔ وہ کون تھا؟

"ان۔ ان۔ خالہ جی کا بیٹا۔۔۔"

ثمینہ کی چیخ نکل گئی۔ "بیٹا۔۔؟" پھر اطمینان سے بولیں۔ "چلو۔ پھر وہ اس سے خود نمٹ لیں گی۔ بڑے بڑوں کو سیدھا کر چکی ہیں۔"

اصباح کی کپکپی رکی۔ تو حواس درست ہوئے۔ پھر اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ بے بسی' بے چارگی۔

"بیٹا! اصباح کو قمیص دے دو۔ اور تم لوگ سو جاؤ۔

فکر نہیں کرو۔"

آثمہ نے اس کی پھٹی ہوئی آستین کو دیکھا جہاں مردانہ ہاتھ۔ طاقت ور ہاتھوں کی سخت گرفت کی سرخی بازو پر موجود تھی۔ تھرتھراتے ہاتھوں سے اصباح نے آثمہ کی قمیص پہنی اور پھر سے رونے لگی۔ کسی مرد کے ہاتھوں نے پہلی بار اس کے ہاتھ کو۔ اتنی طاقت ہوتی ہے؟ مرد میں۔

"اچھا اب رونا دھونا بند کرو۔ ابا کی آنکھ نہ کھل جائے۔ ویسے بھی تم نے گھنٹی بجا کر اور اندر جو ہم نے شور کیا۔ وہ تو شکر ہے ابا اٹھے نہیں۔ پریشان ہو جاتے۔ بڑے بھائی، بھابھی تو اوپر کے پورشن میں رہتے ہیں۔ شاہد، زاہد، دادا کے کمرے میں ان تینوں کی نیند۔ ڈھول بجانے سے کم میں نہیں کھلتی۔ مگر ابا۔"

اصباح نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "سوری آثمہ۔ میں۔ ڈری ہوئی تھی۔"

چند منٹ بعد۔ خالہ بی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ثمینہ منتظر تھیں۔

"اصباح آگئی؟" یوں جیسے معمول کی بات ہو۔

"باجی۔ ہوا کیا ہے؟" ثمینہ بے چینی سے پوچھنے لگیں، پر کسی سے ہمدردی میں کوئی نقصان نہ کر بیٹھیں۔

"بتاؤں گی، مگر ابھی تو مجھے جانا ہے۔ آؤں تو دروازہ کون کھولے گا۔ شاید دیر ہو جائے۔"

ثمینہ نے تسلی دی۔ "میں کھولوں گی۔" پوچھ نہ سکیں۔ کہاں جانا ہے۔ بیٹا کہاں ہے؟

"اپنا گھر۔ بند کر کے۔ اچھی طرح سے بند کر دیا ہے نا۔" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ابھی تو اس بے ایمان کو گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑا ہے۔ کمرے لاک ہیں۔ اچھا اصباح کو تسلی دینا۔ میں بھی یہیں رہوں گی آج۔" باہر سے کسی نے پکارا۔

"آنٹی! جلدی کریں۔"

ثمینہ حیران۔ یہ تو ان کے کرائے دار کے بیٹے کی آواز ہے۔ نہ جانے کیا کر رہی ہیں اور کرائے دار کے بیٹے کے ساتھ کہاں جا رہی ہیں۔ ہیں؟ ایمبولینس کی آواز۔ اللہ خیر کرے۔ کچھ دیر پہلے بھی ایمبولینس کا ہارن سنائی دیا تھا۔ اس وقت وہ اصباح کے پاس تھیں۔ غور نہیں کیا۔ ٹی وی کھول کر بیٹھ گئیں۔ جاگنے کا بہانہ، جب تک باجی آنہ جاتیں۔ انتظار اف۔ نہ جانے کس پڑوسی کو اسپتال لے گئی ہیں' حفصہ بیگم تنہا سخت زندگی گزار رہی تھیں۔ تنہائی کے تدارک کے لیے کرائے دار رکھ لیے، لیکن وہاں بھی دھوکا ہوا۔

بدرجہ مجبوری اصباح کی ذمہ داری اٹھائی۔ ان سے زیادہ قریبی رشتے دار کوئی نہ تھا۔ اس کے چچا تھے، مگر۔ وہ بھی مصباح کو شاید غیر یا غاصب سمجھ کر اس بچی کو اپنا نہ سکے یا پھر جوان بھتیجیوں کی حمایت۔ حفصہ کے لیے مشکل فیصلہ تھا، لیکن حق ان ہی کا تھا۔ یوں بھی مصباح اپنے حصے سے دستبرداری اختیار کر کے حفصہ کو مالک بنا چکی تھی۔ اس کا احسان۔ پھر اصباح کو گھر کا حصہ دینے کا ارادہ کر کے۔ بچی کی یتیمی اور بے سہارا پن۔ ماں باپ سے محروم۔ باپ کے گھر سے بے دخلی۔ ان کا دل بچی کے لیے تڑپ گیا، لیکن دنیا کی بے ثباتی۔ خود غرضی اور ریاکاری سے خوف زدہ۔ اس پر پابندیاں لگا دیں۔ وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ دوستوں سہیلیوں کو بلانا منع۔ زور سے بولنا، زور سے ہنسنا، رشتے داروں سے ملنے کے لیے بھی خالہ بی کا وجود ضروری۔ وغیرہ۔

کرائے دار کے لڑکے سے خوف زدہ، یہ نہیں جانتی تھیں کہ بیٹا بھی راہزن ہو گا۔ اس دن ہزار ہدایتیں دے کر کھانا تیار کر کے وہ واجد بھائی سے ملنے گئی تھیں۔ لڑ بھڑ کر آئیں۔ ان کا بیٹا سامنے نہیں آیا۔ یا وہ تھا ہی نہیں۔ گھر آکر دیکھا۔ اپنا بیٹا موجود۔ مع سامان۔ لاکھ خفگی سہی۔ ماں کا دل گداز، جذبوں سے لبریز، مگر دو گھنٹے بعد ہی سوچنے لگیں۔ امریکا کے تنگ دھڑنگ ماحول میں چھ سال گزار کر آنے والا۔ نہ جانے کس قماش کا ہو گا۔ بگڑنے میں پل نہیں لگتا۔ سدھرنے میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔

اور ان کا وسوسہ، وہم سچا تھا۔ رات ابھی گزری نہ

تھی۔ واردات ہو گزری۔ اصباح کی چیخ نماز کے دوران سنی۔ بغیر دیکھے سمجھ گئیں۔ ڈنڈا برآمدے میں رکھا رہتا تھا۔ اٹھا کر درانہ کمرے میں گھس گئیں۔ "چھوڑ۔ چھوڑ اس کا ہاتھ۔" مضبوط توانا مرد۔ ماں کی آواز کی کیا پروا کرتا۔ اصباح جدوجہد کے دوران زوردار لات اس کے پیٹ کے نچلے حصے میں مار چکی تھی۔ اس کا غصہ اور تکلیف۔ ضد ماں کی ڈانٹ ڈپٹ کو خاطر میں لائے بغیر لڑکی کو کھینچا۔ اور ماں نے ڈنڈا رسید کیا پیروں پر لگا۔ وہ ذرا سر جھکا کر اٹھنے لگا کہ دوسرا ڈنڈا۔ عین سر پر۔ اصباح ہاتھ چھڑا کر بھاگ چکی تھی۔

حفصہ بیگم کو اپنی طاقت کا پہلی بار احساس ہوا۔ جب بیٹا چیخ کر دہرا ہوا اور پلنگ سے لڑھک کر نیچے گرا اس کے سر سے خون بہا۔ چہرہ تر ہو گیا۔

"کیا سمجھتا ہے۔ میں اتنی کمزور ہوں۔ جان لے سکتی ہوں۔ عزت کے عوض۔" ان کا سانس تیز ہو رہا تھا۔ "بدبخت۔"

کیڑے کی طرح سر تھامے زمین پر سکڑا پڑا تھا۔ طاقت اتنی تھی تو نہیں۔ پھر یہ کہاں سے آئی۔ شاید۔ اس ذمے داری کے احساس نے۔ جو وہ اصباح کے لیے دل میں رکھتی تھیں۔ بے پناہ محبت۔ ماتا۔ ممنونیت۔ جو اس کی ماں نے ان پر احسان کیا تھا۔ جب وہ بے سہارا۔ کوڑی کوڑی کو محتاج تھی۔ یک لخت انہیں بیٹے کا خیال آیا۔ یہ بہتا ہوا خون۔ کس کا تھا۔ ان کا اپنا۔ ماں کے دودھ سے کشید کیا ہوا خون۔

وہ ڈنڈے سمیت صحن میں دوڑیں۔ درمیان کی دیوار میں کھڑکی جو عرصہ دراز سے بند تھی۔ زور زور سے ڈنڈے سے بجائی۔ کبھی سوچا نہ تھا۔ یہ کھڑکی اس لیے بنائی ہے کہ کبھی اس کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔ اس قسم کی مدد کے لیے۔ کھڑکی کھل گئی۔ حیران پریشان کرائے دار کا بیٹا۔ جسے مردود۔ مسٹنڈا کہتی تھیں۔

"جی۔ جی۔ خیریت۔" کہتا ہوا۔

"تمہارے پاس فون ہے؟ ذرا یہ قریب والے اسپتال فون تو کرو۔ ایمبولینس منگوالو۔"

"خ۔ خ۔ خیریت۔ تو ہے۔ خا۔ خالہ جی۔" حواس باختہ ہو گیا۔

"اوہو۔ تم تو ہکلے ہو۔ گھنٹہ لگا دو گے۔ نمبر ملا کر مجھے دو ذرا۔" وہ ہکلا نہ تھا، مگر "دشمن خالہ" کے بے وقت درشن اور خطرناک فرمائش۔ بجلی کٹوا دی۔ پانی کٹوا دیا۔ مقدمہ کر دیا اور اب.... جلدی سے نمبر ملا کر انہیں موبائل دیا۔ انہوں نے ایمبولینس طلب کی۔ ایڈریس بتایا۔ فون واپس کر دیا۔

"جج... جی خالہ جی۔ کون مریض ہے؟" خالہ جی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ابھی اپنے صحن میں ہی کھڑا تھا۔ اجازت ملتے ہی خالہ جی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اندر کا سین بہت خوف ناک تھا۔ چیخ نکل گئی۔

"آ۔ آپ نے قتل کر دیا۔"

"نہیں بھئی۔ ڈنڈا مارا تھا۔ میرا بیٹا ہے۔ آج امریکا سے آیا ہے۔" حیران لڑکے نے آگے آ کر ضرار کو دیکھا۔ فرش پر خون پھیل رہا تھا۔ "آپ نے۔ سر پھاڑ دیا بیٹے کا۔"

"ہاں۔ غلط جگہ لگ گیا۔"

"مگر۔ خالہ جی۔ اس طرح تو ڈاکو کو ہی۔" ایمبولینس آ گئی تھی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لڑکا ایمبولینس والوں کو راستہ بتانے باہر گیا۔ کھڑکی میں نوید صاحب لڑکے کے ابا جان سوالیہ نشان بنے کھڑے تھے۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"تماشا ہو رہا ہے۔ آیئے۔ آپ بھی نظارہ کر لیں۔"

اور وہ آ گئے۔ ضرار کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔

"یہ۔ یہ تو آج صبح۔ میں نے دیکھا تھا۔ ٹیکسی سے اتر رہا تھا۔"

"اچھا سنیے۔ میں اس کے ساتھ اسپتال جا رہی ہوں۔ آپ کھڑکی کھولے رکھیں پورا گھر آپ کے حوالے۔ میں شاید صبح آؤں۔"

وہ حیرت سے اس عورت کی مضبوط قوت ارادی اور قائم ہوش حواس دیکھ رہے تھے۔ کمروں میں لاک لگا رہی تھیں۔ اس حال میں بھی۔

”دروازے اندر سے بند کر لیں۔“ دو آدمی ضرار کو اسٹریچر پر لے جا چکے تھے۔ حواس قائم رکھنا ان کی مجبوری تھی گھر جو دشمن کے حوالے کرنا پڑا۔ ڈوری سے تولیہ بھی کھینچ لیا۔ پھر باہر نکل کر ثمینہ کا دروازہ۔ وہاں سے۔۔۔ آکر لڑکے سے کہا۔

”تم بھی چلو میرے ساتھ۔“ وہ بدک گیا۔ پہلا شک تو یہی تھا کہ اسے کہیں قتل کا ذمہ دار نہ ٹھہرا دیں۔

”جی۔ یہ تو پولیس کیس ہے۔ میں نہیں جاؤں گا۔“

”اوہو۔ تم اسپتال کے دروازے پر کھڑے رہنا۔ میں رات میں اکیلی واپس کیسے آؤں گی۔ چلو۔“

ادھر ایمبولینس والے نے جلدی مچائی۔ مریض بے ہوش ہو گیا۔ ضرار کے ساتھ بیٹھ کر اسے دیکھا۔ دل بیٹھنے لگا۔ تولیے سے چہرہ صاف کرتی گئیں۔ آنسو بہاتی گئیں۔ یہ وہی چہرہ ہے۔ جس کو دیکھ کر زندگی کی دعا مانگا کرتی تھیں۔ اس کے گھنے بالوں میں منہ گھسا کر لوریاں دیتی تھیں۔ بچپن سے نوجوانی تک کے کتنے ہی سین فلم کی طرح سامنے سے گزر رہے تھے مگر اسپتال آ گیا تھا۔ ایمرجنسی میں ڈاکٹر نے دیکھتے ہی کہہ دیا۔

”یہ تو سراسر اقدام قتل کا کیس ہے۔“

”اچھا! پھر بلا لو پولیس کو۔ لگا دو ماں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ میں نے سرزنش کے لیے ذرا سا ڈنڈا گھمایا۔ بس آج کل کی نازک اولاد۔“

”سچ بتائیں۔ یہ آپ کا بیٹا ہے۔ سگی اولاد۔ آپ نے خود اس کو زخم لگایا ہے۔ کوئی اور۔۔۔“

”کوئی اور میرے بیٹے کو ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ سر نہ پھاڑ دوں گی اس کا۔ پھر بدتمیزی کرے گا یہ۔ تو پھر پٹے گا۔“

”آپ تو۔ لگتا ہے۔۔۔ عادی ہیں۔۔۔ میں مجبوراً پولیس سے رابطہ۔۔۔“ ڈاکٹر ان کو سمجھ نہ سکا۔

”اچھا بھئی۔ پہلے زخمی کا حال دیکھ لو۔ پھر بے شک پولیس بلا کر میرے ہتھکڑی لگا دینا اور اس سے پہلے ذرا مجھے اپنا فون دو۔ میں یہاں کے آئی جی کو بلا لوں۔ بڑی بھابھی کے ہتھکڑی لگے دیکھ کر بہت خوش ہو گا۔ تمہیں انعام بھی دے گا۔“

”ک ک کون۔ آ آئی جی یعنی کہ۔“

”یعنی کہ میرا دیور نثار حسین۔ اس لڑکے۔ یعنی کہ زخمی کا سگا چچا۔“ سنتے ہی ڈاکٹر رفو چکر ہو گیا۔ زخمی کی دیکھ بھال۔ مرہم پٹی اس پر فرض تھی۔ زخمی کے پٹی ہو گئی۔ انجکشن لگ گیا۔ ڈرپ لگا دی گئی۔ زخم بہت گہرا نہ تھا مگر خون کافی بہہ گیا تھا۔

”اب میں گھر جاؤں؟ یا پولیس آئے گی؟“ مطمئن ہو گئی تھیں۔

”آپ۔۔۔ واقعی اس کی ماں ہیں؟ اس کے پاس رہیں گی نہیں؟“ ڈاکٹر مشکوک تھا۔

”میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ اس کو تمہارے پاس تمہاری ذمے داری پر چھوڑ کر جاؤں گی۔ سن لو۔ آئندہ بھی ایسا ممکن ہے۔ میں شرمندہ نہیں ہوں۔“ ڈاکٹر ان کے رعب میں آ گیا۔ ڈکٹیٹر۔ ضرار کو ہوش آ گیا تھا۔ اماں کہہ کر بیٹھنے لگا۔ نرس نے پھر لٹا دیا۔ انہوں نے اس کے پٹی میں بندھے سر کو دیکھا۔ نہ جانے کتنی تکلیف ہو رہی ہو گی۔ دل دکھ سے بھر گیا۔

”اب میں گھر جا رہی ہوں۔“ بیٹے کے سر پر پٹی کو نرمی سے چھوا۔ آنسو حلق کے اندر اتارے۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں لجاجت کے پیغام ارسال کیے۔

”رک نہیں سکتی۔ یہاں یہ نرسیں ہیں۔ ڈاکٹر ہے۔ تمہاری دیکھ بھال کریں گے۔ صبح آؤں گی۔ ناشتا لے کر۔“

اسپتال کے گیٹ پر کرائے دار کا بیٹا کھڑا تھا۔ متفکر سا۔ (پولیس دیکھ کر دوڑ لگا دوں گا۔ سوچ لیا تھا۔)

”ٹیکسی روک لو۔“ آرڈر ملا۔

”سب ٹھیک تو ہے جی۔۔۔“ گھبرائے ہوئے کرائے دار نے پوچھا۔ جواب ”ہوں“ میں ملا۔ ٹیکسی میں گھر آئیں۔

”سنو! اے لڑکے کیا نام ایسا کرو اپنے گھر کے دروازے سے اندر جاؤ۔ کھڑکی کے راستے میرے گھر کے برآمدے میں سو جانا اور ہاں۔۔۔ ٹین لیٹ۔۔۔ یہ دا

(اشارہ کیا) اندر سے چٹخنی کھول دینا۔ میں باہر سے لاک کر کے جا رہی ہوں۔ صبح سویرے آؤں گی خود ہی کھول کر۔ ناشتا بنا کر اسپتال لے جانا ہے۔" وہ گردن ہلاتا رہا۔

کیا مجبوری ہے۔ کمبختوں کو چوکیداری سونپ دی۔ کل تک جن کو غاصب' بے ایمان' قبضہ گروپ کہہ کر بدنام کرتی تھیں۔ مرد کا سہارا بھی ضروری ہے۔ ایک اپنا بیٹا ہے۔ دوسروں کو الزام دینے کا یہ صلہ ملا کہ اپنا بیٹا ہی ڈاکو بن گیا۔

ثمینہ نے پہلی دستک پر دروازہ کھول دیا۔ ہمدرد ہستی۔ فکر مند چہرہ۔ ان کی برداشت جواب دے گئی۔ ثمینہ کے گلے لگ کر لڑکھڑا گئیں۔ ثمینہ گھبرا گئیں۔ سہارا دے کر اندر لائیں۔ ٹی وی بند کیا۔ ساتھ لپٹ کر بیٹھیں۔ وہ بھی اپنا دکھ آنسوؤں کی زبان میں بیان کرنے لگیں۔ ثمینہ نے پانی پلایا پیٹھ سہلائی۔

رات کا سناٹا۔ ماں کی درد بھری فغاں۔ ثمینہ کا دل بھر آیا۔ نہ جانے کیا ہوا ہے جو باجی جیسی مضبوط چٹان میں دراڑ پڑ گئی۔ آنسوؤں کی برسات پہلی بار دیکھی تھی۔

"باجی! دل سنبھالیں۔ مجھے بتائیں ہوا کیا ہے۔" اولاد کا جرم۔ اپنی سنگدلی۔ مجبوری کی داستان کن الفاظ میں سنائیں' لیکن بوجھ ہلکا نہ کیا تو... آہستہ آہستہ سناتی چلی گئیں۔

سچی۔ کھری مضبوط ایمان کی مالک عورت۔ ماں بعد میں تھی۔ فرض شناس عورت پہلے۔ ثمینہ تاسف میں گھر گئیں۔ کیا قسمت ہے اس عورت کی۔ تنہا عمر گزار دی' شوہر دغا دے گیا۔ بیٹے نے آتے ہی یہ گل کھلائے۔ ان کا بیٹا بھی کئی سال بعد آیا تھا۔ شادی کر کے اب میاں بیوی خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں اور ان کا بیٹا پہلے دن ہی اسپتال پہنچ گیا۔ ماں کے ہاتھوں۔ خدایا رحم کر۔ "ہوش میں تو تھا...؟"

"ہاں۔ اس کی فکر نہیں ہے مگر جو کرائے داروں کے سپرد کر کے آئی ہوں۔"

"یہ کیا غضب کیا آپ نے۔"

"ثمینہ! اس گھر میں جانے کو دل نہ چاہا۔ کمرے میں اس کا خون..." سر جھکا لیا۔ آنسو ٹپکنے لگے۔ پھر سر اٹھا کر پوچھنے لگیں۔ "اصباح... ٹھیک ہے؟"

"جی۔ پہلے روتی رہی۔ پھر آئمہ نے بہلا لیا۔ سو گئی ہیں دونوں۔"

"اچھا۔ یہ وقت بھی آنا تھا۔" سرد آہ۔ "جس برے وقت سے بچانے کے لیے اسے پردوں میں چھپا کر رکھتی تھی۔ یہ خبر نہ تھی۔ میری ہی اولاد..." آواز گلے میں پھنس گئی۔

ثمینہ نے تسلی دی۔ "چلیں جانے دیں۔ اللہ مالک ہے۔ آپ آرام کریں۔ فکر نہ کریں۔" وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئیں۔

ثمینہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئیں۔ تاسف۔ عورت کے نصیبوں کے سارے کھیل ہیں اور اب۔ اس بچی کی حفاظت کا مسئلہ۔ نہ جانے کیسے رشتے دار ہیں۔ بچی کو درمیان میں لٹکایا ہوا ہے۔ اللہ اس کے لیے بہتر راہ نکالے۔ وہ تو سو گئیں۔

حفصہ بیگم کی نیند اڑ گئی۔ لاؤنج سے متصل ایک چھوٹا واش روم تھا۔ وہاں جا کر وضو کیا اور تہجد ادا کرنے لگیں۔ دعائیں اور وظیفے۔ پھر فجر ہو ہی گئی۔ دروازے کھلنے کی آواز۔ ثمینہ کے میاں مسجد جا رہے تھے۔ شاہد' زاہد کو بھی جگا کر لے جاتے تھے۔ کتنا اچھا ماحول ہے۔ امن' محبت' سیدھا سادہ گھرانہ' ہمدرد لوگ' ایک میں ہوں فکر میں مبتلا۔ اطمینان نصیب ہی نہیں۔ اصباح کی طرف سے ہی کم فکر نہ تھی کہ بیٹے نے پریشان کر دیا۔ بیٹا کسی قابل ہوتا۔ اصباح کی اب بھی اس سے ہو سکتی تھی۔ خلع کے بعد' واجد بھائی نے اطمینان نہیں دلایا نہ مایوس کیا۔ عجیب مبہم سا جواب دیا۔ بھئی آپ کا بیٹا انکار کر رہا ہے۔ تو پھر اس سے طلاق کا کہیں۔ بچی کو فارغ کریں۔ ابھی تو۔ اعزاز' افراز اور اتنی معصوم پیاری بچی ہر کسی کی پسند ہوتی ہے۔ کون انکار کر سکتا ہے۔ فی الحال تو گھر کی فکر کم نہیں تھی۔ نہ جانے... ضد میں وہ لڑکا اندر گھسا کیا توڑ پھوڑ کر رہا ہو گا اور ضرار... پتا نہیں رات کیسی گزری ہو گی۔

زخم میں ٹانکے لگے ہیں ۔ تکلیف تو ہوگی۔ آئمہ الماری سے قرآن شریف لینے آئی۔ ٹھٹک گئی۔

"ارے۔ آپ جاگ گئیں۔ امی سمجھ رہی تھیں آپ سو رہی ہوں گی۔ میں چائے لاتی ہوں۔"

"چائے بعد میں لے آنا۔ قرآن شریف پڑھ لو۔"

"میں چائے بنا رہی ہوں۔ ابو آتے ہوں گے۔ امی بھی جاگ رہی ہیں۔ قرآن میں بعد میں پڑھ لوں گی۔ ابھی تو اصباح نے مانگا ہے۔ اس کے لیے لینے آئی تھی۔"

وہ قرآن پاک لے کر چلی گئی۔ وہ بھی صوفے پر لیٹ گئیں۔ جسم کا انگ انگ دکھ رہا تھا۔ دل بے چین۔ کچھ دیر بعد شاہد' زاہد کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر آئمہ چائے لے آئی۔ اصباح بھی وہیں آگئی۔ خالہ بی نے بازو پھیلا دیے۔ وہ سما گئی۔ کیسا سکون ملا۔ رات بھر میں خون نچڑ گیا تھا جیسے۔ ہا۔ بچی کیسی خوف زدہ تھی۔

"ہم گھر کب چلیں گے۔" وہ جانتی نہ تھی 'خالہ بی کیا کارنامہ انجام دے چکی ہیں۔

"تم ابھی یہیں رہو۔ میں جاؤں گی۔"

"خالہ بی۔ آپ بھی رکیں۔ ناشتا کر کے جائیے گا۔" آئمہ نے محبت سے کہا۔

"مجھے اسپتال جانا ہے ناشتا لے کر۔ خود بھی کرلوں گی۔" لڑکیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اسپتال ۔۔۔؟"

"ہاں۔ ضرار وہیں ہے۔" انہوں نے اختصار سے کام لیا۔ لڑکیوں نے نظروں کا تبادلہ کیا۔ چائے ختم کر کے اپنا پرس اٹھا کر چلی گئیں۔

گھر کا لاک کھول کر اندر آئیں۔ کرائے دار لڑکا برآمدے میں نماز کی چوکی پر سکڑا ہوا سو رہا تھا۔ سرہانے اس نے کرسی رکھ لی تھی۔ اس پر ایک چادر کو تہہ کر کے گویا تکیہ بنا لیا تھا۔ "ہئے ہئے بے چارا اور میں سمجھ رہی تھی توڑ پھوڑ کر رہا ہوگا۔ گھامڑ کہیں کا۔ اپنے گھر سے بستر ہی لے آتا۔ بھلا مانس ہے۔"

فوراً" خیال بدل گیا۔ کھٹ پٹ کی آواز سے جاگ گیا۔ خالہ بی کو دیکھ کر اوہ کر کے بولا۔

"آپ اتنے سویرے جاگ گئیں۔"

"بس بیٹا۔" (ہائے۔ کیا وقت پڑا تھا جس کا نام ہی سنڈا مسٹنڈا رکھ چھوڑا تھا۔ آج بے اختیار بیٹا کہہ دیا۔ خود ہی شرمسار ہو گئیں)

"نیند آئی ہی نہیں۔ اسپتال ناشتا بھی لے کر جانا ہے۔ میں تمہارا ناشتا بھی بنا رہی ہوں۔ آملیٹ کھاؤ گے۔ پراٹھے بھی بنا رہی ہوں۔"

لڑکا جھینپ گیا۔ (لڑاکا آنٹی۔ اتنی مہربان)۔

"نہیں۔ میں گھر پر کرلوں گا۔ آپ کو زحمت ہوگی۔"

"تم نے بھی اتنی تکلیف اٹھائی۔ گھر سے بستر لے کر آتے۔ معاف کرنا۔ مجھے ہوش نہ تھا کہ تمہیں بتاتی۔ پیچھے گیلری میں پلنگ بھی کھڑا ہے۔ میرے ساتھ کرلو ناشتا۔"

ہائے رے غرض۔ کل تک جو دشمن تھے۔ آج انہیں ہی دوست بنانا پڑا اور جو اپنا بیٹا ہے۔ وہ؟

"نہیں خالہ جی! شکریہ۔ دراصل مجھے بھی دیر سے نیند آئی۔ آپ کے بیٹے کی فکر تھی۔ آپ رک جاتیں یا مجھے کہتیں میں رک جاتا۔ اصل میں۔ میں تو ڈر رہا تھا۔ پولیس مجھے ہی نہ دھر لے۔"

"ہاں۔ کہتے تو یہی تھے کہ یہ پولیس کیس ہے۔" جلدی جلدی انڈا پھینٹ رہی تھیں۔

"میں نے کہا۔ ٹھیک ہے لگا دو میرے ہتھکڑی۔ پہلے مجھے آئی جی نثار حسین سے بات کرنے دو۔ وہ اپنی بڑی بھابھی کو ہتھکڑی میں دیکھ کر تمہیں انعام دیں گے۔ بس ڈر گئے۔"

"کیا واقعی۔ آپ آئی جی کی بھابھی ہیں۔" (حیرت پھر ہمارے معاملے میں ان سے مدد کیوں نہ لی۔)

"لو۔ میں کیا جانوں آئی جی نگوڑے کو۔ اخبار میں کہیں پڑھا تھا۔ تڑی لگا دی۔"

"(ہاں جی۔ اس کی تو ماہر ہیں۔)" "اچھا خالہ میں چلتا ہوں۔"

"ارے کر لیتے ناشتہ۔ ویسے شکریہ۔ رات کو ساتھ جانے کا۔ اور گھر کی چوکیداری کا۔"

(چوکیداری؟ جز بز ہوا۔) "ابھی تو گھر جا کر سوؤں

گا۔" کہہ کر کھڑکی سے اپنے گھر میں کود گیا۔
کھڑکی بند۔ چلو۔ بزرگ کہہ گئے ہیں وقت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے۔ شاید یہی وقت تھا۔
اسپتال میں صبح بڑی ہلچل ہوتی ہے۔ ناشتے۔ نرسوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ کینٹین کے بیرے ادھر سے ادھر ناشتہ لیے پھر رہے تھے۔ "ضرار جاگ رہا تھا ماں کو دیکھ کر آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس ناشتہ کرایا۔
"رات کو۔ نیند آگئی تھی؟ کوئی درد وغیرہ۔"
ضرار منہ پھلا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ "خود ہی ڈنڈا مارا۔ اب پوچھتی ہیں۔"
"مرد بنو۔ کیا ہو گیا۔ پراٹھے بنا کر لائی ہوں دیسی گھی کے۔ پنیر والا آملیٹ۔ کیسا ہے؟" بہلا رہی تھیں اسے۔
وہ آنکھوں میں آنسو بھرے انہیں دیکھتا رہا۔ ان کے ہاتھ پکڑ کے چومنے لگا۔ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ضبط کے باوجود آنکھیں بھر آئیں۔ ہائے؟ ماں کا دل۔ اور کیا رات کو ماں کا دل نہ تھا؟ قصائی بن گئیں۔
نرس ٹھٹک گئی۔ "آپ سگی ماں ہیں؟ یقین نہیں آتا۔" ٹھک ٹھک کرتی چلی گئی۔ اپنے گھر جانے کے بجائے رفیعہ کے گھر چلی گئیں۔ کچھ مشورہ کرنا تھا۔
رفیعہ ان کی بات سن کر دنگ رہ گئیں۔
"یعنی۔ واجد بھائی بھی انکاری ہو گئے۔ مجبوراً"۔"
"بالکل انکار نہیں کیا۔ گومگو میں تھے۔ لڑکا مانتا نہیں۔ کوشش کرنے کا کہا ہے۔"
"سیدھی طرح طلاق دے دیں۔ بات ختم۔ مگر مہر کے معاملے میں۔ جان اٹکتی ہے۔ واجد بھائی شریعت کے پابند ہیں۔ شاید مہر تو دلوا دیں گے۔ ورنہ اللہ کا عذاب کون برداشت کرے گا۔ لیکن آپا" آپ لڑکے سے ملیں تو سہی۔ ایک بار وہ اصباح سے مل تو لے۔ پتا نہیں کبھی دیکھا بھی ہے۔"
"اب یہ بتاؤ۔ کب تک انتظار کروں ان کی کوشش کا۔ خلع کا نوٹس بھجوا دوں۔"
"اگر۔ مان جائیں تو۔ میں تو اس کی گلو خلاصی ہوتے ہی بہو بنا کر لے آؤں گی۔"
"رفیعہ! اگرچہ سال سے نکاح کا کچھ اثر تو ہو گا۔ ذکر پر رنگ اڑ جاتا ہے اصباح کا۔ دیکھا تو اس نے بھی نہیں ہے مگر۔ تعلق تو ہوتا ہے۔ لڑکے نے ملنے یا دیکھنے کی شرط رکھی نہیں۔ ورنہ کیا رکاوٹ ہے۔ اصل میں کسی اور لڑکی سے دل لگا لیا ہے۔"
"تو آپ طلاق کا مطالبہ کریں اصباح کو سمجھا دیں۔ یا انتظار کریں۔"
"رفیعہ! اصل میں اب میرے پاس انتظار کا وقت بھی نہیں ہے۔ کل۔"
سوچ سمجھ کر مناسب الفاظ میں پورا واقعہ سنایا۔ اپنا کارنامہ۔ رفیعہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ منہ فق۔ حیرت۔ تاسف۔
"اب وہ اسپتال سے آئے گا۔ پتا نہیں کیا کرے گا۔ بدطینت ہے تو بدلہ تو لے گا ہی۔ اصباح کو کہاں چھپاؤں۔ تمہیں اپنا سمجھ کر بتا رہی ہوں۔ کروں کیا؟"
"آپا! ویسے تو میرا گھر حاضر ہے۔ مگر یہ کوئی حل تو نہیں ہے۔ آپ واجد بھائی پر دباؤ ڈالیں۔ اگر۔ ضرار کے آنے پر اصباح کا تعارف کرا دیتیں۔ وہ اتنی ہمت نہ کرتا۔ ظاہر ہے امریکہ کے ماحول کا عادی۔ ابھی یہاں کے طور طریقے سمجھنے میں کچھ عرصے تو لگے گا۔ اس پر بھروسا کریں۔ آپ کا بیٹا ہے۔"
"ابھی مجھے یہ بھی تو پتا نہیں کہ وہاں کیا گل کھلا کر آیا ہے۔ یا سچ مچ ماں کی یاد نے۔ خیر۔ تمہارے ہاں چھوڑ دوں۔ مجھے تمہارے بیٹوں پر بھروسا ہے۔ مگر سب سے کیا کہوں گی۔ کبھی تو وہ یہاں آ کر رہی نہیں۔ پڑوس میں بھی ان کے بیٹے چھوٹے ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ دوستی ہے اس کی۔ مگر۔ غیر ہی ہیں۔ کوئی وجہ بھی تو ہو۔ سب کو بیٹے کے کمینے پن کی کہانی تو سنا نہیں سکتی۔ اس کے مزاج کو سمجھنے کے لیے مجھے بھی وقت درکار ہے۔ ابھی تو خود مجھے علم نہیں۔ اچھا۔ تم اپنے طور پر اگر سعیدہ سے باتوں باتوں میں پوچھ لو کہ تمہارا بیٹا آ گیا ہے۔ رخصتی کب کرا رہی ہو۔ دیکھو کیا جواب دیتی ہیں۔ میرا نام نہ لینا۔"

"ٹھیک ہے۔ اصباح کو آج ہی لے آئیں۔ امتحانوں سے فارغ ہو کر لڑکیاں ملنے ملانے جاتی ہی ہیں۔ افراز تو اسلام آباد میں ہے۔ ٹرانسفر ہو گیا ہے۔ اعزاز صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ اجیہ کے ساتھ اصباح کا دل لگا رہے گا۔ ثریا بھی آنے والی ہے۔"

اصباح کو رفیعہ کے گھر سے قدرتی لگاؤ تھا۔ ان کے برابر میں ہی تو اس کا اپنا گھر تھا۔ اپنا گھر۔ جہاں نہ جانے اب کون رہتا ہے مگر۔ اس کے بچپن کی یادیں۔ اس گھر سے وابستہ تھیں۔ خالہ بی نے چاہا کہ وہ اپنے کچھ کپڑے ضرورت کا سامان لے کر آئے۔ پھر مناسب نہ سمجھا۔ کمرے میں ضرار کا خون۔ بستر پر خون۔ وہ خود اپنے گھر سے نظر چرا رہی تھیں۔ کمرے کی حالت کا سوچ کر ماں کا خون ہوتا محسوس ہوتا۔

ثمینہ اپنی ملازمہ کو ساتھ لے کر خود گئیں۔ کمرہ دھلوایا۔ بستر تبدیل کیا۔ خالہ بی نے لڑکی کو انعام کہہ کر سو روپے دیے۔ بہت شرمائی۔ آنچل دانتوں میں دبا کر نوٹ پکڑ کر ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

"اس کی تو عید ہو گئی۔" آئمہ نے بتایا۔ "ماں آکر تنخواہ لے جاتی ہے۔ اس کو دو روپے مکئی کے دانوں کے دیتی ہے۔ کبھی دس روپے نہیں دیے، آئس کریم کے لیے۔"

اصباح مگر گھر جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ اگر اسپتال سے اچانک آجائے۔ اسے دیکھ کر پھر غصہ آجائے۔ پیٹ میں لات ماری تھی۔ بھولا تو نہیں ہوگا۔ خالہ بی خود ہی جاکر کپڑے لے آئیں۔ اصباح کو رفیعہ کے گھر پہنچوایا۔ وہاں سے اسپتال گئیں۔

"اماں! ڈاکٹر سے کہو۔ مجھے آج ہی چھٹی دے دیں۔ دل گھبراتا ہے بہت۔" ملجاجت سے کہا تھا۔

"کیوں؟ دل کیوں گھبراتا ہے؟ نرسیں دل نہیں بہلاتیں؟" طنزاً کہا۔ "اچھا خیر۔ شام کو رقم لاؤں گی تو چھٹی کروا دوں گی۔ ابھی تو اندازہ نہیں بل کتنا ہو گا۔"

"کمرے میں میرا نیلا بیگ الماری میں رکھا ہے۔ اسی میں رقم ہے۔" گردن جھکالی۔

تب گئیں "اللہ وہ دن نہ لائے۔ جو میں تم سے رقم لوں۔ تم نے جب کبھی ڈالر بھیجے۔ وہ بینک کے لاکر میں رکھے ہیں۔ لے لینا وہ بھی تم۔ میں کسی سے ادھار کر لوں گی۔"

بیٹے کو مایوس اور حیران کر کے آگئیں رفیعہ کے ہاں اصباح کا حال پوچھنے اور رفیعہ سے معلوم کرنا تھا۔ سعیدہ کے فون کا۔ انہوں نے اپنے کمرے میں لے جاکر سرگوشی میں بتایا۔

"سعیدہ خود پریشان ہیں۔ لڑکا راضی نہیں۔ اصل میں یہاں کوئی لڑکی اسے بہت پسند آگئی ہے۔ کہتا ہے۔ آپ اس لڑکی کو دیکھ لیں۔ پھر فیصلہ کریں۔ اگر آپ کو پسند نہ آئے۔ تو پھر جو آپ کہیں گی۔ مان لوں گا۔ اب سعیدہ اس دوسری کو دیکھنے جائیں گی۔"

حفصہ بیگم پریشان ہو کر لیٹ گئیں۔ شام کو اسپتال کا بل بھی جمع کرانا ہے۔ کس سے کہیں۔

"آپا ہو سکتا ہے سعیدہ کو پسند نہ آئے۔ یا اگر وہ خاندان کے دباؤ کی وجہ سے بظاہر کہہ دیں کہ نہیں پسند آئی۔ تب۔ آپ تیار رہیں۔ اچھا ایک بات اور کہوں گی۔" وہ قدرے ہچکچا کر ان کو دیکھنے لگیں۔

"آپا! بیٹا آپ کا ہے۔ جیسا بھی ہے۔ آپ کے زیر سایہ تربیت ملی ہوتی۔ تو آپ کی مرضی کے مطابق ہوتا۔ امریکہ میں وہاں کے رنگ میں رنگ گیا تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اب آگیا ہے تو غنیمت جانیں۔ آپا! ماں کو بہت تقویت ہوتی ہے بیٹے کی ذات سے۔ اسے سمجھا بجھا کر۔ پیار محبت سے اپنا بنائیں۔ یہاں کے طور طریقوں سے آگہی ہو گی تو اسے عقل آجائے گی۔ سچ کہتی ہوں آپا۔ آپ کے نصیب جاگ جائیں گے۔ اللہ میاں نے موقعہ دیا ہے اسے سنبھلنے کا۔ آپ کو اسے سمیٹنے کا۔ مار پیٹ، سختی ہمیشہ کارگر نہیں ہوتی۔ جہاں آپ کی سرزنش اس کو سدھرنے میں مدد دے گی۔ وہاں ماں کا پیار اور ممتا اس کو سیدھے راستے پر چلنے کا درس دے گی۔ ممتا میں بڑی کشش ہے آپا۔ اور اولاد بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ کا شکر کریں۔ کوئی ہے آپ کا۔ اکیلی نہیں ہیں آپ۔ کوئی تڑپ ہے، جو اسے واپس لائی ہے۔ قدر کریں اس کی۔"

حفصہ بیگم سر نیچے کیے خاموش آنسو بہا رہی تھیں۔

"آپا دیکھیں۔ بیٹی کے لیے آپ کو کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔ اس کے ماں باپ نے تو اسے نکاح کر کے مضبوط رشتے میں باندھ دیا کہ وہ محفوظ ہو گئی۔ لیکن آج وہ کتنی غیر محفوظ ہے۔ بے آسرا ہے۔ بیٹے کے ساتھ ایسی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ کم از کم بے بسی نہیں ہوتی۔"

رفیعہ انہیں تسلی دے کر کام میں لگ گئیں۔ کچھ دیر بعد آکر دیکھا۔ وہ ابھی تک اسی طرح سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔

"اچھا۔ اب فکر کرنا چھوڑیں۔" انہوں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ "یقین کریں۔ وہ اگر بگڑا ہے۔ تو سدھر بھی جائے گا۔ آپ کی ایک بار کی سرزنش نے اسے احساس دلا دیا ہوگا کہ ماں محبت کرتی ہے تو سزا بھی دے سکتی ہے۔ خیر۔"

"تمہارے سامنے ہے کوئی مثال۔ کہ بگڑی ہوئی اولاد سُدھر گئی ہو۔" وہ ایک دم بولیں۔

رفیعہ مسکرائیں۔ "بے شمار۔ لیکن کم از کم آپ میں اتنی صلاحیت ہے۔ کہ اپنی اولاد کو سیدھا کر دیں۔ اچھا خیر چھوڑیں۔ ایک اور معاملہ ہے۔ آپ برا نہ مانیں۔ یہ۔ یہ لے لیں۔" ایک لفافہ ان کی طرف بڑھا رہی تھیں۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"یہ۔ آپا۔ کئی سال پہلے۔ جب اعزاز کے یونیورسٹی داخلے کے لیے میں نے آپ سے قرض لیا تھا۔" ہچکچا رہی تھیں۔ "آپ نے دے کر کہا تھا یہ قرض نہیں۔ اعزاز میرا بھی بیٹا ہے۔ تو۔ پھر۔ بعد میں افراز کی جاب بھی ہو گئی۔ میری ہمت نہ پڑی آپ کو یہ واپس کرنے کی۔ اب۔ اعزاز بھی ماشاء اللہ کما رہا ہے۔ تو اس نے دیے ہیں کہ وہ اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنوں کی کچھ خدمت کر سکے۔ آپا! پلیز رکھ لیں۔ بچوں کو یہ احساس ہو جائے کہ جو ان کے برے وقت میں کام آتے ہیں۔ وہی خیر خواہ ہوتے ہیں۔ باقی تماش بین۔"

"مجھے تو یاد نہیں۔" انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے پتا ہے آپ کس طرح سلوک کر کے بھول جاتی ہیں۔ مگر جن پر برا وقت آئے اور اس وقت جو ساتھ دے۔ اسے بھولنا نہیں چاہیے۔ مجھے یاد ہے۔ اس لیے کہ ان دنوں میں بہت پریشان تھی۔ کتنے لوگوں سے قرض مانگ کر شرمندہ ہوئی۔ کوئی کام نہ آیا۔ صرف آپ تھیں۔ جو دے کر بھی واپس نہ لینے کا وعدہ لے رہی تھیں۔"

ایک وقت وہ تھا۔ جب رفیعہ مانگ کر شرمسار تھیں۔ اور ضرورت پوری ہونے پر بھی شرمندہ۔ آج وہ دے کر شرمندہ ہو رہی تھیں اور حفصہ بیگم لیتے ہوئے۔ وقت کتنا بے رحم اور مہربان ہے۔ دونوں کے احساسات میں عجیب سی یگانگت تھی۔

"اچھا رفیعہ! میں چلتی ہوں۔ اسپتال کا چکر لگا لوں۔ اگر آج ڈسچارج کر دیا تو گھر لے جاؤں گی۔ ممکن ہوا تو واپسی میں شاید دیر ہو جائے۔" کھڑی ہو گئیں۔

"آپا، پھر گھر پر ہی رک جائیں۔ کہاں اکیلی آئیں گی۔ یا پھر ضرار کو لے کر یہیں آ جائیں۔ سب سے مل کر اس پر اچھا اثر پڑے گا۔"

"اس پر اچھا اثر پڑے۔ نہ پڑے۔ اصباح مر جائے گی۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا۔" کہہ کر باہر آ گئیں۔

اسپتال کے سارے معاملات۔ بلوں کی ادائیگی۔ پھر ڈاکٹروں کی ہدایتیں۔ سب درست۔ پرانی گھسی ہوئی کھٹارا ٹیکسی۔ ویسا ہی بوڑھا گھسا ہوا اس کا ڈرائیور۔ اسپتال کے گیٹ پر ہی دستیاب تھا۔ ٹیکسی کی خوفناک آواز۔ رک رک کر چلنا۔ ضرار کو کوفت ہو رہی تھی۔

"میں بہت جلد گاڑی لے لوں گا۔" اماں کو دیکھ کر کہا۔

اماں نے ہونٹ سکوڑ کر منہ سڑک کی طرف کر لیا۔ گویا۔ اونہہ۔ مجھے کیا۔ ضرار نے کم از کم یہی نتیجہ اخذ کیا۔ (اور سچ بھی یہی تھا۔) ٹیکسی سے اتر کر ڈرائیور کو دو ہزار دیے۔ ہمدردی۔

"اچھا۔ اب غور سے سنو میری بات۔" گھر کے اندر پہنچ کر، ضرار کو کمرے میں لٹا کر، انہوں نے اسے

متوجہ کیا۔ ضرار کے چہرے پر کمزوری کے آثار تھے۔ پورا سر پٹیوں میں اس طرح چھپ گیا تھا۔ گویا ٹوپی منڈھی ہوئی ہے۔ رنگ بھی پیلا ہو گیا تھا۔

"وہ جو لڑکا۔ تمہارے ساتھ آیا تھا۔ اس کا فون نمبر بتاؤ۔ میں پڑوس میں جا کر کر دوں گی۔ اسے بلاؤں گی۔ اور تب تک تم اپنا بکھرا ہوا سامان سمیٹو۔ وہ آجائے تو جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔ میں نے جو کرنا تھا۔ کر لیا۔ اب میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ تو یہ گھر تمہارے باپ کا ہے' جہاں حق جتا کر رہو۔ یہ گھر میرے باپ کا ہے اور اس کی مالک میں اور وہ لڑکی ہے۔ جسے تم نے شکار کرنا چاہا تھا۔"

ہکا بکا۔ بلکہ اس سے زیادہ پریشان۔ کن حالت میں وہ ماں کی کھردری خشک بے درد اور دل چیرنے والے جملے سن اور سہ رہا تھا۔ نقاہت نے از سر نو حملہ کیا۔ آنکھیں بند کر کے شاید ابلتے آنسو اندر ہی دبا دیے۔ بولا تو آواز بھی جکڑی ہوئی تھی۔

"اماں! بہت برا ہوں۔ بہت سخت سزا کا مستحق ہوں۔ کس طرح معافی مانگوں۔ کہو تو ابھی سڑک پر جا کر لیٹ جاؤں۔ کوئی گاڑی کچلتی ہوئی گزر جائے۔ میرا خاتمہ اسی طرح۔ شاید آپ سے معافی مل جائے۔"

"اے سنو! میں باتوں سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ مر کر بھی تمہیں معافی نہیں ملے گی۔ کوئی ایک جرم تو نہیں ہے۔ لمبی فہرست ہے بیٹا۔ جس طرح تم نے تمہارے باپ نے مجھے تڑپایا ہے۔ مجھے اکیلا کر کے بے آسرا کیا۔ وہ تو الگ رہا' تم نے تو بھری دنیا میں مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ سر اٹھا کر جینے کے لائق نہ چھوڑا اور اب جو فخر سے سر اٹھا کر آ گئے ہو۔ بلا اجازت' تو آتے ہی اپنا رنگ دکھا دیا۔ اب اس تمہارے کیے ہوئے کارنامے کے بعد میں خود بھی جان دے دوں تو اس معصوم پاک دامن لڑکی کے سامنے میری روح شرمندہ رہے گی۔ صرف ایک اس گناہ کی وجہ سے کہ تم کو دنیا میرے بیٹے کے نام سے جانتی ہے۔"

ضرار کی ہچکی بندھ گئی۔ نادم اور شرمسار۔۔۔

"وہ۔۔۔ وہ کدھر ہے۔ میں اس کے قدموں میں گر کر اس سے معافی مانگ لوں گا۔"

"وہ تمہاری صورت دیکھتے ہی مر جائے گی۔ ایسی ہی ہے وہ' میں نے پالا ہے سختیوں میں' پابندیوں میں کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے کردار پر اور اس نے میرے ہر اشارے کو حکم سمجھ کر تعمیل کی۔ وہ میرے پاس امانت ہے' منکوحہ ہے۔ سمجھتے ہو' تم نے جو کیا۔ چاہتی تو پولیس کے حوالے کر دیتی مگر جرم میرے گھر پر میری موجودگی میں ہوا' تو سزا بھی مجھے ہی دینی تھی' اب اٹھو سامان سمیٹو اور چل پڑو۔"

دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس کا رد عمل دیکھے بغیر دروازے کی طرف چلی گئیں۔ سنگ دل ماں کے زہریلے جملے' ایک ایک لفظ نشتر بن کر چبھ رہا تھا۔ لمبے لمبے سانس لینے لگا' یک لخت آکسیجن کی کمی محسوس ہوئی' کوئی عورت۔ جس کا خمیر محبت' ایثار اور درد مندی سے گوندھا گیا ہو' ماں جسے ممتا کی تفسیر کہا گیا ہو' اتنی بے رحم' بے نیاز کیسے ہو سکتی ہے' لیکن جب اپنے کردار پر توجہ کی اس ماں کو تنہا چھوڑ کر باپ کے لالچ دینے پر' شوق کی خاطر چپکے سے چلے جانا اور سالوں خبر نہ لینا' باپ کا تسلی دینا' تمہاری ماں کا پورا خاندان ہے وہاں' اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ شاید اماں اپنے رویے میں حق بجانب ہوں' نہ جانے ان پر کیا گزری ہوگی' کس کس کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوں گے۔

دروازے پر ثمینہ اور کرائے دار لڑکا موجود تھے' ثمینہ نے کہا۔ "آپ کب آئیں باجی۔"

اور لڑکا کہہ رہا تھا۔ "میں نے آپ کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تھا۔ میں بھائی کا حال چال پوچھنے آیا تھا' آجاؤں۔"

چاہتی تھیں اسے بھگا دیں مگر ثمینہ کے چہرے پر دبا دبا سا جوش اور کچھ بتانے والی کیفیت۔۔۔ انہوں نے لڑکے کو اندر آنے دیا۔ ثمینہ کو لے کر اندر آئیں۔

"باجی۔۔۔ بڑی اہم خبر لائی ہوں۔" سن کر انہیں کچن میں لے آئیں۔ ضرار کے کمرے سے دور۔ ان کا کندھا دبا کر ثمینہ نے چپکے چپکے بتایا۔

''باجی آج کوئی عصر کا وقت ہو گا۔ میں آئمہ کی پھوپھی وغیرہ کو خدا حافظ کہنے گیٹ تک آئی' تو آپ کے دروازے کے سامنے کچھ لوگوں کو کھڑا دیکھا۔''
پرجوش آواز میں بتانے لگیں۔
''میں نے پہچان لیا۔ ایک تو آپ کی سعیدہ بھابھی تھیں۔ دو ان کی بیٹیاں اور ایک جوان خوب صورت سا لڑکا۔ میں اوٹ میں ہو گئی۔ کان ادھر لگا دیے کہ سنوں تو سہی۔ سعیدہ بہت حیرانی سے کہہ رہی تھیں۔ ارے یہ کہاں لے آئے ہو۔''
پھر دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی حیران لڑکے کو دیکھ رہی تھیں۔ لڑکا بولا' بس یہی گھر ہے۔ اسی گھر میں رہتی ہے وہ مگر یہاں تو لاک لگا ہوا ہے۔
سعیدہ کہنے لگیں' دیکھو میں بہت پریشان ہوں۔ نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہو تم۔ پتا نہیں مذاق ہے یہ یا کیا۔ تمہارے ابا ہیں وہ مجھے طعنے دیتے رہتے ہیں' تم کو کوئی دھوکا ہوا ہو گا۔ آخر تم نے کیا دیکھا یہاں۔ راستہ بھول گئے ہو۔ چکر کیا ہے۔ وہ لڑکا کہنے لگا۔
''واہ راستہ کیوں بھولوں گا۔ دو مہینے گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر نگرانی کی ہے۔ یہیں جاتی ہے وہ لڑکی۔''
ثمینہ کا حلق خشک ہو گیا' تھوک نگلنے سے ہی ایک چلو پانی پی کر پھر شروع ہو گئیں۔
''سوری باجی۔۔۔ لڑکیاں جو چپ کھڑی تھیں۔ دونوں بولنے لگیں۔ تم نے اس سے بات کیوں نہیں کی۔ تم کچھ پوچھتے' وہ کچھ بتاتی' پتا تو چلتا۔''
لڑکا بولا۔ کیسے بات کرتا' اتنا سخت پردہ منہ ڈھانکے رہتی ہے اور بس سے اتر کر گلی میں آتی تو دکان پر بیٹھے بڑے میاں ان کے پیچھے چل پڑتے۔ دو لڑکیاں ہیں۔ دوسری برابر والے گھر میں جاتی ہے۔ برابر آتا رہا ہوں میں۔ پاگل نہیں ہوں کہ راستہ بھول جاؤں گا۔ تو سعیدہ نے کہا۔ گھر چلو' سیدھا راستہ تو میں تمہیں دکھاؤں گی۔ لڑکیاں ہنسنے لگیں' لڑکا غصہ کرنے لگا۔ کسی پڑوسی سے پوچھیں تو سہی۔ یہ کہاں گئی ہیں۔ بس باجی یہ سن کر میں نے گلی میں منہ نکالا اور سعیدہ کو سلام کیا۔ میں نے کہا' آپ۔۔۔ کہنے لگیں ہاں۔۔۔ بغیر اطلاع کے آئے ہیں۔ معلوم نہ تھا گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ آپ بتا سکتی ہیں' میں نے کہا' جی۔۔۔ وہ کسی رشتے دار سے ملنے گئی ہیں۔ شاید کل آجائیں۔ وہ کچھ مایوس ہو گئیں۔ پھر آپس میں کچھ چپکے چپکے بات کر کے چلی گئیں۔ میں نے تو انہیں اندر آنے کا بھی کہا لیکن باجی ایک اور بات بتاؤں۔''
وہ مزید پرجوش پراسرار انداز میں قریب آکر کہنے لگیں۔
''میں نے آئمہ سے ذکر کیا۔ وہ کہنے لگی' امی کچھ دنوں سے ایک لڑکا کالج سے بس اسٹاپ تک پیچھا کرتا تھا۔ موٹر سائیکل پر ہوتا تھا۔ دادا کی وجہ سے شاید وہیں گلی کے سرے پر کھڑا ہو کر دیکھتا رہتا تھا۔ باجی ہے نا بمباسٹک خبر۔'' باجی بے تاثر۔۔۔
''باجی۔۔۔! بیٹا کیسا ہے اب آپ کا۔ ٹھیک تو ہے۔'' اتنی بڑی خبر کے بعد باجی کا رویہ۔۔۔
''ارے۔۔۔ کیسا ہوتا۔ ڈھیٹ ہڈی۔۔۔ پڑا ہے بستر پر۔ چلو تم بھی دیکھ لو' میں نے تو اسے گھر سے جانے کا کہہ دیا ہے۔''
باجی جو ثمینہ کی داستان سن کر گم صم ہو گئی تھیں۔ پھر اپنی جون میں آگئیں۔ ثمینہ نے کمرے کے باہر سے ہی ضرار کی خیریت دریافت کی' تو وہ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ سرہلا کر بولا۔ ''جی۔۔۔ ٹھیک۔۔۔''
''اے باجی۔۔۔ بچہ بہت کمزور ہو گیا ہے' میں ابھی جا کر سیب کا جوس نکال کر ابا جی کے ہاتھ بھیجتی ہوں' اسے طاقت کی ضرورت ہے' دوائیں تو خون سکھا دیتی ہیں۔''
''رہنے دو۔۔۔ اسے طاقت کی نہیں۔۔۔ ہدایت کی ضرورت ہے۔'' کہہ کر ثمینہ کو اشارے سے بلا کر لائیں۔ برآمدے میں نماز کی چوکی پر بیٹھ گئیں۔ ثمینہ بھی بیٹھ گئیں۔
''باجی۔ پھر اب۔ آپ کیا کریں گی۔ سعیدہ نے اگر۔'' ''شکر ہے۔ باجی اب متوجہ تو ہوئیں۔
''وہ اگر مجھ سے کچھ کہیں گی۔ تو جواب دوں گی۔ خلع یا طلاق۔ بات ختم۔''

ثمینہ دنگ۔ کرائے دار لڑکا آکر بولنے لگا۔ ''آنٹی۔ بھائی بہت کمزور ہیں۔ آپ کی اجازت ہو۔ تو رات کو میں آکر ان کے پاس رک جاؤں۔ شاید کچھ ضرورت۔''

''نہیں بھیا۔ شکریہ تمہارا۔ یہ تو ابھی یہاں سے چلا جائے گا۔ میں بھی گھر بند کرکے اپنی بہن کے گھر چلی جاؤں گی۔'' ثمینہ نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اچنبھا۔ حیرت' لڑکا بھی حیران۔

''باجی! ایسا ظلم تو نہ کریں۔ بچہ ہے۔ غلطیاں بچے کرتے ہیں۔ اب سزا تو مل گئی۔ رات میں کہاں جائے گا۔ معاف کردیں۔''

''سزا ملنے کے بعد گناہ معاف ہوجاتا ہے کیا۔ ہاں اگر انسان ہو تو۔ درندوں کو تو ماردینا چاہیے۔''

ضرار لڑکھڑاتا ہوا آیا۔ زمین پر گر کر ان کی گود میں سر رکھ کر بلکنے لگا۔ ایک ماں۔ بظاہر اصولوں کی سخت۔ مذہبی اقرار کی پابند۔ لیکن ایک دل ہے۔ ماں کا دل۔ جو اولاد کے لیے کبھی کبھار بے اصولی برداشت کرلیتا ہے۔ کرائے دار لڑکا چپ چاپ چلا گیا۔ ثمینہ منمنا رہی تھیں۔

''باجی! اتنی سختی تو اللہ کو بھی پسند نہیں۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں اماں۔ مجھے غصہ آگیا تھا۔ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی گری ہوئی حرکت نہیں کی۔ میں تو کہہ رہا تھا۔ چلو واک کرتے ہیں۔ پتا نہیں وہ کیوں ڈر گئی۔ میں تو کرانی سمجھ کر۔۔۔''

''یہاں رانی اور نوکرانی سب کی عزت برابر ہے۔ سمجھا اور میں نے جب کہا اس کا ہاتھ چھوڑ۔ تو نے میری بات سنی۔؟''

''ضد آگئی تھی۔ اس نے بھی مجھے زور سے لات ماری۔ نہیں تو۔ اماں قسم سے۔'' ''خبردار۔ میرے سامنے جھوٹی قسم نہ کھانا آئندہ۔ معاف نہیں کروں گی۔ چل اٹھ اور جاکر لیٹ۔ کمبخت' ذلیل اولاد۔''

ثمینہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے لگیں۔ وہ پھر رو رہا تھا ''اس سے بھی معافی مانگ لوں گا۔ اماں! بہت دن آپ سے جدا رہا۔ اب نہیں۔ پلیز۔''

''اچھا اچھا۔ دھوکے باز باپ کی اولاد۔ بھول چکی تھی کہ کوئی بیٹا بھی ہے۔ نہ جانے کہاں سے آگیا۔''

''ثمینہ نے ضرار کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ کمرے میں لے جاکر چند نصیحتیں اس کی سماعت کی نذر کیں۔ ماں کا رتبہ۔ ماں کی مامتا۔ باہر آکر کہا۔

''باجی رات کے لیے کھانا بھیج دوں گی۔ تھک گئی ہیں۔ کہاں پکائیں گی۔''

''نہیں۔ پکالوں گی۔ ابھی کچھ دیر بعد تمہارے گھر آکر اصباح کو فون کروں گی۔ اس سے تو کہا تھا کہ میں آجاؤں گی۔''

ثمینہ کے جانے کے بعد کچن کی راہ لی۔ دودھ والا کئی دن سے آیا نہ تھا۔ خشک دودھ ہمیشہ رکھتی تھیں۔ چائے بناکر بسکٹ لے کر کمرے میں آئیں۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''یہ۔ میرے لیے۔''

''ہاں۔ تھوڑے بسکٹ اور نمک پارے ہیں۔ رات کے لیے مرغی پکالیتی ہوں۔ رکھی ہے۔ اس دن کی بریانی بھی اگلے دن آکر فریز کرلی تھی۔ خیر۔ وہ کل سہی۔ کل سبزی۔''

جانے کونسا بوجھ تھا۔ بول بول کر ہلکا کررہی تھیں۔ (بیٹا ماں کی طاقت ہوتا ہے۔ اور اگر بدطینت ہو۔ مجھ کو اکیلا سمجھ کر گردن دبادے۔ کیا بھروسا۔ باپ نے پٹی پڑھا کر بھیجا ہو۔ لالچ سوار ہوجائے۔ تو۔ باپ بیٹا۔ ایک ذات۔ باپ پر پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔ اتنے سالوں بعد محبت جاگ پڑی اور کیا معلوم۔ گھر پر قبضہ کرنے کا ارادہ ہو۔ دل کی بات کون جانے) کچن میں مصروف تھیں۔ ہاتھوں سے زیادہ ذہن کام کررہا تھا۔ سوچ کا گھوڑا سرپٹ انجانی راہوں کی سمت اڑا جارہا تھا۔ ہائے یہ وہم۔ اور وسوسے۔

اصباح کو فون کرنا ہے۔ نہ جانے وہ کیا سوچتی ہوگی۔ اور اب نیا معاملہ۔ لڑکا خود اپنی انجانی منکوحہ کو پسند کررہا ہے۔ اس کو۔ جس سے انکار کررہا ہے۔ او بھئی! آج کی نسل ہے۔ سیدھی طرح ناک پکڑنے کے بجائے پیچھے

سے گدی کی طرف سے ہاتھ گھما کر ناک پکڑے گی۔ اور خوش کہ میدان مار لیا۔ عقل بھی تو گدی کے پیچھے ہوتی ہے۔ اچھا بچو۔ اب تم ذرا دیکھنا۔

"اماں!۔ میری وجہ سے کتنی تکلیف ہو رہی ہے آپ کو۔" سناٹے۔ سوچ کے میدان میں آواز۔ اچھل پڑیں۔

"ہے ہے۔ ڈرا دیا مجھے۔ کیا ہے۔ کیوں آیا ہے۔ مارے گا مجھے۔ بدلہ لے گا؟"

اس کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر وسوسوں نے حقیقت کی راہ لی۔ ضرار نے اچنبھے سے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا دور پھینکا۔ جیسے وہ سانپ ہو۔

"برآمدے میں رکھا تھا۔ سہارے کے لیے پکڑ لیا۔ اتنا ذلیل نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا۔ آپ کا خون۔" لپٹ گیا۔ انہوں نے اسے پیچھے دھکیلا۔

"جس باپ کا خون تیرے اندر دوڑ رہا ہے۔ اس سے ہر برائی کی توقع کر سکتی ہوں میں۔ ظالم۔ جابر، خود غرض۔ کینہ پرور۔ خون کے آنسو رلائے تھے۔"

"آپ کا خون زیادہ طاقت ور ہے۔ دودھ کی تاثیر بھی ہے۔ یقین کریں۔ بہت پچھتاتا رہا۔ وہاں ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ ان کے درس پر جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ بہت سمجھایا۔ آپ کا بیٹا بن کر دکھاؤں گا۔ کہو تو حلف اٹھالوں۔"

"حلف کا مطلب جانتا ہے۔" طنزاً کہا۔

"جی۔ مسلمان ہوں۔ نماز پڑھتا ہوں۔"

ماں کا دل۔ یک دم مضبوط ہو گیا۔ "کمرے میں جاؤ دوا کھائی کہ نہیں۔ مجھے ثمینہ کے گھر فون کرنے جانا ہے۔ آکر روٹی پکاؤں گی۔"

"گھر پر فون۔ لگوایا کیوں نہیں ہے؟" ٹال کر باہر آگئیں۔ ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں ہوتا۔

ثمینہ کے دروازے پر اس کے سر کھڑے تھے۔ سلام۔ خیر و عافیت۔ بات کر کے اندر آگئیں۔ ثمینہ بوکھلائی ہوئی آ رہی تھیں۔

"آپ آگئیں۔ میں آپ کو بلانے والی تھی۔ وہ رفیعہ بہن کا فون آیا تھا۔" ناجیہ کو آج ماں کے انداز میں کچھ نیا پن لگ رہا تھا۔ امی آئمہ کو تو بتا بھی دیتی تھیں۔ ناجیہ کو ناسمجھ کہہ کر ہر بات چھپاتی تھیں۔ وہ کھوج میں تھی۔ آخر اصباح کا معاملہ ہے کیا۔ آئمہ کو اگر خبر تھی بھی تو اس نے نہیں بتایا۔ آنٹی کو آتا دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہولی۔ مگر امی۔ کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ بند۔ وہ گیلری والے دروازے کی طرف لپکی۔ وہاں ایک شیشہ ٹوٹا ہوا تھا کھڑکی کا۔ ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ امی کی بات ختم ہو گئی تھی۔ خالہ بی سوچتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ میں رفیعہ سے بات کر لوں ذرا۔" ثمینہ نے نمبر ملایا۔ اور خود کمرے سے باہر چلی گئیں۔ خالہ بی رفیعہ سے بات کرنے میں سر ہلاتی جا رہی تھیں۔ پھر کہا۔

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ تم کل ہی انہیں بلالو۔ ماں، بیٹے دونوں کو۔ اور اب ذرا اصباح کو فون دو۔"

"ہاں بچی۔ نہیں آسکی۔ ضرار گھر آگیا ہے۔ بہت معافیاں۔ خیر۔ یہ بتاؤ۔ جب میں نے نماز کی نیت باندھی۔" آواز دھیمی ہو گئی۔ اب شاید اصباح کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ گردن ہلا رہی تھیں۔

"اچھا خیر۔" بہت شرمندہ ہے۔ معافی مانگنے کا کہہ رہا ہے۔ اب سنو غور سے۔ جو میں بتاتی جاؤں۔ وہی کرنا ہے تمہیں۔ وہی کہنا ہے۔ کل جب سعیدہ آئیں۔ ہاں ہاں۔ کل آئے گی۔ تو تم۔

"اف! شاہد زاہد کو بھی ابھی آنا تھا۔ مسجد سے آتے ہیں تو لڑتے جھگڑتے۔ جیسے وہاں یہی سبق ملتا ہو۔ نالائق۔ ایک لفظ سننے نہیں دیا۔" مایوس ہو کر باہر آگئی۔ ثمینہ دونوں کی صلح کرا رہی تھیں۔

روز کا معمول تھا۔ خالہ بھی آگئیں۔

"لو بھئی ثمینہ! رفیعہ سے بات ہو گئی ہے۔ اب تم دیکھنا کیسا رگڑتی ہوں سعیدہ کو اور اس کے بیٹے کو۔ کل رفیعہ فون کرے تو مجھے بلا لینا۔ میں نے سمجھا دیا ہے رفیعہ کو۔ اصباح کو بھی۔"

ثمینہ مسکرائیں۔ "اب آپ فون لے لیں۔" وہ جانے لگیں تو ثمینہ نے ایک ڈش ان کو دی۔

"میں خود لے کر آنے والی تھی۔ دیسی مرغی کا سوپ ہے۔ سبزی اور سیب بھی ڈالا ہے۔ بہت طاقت کی ضرورت ہے بچے کو۔ کل سیب لے کر آؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔"

دونوں خواتین ہشاش بشاش۔ مسکرا رہی تھیں۔

ضرار برآمدے میں نماز پڑھ چکا تھا۔ (یا ایکٹنگ۔ کیا پتا)

"تم نے سجدہ کیسے کیا۔ سر نیچے کرنے میں 'زخم میں درد نہیں ہوا؟"

"ہوا۔ مگر آپ کے ڈنڈے کی چوٹ سے بہت کم۔" بے فکر تھا۔ "اصل میں کمرے میں گھبراہٹ ہوئی تو باہر آگیا۔ نماز کی چوکی دیکھی۔ تو یاد آیا' کئی دن سے اللہ کو بھولا ہوا ہوں۔ نماز پڑھی۔ اب سوچ رہا ہوں۔ آپ اکیلی اتنے سال کیسے رہیں۔ اب اپنی خطا زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔ کاش۔ میں نے حماقت نہ کی ہوتی۔"

"اچھا اچھا۔ اب جا کر لیٹو۔ درد نہ بڑھ جائے۔ ڈاکٹر نے آرام کا کہا تھا۔ کل جا کر پٹی بھی کروا لینا۔ میں کھانا لاتی ہوں۔"

"اور یہ کیا ہے؟" ان کے ہاتھ ڈش دیکھ کر پوچھا۔ پھر ڈھکن کھول کر دیکھا۔

"واہ۔ شکل تو بہت اچھی ہے اور خوشبو بھی مزے کی۔" کچھ دیر بعد دونوں ماں بیٹے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں کا موڈ اچھا تھا۔

"یہ۔۔۔ دیوار کب بنی؟" وہ جب امریکا گیا تھا دیوار نہ تھی۔ بڑا کشادہ صحن تھا۔

"جب تم بھی دھوکا دے کر بھاگ گئے تو کرائے دار رکھ لیے۔ اس لیے۔۔۔ کہ میرے آڑے وقت میں کوئی قریب ہو جس کی مدد لے سکوں' مگر اتفاق دیکھو۔ جس دن تم آئے اس سے پہلے ان کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تمہارے مبارک قدموں کی بدولت ان لوگوں سے مدد لی۔ جن کو دن رات برا بھلا کہتی تھی۔"

"مگر۔ مجھے تو اچھے شریف لوگ لگے۔ یہ جو لڑکا۔۔۔" لیٹ رہا تھا تو اماں حلق میں دوا ڈال رہی تھیں۔

"ہاں۔ تم کو تو لگیں گے ہی۔ جیسے تم دغا باز۔ ویسے ہی یہ۔ ہر شخص آئینے میں اپنا چہرہ ہی تو دیکھتا ہے۔" کھانے کے برتن اٹھا کر لے گئیں۔ باہر سے پکارا۔

"سو جاؤ اب۔"

اور وہ فرماں برداری کے ریکارڈ برابر کرنے کے چکر میں فوراً" آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دوا میں شاید نیند کا عنصر بھی تھا۔ گہری نیند آئی۔ صبح آنکھ کھلی۔ چڑیوں کی چہکار سے۔ کھڑکی سے جھانکا۔ آہا۔ بڑی سہانی صبح۔۔۔ نرالا سا موسم۔ ہوا میں خنکی۔ چار دن سے کمرے میں رہتے ہوئے اندازہ ہی نہ ہوا۔ کیسی رنگیلی صبح ہوتی ہے۔ آسمان پر تیرتے بادلوں کے ٹکڑے کچھ سفید۔ کچھ کالے۔ کچھ نارنجی۔ سورج کی کرنوں میں نہائے ادھر سے ادھر مٹر گشت کر رہے تھے۔ باہر نکل کر لطف لیا۔ چنبیلی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ انار کے درخت میں سرخ کلیاں خوش رنگ۔ کچن کھول کر جائزہ لیا۔ ساس پین میں پانی چولہے پر رکھا۔ چولہا جلانے کا کوئی اندازہ نہ ہوا۔ پھر امریکا کے بجلی کے چولہوں کو بھلا کر ماچس پر نظر جمائی کھٹ پٹ کی آواز سے اماں ہوشیار ہوئیں۔ سیدھی کچن میں۔

"ہائیں۔ یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"چائے بنا رہا ہوں۔ آئیے۔ آپ کے لیے بھی دم کر دی ہے۔" چائے چھوٹی چائے دانی میں دم کر چکا تھا۔ دو مگ' چینی دان' خشک دودھ کا پیالہ ڈھونڈ کر میز پر رکھ دیا تھا۔ بسکٹ بھی پلیٹ میں رکھے تھے۔

"واہ۔ بڑا سلیقہ آگیا ہے۔ وہاں کیا کسی وزیر سفیر کے گھر خانساماں لگ گئے تھے۔" زور سے ہنسا۔ بے ساختہ اونچا' مردانہ قہقہہ۔ کچن گونج گیا۔ صحن تک بازگشت سنائی دی۔ انوکھا۔ برسوں سے یہ گھر کسی مردانہ ہنسی سے محروم تھا۔ جو کبھی کبھار رشتے دار مرد ملنے آتے بھی تھے۔ خالہ بی کی تنک مزاجی کی وجہ سے تمیز سے بیٹھتے تھے۔ قہقہہ درکنار۔ ہنسنے کی آواز بھی نہیں سنی گئی۔ خالہ بی کو آج یہ آواز۔ کھنک دار قہقہہ بہت دل خوش کن لگا۔ تقویت۔

"چائے تو اچھی بنائی ہے۔ بھئی اور کیا کیا بنانا جانتے ہو۔ کھانے میں۔" (انٹرویو)

"ارے۔ میں وہاں کوئی۔۔۔ افوہ۔ وہاں تو ہر چیز ڈبوں میں بند مل جاتی ہے۔ بس فرائنگ پین میں ڈالو اور تیار۔ آپ چاہیں گی تو کچھ سیکھ لوں گا۔" ہائے فرماں برداری۔ پتا نہیں باپ نے کیا کیا سکھا کر بھیجا ہوگا۔ شکوک ختم ہی نہیں ہوتے۔

"ناشتا بنانا سیکھ لو۔ آملیٹ، حلوہ پوری، آلو اور چنے کی ترکاری۔"

"آہ۔ آہ اور پھر۔ آہ۔۔۔ نہیں ں ں۔۔۔ ظلم کے پہاڑ نہ توڑیں۔" تڑپ گیا۔

"آپ کیا روزانہ اتنی دیر سے اٹھتی ہیں۔"

"اٹھتی تو جلدی ہوں۔ اصباح کے لیے ناشتا بنانا۔۔۔ کالج جاتی تھی۔ آج تو دیر تک جاگتی رہی کہ پتا نہیں۔ تم رات میں کون سی چیز لے کر بھاگ جاؤ۔"

"میں؟" حیرت۔ "اور اپنا سامان چھوڑ کر آپ کی کوئی چیز چراؤں گا۔" پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ "یہاں کون سی ایسی قیمتی چیز ہے جسے لے کر بھاگوں گا۔ افوہ۔ بہت ہی مذاقیہ ہیں آپ۔ ابھی کھولتا ہوں سوٹ کیس۔ کیا کیا چیزیں آپ کے لیے لایا ہوں۔ دنگ رہ جائیں گی آپ۔" کھڑا ہو گیا تھا۔

"مجھے تمہاری کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پتا نہیں حرام کی کمائی کی نہ ہو۔" بے مروتی سے منہ بنا کر یکسر مسترد۔ بے چارہ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

"لگتا ہے۔ مجھے ایک قرآن شریف چھوٹا سا، ہر وقت جیب میں لے کر پھرنا ہوگا۔ آپ کے سامنے حلفیہ بیان دینے کے لیے۔" چند سیکنڈ بعد حواس درست ہوئے تو بولا۔

"اور یہ آپ کر کیا رہی ہیں؟" انہیں برتن ادھر سے ادھر کرتے دیکھا تو کہا۔

"یہ۔۔۔ تمہارے استعمال کے برتن۔ الگ کر رہی ہوں، یہ پلیٹ، مگ، چمچے، پیالہ یہ تمہارے ہیں، میرے برتن استعمال نہ کرنا۔ کیا پتا۔ وہاں تم سور کھاتے رہے ہو۔ شراب پیتے ہو گے، ناپاک پلید منہ ہاتھ۔" بے دردی۔

ضرار سر تھام کر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا

"اووف۔۔۔ میرے پروردگار۔ رحم کر۔ اس ایک اکلوتی ماں کے ساتھ رہ کر کہیں پاگل نہ ہو جاؤں۔"

"دیکھو۔ اگر پچھتا رہے ہو۔ تو مت رہو یہاں۔ جہاں سے آئے ہو۔ دفع ہو جاؤ وہیں۔ مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ جو چار دن زندگی کے رہ گئے ہیں گزار لوں گی۔"

فوراً" کھڑے ہو کر ان کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"لیکن۔ مجھے تو آپ کی ضرورت ہے، میری ماں۔ میری جنت آپ کے قدموں میں ہے۔ جنت چھوڑ کر میں نہیں جاؤں گا۔ کبھی نہیں پچھتاؤں گا۔ وعدہ۔" چٹاچٹ بوسے لے رہا تھا۔

انہوں نے بزور اسے خود سے الگ کیا۔ "ہٹ پرے۔ جھوٹوں کا استاد۔ یہ انگریزوں والی چوپا چاٹی مجھے یقین نہیں دلا سکتی اور اول تو۔ ابھی یہ بھی یقین نہیں کہ امریکا گیا بھی تھا۔ ایسی اردو۔ وہاں سے آنے والا نہیں بولا کرتا۔ پتا نہیں کسی جیل میں ہی پڑا تھا۔ چھوٹ کر یہاں یاد آگئی۔" اپنا کام کیے جا رہی تھیں۔

"جیل سے چھوٹ کر؟ اتنا سامان لے کر؟" ہونق شکل بن گئی۔

لفظی جنگ ہوتی رہی۔ کام ہوتا رہا۔ ناشتا زبردست۔ حلوہ پوری آلو کی ترکاری۔ نہ جانے دل میں کتنے ارمان پل رہے تھے۔ کیسے کیسے نکالیں ہاہ۔ یہ اولاد۔ نہ جانے کیوں دل کے چپے چپے پر قبضہ جما کر بیٹھ جاتی ہے۔

گوکہ ناشتا کافی ہیوی تھا۔ ضرار نے دوپہر کے کھانے کا منع بھی کیا، مگر وہ کھانا تیار کر کے اسے بتا کر۔ دوا کی تاکید کر کے خود نہا دھو تیار ہو کر بغیر بتائے چلی گئیں۔ کہاں جا رہی ہیں پوچھتا رہ گیا۔

وہ ثمینہ کا دروازہ بجا رہی تھیں۔ ادھر رفعہ کے گھر میں۔ خالہ بی کا ایکٹ کیا ڈرامہ کامیابی سے چل رہا تھا۔ سعیدہ بیٹے بیٹیوں سمیت صبح ہی پہنچ گئیں۔

اصباح خالہ بی کی ہدایت کے مطابق اپنا زعفرانی

سوٹ جس کے دوپٹے پر کاسنی پھول بنے ہوئے تھے۔ کاسنی ستاروں کی لیس لگی تھی۔ پہن کر آنکھوں میں کاجل لگا کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے مکالمے یاد کر رہی تھی۔ (خالہ بی کے) سعیدہ لوگ ڈرائنگ روم میں تھے۔ چائے، سموسے کیک وغیرہ کی ٹرالی ان کے سامنے رکھ کر اجیہ اصباح کے پاس آئی تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر چہکی۔

"لو جی۔ ادھر تو زبردست سین چل رہا ہے۔ امی کی خوشامد ہو رہی ہے کہ خالہ بی کو منائیں۔ وہ ناراض ہیں کیونکہ امی سے خالہ بی خوش ہیں تو اب ان ہی پر دارومدار ہے اور جناب ہماری امی۔ وہ خالہ بی کی پوری پوری شاگردی کر رہی ہیں کہ میں نا مانوں۔ تڑپ رہی ہیں موہانی اور سب سے بڑھ کر بیٹا جو گھبراہٹ کا شکار ہے۔ ٹانگیں ہلائے جا رہا تھا۔ جیسے کپکپی چڑھی ہو۔ ہونٹ چبا رہا ہے۔ ارے وہی ہے جو میں نے ثریا آپا کی رخصتی کے بعد دیکھا تھا۔ چلو۔ تمہارا بلاوا آیا ہے۔ اتنی بے قرار ہیں کہ ییں نہ آجائیں کہیں۔"

یہ ملاقات بھی انوکھی تھی۔ کبھی اس طرح اس سے نہیں ملی تھیں مہربانو، شہربانو۔ تینوں ماں بیٹیاں اٹھ کر اس سے لپٹ گئیں۔ کھینچ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ لڑکا اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ پلکیں جلدی جلدی جھپٹتا رہا تھا۔ ہونٹ چباتے چباتے لال سرخ کر لیے تھے۔ ہتھیلی کو انگلیوں سے رگڑ رہا تھا۔ نظریں اصباح پر جم کر رہ گئی تھیں۔

اصباح معصومیت سے نظر جھکائے لیس لگے دوپٹے سے سر ڈھکے بت بنی بیٹھی تھی۔ خالہ بی کی ہدایت کے مطابق۔ زعفرانی رنگ کے دوپٹے میں اس کا رنگ دمک رہا تھا۔ اوپر سے کاجل بھری آنکھیں لمبی گھنی پلکیں چین قرار لوٹنے کو تیار (لڑکے کا) پھر موہانی نے رفیعہ خالہ سے ناز بھرے لہجے میں کہا۔

"بس بھئی۔ اب بلا لو حفصہ باجی کو۔ ہم کو ہماری امانت واپس کریں۔ اب صبر نہیں ہوتا۔"

رفیعہ خالہ نے کہا۔ "مگر ابھی کل ہی تو وہ آپ کے گھر سے آئی تھیں مایوس ہو کر۔ وہ تو خلع کے لیے تیاری کر رہی ہیں، طے کیے بیٹھی ہیں۔"

اتنا سنتے ہی تینوں بلبلا کر کچھ بولنے لگیں۔ لڑکے پر اور طرح کا دورہ سا پڑ گیا۔ کھڑا تھا۔ دھم سے کرسی پر گرا تقریباً۔ زبان ہونٹوں پر پھیرنے لگا بار بار، انگلیاں زور زور سے چٹخانے لگا۔ سر پر بلاوجہ مکے برسانا شروع کر دیے۔ بہنیں اور اماں جان۔

"وہ تو یہ ہوا... اصل میں پتا نہ تھا۔ ارے برسوں کا بندھن۔ ایسے کیسے... اور ہم نے انکار کب کیا۔ ہم تو وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ میں فون کرتی ہوں حفصہ کو۔"

سعیدہ اٹھیں۔ رفیعہ نے اطمینان سے کہا۔ "ان کے پاس فون نہیں ہے۔"

"اوہ۔ ہاں۔ تم نے انہیں بتا تو دیا تھا ہمارے آنے کا۔"

"نہیں۔ کیسے بتاتی؟"

"پڑوس میں جو رہتی ہیں ان کے گھر تو فون ہے۔ ان سے کہو۔ فون پر بلوا دیں۔ میں ان سے خود بات کروں گی بلکہ یہاں آنے کا کہوں گی۔ رفیعہ پلیز۔"

رفیعہ طے شدہ منصوبے کے تحت اٹھیں۔ بظاہر با دل ناخواستہ۔ کچھ دیر بعد آکر بتایا۔

"میں نے ثمینہ سے کہا ہے۔ بچے کو باجی کے گھر بھیج کر بلوا لیں۔ کہتی ہیں کہ پانچ منٹ انتظار کریں۔ وہ خود کال کریں گی آکر۔"

"ہاں۔" سعیدہ نے سکھ کا سانس بھرا۔ "کیونکہ اب میں دیر کرنا نہیں چاہتی۔"

اور اب وقت تھا اصباح کی پرفارمنس کا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور موہانی کی طرف منہ کر کے کہنے لگی۔

"موہانی! بس۔ مجھے اور تماشا نہ بنائیں۔ میں کھلونا نہیں ہوں۔ نہ ہی مٹی کی گڑیا۔ کئی بار پہلے آپ خود انکار کر چکی ہیں۔ ماموں نے مہینوں سے میری شکل نہیں دیکھی۔ آپ لوگوں نے مجھ سے بے زاری کا کئی دفعہ اظہار کیا ہے۔ میں خود اب اس رشتے کو قائم نہیں رکھنا چاہتی۔ مجھے اب اپنی توہین گوارا نہیں۔ پلیز۔

میرا پیچھا چھوڑ دیں۔ مجھے اب کوئی دلچسپی نہیں رہی اس رشتے سے۔ خالہ بی سے بات کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے خود کسی سے واسطہ نہیں رکھنا۔ نہ آپ سے۔"

سعیدہ مومانی تو کاٹو تو لہو نہیں بدن میں کی مثال بن گئیں۔ رنگ فق تھا۔ بولیں تو آواز بھی کنوئیں کی گہرائی سے برآمد ہوئی۔

"بیٹا! میری بچی! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم تو... معیز کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آئے۔ تو پھر..."

"جی! کہ وہ آئے اور اپنی پسند کی کوئی امیرزادی تلاش کرے تو پھر میرا تماشا بنانے کی کیا ضرورت۔ دو مہینے ہو چکے ہیں اس بات کو۔ آپ نے سانس نہ بھری۔ کریں آپ اپنے بیٹے کی مرضی اور پسند کی..."

"ارے۔ وہ دوسری کون۔ وہ تم ہی تھیں جسے اس نے پسند کیا۔ پگلا۔ تمہاری شکل یاد نہ تھی۔ بچپن میں تو پھر۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ وہ تم ہوگی۔"

"مگر مجھے خبر تھی مومانی۔ آپ کچھ بھی کہیں۔ دوسری لڑکی پسند کی۔ اب وہ میں ہوں یا کالی دیوی کلکتے والی۔ مجھے غرض نہیں۔ میں بار بار اپنی ہتک برداشت نہیں کر سکتی۔" کہہ کر باہر کی طرف چلی۔

لڑکا کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو۔ (ہونٹ چبائے) میں بتاتا ہوں۔ (مکا رسید کیا سر پر) ایسا ہوا کہ مجھے پتا نہ تھا کہ تمہارا گھر وہاں..."

اصباح تیزی سے باہر نکلی۔ دل دھڑک رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ مظاہرہ ناقابل فراموش۔ یہ کیا کر کے آگئی ہوں۔ کہیں کچھ گڑبڑ نہ ہو جائے۔ کمرے میں گھس گئی اور یاد کرنے لگی۔ خالہ بی نے اور کیا کیا کہا تھا۔ یہ کہنا وہ کہنا۔ لڑکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے بلکہ انکار کرنے کا بھی کہنا تھا۔ وہ تو ہو نہیں سکا۔ اس قدر تو ہنسی آرہی تھی۔ ضبط کرنا مشکل ہو گیا تو بھاگ آئی۔ بوکھلاہٹ سوار تھی بے چارہ۔ ہائے مگر۔ اچھے سے تو ہیں۔ کیسے مجھے دیکھ رہے تھے۔ خواہ مخواہ بکواس کر کے... اوہو۔ خالہ بی نے کہا کہ یہ ایک ڈرامہ ہے۔ بس۔ اب اگر... وہ سچ سمجھے۔

"سنو اجیہ!" اجیہ کو پکارا وہ آگئی۔

"سنو اجیہ! میں... کیسی لگ رہی ہوں۔ اچھی؟ بہت اچھی؟ یا..."

"او میری بہنا۔ ایسی ویسی؟ اچھی ی ی ی۔ پیاری ی ی کہ وہ صاحب بے ہوش نہ ہوئے یہی حیرت ہے۔ اب مومانی پھر تمہارے پاس آرہی ہیں۔ تمہیں منانے۔ اس سے پہلے کہ خالہ بی رشتہ ختم کرنے کا اعلان کریں تم خالہ بی کو منالو۔ رشتہ پکا کرنے کے لیے ہوشیار۔ وہ آرہی ہیں اور وہاں لڑکا ایک سو ایک جان سے تم پر عاشق ہو چکا ہے۔ نڈھال پڑا ہے۔ میں اس کے لیے گلوکوز ملی سکنجبین بنانے جا رہی ہوں۔"

پھر جاتے جاتے۔ "غصے کی شکل بنا کر بیٹھو" مسکراؤ مت۔" کہہ کر ٹل گئی۔

مومانی آگئیں۔ اصباح کو منانے۔ لپٹانے۔

"میری بچی۔ میں تو کئی دن سے تمہارے گھر کے چکر لگا رہی ہوں۔ (جھوٹ) گھر بند دیکھ کر آجاتی تھی۔ کل وہ ثمینہ ملی تو..." لڑکا۔ ماں کے پیچھے آگیا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ (شرم کیسی۔ منکوحہ ہے۔)

"اس دن جب خالہ بی آپ سے ملنے گئیں۔ تو آپ نے صاف کہا کہ آپ کا بیٹا بچپن کی اس واردات کو گڈے گڑیا کا کھیل کہہ کر انکاری ہے۔ جہاں وہ کہے گا ہم وہیں اس کی شادی کریں گے تب تو آپ نے گھر کے چکر لگانے کا ذکر نہیں کیا۔"

"وہ تو بس۔ ایسے ہی۔ ہے ہے ہے۔" ہنسنے کی بھونڈی کوشش کھسیانی سی۔ "مذاق کر رہی تھی۔"

"تو مومانی۔ میری پوری زندگی آپ کے مذاق کی نذر ہو گی اب؟ نہیں۔ اب نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ کس لیے مجھ سے کنی کترا رہی ہیں۔ میں بن ماں باپ کی غریب لڑکی ہوں۔ میرے پاس کوئی جہیز نہیں۔ کوئی سرمایہ نہیں۔ گھر نہیں۔ میں فقیر ہو چکی ہوں۔ کوئی کیا دیکھ کر پسند کرے گا۔ میرا تو آپ نے مذاق ہی بنا رکھا

تھا۔ ماموں نے بھی اپنے رشتے کا خیال نہیں کیا۔ تو میں کیوں کسی کا خیال کروں۔"

وہ اب اندر کمرے میں آ گیا تھا۔ انگلیاں مسلتا ہوا۔ ہائے۔ جیسے کہیں کا شہزادہ ہو۔ مگر کبھی شہزادہ تو دیکھا نہ تھا۔ اچھا ہیرو سہی۔

"آپ نے ادھر ثریا باجی کی شادی پر میرے سلام کا جواب دے کر منہ پھیر لیا۔ بات ہی نہیں کی۔ ماموں نے بھی ملنا چھوڑ دیا۔ میں اتنی کمتر۔ غیر اہم تھی آپ کے لیے۔ بار بار یہی سنتی رہی۔ وہ نہیں مانتا اب کیا مجھ میں سرخاب کے پر اگ آئے ہیں۔" (اگتے ہیں کہ لگتے ہیں۔ پتا نہیں خالہ بی نے کیا کہا تھا۔ اُف)

سعیدہ ممانی پھر لپٹ گئیں۔

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے میری جان اور ہمیں دولت' جہیز کی ضرورت بھی نہیں۔ بس میری چاند۔ میرے گھر میں روشنی کر دے۔ آرزو ہے میری۔"

"لیکن... آپ نے پچھلے دنوں... امیر گھر سے بہو لانے کا بہت چرچا کیا۔ اپنی پوزیشن کے مطابق۔ آپ نے کہا۔ ہم فقیروں سے ناتا جوڑ کر خاندان میں اپنی سبکی نہیں چاہتے۔ ممانی۔ اب کیا میں فقیر نہیں۔ امیر ہو گئی ہوں۔" آواز بھرا گئی سچ مچ۔

"کس۔ کس... اور... کس نے کہا جھوٹ' بالکل۔ بلاؤ ذرا۔" ہڑبڑا گئیں' بوکھلا گئیں۔

"میری موجودگی میں کہا تھا۔ آپ نے کہا۔ میرا بیٹا للّو پنجو لوگوں میں رشتہ کر کے ہنسی نہیں اڑوا سکتا۔ بس ممانی۔ آپ جائیں۔ خالہ بی سے بات کریں۔" منہ موڑ لیا۔

ادھر ماں بیٹا چیخ چیخ کرنے لگے۔ "امی! میں نے یہ کب کہا۔ ہاں بچپن کے رشتے سے اختلاف تھا۔ آپ نے کوئی تصویر بھی نہیں بھیجی۔ یہاں بھی تصویر نہیں دکھائی۔ مجھے ملنے ہی لے جاتیں... میں دیکھ..." بند لال ہونٹ خون کھوتے...

"تو مجھے الہام ہوا تھا کیا کہ تصویر دیکھ کر تم راضی ہو جاؤ گے۔"

دروازے میں اجیہ کا مسکراتا چہرہ نمودار ہوا۔ "خالہ بی آ گئی ہیں ممانی۔"

سعیدہ ممانی ہڑبڑا کر اٹھیں۔ گھبرائی ہوئی۔ دروازے کے بالکل قریب جا کر لڑکھڑائیں۔ بیٹے کو ہٹانے کی کوشش میں خود پہلے نکلنے کی تگ و دو کی مگر دھڑام سے گر گئیں۔ بیٹا اوفوہ کہہ کر انہیں اٹھانے کے لیے جھکا' مگر... خالہ بی چویشن سے بے خبر دروازے کو دھکا مارتی اندر تیزی میں گھسیں تو سعیدہ ممانی کے سر سے ان کا پیر ٹکرایا۔ سنبھلنے کی کوشش میں۔ خود کو گرنے سے بچاتے ہوئے ہاتھ کسی ان دیکھے سہارے کی طرف پھیلائے۔ تو جو چیز ان کی ہتھیلی سے ٹکرائی۔ وہ لڑکے کے لمبے بال تھے۔ گرنے سے تو بچ گئیں۔ بال انہوں نے مٹھی میں جکڑ لیے۔

ادھر لڑکا بے چارہ اس ناگہانی افتاد پر سر اٹھانے پر مجبور کہ بال... کسی کی مٹھی میں تھے بھاری بدن کی سعیدہ ممانی خود اٹھنے سے قاصر۔ بیٹا اٹھانا چاہتا تھا وہ بھی آزمائش بن گیا اس لیے اب نہ ماں بیٹے کے ہاتھ چھوڑ رہی ہیں نہ خالہ بی اس کے بال۔ خالہ بی کی ٹھوکر جو سر پر لگی اس نے چیخیں نکال دیں۔ "معیز مجھے اٹھا۔" کہہ کر پھر سے لیٹ گئیں۔ نہ وہ اٹھتی ہیں نہ بیٹا اٹھا سکتا ہے کہ بال جڑ چھوڑنے کے قریب تھے۔

ادھر اجیہ اندر آ کر حیران۔ پھر دونوں لڑکیاں ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں بے حال پلنگ پر لوٹیں لگا رہی ہیں۔

وہ تو رفیعہ حالات حاضرہ کا جائزہ لینے اندر آئیں تو انہیں اس عجیب اور انوکھے جنگ و جدال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ سمجھنے کا موقع نہ تھا۔ انہوں نے پہلے ذرا سی جھکی ہوئی خالہ بی کو پکڑ کر کھڑا کیا۔ خالہ بی نے بال چھوڑ دیے۔ لڑکے نے یک لخت اماں کے ہاتھ چھوڑ کر اپنا سر پکڑ لیا۔ اوووف۔ اب رفیعہ' سعیدہ کو اٹھانے میں مصروف ہو گئیں۔ وہ کھڑی ہوئیں۔ تو سعیدہ بے چاری نے چوٹ کو بھلا کر مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

خالہ بی نے بھی ازراہ مصلحت ہاتھ بڑھایا۔ (ارادہ لڑائی کا بھول کر) اب ہاتھ دونوں کے ملے۔ پھر سعیدہ

نے ایک چیخ ماری۔ ساتھ ہی خالہ بی نے ایک ساتھ تین چیخیں۔ دولہا میاں (متوقع) کے بالوں کا گچھا جو بذریعہ خالہ بی کی ہتھیلی کے سعیدہ کے ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔ انہوں نے "ہائے اللہ یہ کیا ہے؟" کہہ کر ہاتھ جھٹکا۔ خالہ بی نے سعیدہ کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا ہاتھ جھٹکا۔ سعیدہ ڈر گئیں۔ یہ نرم سی جان دار جیسے مکڑی کا جالا جیسی چیز کو ہتھیلی سے چھڑانے کی کوشش میں دونوں خواتین ایک دوسرے سے بازی لے جارہی تھیں ان کی یہ کاوش بے چاری رفیعہ نے بھگتی جوان کے درمیان آگئی تھیں۔ دونوں کے ہاتھوں میں چپکے ہوئے بال رفیعہ کے منہ پر چپک گئے۔ وہ آخ۔ آخ کرتی ہاتھوں سے اس دن دیکھی چیز کو چہرے سے ہٹاتی باہر لپک گئیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ مکڑی کا جالا آکہاں سے گیا۔ منہ پر چپکنے کے لیے۔

کمرے میں لڑکیوں کو لوٹن کبوتر بنا دیکھ کر خالہ بی کو بھی ہنسی آگئی۔ شرما شرمی سعیدہ بھی ہنسنے لگیں۔ لڑکا یعنی دولہا (متوقع) سر سے ہاتھ ہٹا کر بال جھٹکنے کے فعل سے فارغ ہوا تو سب کو زعفران کے کھیت میں موجود پاکر گھورنے لگا۔ جڑیں کافی دکھ رہی تھیں۔ بالوں کی۔ اذیت اب بہت بڑھی تو کھلکھلاہٹ نے زور پکڑا۔

اجیہ ہنستے ہنستے نیچے جاگری۔ ساتھ ہی اصباح کو گھسیٹ لیا۔ پیٹ پکڑے ہنستی چلی گئیں۔ پھر دونوں اٹھ کر باہر بھاگیں تو ٹکرا گئیں دولہا میاں سے۔ اور دولہا موقع کو ضائع کرنے کے موڈ میں نہ تھا۔ اجیہ پہلے نکلی۔ دولہا نے اصباح کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اصباح کھڑی رہ گئی۔ حیران یہ 'نرم ہاتھوں کی حرارت۔ ملائمت۔ گداز۔ مضبوط گرفت زبان حال سے کچھ بیان کررہی تھی' گرمی جذبات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ جیسے انہیں اپنی آغوش میں سمونے لگا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ حالات حاضرہ سے بے خبر۔ خالہ بی سعیدہ کو ساتھ لے کر چلی گئی تھیں۔ اور... اصباح کے متوقع کئی رشتے گنوانے کے بعد۔ یعنی اگر سعیدہ کی طرف سے انکار ہے تو یہاں درجن بھر امیدوار موجود، مگر مہربانو، شہربانو کی معافی خوشامد۔

خالہ بی کے دل نے پسیجنا شروع کردیا۔ اب مہمانوں کی فہرست۔ شادی ہال کی بکنگ، مگر سب سے پہلے خالہ بی کی فرمائش اور مشورہ۔

"دیکھو بی سعیدہ! سچ تو یہ ہے کہ نہ مجھے۔ نہ اصباح کو گنجے لوگ پسند اور تمہارا بیٹا۔ بہت جلد گنجا ہوجائے گا۔ اس لیے پہلے تم سرسوں کا اصل تیل منگالو۔ اس میں کلونجی میتھی فلاں فلاں پکا کر مالش کرو۔ روزانہ۔ مجھے بھیجنا تیل۔ میں بنادوں گی۔"

اور اندر کمرے میں نوجوان جوڑا۔ اب مسکرا رہا تھا۔ اصباح شرما گئی اور لڑکا دوسو بیس جان سے عاشق ہوگیا۔ لڑکے کے بال بے ترتیب ہوگئے تھے۔ اصباح کا جوڑا بھی کھل کر کمر گردن پر بکھر گیا تھا۔

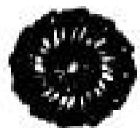
"تم... میری ہو۔ ازل سے۔" لڑکے نے جھجک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اصباح نے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ ہکلائی۔ "تو... میں نے کب انکار کیا؟" اور ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگی۔ باہر بڑی خوش گوار دوپہر چھائی ہوئی تھی۔ دھوپ اور سائے ملن رت کے گیت گارہے تھے۔

خالہ بی اور سعیدہ ممانی مہمانوں کی لسٹ بنا رہی تھیں۔ کھانوں کی اقسام مہربانو شہربانو طے کررہی تھیں۔ اصباح بھاگتے بھاگتے اجیہ سے لپٹ گئی۔ دونوں پر از سر نو ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

ساری عمر غم کے دریا میں غوطے لگانے والی اصباح۔ ہنسی کو ترستی رہی۔ آج اپنے ہی قہقہوں سے حیران ہورہی تھی۔ شاد کام ہورہی تھی۔

زندگی کے امتحان کا رزلٹ تو بہت شاندار آیا تھا۔ میں تمہاری ہوں... بچپن سے۔ دل نے لہک کر کہا تھا۔



ثمینہ فرحان

سکونِ قلب

"آپا آئی تھیں آج۔" سلمیٰ بیگم نے چاول چنتے ہوئے بظاہر سرسری سے انداز میں میاں کو مخاطب کرتے ہوئے گویا اطلاع دی۔

"اچھا!" اصغر صاحب کو جیسے اندازہ تھا کہ بات صرف اطلاع پر ہی ختم نہیں ہوگی اب کچھ اور بڑھے گی' وہ اپنی بیوی کی ہر ایک کی ریس کرنے اور دیکھا دیکھی کرنے کی عادت سے بخوبی واقف تھے۔

"کیسے آنا ہوا تھا.... میرا مطلب ہے کوئی خاص بات۔" حالانکہ وہ جانتے تھی کہ آپا کوئی خاص بات کر کے گئی ہوں یا نہ گئی ہوں ان کی بیوی ضرور اس میں سے کچھ مسئلے والی بات نکال چکی ہوگی۔

"نہیں... سلمیٰ نے حسرت سے نہیں کہتے ہوئے آہ بھری "بھئی جسے اللہ ہی اتنا دے تو بندہ کیا کر سکتا ہے سوائے شکر کرنے کے۔"

"تو بندے نے اور کرنا بھی کیا ہے سوائے شکر کرنے کے۔" اصغر صاحب نے نرمی سے مسکراتے ہوئے بیگم کی ٹھنڈی آہوں کو مزید ٹھنڈا کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

یہ اور بات ہے کہ ان کا دل آنے والے مکالموں کے خوف سے یہاں سے رفوچکر ہونے کا سگنل دے



رہا تھا مگر مجبوری کہ چائے ابھی کپ میں آدھی سے زیادہ پڑی تھی اور ابھی تک گرم تھی ورنہ اس کو بیگم کو گرم کر کے لانے کے لیے تھما دیتے۔ اسی لیے مسکراتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرنے پر ہی اکتفا کیا۔

ان کی یوں اطمینان بھری مسکراہٹ نے تو جیسے جلتی پہ تیل کا کام کیا تھا۔ سلمیٰ نے چاولوں کے تھال کو جھٹکے سے فرش پر دھرا کہ ظاہر ہے میاں کو قائل کرنے کے لیے زبان اور ہاتھ دونوں کی ضرورت تھی۔

"بات سنیں میری۔" انہوں نے اشارے سے میاں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ "شکر بھی وہ ہی کرتا ہے جس کے پاس کچھ ہوتا ہے۔ ادھر میرے پاس کیا ہے جو میں شکر کرتی پھروں۔"

اب اسی بات سے وہ بچنا چاہ رہے تھے۔۔۔ "اچھا تو کیا کہہ رہی تھیں آپ کی آپا صاحبہ۔" چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔ لہجہ ہنوز سرسری سا تھا۔ اندازہ تو اصغر صاحب کو بھی تھا کہ آپا یقیناً" کوئی الیکٹرونک آئٹم۔۔۔ کوئی نئے ماڈل کا موبائل بس کچھ نیا ہی دکھا کے یا بتا کے گئی ہوں گی۔ مالی اعتبار سے وہ ان لوگوں سے کافی بہتر تھیں۔ ان کے میاں کا کپڑے کا کاروبار تھا جو اچھا خاصا چل رہا تھا۔ ادھر اصغر صاحب ٹھہرے نوکری پیشہ اور لگی بندھی کمانے والے۔

"وہ کہنا کیا ہے۔" سلمیٰ نے بات شروع کی۔ "کہہ رہی تھیں کہ سونا سستا ہوا ہے تو دونوں بچیوں کے لیے سونے کے سیٹ بنوائے ہیں یہ ہی کہہ رہی تھیں کہ آ کے دیکھ جاؤ کسی دن ہم LED بھی دیکھنے نہیں آئیں۔"

"ہاں تو چلی جاؤ کسی دن۔" انہوں نے چائے کا خالی کپ بیگم کو تھماتے ہوئے کہا۔ صحن میں بچھی ایک چارپائی پہ وہ اور سامنے رکھی چارپائی پر سلمیٰ بیگم براجمان تھیں۔ سلمیٰ نے سستی سے خالی کپ نیچے فرش پر رکھا اور چاولوں والا تھال اٹھا کے دوبارہ چاول چننے لگیں۔

"ہاں سوچتی ہوں۔۔۔ ایک دو دن میں آپا کی طرف چکر لگا آؤں۔ نہیں آپا ہی پھر دوبارہ ٹپک پڑیں کوئی نئی چیز لے کے، ہمارے پاس تو دکھانے کو بھی کچھ نہیں ہے۔ الٹا شرمندگی ہوتی ہے۔ کوئی ڈھنگ سے بیٹھنے تک کی جگہ تو ہے نہیں گھر میں۔" اب اس بات کا جواب تو اصغر صاحب کے پاس بالکل نہ تھا۔

"جاؤ گی تو اطہر کے گھر کا بھی چکر لگا لینا۔ تمہاری آپا کے محلے میں ہی اس نے کرائے کا گھر لیا ہے۔ بتا رہا تھا کہ چھوٹی کو ذرا بخار ہے۔ اس کا بھی پتا کرتی آنا۔" اصغر سے چھوٹے اطہر تھے جو پہلے دوسرے علاقے میں مقیم تھے۔ دونوں بھائی ایک ہی ادارے اور تقریباً" ایک جیسے عہدوں پر فائز تھے۔۔۔

"اس دفعہ تو میں نے سوچ لیا ہے اب جو کمیٹی کھلے گی تو LED یا سونے کا سیٹ اور کچھ نہیں لینا ہے بس۔" وہ اپنا چاولوں کا تھال لے کے کچن کی طرف چل پڑیں اور ساتھ ہی میاں کو بھی اپنے عزائم سے باخبر کر دیا۔

پورے دو دن، دو نئے سونے کے سیٹ سلمیٰ کے حواسوں پہ چھائے رہے۔ آپا کی بیٹیاں ابھی اتنی بڑی بھی نہ تھیں کہ یوں ان کی شادی کی تیاریاں شروع کی جاتیں۔ چھوٹی ندا تو ابھی نویں میں جبکہ بڑی فرسٹ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ بڑا بیٹا دو تین دفعہ میٹرک میں فیل ہو کے اب باپ کے ساتھ دکان پہ بیٹھتا تھا جبکہ چھوٹا والا ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔

تیسرے ہی دن وہ آپا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ صبح آپا کو اپنے آنے کا جب بتایا تو انہوں نے دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کا کہا اس لیے وہ بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد فوراً" ہی چل پڑیں۔ وہ تقریباً" 5 مہینے بعد آپا کی طرف جا رہی تھیں ورنہ تو اکثر آپا ہی ایک آدھ مہینے میں ان کی طرف چکر لگا لیتی تھیں۔ آپا کے گھر کم جانے کی ایک وجہ ان کے میاں کا مزاج بھی تھا جو ہر وقت ساتویں آسمان پر چڑھا رہتا تھا اور میکے والوں کو دیکھ کر تو وہ اور بھی بدلحاظ ہو جاتے تھے۔

☆ ☆ ☆ ☆

سلمیٰ کے دو بچے تھے۔ 12 سالہ مریم اور 8 سالہ زیشان۔ بچوں کے ساتھ دو دو بسیں بدل کے وہ آخر کار اپنی آپا صاحبہ کے گھر پہنچ ہی گئیں۔۔۔ آپا T.V لاؤنج ہی میں مل گئیں۔ کوئی ڈرامہ وغیرہ دیکھ رہی تھیں۔ صوفے کے آگے رکھے شیشے کے میز پر چائے کے کپ اور پلیٹیں بکھری پڑی تھیں۔ لگتا تھا ابھی یہیں ناشتہ کیا گیا ہے۔ دونوں لڑکیاں بھی ادھر ہی تھیں۔

”تمہارے آنے کی خوشی میں تینوں بچوں نے آج اسکول، کالج سے چھٹی کی ہے۔ سلمیٰ دیکھ لو کتنا پیار ہے اپنی خالہ سے۔“ آپا نے گلے ملتے ہی جتاتے ہوئے کہا۔

”ہاں تو خالہ کو بھی تو پیار ہے۔“ سلمیٰ نے بھی ندا اور سمرہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

”تو صبح سے ہی کیوں نہ آگئیں پھر۔۔۔ تیرے دولھا بھائی تو 10 بجے تک گھر سے نکل جاتے ہیں تو 11 بجے تک آجاتی۔ ابھی تیرے بچے کونسے PHD کر رہے ہیں جو تو ان کی ایک دن کی بھی چھٹی نہ کرا سکی۔“

”ارے آپا! اب بس آگئی ہوں نا۔ اب رہنے دیں۔ آپ کو پتا تو ہے اصغر پڑھائی کے معاملے میں بالکل رعایت نہیں برتتے۔“ سلمیٰ نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

لگتا ہے کارپٹ بھی نیا لیا ہے آپا!“ سلمیٰ نے فرش پہ بچھے سرخ اور کالے رنگ کے امتزاج کے قالین کو دیکھتے ہوئے آپا کو خوش کرنا چاہا۔۔۔

”ہاں بھئی اب وہ براون والا تو ان صوفوں سے میچ نہیں کرتا تھا تو جب صوفہ سیٹ بدلا تو قالین بھی نیا لینا پڑا۔“ آپا کے جتانے پر کہ صوفے نئے ہیں۔ سلمیٰ نے صوفے کو بھی ذرا غور سے دیکھا۔

گو کہ پچھلے آٹھ مہینے ہی ہوئے ہوں گے صوفے کو پر یوں جا بجا دھبے پڑے ہوئے تھے صوفے پر کہ لگتا تھا آٹھ دس سال تو ضرور پرانا ہے۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ ابھی چند ماہ پہلے ہی نیا لیا ہو۔ ایک تو صوفہ سیٹ T.V لاؤنج کے حساب سے۔۔۔ ت بھاری بھر کم تھا، اوپر سے سامنے والی دیوار پہ لگا اتنا بڑا LED کچھ عجیب سا لگ رہا تھا کیونکہ صوفے اور LED کا فاصلہ کافی کم تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ ہی ڈیپ فریزر بھی رکھا ہوا تھا۔ جس پہ بچوں کے بیگ اور اسکول کی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ فرش پر بھی لگتا تھا جھاڑو نہیں لگی ابھی تک حالانکہ دو ڈھائی بج رہے تھے۔

آپا ان لوگوں کی خاطر تواضع کولڈ ڈرنک سے کر چکی تھیں اور اب کچن میں چولھے پہ چڑھا ہوا سالن دیکھنے آئیں تو سلمیٰ بھی بہن کے ساتھ ہی کچن میں آگئی۔ کچن کے سنک میں بھی برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ لگتا تھا رات کے کھانے کے برتن تک نہیں دھلے ابھی تک۔

”ارے توبہ ہے پورا گھنٹہ گزر گیا۔ گوشت تو لگتا ہے گلنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔“ آپا نے بھاپ اڑاتی بوٹی کو توڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں آپا۔“ اب سلمیٰ بیچاری کیا کہتی۔ بچے تو بغیر کچھ کھائے پیئے اسکول سے سیدھے یہاں آئے تھے۔ ان کی تو فکر تھی اور آپا کو بھی جیسے اندازہ ہو گیا۔

”ارے لڑکیوں! وہ تم لوگ کیا نگٹ وگٹ تلتی رہتی ہو۔ وہ تل کے دو نا بچوں کو۔“ سلمیٰ! ڈیپ فریزر بھرا رہتا ہے ان کے چونچلوں سے۔ ارے ندا! بابر کو پانچ سو روپے دے کہ کہہ کر کسی اچھے سے ہوٹل سے بریانی لے آئے۔ یہ گوشت تو گلنے کا نام نہیں لے رہا۔“

ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں پڑے ڈائننگ ٹیبل کی جو گرد سے اٹا پڑا تھا۔ جھاڑ پونچھ کر کے عزت افزائی کی گئی۔

”آپا! آپ کی کام والی ماسی نہیں آتی اب۔“ کب سے دل میں آئی بات سلمیٰ کے ہونٹوں کو چھو گئی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ سلمیٰ بہت نفاست پسند اور گھر کو چمکا کے رکھنے والی عورت تھی۔ ہاں پر جیسے تیسے کر کے گھر کی روز کی صفائی کر ہی لیتی تھی۔ کم از کم گرد میں

اتی چیزیں اور ادھر ادھر بکھرے خالی ریپر فرش پر نہیں ملتے تھے۔

بھوک زوروں کی لگی ہوئی تھی اس لیے سلمیٰ نے بھی بچوں کے ساتھ ساتھ خود بھی چپس اور نگٹ پلیٹ میں ڈال کے کھانے شروع کردیے۔

"پتا نہیں یہ کمبخت ' بریانی ابھی تک کیوں نہیں لے کے آیا۔ دیکھ ' تین بج رہے ہیں۔" آپا دونوں سونے کے سیٹ ڈائننگ ٹیبل پر ہی لے آئیں تو سلمیٰ نے بھی اپنی پلیٹ سائڈ پہ کرلی۔

"ہاں واقعی بہت خوب صورت سیٹ ہیں۔ دونوں ہی بہت خوب صورت ہیں آپا۔" سلمیٰ نے دل کھول کے زیورات کی تعریف کی اور ستائشی نظروں سے مخملی ڈبوں میں رکھے سیٹوں کو دیکھا۔

"خالہ یہ والا زیادہ پیارا ہے نا۔۔۔ یہ والا میرا ہے۔"

چھوٹی ندا نے ایک سیٹ کو اپنے گلے میں لگاتے ہوئے خالہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"نہیں یہ میرا ہے۔" اس سے بڑی سمرہ نے اس کے ہاتھ سے سونے کے ہار کو جھپٹا۔

"اری منحوسو! شادی تو ہو جانے دو۔ یہ کوئی میں تمہیں ایسے ہی پہننے کو دوں گی۔ جب شادی ہو گی تب ہی دوں گی جہیز میں۔۔۔ ابھی سے کیوں لڑ مر رہی ہو۔" لڑکیوں پر آپا کو غصہ آیا۔

"کس کی شادی پر امی۔۔۔" سلمیٰ کی بارہ سالہ بیٹی نے جو ندا سے دو ڈھائی سال ہی چھوٹی تھی معصومیت سے پوچھا۔

"کسی کی نہیں، تم چپ رہو۔" سلمیٰ نے اسے ڈپٹا۔

"ارے یہ بابر کہاں مر گیا۔ ابھی تک بریانی لے کے نہیں آیا۔" ابھی آپا کی منہ سے ہی نکلا تھا کہ بیل کی آواز سنائی دی۔ "دیکھ چھوٹی! بابر آیا ہو گا۔" آپا نے ندا کو آواز دی۔

"بابر نہیں 'ابا آئے ہیں اماں۔" سمرہ کی صحن میں سے آواز آئی۔

"ہائے اللہ!" آپا اپنا دوپٹہ سنبھالتی ہوئی صحن کی طرف لپکیں۔ جہاں سے ابا صاحب کی خوب زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی تھی۔

"کیا مصیبت ہے اس گھر میں۔ کب سے انتظار کر کر کے خود آگیا ہوں۔ کھانا بھیجنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا یا آج پھر بھول گئی تھی' جاہل عورت۔" اب ان کی آواز بخوبی ڈرائنگ روم میں سنائی دی رہی تھی۔

"وہ اصل میں 'میں نے آج وہ۔۔۔ ارے سمرہ! تجھ سے کہا تو تھا کہ یاسر کو فون کردے کہ آج بازار سے کچھ منگوا لے اپنے اور ابا کے لیے۔ آج گھر پہ سالن نہیں بنا۔ تو نے فون نہیں کیا کیا دکان پر؟"

یاسر۔۔۔ وہ آج دوکان پہ آیا ہی کب ہے۔" ابا غصہ میں دھاڑے۔

"صبح سے اکیلا ہی سر کھپا کھپا کے اب تنگ آ کے آیا ہوں۔ تمہارا لاڈلا تو اپنے ننھیال پڑ گیا ہے۔ اتنا کاہل اور ست ہے۔۔۔ سو مر رہا ہو گا اوپر۔"

آپا کو شاک لگا۔ "اری سمرہ بتانا تو تھا۔ تو نے فون کیا تھا بھائی کو۔۔۔"

"نہیں اماں بھائی کا فون بند جا رہا تھا۔۔۔ پھر آپ نے کہا کہ خالہ اور بچوں کے لیے نگٹ تل لو تو اس میں یاد نہیں رہا۔" اپنا حوالہ سنتے ہی سلمیٰ کا دل ایک دم سکڑا۔

اف! خوامخواہ ہی وہ یہاں آگئی۔ دولہا بھائی کے کڑوے مزاج سے پورا خاندان ہی واقف تھا لیکن ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا دولہا بھائی نے۔ تین بجے تک انسان مغز ماری کرے' بڑا بیٹا کام کا بوجھ نہ بانٹے' گھر والے کھانا بھجوانا بھول جائیں تو۔۔۔ سلمیٰ نے حقیقت پسندی سے سوچا۔

"میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ جو تجھ جیسی کاہل عورت پلے پڑ گئی۔ ارے نہیں پکایا جاتا تو کام والی رکھ لے' جاہل عورت۔۔۔ پتا بھی ہے' بلڈ پریشر اور شوگر کا مریض ہوں۔ باہر کا نہیں کھا سکتا پر تجھے کیا' تیری بلا سے۔۔۔"

"ارے میں دیکھتی ہوں۔ سالن پک ہی گیا ہو گا۔ ارے سمرہ! جلدی سے آٹا گوندھ ابھی روٹیاں ڈال

دیتی ہوں۔" آپا جلدی جلدی باورچی خانے کے کیبنٹ کو کھول کر آٹا نکالنے لگیں۔

"اب جو پکار رہی ہو' پہلے نہیں پکا' مر سکتی تھیں۔"

دولہا بھائی زور سے چنگھاڑے اور پھر دھپ دھپ کرتے سیڑھیاں چڑھ گئے... ان کے اوپر جاتے ہی سلمیٰ کی جان میں جان آئی۔ واقعی اسی وجہ سے وہ مہینوں یہاں کا رخ نہیں کرتی تھی۔ یہ شخص تو کسی رشتہ دار کی بھی پرواہ نہیں کرتا حالانکہ سمرہ بتا بھی چکی تھی کہ خالہ اور بچے آئے ہیں تب بھی... سلمیٰ نے اپنا پرس سنبھالا اور آہستگی سے کچن میں چلی آئی جہاں آپا آٹا گوندھ رہی تھیں اور ندا سلاد کے لیے سبزیاں کاٹ رہی تھی۔

"ارے سلمیٰ' تم کیوں آگئیں۔" آپا کے لہجے میں میاں کی لعن طعن کی وجہ سے شرمندگی جھلک رہی تھی۔

"بیٹھو سلمیٰ' میں بس آرہی ہوں یہ شوگر کے مریض ہیں نا اس لیے۔"

"ارے نہیں آپا کوئی بات نہیں۔ میں بس تھوڑی ہی دیر کے لیے آئی تھی۔"

"ارے کیوں بھئی۔" آپا کے آٹا گوندھتے ہاتھ رک گئے۔

"وہ آپا' اصل میں اصغر نے تاکید کی تھی کہ اطہر بھائی کے گھر بھی ضرور چکر لگا آؤں۔ آپ کے محلے میں ہی تو رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی بیٹی کی طبیعت بھی خراب تھی تو اس کو بھی دیکھنا ہے اور کل بچوں کا ٹیسٹ بھی ہے تو پھر جلدی گھر بھی جانا ہے۔" سلمیٰ نے بہن کو تفصیل سے بتایا کہ وہ اس کے جلدی جانے سے پریشان ہی نہ ہو جائے...

"ارے تم آتی ہی کب ہو۔ سلمیٰ یہ تمہارے دولھا بھائی تو ہم جانتی ہو۔"

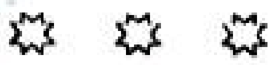
"ارے آپا! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے اگر اطہر بھائی کی طرف نہ جانا ہوتا تو رک جاتی... اب ٹائم دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ ادھر بھی ایک گھنٹہ تو لگے گا۔ پھر واپسی میں دو دو بسیں بدل کے جانا ہے۔ میں پھر آؤں گی انشاء اللہ۔" سلمیٰ نے جلدی جلدی یہاں سے نکلنے کے لیے جواز دیا۔

"گھر پتا ہے تمہیں اس کا۔" آپا نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ہاں آپا! وہ اصغر آئے تھے پچھلے ہفتے۔ آپ کی پیچھے کی طرف کی تیسری گلی میں کونے کا مکان ہے۔"

"اپنا لیا ہے یا کرائے پر ہی ہے ابھی تک۔" آپا نے پوچھا۔

"ابھی تو کرائے پر ہی لیا ہے۔ اچھا آپا' میں چلتی ہوں' اللہ حافظ۔" سلمیٰ نے جلدی جلدی باہر کی طرف قدم بڑھائے۔



تیسری گلی کے کونے والے گھر پہ بڑا سا تالا دیکھ کر ابھی سلمیٰ سوچ ہی رہی تھی کہ یہیں سے رکشہ پکڑے اور سیدھی اپنے گھر جائے... یہ سوچ کر مڑی ہی تھی کہ دیورانی صاحبہ بالکل پیچھے کھڑی نظر آئیں اور ان کی پریشانی کو سمجھ کے مسکرا کے بولیں۔

"میں دور سے دیکھ رہی تھی کہ یہ بھابھی اور بچے ہی لگ رہے ہیں۔ تیز تیز چلتی ہوئی آئی ہوں کہ آپ لوگ تالا لگا دیکھ کے پریشان نہ ہوں۔" ساتھ ہی انہوں نے گیٹ کھولا۔

"ہاں میں تو جانے ہی کا سوچ رہی تھی۔" سلمیٰ نے اندر صحن کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ کیا؟" سامنے ہی برآمدے میں ایک سائیڈ پہ بڑی میز پہ دیورانی کے دونوں بچے کتابیں رکھے اسکول کا کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو دیکھا تو فوراً ہی سلام کرنے چلے آئے۔

"ان کو تم گھر پہ چھوڑ کے گئی تھیں۔" سلمیٰ نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھابھی' میں بس دو منٹ کے لیے ذرا کام سے گئی تھی۔ یہیں دوسری گلی میں یہ پردے دینے گئی تھی۔"

"کون سے پردے؟" اب سلمیٰ کی نظر دیورانی کے ہاتھ

میں پکڑے تھیلے پہ پڑی جو اس نے اب ساتھ ہی پڑے میز پر رکھ دیا تھا۔

"ابھی بتاتی ہوں بھابھی 'ایک منٹ۔" وہ اٹھ کر برآمدے کا پنکھا چلا کر بولی۔ "ذرا ٹھنڈا پانی لے آؤں پھر بتاتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے ساتھ ہی بنے ہوئے کچن کی طرف مڑ گئی۔

"آؤ رملی۔" اپنی نو سالہ بیٹی کو اس نے شاید اپنی مدد کے لیے آواز دی۔ جو فرمانبرداری سے کچن کی طرف چل پڑی۔ تھوڑی ہی دیر میں رملی ٹرے میں ٹھنڈی سکنجبین کے گلاس اٹھائے داخل ہوئی۔ ٹھنڈے مشروب سے سلمیٰ کے اندر تک تازگی آ گئی۔ دیورانی (حنا) ابھی تک کچن میں ہی تھی۔

سلمیٰ نے ایسے ہی سامنے صحن پہ نظر ڈالی تو جہاں قطار سے لگے گملے اور ان میں لگے خوشنما پھول بہت ہی بھلے لگ رہے تھے۔ صحن کافی کشادہ اور صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ برآمدے میں جہاں وہ بیٹھی تھی 'لکڑی کی چار کرسیاں اور بیچ میں چھوٹی سی شیشے کی میز پڑی تھی۔ ایک سائڈ میں ڈائننگ ٹیبل تھا جس پہ بچے پڑھ رہے تھے۔ برآمدے کو یقیناً "T.V لاؤنج اور ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ سامنے کی دیوار کے ساتھ T.V ٹرالی بھی لگی تھی۔ سامان بہت عام سا تھا مگر صفائی اور خوب صورتی سے کی گئی سیٹنگ کی وجہ سے بہت اچھا تاثر دے رہا تھا۔ گملوں کے پاس ہی صحن میں تخت پہ صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی۔

اندر کمروں میں بھی صفائی کا یہی عالم تھا۔ وہ دل ہی دل میں دیورانی کے سگھڑاپے کی قائل ہو گئی۔ گو کہ حنا کا گھر کرائے کا تھا پر سلمیٰ کا تو اپنا تھا تب بھی سامان اس طرح سے سلیقے سے نہیں رکھا ہوا تھا۔ ہر وقت چیزیں ادھر ادھر بکھری پڑی رہتی تھیں۔ ابھی وہ تھوڑی دیر کے لیے آپا کے گھر اور اپنے گھر کا موازنہ کر رہی تھی تو اسے لگا کہ آپا کا گھر تو بہت ہی گھٹن زدہ اور گندہ ہے اس کا اپنا گھر بہرحال اس سے بہتر ہے پر اب حنا کا گھر جو کہ سلمیٰ کے گھر کا آدھا ہی ہو گا اور سامان بھی یقیناً "سستا تھا لیکن ہر چیز صفائی اور طریقے سے رکھی ہوئی تھی۔

کرسیوں کے سامنے رکھی میز پہ خوب صورت سا میز پوش اور اس پہ رکھا پیارا سا نازک سا گلدان چمکتا صاف ستھرا صحن۔ ابھی وہ ان ہی خیالوں میں تھی کہ حنا ٹرے ہاتھوں میں پکڑے کچن سے نمودار ہوئی۔

"چلو بیٹا! بکس اٹھاؤ ٹیبل پر سے 'ادھر ہی کھانا لگاؤں گی۔"

"ارے تم نے کیوں تکلیف کی حنا!" سلمیٰ نے کھانے کا اہتمام دیکھا تو دیورانی کو ٹوکا۔

"تکلیف کیسی بھابھی! مٹر پلاؤ اور رائتہ بنا کے گئی تھی۔ آ کے صرف شامی کباب تلے ہیں۔ آپ کے آنے کا پتا نہیں تھا ورنہ کوئی اچھی سی چیز بناتی۔"

"ارے نہیں 'یہ ہی بہت ہے۔" کھانا واقعی مزیدار تھا۔ مٹر پلاؤ 'پودینے کی چٹنی 'رائتہ 'شامی کباب سب ہی کچھ بہت ذائقہ دار تھا۔ کھانے کے برتن اٹھا کے جب حنا اٹھی تو وہ بھی اس کی مدد کی غرض سے کچن میں آ گئی۔ چھوٹا پر انتہائی صاف ستھرا سا کچن دیکھ کے سلمیٰ کو گندے برتنوں سے بھرا اپنی بہن کا امریکن کچن یاد آ گیا۔ اس کچن میں سلمیٰ کا کھڑے ہونے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا اور یہاں اس چھوٹے سے کچن میں جیسے بندے کا آپ ہی آپ کام کرنے کو دل چاہے۔

"بھابھی آپ بیٹھیں۔ میں بس چائے کا پانی رکھ کے آتی ہوں۔" حنا نے اس کے ہاتھ سے برتن لے کر رکھتے ہوئے کہا۔

ارے نہیں حنا! چائے پھر کبھی۔۔۔ تم بس ادھر بیٹھو میں تھوڑی دیر میں واپس چلی جاؤں گی۔"

"ارے! ایسے ہی! آپ کے شوہر نامدار آ رہے ہیں اطہر کے ساتھ۔ آپ ایسے ہی چلی جائیں گی۔" حنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا واقعی!" سلمیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں 'بچوں نے ابھی بتایا کہ جب میں گھر سے باہر تھی تو بابا کا فون آیا تھا۔ آج تایا ابو شام میں ان کے ساتھ ہی آئیں گے۔ وہ میرے پاس موبائل نہیں ہے ورنہ وہ مجھے فون کر دیتے۔ آپ کو شاید فون کیا ہو 'آپ اپنا فون چیک کریں۔"

"ہاں اچھا دیکھتی ہوں۔" سلمیٰ نے ہینڈ بیگ کھول کے اپنا فون چیک کیا تو کئی مسڈ کالز تھیں۔

"اوہ یہ موبائل سائلنٹ پہ تھا شاید۔" سلمیٰ نے فون کو واپس بیگ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے حنا تم بھی لے لو نا موبائل فون' اب تو ہر ایک کے پاس ہے۔" یہ کہتے ہوئے اسے آپا کی چھوٹی بیٹی ندا کی بات یاد آ گئی۔

جب اس نے سلمیٰ کے موبائل فون کو دیکھا تھا تو کہا تھا۔ "خالہ یہ والا موبائل تو اب ماسیاں بھی نہیں لیتیں۔ خالو سے ٹچ اسکرین موبائل منگوائیں اور اسے کسی کوڑے کے ڈبے میں پھینک دیں۔"

"ارے نہیں بھابھی۔" اسے حنا کی آواز نے متوجہ کیا۔ "مجھے موبائل کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔ گھر میں فون تو ہے ہی اور اطہر کے پاس ہے ایک موبائل' وہ ہی ہمارے لیے کافی ہے اور میں کونسی جاب کرتی ہوں۔

سلمیٰ دیورانی کے اطمینان پر حیران ہی تو رہ گئی۔

شام میں اصغر بھی اطہر کے ہمراہ آ گئے تو پھر خوب محفل جمی۔۔۔ دونوں بھائی برآمدے میں رکھی کرسیوں پہ بیٹھے' T.V کی خبروں کے ساتھ ساتھ چائے کا مزہ لے رہے تھے۔ حنا اور سلمیٰ چائے کے کپ اٹھائے صحن میں رکھے موڑھوں پر بیٹھی تھیں۔ قریب ہی رکھے گملے اور ان میں کھلے خوشنما پھول ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکوں سے ہلتے بہت دلفریب اور فرحت بخش محسوس ہو رہے تھے۔ حنا نے چائے کے ساتھ پکوڑے اور ویجیٹبل رولز بنائے تھے جو کہ بہت ہی لذیذ تھے۔ ساتھ میں پودینے اور املی کی چٹنی۔

اس کو خیال آیا کہ حنا کھانا تو پہلے بھی بہت اچھا بناتی تھی لیکن آج جب آپا کے گھر سے موازنہ کیا تو حنا کے گھر کی ہر چیز میں ترتیب' قرینہ اور سلیقہ جھلک رہا تھا جبکہ آپا کے گھر میں اس چیز کا فقدان تھا۔ اسے اپنی کل تک کی سوچ پہ حیرت ہوئی کہ وہ کیسے آپا سے جیلس ہو رہی تھی کہ آپا کے پاس کتنا پیسہ ہے۔۔۔ آپا کتنی عیش کی زندگی گزار رہی تھیں۔۔۔ اور وہ بیچاری قسمت کی ماری صرف آپا کو شو مارتے ہوئے دیکھ ہی سکتی ہے۔۔۔

جبکہ صرف دو گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد ہی اس کی حالت خراب ہونے لگی تھی۔۔۔ بچوں کا ایک دوسرے سے لڑنا جھگڑنا' مار اماری کرنا' آپا اماں کا بچوں کو بات بلت میں لعن طعن کرنا۔۔۔ اف آپا نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔

کہاں گم ہیں بھابھی۔" حنا نے پکوڑوں کی پلیٹ اس کے قریب کرتے ہوئے کہا۔۔۔

"کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی' تم اتنا سارا ٹائم کیسے نکال لیتی ہو!۔۔۔ میرا مطلب ہے اتنا اچھا صاف ستھرا گھر۔۔۔" اس نے دوسرے کمرے میں جو کہ شاید بچوں کا تھا اور چاروں بچے بیڈ کے ساتھ بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھے کوئی گیم وغیرہ کھیل رہے ان پہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ بچوں کے کمرے میں ہی دیوار کے ساتھ بنی کتابوں کی الماری بھی تھی۔ جس میں بچوں کی اسکول کی کتابوں کے علاوہ دوسری بہت ساری کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

"ٹائم ہی ٹائم ہے بھابھی۔۔۔ اور اب تو بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ انہیں اسکول بھیج کے۔۔۔ گھر کا کام تو دو ڈھائی گھنٹے میں ہو ہی جاتا ہے تو میں تو محلے والوں کے کپڑے بھی سی لیتی ہوں۔ وہ جو آج تھیلا لے کے آ رہی تھی نا' جب آپ آئیں تھیں۔۔۔ اس میں پردے تھے۔ درزی پردے سینے کے بہت زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب میں نے اپنے گھر کے پردے خود سیے تو میری پڑوسن نے کہا کہ تم میرے بھی سی دو۔۔۔ پھر اس طرح محلے میں اور بھی لوگوں نے سلوائے۔ آج سامنے والی گلی میں ایک گھر ہے ان کے پردے سلے ہوئے تھے تو ان کو دینے گئی تھی پر وہ لوگ نہیں گئے ہوئے تھے تو واپس لے آئی۔"

"اچھا! تمہیں عجیب نہیں لگتا۔۔۔ میرا مطلب ہے کافی مشکل کام ہے۔۔۔" سلمیٰ نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ بس ذرا دل لگا کے اور دھیان سے کریں تو کوئی بھی کام مشکل نہیں بلکہ بچوں کو ٹیوشن پڑھانے سے زیادہ اس میں بچت ہے۔" حنا کے جواب پر تو وہ اور حیران ہوئی۔

"تم ٹیوشن بھی پڑھاتی ہو حنا۔۔۔"

"ہاں... ابھی ابھی امتحان ہوئے ہیں تو اس مہینے نہیں ورنہ اکثر تین چار بجے تو آہی جاتے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو پڑھانا ہوتا ہے۔ اب تو سوچ رہی ہوں خود پرائیویٹ بی اے کرلوں تو اور اچھی طرح اور ذرا بڑی کلاسوں کو بھی ٹیوشن پڑھالوں گی۔"

"یار! تم تو بھئی ہر فن مولا ہو۔ پتا نہیں اتنا ٹائم کیسے آجاتا ہے تمہارے پاس۔" سلمیٰ کے پاس تو اپنے بچوں تک کو پڑھانے کا ٹائم نہیں تھا۔ اس کے دونوں بچے محلے میں ٹیوشن پڑھنے جاتے تھے جبکہ وہ بھی حنا کی طرح انٹرپاس تھی۔

"بھابھی ٹائم نکالنے سے نکلتا ہے۔ میں ٹائم کو بلاوجہ ضائع نہیں کرتی۔ میں تو اتنا وقت بھی نکال لیتی ہوں کہ دوپہر میں بچوں کو لے کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرلوں... پھر شام میں ٹیوشن والے بچے آجاتے ہیں... اس کے بعد کھانا کھانا اور کچن سمیٹنا۔ بچوں کے اور ان کے کپڑے استری کرنا اور بس۔"

"اور کپڑے کب سیتی ہو۔" سلمیٰ نے پوچھا۔

"وہ صبح بچوں کے اسکول جانے کے بعد۔ گھر کی صفائی سے فارغ ہو کے ایک دو گھنٹے ہی لگالیتی ہوں، اچھے پیسے مل جاتے ہیں۔" اور سلمیٰ بیگم سوچنے لگیں کہ ٹائم تو ان کے پاس بھی اتنا ہی ہوتا ہے پر انہیں کتنا کم محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب ہر روز تین چار ڈرامے، مارننگ شوز، ٹاک شوز یہ سب دیکھے جائیں گے تو دوسرے کاموں کے لیے ٹائم کہاں بچے گا...

"تم ٹی وی کب دیکھتی ہو۔" سلمیٰ نے اپنے مطلب کا سوال پوچھا۔ "بس جب کوئی اچھا پروگرام آتا ہے تب دیکھ لیتی ہوں۔ ہر وقت نہیں۔" حنا نے مختصر سا جواب دیا۔

ایک میں ہوں بھلے سے دو دن تک اپنا چہرہ آئینہ میں نہ دیکھوں پر 24 میں سے چار چھ گھنٹے ٹی وی ضرور دیکھوں گی۔ سلمیٰ نے جل کے سوچا۔

شام کے سات بجے تک ان کی واپسی ہوئی۔ اصغر نے اسے کہا بھی کہ تم گھر پر ٹھہو میں رکشہ لے آتا ہوں پر سلمیٰ کا رکشہ اسٹینڈ تک، واک کرنے کا موڈ تھا... موسم بھی اچھا تھا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی جو آتی سردیوں کا پتا دے رہی تھی۔ پیدل چلنا اور اچھا لگ رہا تھا۔ بچے بھی خوش تھے۔

ایسے ہی چلتے چلتے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اصغر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج میں دعا کررہا تھا کہ تمہاری آپا نے کوئی نئی چیز نہ خریدی ہو۔"

"کیوں؟" سلمیٰ نے مصنوعی خفگی سے میاں کو گھورا۔ "میں کوئی جلتی ہوں ان کی چیزوں سے۔"

"جلتی تو نہیں ہو... پر تمہارا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔"

"کوئی نہیں! خوشگوار زندگی نت نئی چیزوں کی مرہون منت تو نہیں ہوتی۔"

"اچھا! تو پھر خوشگوار زندگی کن چیزوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔" اصغر نے بیگم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو دلچسپی سے سوال کیا۔

"خوشگوار زندگی۔" سلمیٰ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"خوشگوار زندگی شاید دل کے سکون کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جب ہم اپنی اصلاح کرنے کا پہلے سوچتے ہیں اور بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی ریس نہیں کرتے بلکہ جو اپنے لیے کرسکتے ہیں اپنے زور بازو پہ بھروسہ کرتے ہوئے وہ کرتے ہیں اور جو ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں تو اللہ بھی پھر ہمارے دلوں میں اطمینان ڈال دیتا ہے..."

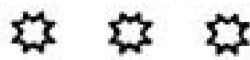
"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپا کے گھر جانے سے تمہارے خیالات میں اتنی تبدیلی آجائے گی... ورنہ یقین کرو، میں خود تمہیں آپا سے روز ملوانے لے آتا۔" اصغر نے ہنستے ہوئے کہا... میاں کی بات پہ وہ بھی ہنس پڑی اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ آپا کی کس بات سے یہ تبدیلی آئی ہے... اب شوہروں سے کچھ تو ٹیکے کا پردہ رکھنا پڑتا ہے!

صائمہ اکرم چوہدری



سیاہ حاشیہ

"سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔" "پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔



عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم و صلوٰۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی



ناولٹ

ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔
عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔
شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔
ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارصم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل جاوید کا انتقال ہو چکا ہے۔
نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔
اوریدا اور ارصم کی بہت دوستی ہے جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔
عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔
سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔
شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ جتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو

کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔

آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔

اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔

ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے جو کسی مرد کی ہے۔

ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔

مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کر لے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔

عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔

عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔

شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔

ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔

ارصم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔

عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

۱۱
گیارہویں قسط

بختاور خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے دوبارہ بیڈ کی طرف بڑھی اور لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بیٹھ گئی' سرما کی اس یخ بستہ رات میں اس کا سارا وجود پسینے سے شرابور تھا۔ دل کو گویا پنکھے لگ گئے تھے اور دماغ میں ایک حشر بپا تھا۔

"اگر وہ مسلمان نہیں تھا تو اس نے میرے ساتھ کورٹ میرج کیوں کی؟" ذہن میں پہلا سوال ابھرا۔

"شاید مجھے مطمئن کرنے کے لیے۔" اس جواب کو سوچ کر اس کا وجود پھر زلزلوں کی زد میں آگیا۔

"نہیں نہیں' ہاشم کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھلا کیوں مجھ سے جھوٹ بولے گا۔" ایک اور سوچ نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا۔

"لیکن اگر ایسا ہی ہوا تو۔" وہ بے بس انداز میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گئی۔

"وہ اتنا اچھا انسان ہے' کسی کو تکلیف دے ہی نہیں سکتا۔ مجھے لگتا ہے اس کے بھائی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے خود کو دلاسا دیا۔

"لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو؟ میں کہاں جاؤں گی۔" تلخ سوچیں بد صورت چمگادڑوں کی طرح اس کے سر پر بے ہنگم انداز میں گھوم رہی تھیں۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ایسے ہی کوئی اور جائیداد وغیرہ کا چکر ہو گا۔" وہ خود کو تسلی دیتے دیتے نڈھال ہو

کرلیٹ گئی۔

"بعض دفعہ جوان لڑکے تھوڑے بہت گمراہ ہو ہی جاتے ہیں' میں اپنی محبت سے اسے واپس لے آؤں گی۔" وہ ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ بیٹھی' اس سوچ نے اس کے اندر توانائی بھر دی تھی۔

"بھلا ہاشم جیسا انسانیت سے محبت کرنے والا شخص کیسے ملحد ہو سکتا ہے۔" اس کے خوش فہم دل نے اسے نئی راہ دکھائی۔

"مجھ سے ہی بات کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو گی۔" وہ خود کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

دوسری طرف ہاشم شاید اپنے بھائی کے ساتھ مصروف ہو چکا تھا کیونکہ اب باتوں کی آواز بہت مدھم آرہی تھی۔ بختاور بھی اپنے ذہن کو پرسکون کر کے نیند کی وادیوں میں گم ہو گئی اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب ہاشم سونے کے لیے آیا۔ صبح فجر کی اذان کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی وہ جلدی سے اٹھی اور وضو کر کے نماز پڑھنے کے لیے کمرے کی لائٹ جلائی۔ ہاشم نے بے زاری سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ ناگواری کا ایک تاثر اس کے پورے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ جائے نماز بچھاتے بچھاتے رکی۔

"یار تم! تم یہ اپنی اٹھک بیٹھک کہیں اور جا کر نہیں کر سکتیں۔" وہ نیند کے خمار کے زیر اثر جھنجلا کر بولا۔

"کون سی اٹھک بیٹھک؟" بختاور کو بہت برا لگا۔

"یہی جو تم صبح و شام کرتی ہو' اب صبح صبح میری نیند خراب کر دی۔ اس سے اچھا ہے تم دن چڑھے یوگا کر لیا کرو۔" اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے وہ حد درجہ چڑا ہوا تھا۔

"ہاشم! میں نماز پڑھتی ہوں جو اللہ نے ہم سب مسلمانوں پر فرض کر رکھی ہے۔" اس نے پریشانی سے اسے یاد دلایا۔

"کس اللہ نے؟" وہ سستی سے جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"وہی جو سب کا رب ہے۔" بختاور کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔

"تم نے دیکھا ہے کبھی اس کو؟" اس نے بے زاری سے اپنا تکیہ درست کیا۔

"ہاں' دنیا کی ہر چیز میں اس کا عکس جھلکتا ہے' صرف دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل ہونا چاہیے۔" وہ نماز چھوڑ کر پریشانی سے اس کے پاس پہنچ گئی۔

"اچھا پلیز! یہ صبح صبح تبلیغی لیکچر مت دینا' اچھی خاصی نیند خراب کر دی میری۔" اس نے غصے سے کمبل لیا اور دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گیا۔ بختاور ہکابکا انداز کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"نیند میں ہو گا' اسی لیے اوٹ پٹانگ بول گیا۔"

اس نے سر جھٹک کر اپنی پریشانی کو دور کیا اور جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔ جب کہ دوسری جانب ہاشم ایک دفعہ پھر گہری نیند میں جا چکا تھا۔ اس کے خراٹوں کی آواز سے اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس نے یہ ساری گفتگو نیند ڈسٹرب ہونے کی وجہ سے لاشعوری انداز میں کی ہے' وہ بھی نماز پڑھ کر مطمئن ہو کر لیٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

"او مائی گاڈ! تیمور نے میری بات سن لی۔ اب کیا ہو گا؟" بینش' تیمور کے پلٹنے پر حواس باختہ ہوئی۔ وہ ڈیزی کی پسند کی شادی کا ذکر جتنے بھونڈے انداز میں کر رہی تھی اور باقاعدہ اس خبر سے لطف اٹھا رہی تھی' یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ تیمور اس سے خفا نہ ہوا ہو۔

"تیمور بھائی بہت غصے میں واپس گئے ہیں۔" بندیا نے ڈرتے ڈرتے اسے اطلاع دی۔

"بے وقوف لڑکی' تم مجھے بتا نہیں سکتی تھیں۔" اس نے کھا جانے والی نظروں سے بندیا کو دیکھا' وہ اپنا غصہ خوامخواہ اس پر اتارنے لگی تھی۔

"میں کس طرح بتاتی' وہ اچانک ہی آگئے تھے۔" اس نے بھی گھبرا کر صفائی دی۔

”میرا خیال ہے وہ آغا جی کو بلانے آیا ہو گا۔“ بینش نے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”لیکن بیا! اب کیا ہو گا؟“ بندیا اس سے زیادہ سہم گئی۔

”ہونا کیا ہے‘ منالوں گی۔ آخر اتنی تو محبت کرتا ہے وہ مجھ سے۔“ بینش کی بات پر اسے دھچکا لگا۔ اس نے حیرانی سے اس کا پر اعتماد چہرہ دیکھا‘ وہ ضرورت سے زیادہ خود آگاہ تھی اور ہر قسم کی صورت حال سے نبٹنے کا ہنر جانتی تھی لیکن اسے یہ علم نہیں تھا کہ مرد بڑی سے بڑی بات پی سکتا ہے لیکن اپنے خونی رشتوں کا اڑایا جانے والا مذاق کبھی بھی برداشت نہیں کرتا۔

بڑے ابا کے گھر میں موت کا سا سناٹا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے در و دیوار تک سہم گئے ہوں۔ ڈاکٹر جلال اور ان کی بیگم‘ ڈیزی کے بغیر ہی واپس آچکے تھے۔ اس واقعے کے بعد بڑے ابا کے چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی اور بڑی اماں کونے کھدروں میں چھپ کر روتی تھیں کہ کہیں ان کے میاں کو خبر نہ ہو جائے۔ گھر کی دیواروں پر لگی وہ ساری تصویریں ہٹادی گئی تھیں جن میں ڈیزی موجود تھی۔ ان ہی دنوں طیبہ کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہو گیا اور اس خبر نے بھی بڑے ابا کے وجود پر پھیلے جمود کو نہیں توڑا۔

”اللہ غارت کرے تمہیں‘ تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“ بڑی اماں کے دل سے نکلنے والی آہیں اردگرد کے لوگوں کو خوفزدہ کر دیتیں۔

”بیگم صاحبہ! خدا کے واسطے بددعا مت دیں۔“ رحمت بوا کی آنکھیں ان سے التجا کرتیں۔

”کیا کچھ نہیں کیا تھا اس کے لیے۔ باپ سے چھپ کر کون کون سی فرمائشیں پوری نہیں کی تھیں میں نے۔“ بڑی اماں منہ پر دوپٹہ رکھ کر جو رونا شروع کرتیں تو چپ کرانا محال ہو جاتا۔

”خود جھگڑ کراتنی دور ایڈمیشن کروایا یونیورسٹی میں اور اس نے خاک ڈال دی ہمارے سروں پر۔“ ان کے سارے دکھ ایک ساتھ جاگ اٹھتے۔

”اللہ جانے کون لڑکا تھا‘ کس خاندان کا تھا۔ کچھ پتا ہوتا تو تحقیق ہی کروا لیتے۔“ بوا رحمت نے بھی سرد آہ بھری۔

”اب تو جیسا بھی چوڑا چمار ہو‘ اسی کے ساتھ منہ کالا کرے اپنا۔“ بڑی اماں جل کر بولیں۔

”خیر اب چوڑے چمار سے تو شادی کرنے سے رہی وہ‘ اتنی بھی پاگل نہیں ہے۔“ بوا نے سنجیدگی سے لقمہ دیا۔

”دیکھ لینا بوا‘ چاہے شہزادہ ہی کیوں نہ ہو لیکن ماں باپ کی آہوں پر رکھے گئے گھروں کی بنیادیں زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتیں۔“ انہوں نے بے دردی سے اپنی نم آنکھوں کو صاف کیا۔

”اللہ کسی آزمائش سے بچائے۔“ بوا کا دل دہل گیا۔

”دیکھ لینا ایک کے بجائے دو دو بیٹیاں پیدا ہوں گی‘ تب اسے احساس ہو گا میرے جذبات کا۔“ انہوں نے دکھی دل سے آہ بھری۔

تیمور نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور بینش کے بار بار دروازہ کھٹکھٹانے پر بھی اندر سے کوئی آواز نہیں آتی تھی۔ اس ساری صورت حال نے بینش کو وقتی طور پر بوکھلا دیا تھا۔ ڈیزی کے گھر سے جانے کی ساری خوشی ملیا میٹ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس ساری صورت حال میں بندیا لحہ لحہ بڑی اماں کے ساتھ تھی۔ طیبہ تو اپنی میڈیکل کی پڑھائی میں مگن ہو گئی تھی اور تیمور نے اپنی سیٹ کچھ ہفتے اور آگے کروالی تھی۔ وہ ان حالات میں اپنی ماں کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ جب کہ بڑے ابا تو سارے خاندان سے خفا ہو گئے تھے۔ انہوں نے سرد مہری اور خاموشی کی چادر اوڑھ لی تھی۔

وہ اسپتال سے آکر اپنے کمرے تک محدود ہو جاتے اور ان کے کمرے میں صرف بینش اور آغا جی کو جانے کی اجازت تھی۔ آج کل تو بینش بھی تیمور کے رویے کی وجہ سے کافی پریشان تھی‘ اسی لیے دن میں ایک دو دفعہ چکر لگا جاتی اور یہ نے اوپر اوپر سے بڑی اماں سے

افسوس کا اظہار بھی کرلیا تھا' یہ اور بات کہ انہیں بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ تیمور کے رویے سے گھبرا کر بینش نے کچھ دن کے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اس دن بھی بندیا خاموشی سے پچھلے صحن کے برآمدے میں رکھے لکڑی کے تخت پر آکر بیٹھ گئی۔ بڑی اماں کی متورم آنکھوں کو دیکھ کر اس کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ بوا رحمت ان کے پاس بیٹھیں ان کا سر دبا رہی تھیں۔

"بوا! اتنی وحشت تو اس وقت بھی نہیں ہوئی تھی جب آغا نے عین شادی کے دن میری بہن کے گھر بارات لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔" بڑی اماں کی بات پر بندیا زبردست انداز میں چونکی۔

"وہ بھی تو قیامت کا دن تھا بیگم صاحبہ!" بوا رحمت رنجیدہ ہوئیں۔

"ڈیزی نے تو میری کمر ہی توڑ دی۔ کیسے چن کر اس کا نام رکھا تھا میں نے بختاور' اور وہ کتنی بدنصیب نکلی۔" وہ بے آواز رونے لگیں۔

"تائی اماں! پلیز بس کریں نا۔" بندیا نے ہلکا سا جھجک کر انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"اولاد کی خودسری ماں باپ کو وقت سے پہلے مار دیتی ہے بیٹا' مت پوچھو' کس جہنم میں جل رہی ہوں میں۔" تائی اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بندیا نے افسردگی سے سر ہلایا' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس زبان میں انہیں تسلی دے۔

"اماں' شفیق چچا آئے ہیں آپ سے ملنے۔" طیبہ افسردہ انداز میں چلتی ہوئی وہاں پہنچی۔

"لو! جلال صاحب پھر میری تربیت میں کمی کا کھاتہ کھول کر بیٹھ جائیں گے۔" وہ تلخ لہجے میں کہتی ہوئی ان سے ملنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"خاندان والے بھی تو سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہے' جس کو دیکھو چسکے لینے کے لیے آرہا ہے۔" بوا رحمت کو غصہ آیا۔

"بوا جب اپنی ہی جھولی میں چھید ہوں تو دوسروں سے کیا گلہ۔" ان کا لہجہ نم ہوا۔

"میری مانیں تو بڑے صاحب سے مت ملوایے گا انہیں۔" بوا رحمت نے فوراً مشورہ دیا۔

"وہ ابا کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔" طیبہ نے منہ بنا کر اطلاع دی تو بوا رحمت کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی۔ طیبہ اپنی ماں کے ساتھ اندر کی طرف بڑھ گئی' اب وہاں صرف بندیا اور بوا رحمت بیٹھی تھیں۔

"بوا رحمت! ایک بات پوچھوں۔؟" بندیا نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

"ڈیزی بیٹا کے بارے میں مت پوچھنا' یقین مانو کلیجہ جل جاتا ہے۔" بوا بدلحاظ ہوئیں۔

"نہیں نہیں بوا' ان کے بارے میں نہیں ہے۔" اس نے بوکھلا کر وضاحت دی۔

"اچھا' پھر پوچھو۔" انہوں نے اپنا پاندان کھول دیا۔

"بوا بینش کے بابا نے تائی اماں کی بہن سے شادی

سے انکار کیوں کیا تھا؟" اس نے محتاط انداز میں دریافت کیا۔

"عشق کا بھوت جو سوار تھا ان پر۔" بوا نے مختصر جملے میں جواب دیا۔

"پھر شادی والے دن ہی کیوں انکار کیا؟" وہ الجھن بھرے انداز میں گویا ہوئی۔

"پہلے تو بڑے بھائی اور بھاوج کے لحاظ میں چپ رہے، ہم سمجھے کہ بینش کی ماں کے عشق کا بھوت اتر گیا ہے، لیکن عین بارات کے دن انکار کر دیا۔ مت پوچھو، کتنی جگ ہنسائی ہوئی پورے خاندان کی۔" وہ افسردہ ہوئیں۔

"کیسی تھیں اس کی والدہ...؟" بندیا نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"مطلقہ عورت تھی اور ایک پانچ سال کا بیٹا بھی تھا اس کا، جو اس نے چھوٹے صاحب کی محبت میں چھوڑ دیا۔" بوا رحمت کی بات پر اسے دھچکا لگا۔ وہ ہکابکا انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگی جو مزید انکشاف کر رہی تھیں۔

"اور سچ پوچھو، شکل و صورت تو اللہ نے بنائی ہے، اس میں کیا نقص نکالنا، لیکن مزاج بھی سوا نیزے پر رہتا تھا اس کا۔" انہوں نے مزید اسے حیران کیا۔

"تو بیا کا بھائی کہاں رہتا ہے؟" بندیا نے حیرانی سے پوچھا۔

"ماں سے سخت نفرت کرتا تھا۔ اس لیے باپ کے ساتھ باہر چلا گیا اور پھر کوئی خبر نہیں ملی اس کی۔" انہوں نے چھالیہ کترتے ہوئے لاپروائی سے بتایا۔

"اسی وجہ سے ان کی تائی اماں کے ساتھ نہیں بنی؟" اسے کچھ معاملہ سمجھ میں آ ہی گیا۔

"بڑی بیگم صاحبہ نے تو دل بڑا کر ہی لیا تھا، لیکن اس کی ماں کا مزاج بہت عجیب تھا۔ بہت اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتی تھی وہ۔"

"وہ کیسے؟" تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ان کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گئی۔

"سب سے پہلے تو اس نے اس گھر میں آنے کے بعد بڑے صاحب کو قابو کیا، انہیں بچوں اور بیگم صاحبہ کی طرف سے بدگمان کیا، حالانکہ وہ تو بینش کی والدہ سے بہت بری طرح چڑتے تھے، لیکن جلد ہی اس کی باتوں میں آ گئے۔ رہی سہی کسر بینش کی پیدائش کے بعد پوری ہو گئی۔" انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

"لیکن وہ ایسا کیوں کرتی تھیں؟" بندیا کو اب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

"دماغ کی خرابی۔" انہوں نے منہ بنایا۔ "اسے لگتا تھا کہ ساری دنیا اس کی دشمن ہے۔ سارے خود ساختہ وہم پال رکھے تھے اس عورت نے۔"

"آغا جی نے کبھی نہیں سمجھایا انہیں...." اس کے ذہن میں سوال ابھرا۔

"وہ بے چارے تو شادی کے کچھ ہی عرصے کے بعد پچھتانے لگے تھے، لیکن بینش کی پیدائش کے بعد مجبور ہو گئے۔ وہ تو اللہ کا کرنا ایسا ہوا، اس عورت کی زندگی ہی کم تھی، لیکن اس مختصر عرصے میں جو اس نے اپنی بیٹی کے ذہن میں زہر بھرا، وہ ساری زندگی کے لیے کافی تھا۔" بوا رحمت کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

یہ ساری تفصیل جان کر بندیا کا دل بھی رنجیدہ ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ بینش کی والدہ شدید قسم کے عدم تحفظ کا شکار تھیں اور انہیں لگتا تھا کہ وہ زبردستی اس گھر میں آئی ہیں اور کہیں ان سے یہ گھر اور ان کا مقام چھین نہ لیا جائے، اس لیے انہوں نے اس گھر کے سربراہ ڈاکٹر جلال کو قابو کرنے کے لیے انہیں باقی گھر والوں سے بدگمان کر دیا اور رہی سہی کسر ڈیزی اور تیمور کی خود سری نے پوری کر دی۔ جس کے نتیجے میں جلال صاحب اپنے سارے ہی بچوں سے دور ہوتے گئے۔ اسی وجہ سے اب اس گھر میں صرف بینش کی اہمیت تھی۔ جس کا وہ اکثر ناجائز فائدہ اٹھاتی نظر آتی تھی۔ بندیا کو یہ ساری حقیقت جان کر دکھ ہوا۔



"تم نے نئے سیریل کا کنٹریکٹ سائن کر لیا؟" رباب ہکابکا انداز میں شانزے کا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے لگا

جیسے اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے' جبکہ شانزے اس کے چہرے پر پھیلی ناگواری اور پریشانی سے نظریں چرائے اپنا اسکرپٹ پڑھنے کی اداکاری کرنے لگی۔

"تو کیا ہوا۔" اس نے دانستہ لاپروائی سے کہا۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟" رباب نے آگے بڑھ کر اس سے غصے سے اسکرپٹ چھینا۔

"اس میں دماغ کی خرابی کی کیا بات ہے۔" شانزے تھوڑا سنبھل کر گویا ہوئی۔

"تم نے ماہیر بھائی سے وعدہ کیا تھا کہ تم نیکسٹ ٹائم کوئی ایسا کام نہیں کروگی۔" رباب نے ناگواری سے اسے یاد دلایا۔

"وہ میری بے وقوفی تھی۔" وہ ڈھٹائی سے اس کے ناراض چہرے کو دیکھنے لگی۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے وعدہ خلافی کرتے ہوئے۔" رباب نے غصے سے اسکرپٹ بیڈ پر پھینکا۔

"وہ خود تو انگلینڈ جاکر بیٹھ گیا ہے اور چاہے ساری زندگی واپس نہ آئے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"وہ کیوں واپس نہیں آئے گا بھلا؟" رباب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک آدھ تھپڑ گھما کر اس بے وقوف لڑکی کو لگا دے۔ جو اپنے بے صبرے پن اور جذباتیت سے چیزوں کو خراب کرنے پر تل گئی تھی۔

"پندرہ دن ہوگئے ہیں اسے گئے ہوئے اور صرف ایک دفعہ کال کی ہے اس نے مجھے۔" وہ ناراضی سے بستر پر بیٹھ گئی۔

"کوئی فنکشن اٹینڈ کرنے نہیں گیا وہ۔" اس نے طنزیہ انداز میں اسے یاد دلایا۔

"پتا ہے مجھے اس کے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" شانزے نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

"تم بہت بے حس اور فضول لڑکی ہو۔ تم سے تو بات کرنا ہی بے کار ہے۔" رباب جیسی ٹھنڈے مزاج کی لڑکی بھی بری طرح تپ گئی۔ وہ ناراضی سے کمرے سے نکل گئی جب کہ شانزے کا دل لمحہ بھر کو پریشان ہوا اور اس کے بعد اس نے خود کو سنبھال کر اپنا اسکرپٹ اٹھایا اور پڑھنا شروع کردیا۔ ان دنوں سرمد بھی کسی پراجیکٹ میں مصروف تھا۔ اس لیے اسے شانزے کی مصروفیت کا اندازہ نہیں ہوسکا' وہ کچھ گھنٹوں کے لیے آفس جاتی اور پھر اس نے ایک مہینے کی چھٹی لے لی' وہ جلد از جلد اپنے ڈرامے کی ریکارڈنگ کروانے میں مصروف تھی۔ اس دن اس کا آخری شوٹ تھا' جب سیریل کے ڈائریکٹر کے ساتھ سرمد کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا' وہ بھی گولی کی طرح اڑتے ہوئے اس کے قریب پہنچا۔

"تم یاور کا سیریل کررہی ہو اور تم نے بتایا تک نہیں۔" اس کے لہجے سے خفگی جھلکی۔

"وہ سرمد بھائی! میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔" شانزے نے جلدی سے بات بنائی۔

"تمہیں پتا ہے' ماہیر اس بات کو سخت ناپسند کرے گا۔" وہ حد درجہ سنجیدگی سے اس کا بدلا بدلا سا روپ دیکھ رہا تھا۔

"حالانکہ کرنا تو نہیں چاہیے۔" شانزے نے بے نیازی کی انتہا کی۔

"لیکن تمہیں کم از کم مجھے تو بتانا چاہیے تھا۔" وہ اس پر ناراض ہوا۔

"کہا نا کہ میں آپ کو سرپرائز دینا چاہتی تھی۔" اس نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"یہ میرے لیے بھی کوئی خوشی کی خبر نہیں ہے شانزے۔" سرمد کی ناراضی پر وہ تھوڑا بے چین ہوئی۔

"آئی ایم سوری بھائی۔" اس کی معذرت بھی سرمد کا موڈ بحال نہیں کرسکی تھی تب ہی تو وہ ہنوز سابقہ لہجے میں بولا۔ "انی ہاؤ' بیسٹ آف لک۔ میں چلتا ہوں اب۔" وہ اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اپنی گاڑی کی طرف پلٹ گیا۔

شانزے اب ٹھیک ٹھاک پریشانی کا شکار ہوچکی تھی' اسی لیے وہ اپنے کام پر بھی پوری توجہ نہیں دے پارہی تھی۔ وہ ڈائریکٹر سے معذرت کرکے ہاسٹل چلی آئی' جہاں ایک اور پریشان کن خبر اس کی منتظر تھی۔ وارڈن نے اسے ہاسٹل خالی کرنے کی وارننگ دے دی تھی' وہ ایم ایس میں ایڈمیشن لے کر یہاں موجود تھی۔

ڈیپارٹمنٹ سے بھی اس کا نام خارج کر دیا گیا تھا۔

"اب کیا ہوگا رباب۔۔۔؟"

"ہاسٹل تو تمہیں خالی کرنا ہوگا کیونکہ وارڈن کو پتا چل گیا ہے کہ تم شوبز جوائن کر چکی ہو۔" رباب اپنی ساری خفگی بھلائے اب اس کے ساتھ اپ سیٹ تھی۔

"لیکن میں تو ایک سال کے ڈیوز ادا کر چکی ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"وارڈن کو اس چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا اگر تم کہتی ہو تو ہم دونوں دوبارہ اس سے بات کرتے ہیں۔" رباب نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی۔ وہ بادل نخواستہ اس کے ساتھ وارڈن کے آفس چلی آئی لیکن اتنی زیادہ بحث کا صرف اتنا فائدہ ہوا تھا کہ وارڈن نے اسے پندرہ دن کی مہلت دے دی تھی۔

"تم سرمد بھائی سے بات کرو نا وہ جو تم نے پہلے ڈی ایچ اے میں ایک فلیٹ لیا تھا کرائے پر۔" رباب نے اسے یاد دلایا۔

"وہ تو ان سے ایڈوانس واپس لے کر ایگری منٹ ختم کر دیا تھا کیونکہ فلم جو کینسل ہو گئی تھی میری۔" اس نے رنجیدگی سے بتایا۔

"دوبارہ بھی تو مل سکتا ہے نا تم بات تو کرو سرمد بھائی سے۔" رباب کے اصرار بھرے انداز پر اس نے آنکھیں چرائیں۔ رباب کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

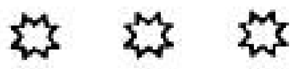
"تم کال کیوں نہیں کر رہی ہو انہیں۔۔۔؟" وہ الجھن کا شکار ہوئی۔

"وہ خفا ہیں مجھ سے۔۔۔" شانزے کی بات پر اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں نے سیریل میں کام کرنے کا بتایا جو نہیں تھا انہیں۔"

"یہ ناراضی تو ان کا حق بنتی ہے تم بھی تو بے وقوفیاں کرتی پھرتی ہو۔" وہ منہ بنا کر شانزے کے پاس بیٹھ گئی۔

"لیکن اس کے باوجود میں انہیں کال کروں گی تو وہ ہیلپ ضرور کریں گے میری۔۔۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"ظاہری سی بات ہے ساری دنیا تمہاری طرح بے وفا اور بے مروت تھوڑی ہوتی ہے۔" رباب کے دل جلے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دی۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور سرمد کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔



بڑی اماں کے جانے کے بعد اوریدا نیلی کوٹھی میں ہی تھی۔ بوا رحمت نے زبردستی اسے یہیں روک لیا تھا۔ دوسری طرف ارصم کے گھر میں اس کے کزن کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور وہ کافی مصروف نظر آتا تھا۔ اس کی یہ مصروفیت اوریدا کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔

"تم تو ایسے مصروف ہو گئے ہو جیسے تمہاری کزن کی نہیں تمہاری شادی ہو۔" اس دن وہ ان کے پورشن میں آیا تو اوریدا نے جھٹ سے گلہ کر دیا۔ وہ میز پر رات کا کھانا لگا رہی تھی۔ ارصم اس کے چڑنے پر بے ساختہ مسکرایا۔

"اپنی شادی تو میں بہت سادگی سے کروں گا۔" اس نے سلاد کی پلیٹ سے کھیرا اٹھاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں جیسے آنٹی بینش تو مان ہی جائیں گی۔" اوریدا نے اسے ڈرایا۔

"شادی میری ہے اور اس میں وہی سب کچھ ہوگا جو میں چاہوں گا۔" وہ پُراعتماد انداز میں بولتا ہوا بینش کے چھکے چھڑا گیا جو اس وقت شادی کارڈ لیے بڑے ابا کو ڈھونڈتی ہوئی ادھر آ نکلی تھیں۔ ان کے خیال کے مطابق تو اوریدا ہاسٹل میں تھی لیکن اسے سامنے دیکھ کر انہیں ناگواری کا جھٹکا لگا۔

"السلام علیکم بینش آنٹی۔۔۔" اوریدا نے بوکھلا کر انہیں سلام جھاڑا۔

"تایا ابا کدھر ہیں؟" انہوں نے سلام کا جواب دیے بغیر ناگواری سے پوچھا۔

"اتنے سال ہو گئے بیٹا کیا ابھی تک نہیں پتا چلا بڑے صاحب اس وقت مطالعہ کرتے ہیں۔" بوا

رحمت کے طنزیہ انداز پر ان کا چہرہ سرخ ہوا۔

"بہت اچھی طرح سے پتا ہے مجھے' اس لیے بتانے کی ضرورت نہیں۔" وہ چڑ کر بولیں۔

"ممی! کوئی کام تھا کیا بڑے ابا سے..." ارصم نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

"میرے کاموں کو چھوڑو اور ارسلہ کو پار لرلے کر جاؤ' وہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے تمہیں۔" انہوں نے ناگواری سے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔

"آئی ایم سوری ممی' کوئی اور کام ہے تو بتادیں' یہ خواتین والے کام میں نہیں کر سکتا' آپ ڈرائیور کے ساتھ بھجوا دیں اسے۔" ارصم کے دوٹوک انداز پر وہ تھوڑا سا جھنجلائیں' لیکن انہوں نے خود پر قابو پا ہی لیا۔

"ٹھیک ہے پھر جونی کے ساتھ جا کر اس کی شاپنگ کروا آؤ۔" انہوں نے ایک اور کام سوچ کر بتایا۔

"وہ تو کب کا جا چکا اپنے فرینڈز کے ساتھ..." ارصم ڈائننگ میز کی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔ بینش کے اعصاب تن گئے۔

"اچھا' میں تایا ابا سے مل کر آرہی ہوں' پھر مجھے اپنی آنٹی صوفیہ کی طرف لے جاؤ' انہیں شادی پر انوائٹ کرنا ہے۔" وہ ہر حال میں اسے یہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں اور بڑی مشکل سے ایک معقول بہانہ انہیں سوجھ ہی گیا تھا۔

"ٹھیک ہے آپ بڑے ابا سے مل کر آئیں' میں اتنی دیر میں کھانا کھالوں' سخت بھوک لگی ہے۔" وہ بے تکلفی سے کہتا ہوا کھانا پلیٹ میں نکال چکا تھا۔

"بوا! دو کپ کافی کے تایا ابا کی اسٹڈی میں بھجوادیں۔" انہوں نے بے زار لہجے میں فرمائش کی' کچھ بھی تھا' وہ اپنے بیٹے کو کھانے کی میز سے نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ بوا رحمت سر ہلا کر کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

دس منٹ کے بعد انہوں نے ایک چھوٹی ٹرے میں دو کپ رکھ کر اوریدا کے ہاتھ اسٹڈی میں بھجوا دیے۔ وہ بڑے محتاط انداز میں ان کی اسٹڈی کی طرف بڑھی اور جیسے ہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا' اندر سے آتی بینش کی بلند آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"بڑے ابا! ارسلہ کے رشتے میں برائی کیا ہے آخر؟ مجھے تو ارصم کے لیے بہت سوٹ ایبل لگ رہی ہے۔" بینش کی بات نے اوریدا کا سارا سکون درہم برہم کر دیا۔

"برائی تو کوئی نہیں ہے' لیکن ارصم کے لیے کوئی اسی کے پروفیشن کی لڑکی ہونی چاہیے۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوئے۔

"رہنے دیں تایا ابا! ڈاکٹر لڑکیاں کہاں گھر سنبھال سکتی ہیں۔" وہ بے مزا ہو کر بولیں۔

"لیکن کچھ عرصہ پہلے تک تو تم ارصم کے لیے کسی ڈاکٹر کی ہی تلاش میں تھیں' اب بیٹھے بٹھائے کیا ہوا؟" بڑے ابا کو حیرانی ہوئی۔

"وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی سوچ اور خیالات بدل بھی تو جاتے ہیں۔" وہ ذرا سی شرمندہ ہوئیں۔

"بہرحال دیکھ لو اور ارصم سے پوچھ لو..." انہوں نے محتاط انداز میں مشورہ دیا۔

"ارصم سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے' وہ میرا بیٹا ہے اور وہی کرے گا جو میں چاہوں گی۔" ان کے لہجے سے چھلکتا زعم اور اعتماد بڑے ابا کے زخموں کے کئی ٹانکے ایک ساتھ ادھیڑ گیا۔

"ہاں بھئی! تم اور حماد خوش قسمت ہو' جنہیں اتنی فرمانبردار اور نیک اولاد ملی۔" ان کے لہجے میں کئی حسرتیں ایک ساتھ چھلکیں۔ اس سے زیادہ سننا اوریدا کے لیے مشکل تھا' تب ہی وہ ہلکا سا دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئی' وہ دونوں اسے دیکھ کر دانستہ خاموش ہو گئے۔ اس نے بھی آہستہ سے ٹرے میز پر رکھی اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ جیسے ہی ڈائننگ روم میں پہنچی' اس کا دھواں دھواں سا چہرہ ارصم کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

"کیا ہوا' بڑے ابا نے ڈانٹا ہے کیا؟" ارصم نے بے ساختہ پوچھا۔

"نہیں تو۔" اوریدا نے لاشعوری طور پر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"پھر اتنی بوکھلائی ہوئی کیوں ہو؟" وہ کھانا چھوڑ کر جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا' وہ بوکھلا گئی۔ "کیا مصیبت ہے' ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہوں' ایسی کیا بات ہے' جس کی وجہ سے تمہارے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے؟" اس نے مزے سے کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے' تم یہ کباب کھاؤ اور بتاؤ ہاسٹل کب جاؤ گے؟" اوریدا نے بات کا رخ تبدیل کیا۔

"ہوسٹل تو اب شادی کے بعد ہی جاسکوں گا۔ سنڈے کو ولیمہ ہے۔" وہ ایک دفعہ پھر افغانی پلاؤ اپنی پلیٹ میں نکالتے ہوئے مزید بولا۔ "تمہارا کب تک ارادہ ہے؟ شادی اٹینڈ کرو گی کیا؟"

"شادی اٹینڈ کرنا تو مشکل ہے' پھر عدینہ کی بار بار کالز آرہی ہیں وہ اکیلی بور ہو رہی ہے ہاسٹل میں۔" اوریدا نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا ذہن ابھی تک بینش آنٹی کی بات میں الجھا ہوا تھا۔

"تو یہ کون سا مشکل ہے' تم عدینہ کو بلوا لو یہاں۔ کچھ دن تمہارے ساتھ رہ لے' صبح اکٹھے چلے جایا کریں گے کالج۔" ارصم نے مفت مشورہ دیا' جسے سن کر وہ ایک دم پُرجوش ہو گئی۔

"ارے واہ' یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

تھوڑے ہی عرصے میں اسے عدینہ سے خاصی انسیت ہو گئی تھی اور پاکستان آنے کے بعد' وہ واحد لڑکی تھی جس کے ساتھ اس کی دوستی دنوں میں گہری ہوئی تھی۔

"ارے نہیں یار' امی اجازت نہیں دیں گی۔" اگلے دن کالج میں عدینہ نے اس کی بات سن کر فوراً" انکار کیا۔

"تم میری ان سے بات کرواؤ' میں پوچھ لیتی ہوں ان سے۔" اوریدا نے بے چینی سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"تم انہیں جانتی نہیں ہو' وہ بہت سخت مزاج خاتون ہیں۔" اس نے اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"تم جیسی نرم مزاج لڑکی کی ماں اتنی سخت ہو ہی نہیں سکتی۔" اسے یقین ہی نہیں آیا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی اور ویسے بھی داد دے ہم مجھے اپنے گھر کیوں لے جانا چاہتی ہو؟" عدینہ نے مسکرا کر اس کا پُرخلوص چہرہ دیکھا۔

"میں بڑے ابا کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی' جیسے ہی بڑی اماں واپس آجائیں گی' ہم دونوں ہاسٹل شفٹ ہو جائیں گے۔" اس کی بات پر عدینہ نے بے توجہی سے سرہلایا لیکن اوریدا کی اگلی بات نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی۔

"ہم دونوں سارے مشکل ٹاپک بڑے ابا سے سمجھ لیں گے' وہ ہماری کافی ہیلپ کرسکتے ہیں۔"

"تو' خود تو تم ان سے اتاؤڑتی ہو اور اب اپنے ساتھ مجھے بھی پھنسواؤ گی۔" عدینہ اس کے متعلق کافی کچھ جان چکی تھی۔

"اسی لیے تو تمہیں ساتھ لے جانا چاہ رہی ہوں' بڑے ابا کو ذہین لوگ بہت اٹریکٹ کرتے ہیں۔" اس نے ہنس کر بتایا تو وہ بھی مسکرا دی۔

"بہت تیز ہو گئی ہو تم۔" عدینہ نے تبصرہ کیا۔

"بس تم اپنی امی کا نمبر ملا کر دو' میں ان سے بات کرتی ہوں۔" عدینہ نے اس کے پُرزور اصرار پر صالحہ بیگم کا نمبر ڈائل کر کے سیل اسے پکڑا دیا تھا۔

اور خود کوریڈور کے کونے میں کھڑی اپنی دوسری کلاس فیلو کی طرف بڑھ گئی' اسے یقین تھا کہ صالحہ بیگم کسی صورت نہیں مانیں گی' اور وہ اوریدا کے چہرے پر پھیلی افسردگی سے بچنا چاہتی تھی۔ اوریدا سیل فون کان سے لگائے تھوڑے کم رش والی جگہ پر چلی گئی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ خاصی پُرجوش تھی۔

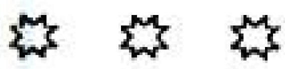
"تو تم خوامخواہ ڈرا رہی تھیں مجھے' تمہاری امی تو اتنی آسانی سے مان گئیں۔" اوریدا کی بات پر اسے خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" اسے بالکل بھی یقین نہیں آیا' تب ہی تو اس نے فوراً" ہی آپا صالحہ کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف وہ اپنی آواز سے اسے کچھ نڈھال سی

لگیں۔
"ہاں ہاں میں نے ہی کہا ہے اسے کہ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے۔ اچھا ہے اس کے دادا سے کچھ پڑھ لوگی تم بھی۔" آپا صالحہ نے اسے مزید حیران کیا۔
"ویسے بھی ان کے گھر میں کون سا کوئی اور بندہ رہتا ہے' صرف دادا اور پوتی ہی تو ہیں۔" آپا صالحہ کو اوریدا کافی معلومات دے چکی تھی۔
"آپا' کیا میں واقعی چلی جاؤں؟" عدینہ نے دوبارہ تصدیق کے لیے پوچھا۔
"ہاں ہاں چلی جاؤ کچھ دن کے لیے' لیکن خیال سے رہنا اور سارا دھیان پڑھائی پر دینا۔" وہ اسے نصیحت کرنا نہیں بھولی تھیں۔
اوریدا کے ساتھ ہاسٹل اور پھر وہاں سے پیکنگ کرتے ہوئے بھی عدینہ کو دھڑکا سا لگا رہا کہ آپا صالحہ ابھی فون کرکے اسے منع کردیں گی' لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور وہ شام میں اوریدا کے ساتھ نیلی کوٹھی پہنچ گئی۔ اس نے توصیفی نگاہوں سے مارگلہ کی پہاڑیوں کے عین سامنے بنے اس خوب صورت بنگلے کو دیکھا۔ پورچ میں ہی اس کی اور اوریدا کی ڈاکٹر جلال سے سرسری سی ملاقات ہوگئی تھی۔ ارصم بھی ان کے ساتھ تھا' تب ہی بڑے ابا رک گئے تھے۔
"بڑے ابا' یہ عدینہ ہے' اوریدا کی روم میٹ اور فرینڈ' کچھ دن یہیں رہے گی۔" اس نے عجلت بھرے انداز میں تعارف کروایا تو عدینہ نے جھٹ سے انہیں سلام کردیا' انہوں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اوریدا کے ساتھ کھڑی لڑکی پر ڈالی اور چونک گئے۔
"مجھے بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا' میں خود بھی بہت اچھی میڈیکل اسپیشلسٹ بننا چاہتی ہوں۔" عدینہ کا پُراعتماد انداز انہیں حیرانی میں مبتلا کرگیا۔
"اللہ آپ کو کامیاب کرے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے اور ڈرائیور نے جیسے ہی گاڑی پورچ سے نکالی' اوریدا کے حلق سے ایک پُرسکون سانس خارج ہوئی۔ گھر میں بوا رحمت نے ان کا استقبال بڑے پُرجوش انداز میں کیا تھا۔ وہ عدینہ کی آمد سے خاصی خوش تھیں۔ بڑی اماں کو گئے ہوئے بیس دن ہوچکے تھے۔ اور سب ہی لوگ ان کی کمی بہت زیادہ محسوس کررہے تھے۔
"یہ ارصم کی والدہ کچھ عجیب سی نہیں ہیں۔" رات کو اوریدا کے ساتھ لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے عدینہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ رک گئی۔ آج شام میں ہی آنٹی بینش کے ساتھ اس کا بھی ٹاکرا ہوگیا تھا۔ وہ کسی کام سے بڑے ابا کے پاس آئی تھیں اور انہوں نے ٹی وی لاؤنج میں اوریدا کے ساتھ بیٹھی عدینہ کو کوئی لفٹ نہیں کروائی تھی بلکہ اس کے سلام کا جواب بھی لاپروائی سے بس سرہلا کردیا تھا اور پھر بڑے ابا کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
"ان کا مزاج خاصا ڈفرنٹ ہے۔" اس نے محتاط انداز میں جواب دیا۔
"جو لوگ منفی عادات کے حامل ہوتے ہیں ان کے وجود سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو سامنے والے انسان کو بھی عجیب سا احساس دلاتی ہیں' ان خاتون سے مل کر مجھے ایسے ہی فیل ہوا تھا۔" وہ بے تکلف انداز میں تبصرہ کررہی تھی۔
"ارصم کے سامنے ایسا کچھ مت کہنا' وہ ہرٹ ہوگا۔" اوریدا نے گھبرا کر کہا۔
"تم نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے کیا؟" وہ برا مان گئی۔
"ارے نہیں نہیں' میں تو یونہی کہہ رہی تھی' کبھی کبھی بندہ روانی میں بھی تو کمنٹ پاس کردیتا ہے۔" اس نے فوراً اپنی بات کی وضاحت کی۔
"ٹینشن مت لو' میں روانی میں بھی سوچ سمجھ کر ہی بات کرتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ وہ دونوں واک کرکے اندر آگئی تھیں اور اب لاؤنج میں اپنی کتابیں کھولے بیٹھی تھیں۔ ایک ٹاپک دونوں کی ہی سمجھ سے باہر تھا۔ بڑے ابا نے لاؤنج میں آتے ہی دونوں کو اپنی کتابوں پر جھکے پایا' وہ اس وقت ٹی وی پر نیوز سننے کے لیے آئے تھے اور اب شش و پنج کا شکار تھے۔

عدینہ کی ان پر نظر پڑی تو اس نے فوراً ہی سلام کردیا۔
"آپ کوئی وی دیکھنا ہے کیا۔" عدینہ نے جھٹ سے اندازہ لگایا تو انہوں نے سرہلادیا۔
"اگر آپ برانہ مانیں تو فری ہو کر ہمیں ایک ٹاپک سمجھادیں گے۔" وہ عدینہ کی فرمائش پر حیران ہوئے جبکہ اوریدا ہکابکا انداز میں اپنی دوست کا چہرہ دیکھ رہی تھی جو بے تکلفی سے بڑے ابا سے مخاطب تھی۔
بڑے ابا نے ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی چلایا اور خبریں سننے لگے، دس منٹ کے بعد جب وہ دونوں ہی مایوس ہوگئی تھیں، انہوں نے ٹی وی کی آواز بند کرکے کتاب مانگی اور انہیں پڑھانے لگے۔ لاؤنج میں داخل ہوتی بوا رحمت نے یہ منظر خاصی دلچسپی سے دیکھا۔
اوریدا کو پہلی دفعہ پتا چلا تھا کہ بڑے ابا کا پڑھانے کا انداز بہت زبردست تھا، وہ خاموشی سے انہیں سن رہی تھی جبکہ عدینہ کے سوال و جواب کی وجہ سے پڑھائی کا سیشن خاصا لمبا ہوگیا تھا۔ بڑے ابا کو عدینہ کے سوالات اچھے لگ رہے تھے اور ڈیڑھ گھنٹے کی ڈسکشن کے بعد عدینہ انہیں متاثر کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی تھی۔
"آپ کی فیملی میں کوئی اس پروفیشن میں ہے کیا؟" بڑے ابا نے اچانک ہی اس سے پوچھا۔
"نہیں، میں اپنے خاندان کی پہلی لڑکی ہوں۔" اس کے فخریہ لہجے پر وہ ہلکا سا مسکرائے۔ ان کے سامنے عدینہ تھی، جو کلاس روم میں اپنے بڑے بڑے پروفیسرز کے چھکے چھڑادیا کرتی تھی۔
"آپ پیڈز کارڈک سرجری (Pedis cardiac surgery) میں اسپیشلائزیشن کیجئے گا۔" انہوں نے لاؤنج سے اٹھتے ہوئے اسے مشورہ دیا تو وہ مسکرادی۔
"تھینک یو سر! لیکن میری والدہ کی خواہش ہے کہ میں ایک اچھی میڈیکل اسپیشلسٹ بنوں۔" عدینہ نے اپنی مجبوری بتائی۔
"ایز یو وش، لیکن اس شعبے میں محنتی اور ذہین لوگ کم ہیں، آپ انہیں کنوینس کریں گی تو وہ مان جائیں گی۔" بڑے ابا اوریدا کو حیران کررہے تھے۔

"جی ضرور، میں ان کو آپ کی رائے سے ضرور آگاہ کروں گی، مجھے امید ہے وہ مان جائیں گی۔" عدینہ نے خوش گوار لہجے میں انہیں تسلی دی۔
"مائی گاڈ، تم نے بڑے ابا پر کیا پڑھ کر پھونکا تھا، مجھ سے تو انہوں نے کبھی ایسے بات نہیں کی۔" رات کو کمرے میں آتے ہی اوریدا نے کھل کر اپنی حیرانی کا اظہار کیا اور عشاء کی نماز سے فارغ ہوتی عدینہ نے مسکرا کر جائے نماز تہہ کی۔
"تم نے میری امی پر کیا جادو کیا تھا، جو انہوں نے تم پر اعتبار کرکے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی۔" اس نے ہنستے ہوئے اسے الٹا جواب کیا۔
"وہ تو محبت کا جادو تھا، جو ہر کسی پر چل جاتا ہے۔" اوریدا نے شوخی سے کہا۔
"کسی کسی پر نہیں بھی چلتا۔" اس نے کندھے اچکا کر اس کی بات سے اختلاف کیا۔
"جن پر محبت کا جادو نہ چلے، ان پر بنگال کا کالا جادو کروادینا چاہیے۔" اوریدا کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ عدینہ کے آنے سے کافی خوش تھی اور اس کا اظہار اس نے بڑی اماں کو انگلینڈ فون کرکے بھی کردیا تھا۔ تیمور کی حالت کافی سنبھل گئی تھی، لیکن کسی نے بھی اوریدا کے سامنے ان کی بیماری کا ذکر نہیں کیا تھا، وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ بڑی اماں یونہی اس کے پاپا سے ملنے گئی ہیں۔



"اوریدا کے ساتھ کون لڑکی آئی ہوئی ہے" تایا ابا کی طرف۔" رات کو کھانے کے بعد بینش نے ارصم سے پوچھا وہ اس وقت آغا جی کے ساتھ شطرنج کی بازی سجائے بیٹھا تھا۔ جب کہ ان کے مہمان کسی اور رشتے دار سے ملنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔
"اوریدا کی کلاس فیلو ہے۔" ارصم نے لاپروائی سے جواب دیا۔
"کیا بہت ذہین لڑکی ہے؟" ان کے لہجے میں حسد کی آمیزش شامل ہوئی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟" ارصم چونکا' اس کا سارا دھیان اب اپنی ماں کی طرف تھا' جو بے زار سے انداز میں کھڑی تھیں۔

"تایا ابا' بڑی تعریفیں کررہے تھے۔" انہوں نے بادل ناخواستہ اصل بات بتائی۔

"ہاں میں بھی ملا ہوں' بہت جینئس لڑکی ہے وہ۔" آغاجی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"ایک تو آپ اور تایا ابا' ہرایرے غیرے سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ اب ایسے بھی کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے اس میں۔" وہ حسب عادت کسی اور کی تعریف سن کر چڑ گئیں۔

"ممی' وہ واقعی بہت لائق لڑکی ہے۔ میٹرک اور ایف ایس سی میں بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اس نے۔" ارصم نے ان کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"سوواٹ؟ تو تم کون سا کسی سے کم ہو۔ پوزیشن تو تمہاری بھی آتی ہے۔" انہوں نے جل کر جواب دیا۔

"تو میں اس کے ساتھ اپنا مقابلہ تھوڑی کررہا ہوں' آپ کو بتارہا ہوں۔" ارصم کو ان کے چہرے پر پھیلی بے زاری پریشان کرگئی۔

"بس بس رہنے دو۔ ادھر گئی تو تایا ابا' اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملارہے تھے اور ادھر آئی ہوں تو تم شروع ہوگئے۔" وہ ناگوار انداز میں اصل بات اگل گئیں اور ان کی بات سن کر ارصم اور آغاجی دونوں مسکرائے۔

"اب آپ لوگ کیوں مسکرارہے ہیں۔" ان کی تیوری کے بل گہرے ہوئے۔

"ہم ہنس اس بات پر رہے ہیں کہ تم خود ہی کسی بات پر ہماری رائے پوچھتی ہو اور اوپر سے تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اس پر تمہارا من پسند تبصرہ کریں تو یہ مشکل کام ہم نہیں کرسکتے بھئی' ہمیں معافی دو۔" آغاجی کی بات پر بینش نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس دیں۔ ان کا مزاج کچھ بہتر ہوچکا تھا۔

"آغاجی' وہ جو میں نے آپ کو کام کہا تھا' آپ نے کیا؟" بینش نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں اشارہ کرتے ہوئے گھما پھرا کر پوچھا۔

"نہیں' ایک دو دن میں کردوں گا۔" ان کے پُراسرار انداز پر ارصم چونکا۔ "آپ لوگ کس کام کی بات کررہے ہیں؟"

"کسی کی نہیں' اسپتال کا کوئی مسئلہ ہے۔" بینش نے بوکھلا کر جواب دیا تو ارصم اچھا خاصا مشکوک ہوگیا۔

"آغاجی! میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" وہ ارصم کی کھوجتی نگاہوں سے گھبرا کر لاؤنج سے نکل گئیں۔

"آغاجی' یہ آنکھوں آنکھوں میں کس بات کی طرف اشارے ہورہے تھے۔" اس نے آغاجی کو گھیرنے کی کوشش کی۔

"تو ہم تو آنکھوں' آنکھوں میں اس لیے اشارے کررہے تھے کہ تمہیں کانوں کان خبر نہ ہو۔" آغاجی قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"دیکھ لیں آغاجی' آپ میرے ساتھ فراڈ کریں گے اب!!" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔

"ایسا ممکن ہے بھلا۔" انہوں نے محبت بھری نگاہوں سے اپنے اکلوتے نواسے کو دیکھا' جو انہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔

"پھر بتائیں' یہ ممی کن چکروں میں ہیں؟" وہ بے تاب ہوا۔

"تمہارے سر پر سہرا سجانا چاہتی ہے تمہاری ماں۔" انہوں نے بھی اسی وقت بات کرنے کی ٹھانی۔

"ابھی میرے میڈیکل کے دو اور ہاؤس جاب کا ایک سال باقی ہے آغاجی۔" ارصم نے منہ بنا کر انہیں یاد دلایا۔

"تو کیا ہوا؟ تم نے کون سا گھر چلانا ہے۔" انہوں نے اس کا اعتراض چٹکی میں اڑایا۔

"گھر نہ سہی' گھر والی کو تو ٹائم دینا ہوگا نا' اتنی ٹف اسٹڈی میں' یہ کیسے ممکن ہے۔" وہ سنجیدہ ہوا۔

"تم ہاں کرو' سب کام ہوجائیں گے۔" وہ لاپروائی

سے گویا ہوئے۔

"یہ ممی کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی؟" وہ تھوڑا سا پریشان ہوا۔

"بھئی تمہاری پھپھو نے اپنی بیٹی ارسلہ کے لیے بات کی ہے ان سے۔" آغا جی نے اس کے سر پر بم پھوڑا۔

"کیا ارسلہ......؟" اسے ایک دم شاک لگا اور وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آغا جی، صاف منع کر دیں انہیں۔"

"تم کیسے انکار کر سکتے ہو بھلا......؟" بینش چائے کی ٹرے لیے اندر داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے چونک کر ان کے ناراض چہرے کو دیکھا۔ وہ ان کی بات کا مطلب سمجھ نہیں سکا تھا۔

"تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں تمہیں لاہور کی بجائے یہیں ایڈمیشن لے دوں تو تم میری ہر بات مانو گے۔" بینش کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری، ارصم کو ایک دم دھچکا سا لگا۔ اسے اپنے الفاظ اچھی طرح یاد تھے۔

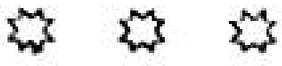
"آغا جی! آپ کو یاد ہے نا؟" انہوں نے فوراً پلٹ کر گواہی کے لیے آغا جی کو دیکھا، جو نظریں چرائے بیٹھے تھے۔ ارصم کو ساری دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی، وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بینش اس کے کہے ہوئے لفظوں کے جال میں اسے اس طرح پھنسا دیں گی۔

"لیکن میں ابھی فی الحال شادی افورڈ نہیں کر سکتا۔" اس نے سنبھل کر جواب دیا۔

"اس بات کو کہیں پر لکھ کر رکھ لو، تمہاری شادی جب بھی ہوگی، چاہے دس سال بعد، لیکن ہوگی میری مرضی سے۔" ان کے سفاک لہجے پر وہ تھوڑا سا جھنجھلا گیا۔

"لیکن ممی......" اس نے بولنے کی کوشش کی۔

"تم اگر انکار کرو گے تو خود کو ختم کر لوں گی میں۔" انہوں نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی، ارصم نے بوکھلا کر ان کی طرف دیکھا، ان کے چہرے پر چٹانوں سے بھی زیادہ سختی تھی۔ اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔



جوں جوں اس کی ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ بختاور کو فطری سی پریشانی لاحق ہوتی جا رہی تھی، اس نے بھی عام خواتین کی طرح پوری نمازیں باقاعدگی سے پڑھنا شروع کر دی تھیں اور ساتھ ساتھ اللہ سے ذہنی اور جسمانی طور پر صحت مند اولاد کی دعائیں بھی جوش و خروش سے کر رہی تھی۔ اس دن وہ ظہر کی نماز پڑھ رہی تھی جب ہاشم نے فلیٹ کی گھنٹی بجائی، اسے دروازہ کھولنے میں دیر ہو گئی تو وہ اس پر برس پڑا۔

"میں نماز پڑھ رہی تھی......" اس نے شرمندگی سے صفائی پیش کی۔

"ہاں فارغ لوگوں کو اور کام ہی کیا ہوتا ہے......" وہ بیزاری سے کہہ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے سرد لہجے پر وہ پریشان ہو گئی، اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا۔ وہ نماز بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ اس نے تو اسے کبھی جمعہ تک پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس بات نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دن اچانک ہی بختاور کو ہاشم کے بڑے بھائی کی بات نے ایک دم بے چین کر دیا۔ اگلے دن اس نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنی واحد دوست نیلم کو کال ملائی۔

"ہاشم کے بڑے بھائی، اس کے متعلق بہت عجیب سی باتیں کر رہے تھے۔" اس نے تفصیل سے ساری باتیں بتائی تھیں۔

"ارے یار! ایسا کیسے ممکن ہے، تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" دوسری طرف نیلم بھی اس کی بات سن کر گھبرا گئی تھی۔

"ہاں دل تو میرا بھی نہیں مانتا لیکن ہاشم آج کل جب اس طرح کی بات کرتا ہے تو دل خراب ہوتا ہے میرا۔" اس نے اپنی الجھن بیان کی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے یار! آج کل ینگ جنریشن، ماڈرن بننے کے چکر میں بھی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں

کرتی ہے اور بعد میں یہی مرد لمبی لمبی داڑھیاں رکھ کر حج اور عمرے کر کر کے اللہ سے اپنے گناہ بخشوانے چلے جاتے ہیں۔" نیلم نے اس کی پریشانی کو چٹکیوں میں اڑایا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو ناں....؟" اسے کچھ تسلی ہوئی۔

"ہاں نا اور خبردار ہاشم بھائی سے اس موضوع پر بحث کر کے لڑنا جھگڑنا نہیں۔" نیلم نے اسے پریشان لہجے میں فوراً" ہی نصیحت کی۔

"اور وہ جوان کے بھائی کہہ رہے تھے....." بختاور نے پریشانی سے یاد دلایا۔

"یار! خاندانوں میں سو مسئلے مسائل چل رہے ہوتے ہیں اور بہن بھائی غصے میں کیا کچھ نہیں کہہ دیتے ایک دوسرے کو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"یہ تو واقعی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" بختاور مطمئن ہوگئی تھی۔

"خوامخواہ ہی اپنا دماغ خراب کر رہی ہو' پتا ہے ناں' ایسی حالت میں اسٹریس لینا بالکل اچھا نہیں ہوتا۔" اس نے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا۔

"آئی ایم سوری یار....." وہ شرمندہ ہوگئی۔

"چلو' اب فون بند کرو اور سکون سے جا کر اپنا کام کرو' کال کافی لمبی ہوگئی ہے۔" نیلم سے بات کر کے اس کے دل کا بوجھ کافی ہلکا ہو گیا تھا۔

اس نے جلدی جلدی فون بند کیا اور کچن میں آکر کھانا گرم کرنے لگی' ہاشم کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ کھانا گرم کر کے فارغ ہوئی تھی کہ فلیٹ کی گھنٹی بج اٹھی' وہ مسکراتی ہوئی دروازہ کھولنے گئی' حسب توقع سامنے ہاشم ہی تھا وہ کچھ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"السلام علیکم....." بختاور نے جھٹ سے سلام کیا۔

"اعظم بھائی دوبارہ تو نہیں آئے۔" اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں' کیا آنا تھا انہوں نے.....؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں....." ہاشم سنجیدگی سے کہہ کر لاؤنج میں چلا آیا۔

"آپ نے مجھے ان سے ملوایا ہی نہیں' میں تو انتظار کرتی رہی....." اس نے گلہ کیا۔

"ہاں' وہ صبح کچھ جلدی میں تھے' اس لیے ناشتہ کیے بغیر نکل گئے۔" وہ صوفے پر بیٹھ کر اپنے ماتھے کو مسلنے لگا۔

"کیا ہوا ہاشم؟ سر میں درد ہے آپ کے؟ کوئی ٹینشن ہے کیا؟" وہ فکر مند انداز میں صوفے پر اس کے قریب آبیٹھی۔

"میری جاب ختم ہوگئی ہے بختاور....." ہاشم کی بات پر اس کا دل دھک سے رہ گیا' ڈلیوری سے ایک ماہ پہلے جاب ختم ہونے کا مطلب وہ جانتی تھی۔ اوپر سے اللہ نے ایک کے بجائے دو دو ذمے داریاں ان کو سونپ دی تھیں۔

"وہ کیوں.....؟" وہ بوکھلا کر بولی' اس کے چہرے پر بھی تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

"اسلامیات ڈیپارٹمنٹ کے ایک منحوس بندے سے جھگڑا ہو گیا تھا' وہ پرنسپل کا چہیتا تھا' انہوں نے مجھے اس کی شکایت پر نوکری سے نکال دیا۔" ہاشم کے تلخ لہجے پر وہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگئی۔

"جھگڑا؟ لیکن کس بات پر.....؟" وہ بے چین ہوئی۔

"ایسے ہی فضول میں بحث کیے جا رہا تھا۔' بات زیادہ بڑھ گئی اور پرنسپل نے ہم دونوں کو بلا لیا۔" اس نے بیزاری سے وضاحت کی۔

"لیکن بات تھی کیا آخر.....؟" بختاور نے اصرار کیا۔

"کوئی خاص نہیں تھی' تم چھوڑو اس بات کو' کھانے کے لیے کچھ ہے....." ہاشم نے دانستہ بات کا رخ بدلا۔

"ہاں۔" اس کا ذہن بری طرح الجھ گیا' اس لیے اس نے بھی مختصر جواب دیا اور کچن میں آگئی۔ کھانا ٹرے میں رکھ کر جب وہ باہر نکلی تو وہ اپنے کسی دوست سے پی ٹی سی ایل پر کافی غصے میں بات کر رہا تھا۔ اس

نے گفتگو کے دوران ایک انتہائی قابل اعتراض گالی دی تو بختاور کو شاک لگا۔ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات دیکھ کر اس نے فوراً" خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

"تم کیوں اس طرح میری طرف دیکھ رہی ہو۔" ہاشم نے غور سے اس کا ہراساں چہرہ دیکھا۔

"آپ ایسے گالیاں کیوں دے رہے تھے کسی کو، مجھے سن کر بہت عجیب احساس ہوا۔" اس نے اپنی ناگواری کا صفائی سے اظہار کیا۔

"تو کیا کروں، اس الو کے پٹھے کی وجہ سے اچھی خاصی جاب ہاتھ سے نکل گئی۔" وہ چڑ کر بولا اور سر جھٹک کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

"تو آپ کو اس سے بحث نہیں کرنی چاہیے تھی ناں۔۔۔" اس نے محتاط انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ ملک رہنے کے قابل ہی نہیں ہے، سارے پاگل، جنونی لوگ بستے ہیں یہاں۔ مجھے امریکہ واپس چلے جانا چاہیے۔" اس کی بات پر بختاور کو کرنٹ سا لگا۔

"آپ کیا پہلے بھی امریکہ رہ کر آئے ہیں۔ آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔۔۔" اس کے لیے یہ بڑی حیران کن بات تھی۔

"ہاں ایف ایس سی کے فوراً بعد کچھ سال رہا تھا وہاں، گرین کارڈ بھی ہے میرے پاس۔" اس نے ایک اور حیران کن انکشاف کر کے اسے تعجب میں مبتلا کیا۔

"پھر واپس کیوں آگئے۔۔۔؟" اسے تجسس ہوا۔

"بس ابا جی کی جذباتیت کے ہاتھوں مجبور ہو کر آگیا تھا، غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔

"اچھا چھوڑیں، اپ سیٹ مت ہوں، اللہ بہتر کرے گا۔۔۔" بختاور کے تسلی بھرے انداز پر اس نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

"ہاں، اس کے نام نہاد بندے دوسروں کا کام بگاڑ کر اپنے خدا کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے رہیں۔" تلخی اس کے لہجے میں رچی تھی اس کی بات نے بختاور کو پریشان کیا۔

"آپ اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں ہاشم۔۔۔؟" اس کو بھی غصہ آیا۔

"دیکھو بختاور! میرا موڈ اس وقت سخت خراب ہے اور میں پہلے ہی جاب ختم ہونے کی وجہ سے ٹینشن میں ہوں، اس لیے تم مجھ سے فضول قسم کی بحث نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔" ہاشم نے ناراضی سے کھانے کی ٹرے پرے کردی، بختاور گھبرا گئی۔

"آپ کھانا تو کھائیں، درمیان میں کیوں چھوڑ دیا۔" اس نے التجائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، ہاشم کا یہ روپ اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے، جا کر ڈسٹ بن میں ڈال دو۔" وہ تلخی سے بولا۔

"کیسے ڈسٹ بن میں ڈال دوں، اللہ کو رزق کی بے حرمتی پسند نہیں، گناہ ملتا ہے ایسا کرنے سے۔" وہ اپنے بے ساختہ انداز سے اسے مزید جھنجلاہٹ میں مبتلا کر گئی۔ ہاشم غصے سے اسے گھورتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور یہ لوگ گناہ ثواب کے چکروں میں پڑے ہیں۔" وہ تلخ لہجے میں کہہ کر بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔

بختاور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ فکر مند انداز سے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہاشم کے لہجے کی دھمک اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟

"میں ہی پاگل ہوں، جو اس کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہی، ظاہر ہے جاب کا ختم ہونا کوئی معمولی بات تو نہیں۔" اس نے خود کو ڈانٹا اور اپنا ذہن بٹانے کے لیے میز پر رکھے برتن سمیٹنے لگی۔ ابھی اسے جا کر ہاشم کو بھی تسلی دینی تھی۔

آنے والے دنوں کا سورج بختاور کے لیے بے تحاشا پریشانیوں کے ساتھ طلوع ہو رہا تھا۔ جاب ختم ہونے کی وجہ سے کئی معاشی مسائل منہ کھول کر سامنے آن

کھڑے ہوئے۔ دو دکانوں سے آنے والا معمولی سا کرایہ 'بس ان کا کچن ہی چلا رہا تھا اور اوپر سے ڈلیوری کا اچھا خاصا خرچا سر پر تھا۔

ان ہی مسائل کو سوچتے سوچتے بختاور کا دماغ پھٹنے لگتا۔ اپنے والدین کے گھر میں پیسہ اس کے لیے کبھی بھی ایشو نہیں بنا تھا' وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی اور ان کے گھر میں پیسوں کی ریل پیل تھی۔ ان چیزوں کا حساب کتاب رکھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی' لیکن یہاں تو صبح ہونے کے ساتھ ہی وہ جمع تفریق کرنے پر لگ جاتی' ابھی تک اس نے بچوں کے لیے شاپنگ بھی نہیں کی تھی۔ ہاشم خود شدید قسم کے ڈیپریشن کا شکار تھا اور بیروزگاری نے اس کے مزاج پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ وہ بات بات پر اس سے لڑنے لگتا۔ یہ بات بختاور کے لیے اور بھی زیادہ اذیت ناک تھی۔



"اماں! مجھے بینش سے کسی قیمت پر شادی نہیں کرنی۔" وہ ابھی ڈیزی والے حادثے سے نہیں سنبھلی تھیں کہ ایک رات تیمور نے آکران کے سر پر دھماکہ کر دیا۔

اس وقت بندیا' تائی اماں کے کمرے کے ساتھ ملحقہ ڈریسنگ روم میں کھڑی ان کے کپڑے پریس کر رہی تھی۔ تیمور کی بات پر اس کا ہاتھ بے خیالی میں گرم گرم استری سے جا لگا۔ اس نے فوراً" جلتے ہوئے ہاتھ پر منہ سے پھونکیں مارنا شروع کر دیں۔

"تمہارا باپ گولی مار دے گا تمہیں۔" تائی اماں جو لیٹی ہوئی تھیں' بوکھلا کر بیٹھ گئیں۔ بندیا کا بھی سارا دھیان ان دونوں کی گفتگو کی طرف ہو گیا۔

"اس سے شادی کرنے سے اچھا ہے' بندہ خود زہر کھا کر مر جائے۔" تیمور کا اپنا لہجہ بھی زہر میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا ہے تمہیں' پہلے تو میں بھی راضی نہیں تھی اور پھر بھی تم اپنے بابا کی ہاں میں ہاں ملانے بیٹھ گئے تھے۔" ان کو بھی اپنے بیٹے پر غصہ آیا۔

"آپ کو اچھی طرح پتا ہے' مجھے بینش سے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی' میں نے صرف بابا کو خوش کرنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا' کیونکہ ان کی یہی خواہش تھی۔" اس نے سر جھکا کر افسردگی سے جواب دیا۔

"اور وہ پھر بھی خوش نہ ہوئے' الٹا ان کی تم لوگوں سے شکایتیں اور زیادہ بڑھ گئیں۔" انہوں نے منہ بنا کر یاد دلایا۔

"بابا کو بدگمان کرنے میں سو فیصد بینش کا ہاتھ ہے' پتا نہیں وہ چاہتی کیا ہے؟" تیمور کو اس پر بے تحاشا غصہ آ رہا تھا۔

"مجھے تو ساری زندگی اس کی ماں کے ساتھ رہتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہیں آئی' تمہیں اس کی بیٹی کی کیا آئے گی۔" وہ بینش سے خاصی بدگمان تھیں۔

"بہرحال' آپ بابا سے بات کریں' میں اس دفعہ یہ قصہ ختم کر کے جانا چاہتا ہوں۔" وہ حد درجہ بیزار تھا۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟ کچھ پتا بھی تو چلے۔" وہ حیران ہوئیں۔

"میں بھلا ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہوں' جو ہمارے دکھوں پر ہنسے' ہمارا مذاق اڑائے۔ اللہ جانے کون سا ایسا بغض اور نفرت ہے' جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی' میں نے خود اسے ڈیزی اور آپ کے خلاف زہر اگلتے سنا ہے۔" اس نے بھی اندر کی بات بتائی۔

"لیکن تمہارا باپ یہ بات کبھی نہیں مانے گا' ڈیزی نے ان کا مان توڑ کر رکھ دیا ہے۔" وہ افسردہ ہوئیں۔

"بابا مانیں یا نہ مانیں' مجھے اس مینٹل لڑکی سے شادی نہیں کرنی۔ میں اپنی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"لیکن تمہارے بابا۔۔۔" وہ گھبرا گئیں۔

"میں بابا سے خود معافی مانگ لوں گا' لیکن ان سے کہیں' اپنی بھتیجی کے لیے اس کے جیسا ہی کوئی بے حس' سرپھرا بندہ ڈھونڈ لیں۔" تیمور غصے سے کہہ کر ان کے کمرے سے نکل گیا۔ تائی اماں نے دونوں

ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ بندیا ڈرتے ڈرتے باہر نکلی۔

"تائی اماں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟"

"میری اولاد مجھے کبھی بھی سکھ کا سانس لینے نہیں دے گی، تم نے سنا جو یہ کمہ کر گیا ہے۔" وہ پریشانی سے اس سے مخاطب ہوئیں، بندیا نے جھٹ سے سر ہلا دیا۔

"بیٹا! خدا کے واسطے بینش سے ذکر مت کرنا، ورنہ تیمور کا باپ اسے باہر بھجوانے کے بجائے زبردستی دو بول پڑھوا دے گا راتوں رات، انہیں تو آج کل ویسے ہی بہت غصہ آتا ہے ہر کسی پر۔" انہوں نے بندیا سے التجا کی۔

"تائی اماں، میں نے پہلے کبھی ایسا کیا ہے، جو اب کروں گی۔" وہ افسردہ ہوئی۔

"نہیں نہیں بیٹا، تم تو بہت بھلی مانس ہو، تمہاری ماں نے بہت اچھی تربیت کی ہے تمہاری۔" انہوں نے کھلے دل سے اسے سراہا۔

اسی شام کو جب بینش اپنی پڑھائی میں مصروف تھی، تیمور کافی دنوں کے بعد بندیا کے پاس چلا آیا۔ وہ خاصا سنجیدہ سنجیدہ سا تھا۔ بندیا جو چائے کا کپ پکڑے لان کی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی، اس نے چونک کر تیمور کو دیکھا۔ اس کی شکل بجھی بجھی اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے شاید کئی راتوں کے رتجگے کا اثر تھا۔

"کیسے ہیں آپ۔۔۔؟" بندیا کو اس کی خاموشی سے الجھن ہوئی۔

"ٹھیک ہوں۔۔۔" وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوا۔

"ڈیزی باجی کا کچھ پتا چلا۔۔۔؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"پتا ان کا چلایا جاتا ہے جو دنیا کی بھیڑ میں گم ہو جائیں، جو اپنی مرضی سے چلے جائیں، ایسے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔" وہ تلخ لہجے میں بولتا ہوا اسے ساری دنیا سے خفا لگا تھا۔

"ہوں۔۔۔" بندیا خاموشی سے چائے پینے لگی۔

"مجھ سے شادی کرو گی بندیا۔۔۔" اس نے اتنا اچانک پوچھا کہ اسے ایک دم کرنٹ لگا اور اس کے ہاتھ میں پکڑے کپ سے گرما گرم چائے چھلک کر اس کے دوسرے ہاتھ پر جا گری۔ اس کے منہ سے نکلنے والی سی کی آواز پر تیمور نے پلٹ کر دیکھا اور بے ساختہ اس کا ہاتھ پکڑا۔ بندیا کو جھٹکا سا لگا، وہ اپنے پینٹ کی جیب سے رومال نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ بندیا کے دل کی دھڑکنیں مرتعش ہوئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دل میں کوئی بھونچال سا برپا ہو گیا ہو۔

"اٹھو، ذرا میرے ساتھ نل تک چلو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لان میں لگے پانی کے نل کے نیچے لے آیا۔

"سنو، مجھے سوچ کر جواب دینا۔ میں نکاح کر کے جانا چاہتا ہوں تاکہ اگلی دفعہ آؤں تو تمہارے ڈاکومنٹس تیار کرلاؤں۔ ہم یہاں نہیں انگلینڈ میں رہیں گے۔" وہ کھڑے کھڑے سارے معاملات خود ہی طے کر چکا تھا۔ بندیا نے خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے بینش لان کی طرف آرہی تھی۔

"مبارک ہو بندیا! تمہارے بابا کی کال آئی تھی، وہ آغا جی کو بتارہے تھے کہ انہوں نے تمہاری بات طے کردی ہے۔ تمہارے چچا کے بیٹے سے۔" وہ بلند آواز میں اعلان کرتی آرہی تھی، تیمور کو دیکھ کر وہ ایک دم چپ ہوئی۔ وہ کافی دن کے بعد ان کی طرف آیا تھا۔

"ہیلو تیمور! کیسے ہو تم۔۔۔؟" اس نے اس طرح اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے ان کے درمیان کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ تیمور خاموش رہا۔

"بھئی مبارک باد دو بندیا کو، اس کا رشتہ طے ہو گیا ہے، کسی آفس میں کام کرنے والے ہیڈ کلرک کے ساتھ۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

بندیا کے اندر کوئی چیز چھن کر کے ٹوٹی تھی۔ تیمور نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا۔ بندیا کا سارا سکون درہم برہم ہو گیا۔ اپنے چچا کا بیٹا اسے سخت ناپسند تھا اور چچا اکثر اٹھتے بیٹھتے جب اسے بہو بنانے کا ارادہ ظاہر کرتے تو تب بھی بندیا کو سخت غصہ آجاتا تھا۔ اب تو اس سے

پوچھے بغیر اس کی بات طے کر دی گئی تھی۔

اس نے اسی شام اپنی والدہ کو فون کیا اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہی جو اسے جھاڑ پڑی ' اگلے دو گھنٹوں تک اس کے کانوں سے دھواں نکلتا رہا۔ دوسری طرف بینش ' دل ہی دل میں تیمور کو منانے کے سنجیدگی سے منصوبے بنا رہی تھی۔



آپا صالحہ کے چہرے پر تفکر کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور وہ بے بس نگاہوں سے اپنے ہاتھوں میں پکڑی رپورٹس دیکھ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کو یقین نہ آرہا ہو اور وہ کافی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ انہیں بڑی آنت کا کینسر ہو چکا ہے ' جو ابھی ابتدائی اسٹیج پر تھا۔

"آپا یہ دوائی کھالیں۔۔۔" مونا فکر مندانداز میں ان کی میڈیسن والا لفافہ اور پانی کا گلاس اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"سائیڈ میز پر رکھ دو۔۔۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھیں۔

"اچھا ہوا ' میں نے اس دفعہ عدینہ کو گھر آنے سے منع کر دیا۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

"میں بھی حیران تھی کہ تم نے اسے اس کی انجان سہیلی کے گھر میں رہنے کی اجازت کیوں دے دی۔" بے بے نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"سنو مونا! عدینہ کو میری رپورٹس کے بارے میں بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" انہوں نے دروازے میں کھڑی مونا کو اچانک مخاطب کیا ' وہ گڑبڑا سی گئی۔

"لیکن آپا۔۔۔" مونا نے احتجاج کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ آپا صالحہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہیں جو کہا ہے ' اس پر عمل کرو۔ اس کا پہلا سال ہے۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرا علاج کروانے چل پڑے گی ' میں نہیں چاہتی ' اس کی پڑھائی کا حرج ہو۔"

"لیکن اس طرح تو تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی پتر ' ڈاکٹر نے کہا ہے فوراً" آپریشن کروالو۔"

بے بے نے فکر مندانداز میں انہیں یاد دلایا۔

"میں کچھ عرصہ میڈیسن کھا کر گزارا کر لوں گی ' عدینہ کا خیر خیریت سے پہلا سال گزر جائے۔" انہوں نے فوراً" ہی دل ہی دل میں حساب کتاب کیا۔

"عدینہ باجی بہت سمجھ دار ہیں ' وہ اپنی پڑھائی کو ساتھ ساتھ مینج کر لیں گی۔" مونا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہونہہ ' رہنے دو تم ' دیکھ رکھی ہے اس کی ذہانت میں نے ' عبداللہ کے مرنے پر پورے دو سال ضائع کیے تھے اس نے۔" آپا صالحہ نے منہ بنا کر یاد دلایا۔

"لیکن بہو ' تم تو الحمدللہ ' ابھی ٹھیک ٹھاک ہو۔ وہ ایسا کیوں کرے گی۔" بے بے کو بھی ان کی منطق اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"بے جی! میں عدینہ کو آپ سے زیادہ جانتی ہوں۔ اس لیے آپ مہربانی کر کے مجھے وہی کرنے دیں ' جو میں کرنا چاہتی ہوں۔" آپا صالحہ نے اس دفعہ التجائیہ انداز اپنایا تو مونا اور بے بے دونوں کو ہی چپ لگ گئی۔

رات کو آپا صالحہ نے عدینہ کا نمبر ملا لیا ' وہ اپنی دوست اوریدا کے گھر میں خاصی خوش تھی ' اس کے لہجے سے بے ساختہ چھلکتی خوشی کو محسوس کر کے وہ تھوڑا پرسکون ہوئیں۔

"اوریدا کے والد بہت زبردست فزیشن ہیں اور بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔ میرے بہت سے کانسیپٹ کلیئر کیے ہیں انہوں نے۔" وہ بڑے پرجوش انداز میں ان کو بتا رہی تھی۔

"اس کی دادی اماں کب آرہی ہیں واپس؟" آپا صالحہ نے یونہی پوچھا۔

"ان کو ابھی کچھ دن لگیں گے ' کیونکہ اوریدا کے فادر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے فوراً" ہی بتایا۔

"چلو اچھا ہے ' تم بھی کچھ دن وہیں رہ لو ' لیکن اپنی اسٹڈی کا حرج نہیں کرنا۔" انہوں نے فون بند کرتے ہوئے حسب عادت اسے نصیحت کی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" عدینہ نے ان کی

بات کا جواب دینے کے بجائے اچانک پوچھا۔
"میں ٹھیک ہوں ـــ" وہ ذرا سا سنبھل کر گویا ہوئیں۔
"ٹمپریچر دوبارہ تو نہیں ہوا؟" عدینہ کے لہجے میں چھپی فکرمندی انہیں اچھی لگی۔
"نہیں...." انہوں نے جھوٹ بولا۔
"چلیں نیکسٹ ٹائم آپ میرے ساتھ پنڈی آئیے گا' میں آپ کا چیک اپ اور ریدا کے بڑے ابا سے کرواؤں گی۔" اس کی بات پر وہ مبہم انداز میں مسکرائیں۔
"ہاں ہاں' کیوں نہیں ـــ" انہوں نے ایک دفعہ پھر اسے بہلایا۔
"چلیں اپنا بہت زیادہ خیال رکھیے گا' پھر بات کریں گے۔" عدینہ نے سلام دعا کے بعد فون بند کر دیا۔ دوسری طرف آپا صالحہ نے شکر ادا کیا کہ وہ اس ہفتے گھر نہیں آئی تھی ورنہ ان کی حالت دیکھ کر کچھ نہ کچھ اندازہ لگالیتی۔



ہاشم اس دن ایک جگہ پر انٹرویو دے کر تھکا تھکا سا گھر میں داخل ہوا تو بختاور کو پہلی دفعہ اس پر رحم آیا۔ اس نے کئی جگہ نوکری کے لیے درخواستیں جمع کرائی تھیں' اول تو کسی جگہ سے انٹرویو کے لیے کال ہی نہ آتی اور اگر کوئی بھول کر اسے انٹرویو کے لیے بلا لیتا تو بات اس سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی۔ وہ دن بہ دن چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا اور ایک دن پہلے تو وہ اپنی ایک دکان کا کرایہ لینے گیا تو وہاں سے بھی لڑ جھگڑ کر آ گیا کیونکہ کرائے دار نے اسے آدھی رقم دے کر باقی پندرہ دن بعد دینے کا وعدہ کیا تھا۔
جوان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔
آج کل وہ سارا سارا دن جاب کی تلاش میں مختلف جگہوں پر دھکے کھا کر جب واپس لوٹتا تو کھانا کھا کر سو جاتا' اس کی بختاور کے ساتھ گفتگو بس چند جملوں تک محدود ہو گئی تھی۔ بختاور سارا دن گھر میں اکیلے بیٹھ بیٹھ کر کڑھتی رہتی' اس تنہائی نے اسے اللہ کے اور قریب کر دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ مذہبی تو کبھی بھی نہیں رہی تھی لیکن پے در پے پیش آنے والی پریشانیوں کا حل اس نے دعاؤں میں تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ مختلف اخبارات کے دینی صفحات سے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر وظیفے نکالتی اور نمازوں کے بعد گھنٹوں تسبیح لے کر بیٹھی رہتی۔
اس دن ہاشم ذرا جلدی گھر آ گیا تھا' وہ ایک اخبار سے بچوں کے اچھے اچھے اسلامی نام اپنی ڈائری میں تحریر کر رہی تھی۔ ہاشم کا مزاج آج کچھ بہتر تھا۔ اس لیے وہ اس کے پاس ہی صوفے پر آ کر بیٹھ گیا اور سامنے میز پر رکھی اس کی تسبیح اٹھا کر لاپروائی سے انگلی میں گھمانے لگا۔ بختاور کو ناگواری کا احساس ہوا۔
"افوہ تسبیح! ایسے نہیں گھماتے' گر کر ٹوٹ جائے گی...!"
اس کے سنجیدہ انداز پر اس نے خلاف توقع اس کی بات مان لی اور تسبیح لاپروائی سے دوسرے صوفے پر اچھال دی' اس کا یہ اقدام بھی بختاور کو اچھا نہیں لگا تھا لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔
"کیا لکھ رہی ہو ـــ؟" وہ تجسس بھرے انداز میں اس کی ڈائری پر جھکا اور اس پر لڑکوں کے اسلامی نام دیکھ کر چونکا۔
"تم تو سارے لڑکوں والے نام لکھ رہی ہو' اگر بیٹیاں ہو گئیں تو ـــ؟"
"لڑکیوں کے نام بھی ابھی تلاش کر کے لکھوں گی' پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اللہ مجھے اولاد نرینہ ہی سے نوازے گا۔" وہ ضرورت سے زیادہ پراعتماد تھی اس لیے اس نے الٹرا ساؤنڈ کروا کر بھی ڈاکٹر سے بچوں کی جنس کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔
"اچھا' لیکن نام تو تم نے سارے لڑکوں کے لکھے ہیں۔" وہ پڑھنے لگا' "عمر' ابوبکر' علی' عثمان ـــ" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا اور بیزار لہجے میں گویا ہوا۔
"لیکن میں اپنے بچوں کے نام یہ نہیں رکھوں گا۔" اس نے ڈائری اس کے ہاتھ سے پکڑ کر بے دردی سے ان ناموں کو بال پوائنٹ سے کاٹ دیا۔ بختاور کو

یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل کاٹ کر پھینک دیا ہو۔ وہ جھنجلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کے ساتھ پرابلم کیا ہے۔ کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔“ غصے کی زیادتی سے اس کا منہ سرخ ہوا۔

”تو کیا میں اپنے بچوں کے نام بھی اپنی پسند سے نہیں رکھ سکتا۔“ اس کے نرم لہجے میں موجود شکوہ محسوس کر کے اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔

”آپ اپنی پسند کے نام ضرور رکھیں، لیکن یہ صحابہ کرام کے نام ہیں۔ ان ناموں کو برا مت کہیں۔“ اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔

”اچھا بابا! نہیں کہتا معاف کر دو۔۔۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ سنجیدگی سے دوبارہ بیٹھ گئی۔

”تمہیں پتا ہے اگر ہمارے ہاں بیٹے ہوئے تو میں ان کا نام کیا رکھوں گا؟“ وہ اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے دانستہ مسکرایا۔

”کیا رکھیں گے۔۔۔؟“ وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔

”یزدان اور سلمان۔۔۔“ وہ پراسرار انداز میں مسکرایا۔

”سلمان نام تو چلو ٹھیک ہے، لیکن یزداں سے کیا مراد ہے۔۔۔“ بختاور نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”آتش پرست مذہب میں یزداں، نیکی کے خدا کو کہتے ہیں۔“ اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تو کیا آپ آتش پرستی پر یقین رکھتے ہیں۔۔۔“ بختاور کا سانس رکا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔“ اس کی بات پر بختاور کا سانس بحال ہوا اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے یہ نام اس لیے پسند آیا تھا کہ یہ ان کے نیکی کے خدا کا نام تھا، ورنہ مجھے ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”لیکن مجھے تو یہ نام بہت عجیب لگا ہے، میں تو ہرگز نہیں رکھوں گی۔“ بختاور نے بھی ناک چڑھا کر کہا تو وہ اس کے اسٹائل پر ہنس پڑا۔

”کیا بدلہ لے رہی ہو۔۔۔؟“ اس نے فوراً ہی مسکرا کر پوچھا۔

”بدلہ کس بات کا؟ مجھے نہیں اچھا لگا تو بس نہیں لگا۔۔“ بختاور کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

”بھئی، میں نے تمہارے منتخب کردہ نام جو مسترد کر دیے تھے، تم نے حساب برابر کر دیا۔“ اس کی وضاحت پر وہ حیران ہوئی۔

”ہرگز نہیں، میرے دل میں ایسا کچھ نہیں تھا، خیر یہ بتائیں کہ اگر اللہ نے ہمیں دو بیٹیاں دے دیں تو ان کے نام کیا رکھیں گے؟“ بختاور نے کچھ سوچ کر پوچھا تو وہ ایک دم چپ کر گیا۔

”بتائیں نا۔۔۔“ بختاور نے ضد کی۔

”مایا اور مونیکا۔۔۔“ اس نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔

”لیں، یہ دونوں نام بھی ایک دم فضول ہیں، مایا ہندوؤں کا نام لگتا ہے اور مونیکا کرسچن۔۔۔“ بختاور کی بات پر وہ سنجیدہ ہو کر اٹھ بیٹھا۔

”تم اتنی زیادہ کنزرویٹو کیوں ہو بختاور، دنیا کی ہر چیز میں مذہب کو لے آتی ہو۔ ہمارے لیے اہم انسان ہونا چاہیے اس کا مذہب نہیں۔“

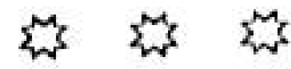
”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم اپنی زندگیوں میں مذہب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔۔۔“ وہ بحث پر اتر آئی۔

”لیکن مذہب کے پیمانے پر کسی انسان کو پرکھنا، انسانیت کی توہین ہے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ بھی دوبدو انداز میں بولا۔

”میں کسی مذہب کو برا تو نہیں کہہ رہی، لیکن اسلام ہمیں ایسے نام رکھنے سے منع کرتا ہے۔ ہمیں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔“ سنجیدگی اس کے چہرے کے ہر نقش سے عیاں تھی، ہاشم نے بغور اس کے چہرے کو دیکھا اور مصلحتاً بات کا اختتام کرنے کے لیے بولا۔

”اچھا بابا، تمہیں جو نام پسند ہو، تم رکھ لینا، بات ختم۔“

ہاشم نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی اور بختاور کا خوش فہم دل ایک دم پرسکون ہو گیا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے ہاشم صرف ایک بھٹکا ہوا نوجوان ہے، جسے اس کی توجہ اسلام کی طرف راغب کر سکتی ہے اور وہ دل ہی دل میں اس بات کا تہیہ کر چکی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی ایک اچھا مسلمان بنانے کی کوشش کرے گی۔ اس نے پانچ وقت کی نماز شروع کر دی تھی اور عافیت رہی کہ ہاشم نے اس کے بعد اسے نہیں ٹوکا تھا۔



"اوریدا! تم مجھے کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہو....." عدینہ نے میڈیکل کی بھاری بھرکم کتاب سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اوریدا کی نظریں سامنے دیوار پر اور دھیان کہیں اور تھا۔ جب کہ گود میں اس نے بھی سلیبس کی کتاب کھول کر رکھی ہوئی تھی۔

"نہیں تو....." وہ ایک دم ہی ہوش کی دنیا میں آئی، خفت اور شرمندگی کا بڑا بھرپور حملہ ہوا تھا اس پر....

"کوئی پرابلم ہے تو تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" عدینہ نے نرمی سے اس کی طرف دیکھا۔

"نن نہیں تو، میں تو بڑی اماں کی وجہ سے اپ سیٹ تھی، وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔" اوریدا نے جلدی سے بات بنائی۔

"خیر اصل بات تو کچھ اور ہی ہے، اب تم بتانا نہ چاہو تو الگ بات ہے۔" عدینہ لاپروائی سے کہہ کر اپنی کتاب پر جھک گئی۔ اوریدا اچھی خاصی شرمندہ ہو گئی۔

"وہ اصل میں....." وہ تھوڑا سا اٹکی۔

"اگر کوئی پرسنل بات ہے تو اٹس اوکے اوریدا، میں مائنڈ نہیں کرتی۔" اس نے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"ارصم کی ممی اس کی انگیجمنٹ اس کی کزن ارسلہ کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔" اوریدا کی آواز نم تھی، عدینہ نے بوکھلا کر اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔

"لیکن کیوں؟ کیا ارصم نے ان سے بات نہیں کی؟"

عدینہ اس کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔

"کی تھی، لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔" وہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلتے ہوئے بولی۔

"ارصم کو اس بات پر اسٹینڈ لینا چاہیے۔" عدینہ نے اپنی کتاب بند کر دی، اس کی پڑھائی سے طبیعت ایک دم ہی اچاٹ ہو گئی تھی۔

"تم بینش آنٹی کو نہیں جانتی ہو، وہ جس بات پر اڑ جائیں اس سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوتیں۔" وہ سر جھکائے افسردگی سے گویا ہوئی۔

"لیکن یہ تمہاری اور ارصم کی زندگی کا معاملہ ہے، وہ ایسے کیسے کر سکتی ہیں؟" عدینہ کو غصہ آگیا۔

"وہ سب کچھ کر سکتی ہیں....." اوریدا مکمل مایوس ہو چکی تھی۔

"کہاں ہے ارصم، میں بات کرتی ہوں اس سے۔" عدینہ کے دوٹوک انداز پر وہ گھبرا اٹھی۔

"آج اس کے کزن کی برات ہے، وہ ان کے ساتھ گیا ہے۔" اوریدا نے جلدی سے بتایا۔

"اسی وجہ سے تم برات کے ساتھ نہیں گئیں۔" عدینہ کی سمجھ میں ساری بات آگئی تھی، وہ پچھلے دو دن سے اسے حد درجہ پریشان اور الجھا ہوا دیکھ رہی تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ وہ شاید اپنے پاپا کی وجہ سے پریشان ہے کیونکہ ماہیر نے اسے پاپا کی بیماری کے متعلق بتا دیا تھا۔

"نہیں، برات کے ساتھ تو میں تمہاری وجہ سے نہیں گئی، اور ویسے بھی مجھے اس فنکشن میں کوئی انٹرسٹ نہیں۔" وہ حد درجہ بیزاری کا شکار تھی۔

"چلو اٹھو پھر، کہیں باہر چلتے ہیں، اچھا سا سوپ پی کر آتے ہیں۔" عدینہ نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کے لیے فوراً "پروگرام ترتیب دیا، جسے اوریدا نے بادل نخواستہ مان لیا تھا۔ اب تو اوریدا کی ڈرائیونگ بہت اچھی ہو چکی تھی، وہ دونوں جناح سپر مارکیٹ چلی آئیں۔ موسم اچھا تھا اور گہرے سیاہ بادلوں نے پورے آسمان کو ڈھک رکھا تھا۔ وہ ایک

چائنیز ریسٹورنٹ میں چلی آئیں۔ سوپ پیتے ہوئے وہ ریسٹورنٹ کی گلاس وال سے گرتی بارش کی بوندوں کو دیکھنے لگیں۔ بارش کے تسلسل میں تیزی آگئی تھی۔

عدینہ ہر طریقے سے اس کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اوریدا کے وجود پر گہری افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ تب ہی وہ اس کی باتوں کے جواب ہوں ہاں میں دے رہی تھی' حتیٰ کہ عدینہ جھنجلا اٹھی۔

"میں نے کہا نا! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا' تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو۔"

"تمہیں اندازہ نہیں ہے' ارصم میرے لیے کیا ہے؟"

"میں نے بھی اس کرب کو بہت عرصہ اپنی ذات پر جھیلا ہے۔" وہ بھی افسردہ ہوئی۔

"تمہیں وہ شخص یاد آتا ہے۔" اوریدا نے جھجک کر پوچھا۔

"بھولے گا تو یاد آئے گا نا' اس کی محبت تو خون بن کر میری شریانوں کے ساتھ دوڑتی ہے۔" وہ بے بس انداز میں گویا ہوئی۔

"محبت تو ہے ہی فضول چیز' ہم لڑکیوں کو تو بالکل بھی نہیں کرنی چاہیے۔" اوریدا کو فوراً ہی غصہ آگیا اور وہ ایک دم کھڑی ہو گئی' عدینہ نے حیرانی سے اس کے سامنے پڑے سوپ کے باؤل کو دیکھا' وہ جوں کا توں پڑا تھا۔

"یہ سوپ تو ختم کرو۔" وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا' چلو کہیں اور چلتے ہیں' عجیب سی وحشت ہو رہی ہے مجھے اس جگہ سے۔" اوریدا بے چین روح بنی ہوئی تھی' اس نے بھی بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا' دونوں بل ادا کر کے باہر نکل آئیں۔ رات کا وقت تھا اور بارش کی بوندوں میں روانی آچکی تھی۔

"گاڑی تک جاتے جاتے تو ہم اچھے خاصے بھیگ جائیں گے۔" عدینہ نے پریشانی سے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑے منچلے لڑکوں کو دیکھا جو موسم کو انجوائے کر رہے تھے اور اس وقت دلچسپ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے' وہ سمجھ گئے تھے کہ وہ دونوں اپنی گاڑی تک پہنچنا چاہتی ہیں۔

"چلو ہمت کرو' اب یہیں تو کھڑے نہیں رہ سکتے نا۔" اوریدا نے بیزاری سے کہا اور دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سڑک کی طرف دوڑ لگادی' ان کی گاڑی پارکنگ میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے سڑک کی دوسرے سائیڈ پر کھڑی تھی۔ سخت سردی میں عدینہ کپکپاتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جبکہ اوریدا موسموں کی شدت سے بے نیاز ٹہلتی ہوئی آرہی تھی۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی ہو تیز چلو۔" عدینہ نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے پلٹ کر اوریدا کی طرف دیکھا اور جیسے ہی سیدھی ہوئی' سامنے سے آتے ہوئے نوجوان سے بری طرح ٹکرائی' نوجوان کے ہاتھ میں پکڑا چھاتہ اچھل کر سڑک پر جا گرا۔

"اوہ... آئی ایم سوری۔" ایک مانوس شناسا لہجہ عدینہ کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ جو ناگواری سے اپنا ماتھا مسل رہی تھی' اسے جھٹکا سا لگا' اس نے تعجب انگیز نگاہوں سے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھا' اس کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔

"عبداللہ..." عدینہ خوف زدہ ہو کر کچھ قدم پیچھے پلٹی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اسلام آباد کی کسی سڑک پر تیز بھیگتی بارش اسے اس شخص کے سامنے لا کھڑا کرے گی' جس کی یاد کا پودا وہ ابھی تک اپنے دل سے اکھاڑ نہیں سکی تھی۔

"عدینہ! کیسی ہو..." بارش ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی' وہ ایک دوسرے کے چہرے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"عدینہ! جلدی آؤ..." اوریدا گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ..." عدینہ سکتے کی کیفیت سے باہر نکل آئی تھی' وہ جو سوچتی تھی کہ جب عبداللہ واپس آئے گا تو وہ سب سے پہلے اس سے اپنی بے تحاشا محبت کا اظہار کرے گی لیکن اس

دشمن جاں کو سامنے دیکھ کر اسے اپنی ڈھائی سالوں کی اذیت، تکلیف اور پریشانی یاد آگئی تھی۔ تیز بارش نے اس کا پردہ رکھ لیا تھا۔ وہ ناراض انداز سے پلٹی اور گاڑی کی طرف جانے لگی، وہ بری طرح سے بھیگ چکی تھی۔

"عدینہ! میری بات سنو۔۔۔" وہ بے تابی سے اس کے پیچھے لپکا۔

"مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔۔۔" وہ اب فٹ پاتھ پر کھڑی رو رہی تھی۔ "وہیں چلے جائیں، جہاں ڈھائی سال رہے ہیں۔"

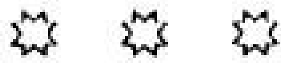
"آج سے دو سال، پانچ مہینے اور دس دن پہلے بھی تم نے میری بات نہیں سنی تھی۔ اس کا دکھ آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔" عبداللہ کی آواز میں گلے، شکوے اور بے انتہا اذیت تھی۔ عدینہ کو لگا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں۔ بارش کے تسلسل میں ایک دم ہی کمی آئی۔ اوریدا جھنجلا کر گاڑی سے باہر نکل آئی اور حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ کر سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی، جواب اسے کسی حد تک سمجھ آ ہی گیا تھا۔

"میرا خیال ہے آپ لوگ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی نمونیہ کروائیں گے، پلیز، میری گاڑی میں بیٹھ کر سارے گلے شکوے کر لیں۔" اس نے آگے بڑھ کر عدینہ کا بازو پکڑ کر اسے گاڑی میں زبردستی بٹھایا۔ عبداللہ اپنی جگہ پر جما کھڑا تھا۔

"آپ بھی شرافت سے بیٹھ جائیں میری گاڑی میں، کیونکہ میرا موڈ آج بہت خراب ہے۔" اوریدا کے دھمکی آمیز انداز پر وہ مسکرایا۔

"آپ اپنا سیل نمبر مجھے دے دیں، میں کل کسی وقت آپ سے رابطہ کر لوں گا۔"

عبداللہ کے کہنے پر اس نے جلدی سے اپنا سیل نمبر اسے لکھوایا اور خاموشی سے اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ عدینہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے اسے رونے دیا کیونکہ بعض دفعہ آنسوؤں کا بہنا بہت ضروری ہوتا ہے، یہ نمکین پانی اگر انسان اپنے اندر ہی جذب کرنے کی کوشش کرے تو یہ پورے وجود میں آگ لگا دیتا ہے۔



اوریدا اور عدینہ دونوں واپس آ چکی تھیں۔ عدینہ تو آتے ہی کمبل تان کر سو گئی تھی یا سونے کی اداکاری کرنے لگی جبکہ اوریدا کو نیند نہیں آ رہی تھی، وہ باہر نکل آئی۔ برات واپس آ چکی تھی۔ اس وقت بینش آنٹی کے پورشن میں خوب ہلہ گلہ ہو رہا تھا۔ تیز میوزک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ اپنی سیاہ شال اوڑھ کر پچھلے صحن کی طرف آ گئی۔ بارش رکنے کے بعد اب آسمان صاف ہو چکا تھا۔۔۔ وہ برآمدے میں پڑے اپنے لکڑی کے مخصوص جھولے پر آ کر بیٹھ گئی۔

"اوریدا۔۔۔" ارصم پچھلی سائیڈ کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم کسی بدروح کی طرح ادھر ہی بیٹھی ہو گی۔" وہ بھی مسکراتا ہوا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"برات واپس آ گئی ہے۔" اوریدا نے یونہی بات کا آغاز کرنے کے لیے پوچھا۔

"ہاں آ گئی۔۔۔" ارصم نے بغور اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔

"بڑی اماں اور ماہیر کب آ رہے ہیں واپس؟" ارصم کو اچانک یاد آیا۔

"ابھی کچھ پتا نہیں، پاپا کی طبیعت مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی ابھی۔۔۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ناراض ہو مجھ سے۔۔۔؟" ارصم نے ہاتھ کی انگلی سے اس کی ٹھوڑی کو اوپر کیا۔

"نہیں تو۔۔۔"

"تم ٹینشن مت لو، میں ممی کو منا لوں گا۔" اس نے اسے دلاسا دیا۔

"مجھے معلوم ہے، وہ کبھی نہیں مانیں گی۔" اوریدا خاصی حقیقت پسند تھی۔

"انہیں ماننا ہو گا اوریدا۔۔۔" ارصم ناراض انداز

میں جھولے سے اترا اور اس کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اگر وہ نہ مانیں تو...؟" اوریدا نے اس دفعہ ہمت کر کے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔

"تو پھر ہم بھی وہی کریں گے جو تیمور انکل نے کیا تھا..." اس کی بات پر اوریدا کو شاک سا لگا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم...؟" اوریدا کو اپنی سماعت پر شک ہوا۔

"تیمور انکل اور تمہاری ماما نے بھی تو پسند کی شادی کی تھی نا..." وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"اس کا انجام دیکھا ہے تم نے، آج تک بڑے ابا نے معاف نہیں کیا انہیں۔" وہ بھی ناراضی سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"تو کیا ہوا؟ زندگی تو اپنی پسند سے گزاری نا انہوں نے۔" وہ آج مکمل بغاوت کے موڈ میں تھا۔

"ارصم! یہ کیسے ہو سکتا ہے..." وہ ٹھیک ٹھاک پریشان ہوئی۔

"تو پھر ویسا بالکل نہیں ہو سکتا، جیسا ہم چاہتے ہیں۔ ممی کبھی نہیں مانیں گی، وہ مجھے مرنے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔" ارصم نے تلخ لہجے میں کہا۔

"بے شک نہ مانیں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی..." اوریدا کی بات پر اسے دھچکا لگا۔

"کیا کہا تم نے...؟" وہ ایک دم تپ اٹھا۔

"میں بڑے ابا اور بڑی اماں کو دکھ پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتی، میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں انہیں وہ دکھ دوں جو پاپا نے اور ڈیزی پھپھو نے انہیں دیا تھا۔" اوریدا کا سنجیدہ انداز ارصم کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب کر گیا۔

"تو کیا میں بے وقوف گدھا ہوں، بے حس ہوں، مجھے کسی کا احساس نہیں، میں بھی تو اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔" غصے سے اس کی آواز بلند ہوئی۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں ارصم، تم پلیز آنٹی بینش کو منانے کی کوشش کرو۔" اوریدا اس کے ناراض انداز پر بوکھلا گئی۔

"تم سونے کی بھی بن کر آجاؤ گی تو وہ کم از کم تمہارے لیے نہیں مانیں گی۔" ارصم کا سفاک لہجہ اس کی روح تک کو زخمی کر گیا۔

"اسی لیے کہتا ہوں کہ دو سال تک میں ممی کو ٹالتا رہوں گا اور میرا میڈیکل مکمل ہونے کے بعد ہم کوئی اسٹیپ اٹھالیں گے۔" وہ ابھی بھی اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری ارصم، میرا جواب جو آج ہے، وہی دو سال کے بعد ہوگا۔ میں بڑے ابا اور پاپا کی عزت کو داؤ پر نہیں لگا سکتی۔" اوریدا نے بھی دل پر جبر کر کے اپنی بات دہرائی، وہ کچھ لمحے ناراضی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے، میں بھی ممی کو ارسلہ کے لیے ہاں کہنے جا رہا ہوں، تم اب مجھ سے گلہ مت کرنا۔" ارصم نے ایک دم اس پر پہاڑ توڑا تھا، وہ بوکھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

جو غصے سے پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے جا چکا تھا۔ اوریدا کو اپنا سارا سکون لٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے بڑے ابا نے ان دونوں کی گفتگو کو بقائمی ہوش و حواس سنا تھا، ایک اور زلزلہ ان کے وجود میں برپا ہو چکا تھا۔ انہوں نے افسردہ انداز میں اپنے کمرے کا پردہ برابر کیا۔

☼ ☼ ☼

اس دن صبح ہی سے بختاور کی طبیعت کچھ خراب سی تھی اور احتیاطاً ہاشم آج گھر میں ہی ٹھہر گیا۔ وہ فکر مندی سے اس کے اردگرد ہی ٹہل رہا تھا اور دل ہی دل میں آنے والے خرچ کا حساب کتاب کرنے میں مصروف تھا۔ دونوں نے کچھ دن پہلے ہی چھوٹی موٹی شاپنگ کی تھی اور ہاشم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جاب ہوتے ہی اسے بچوں کی ڈھیر ساری چیزیں اور بھی خرید کر دے گا۔

"بختاور! زیادہ کنڈیشن خراب ہو رہی ہے تو میں بھاگ کر ٹیکسی لے آتا ہوں۔" وہ تشویش زدہ نگاہوں

سے اس کا زرد چہرہ دیکھ رہا تھا۔
"ہاں' لے آؤ..." وہ تکلیف کے زیر اثر اتنا ہی بول سکی۔
ہاشم بڑی سرعت سے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا اور اگلے ہی پانچ دس منٹوں میں وہ ٹیکسی لے کر واپس فلیٹ میں آیا۔ بختاور کو سہارا دے کر اس نے بمشکل سیڑھیوں سے اتارا اور اس لمحے دونوں کو ہی اپنے ساتھ کسی بزرگ خاتون کی کمی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ بختاور کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی اور جیسے ہی وہ سرکاری ہسپتال کے گائنی ڈپارٹمنٹ میں پہنچی' اسے نرسز نے آپریشن تھیٹر میں شفٹ کر دیا تھا۔ یہ لمحات ہاشم کے لیے انتہائی پریشان کن تھے۔ خون کا انتظام کر کے اس نے سب سے پہلے اپنے دوست سرفراز کو کال کی' جو ایک گھنٹے بعد اپنی بیوی کے ساتھ اسپتال پہنچ گیا تھا' اس کی بیوی سرکاری اسپتال میں پھیلی افراتفری اور صفائی کی غیر تسلی بخش حالت کو کوفت بھرے انداز میں دیکھ رہی تھی۔
"ہاشم بھائی' کیا ضرورت تھی سرکاری ہسپتالوں میں دھکے کھانے کی' مجھے بتاتے' میں ایک اچھے پرائیوٹ اسپتال میں لے جاتی۔" فائزہ بھابھی کی بات پر وہ خفت کا شکار ہوا۔
"بس بھابھی! کچھ حالات ہی ایسے تھے' سرفراز کو پتا تو ہے آج کل میں جاب لیس ہوں..." اس نے شرمندگی سے جواب دیا۔
"تو یار تم مجھے بتاتے' ایسی بھی کیا بات تھی۔ دوست ہی تو دوست کے مشکل وقت میں کام آتے ہیں۔" سرفراز بھائی نے محبت بھرے لہجے میں اسے ڈانٹا۔
"بس یار' مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا..." وہ پھیکے انداز میں مسکرایا۔
"اللہ کرے خیر خیریت ہو' اتنی دیر ہو گئی ہے..." فائزہ بھابھی نے پریشانی میں ہسپتال کے کوریڈور میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ ابھی اندر سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا' تفکر کے سائے ہاشم کے چہرے پر بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور نرس کو دیکھ کر وہ تینوں اس کی طرف لپکے۔ جس کے چہرے کی سنجیدگی انہیں ہراساں کر رہی تھی۔
"اللہ کا شکر ہے آپریشن تو ٹھیک ہو گیا' لیکن پیشنٹ کا ایچ بی لیول بہت کم تھا اور ایک بچی کی تو ڈلیوری کے دوران ہی ڈیتھ ہو گئی۔" نرس نے محتاط طریقے سے انہیں اصل صورت حال سے آگاہ کیا۔ ان کے ہاں دونوں بیٹیاں ہوئی تھیں۔
"اور دوسرا بے بی؟" ہاشم بوکھلا کر بولا۔
"دوسری بچی ماشاء اللہ ٹھیک ہے' لیکن بہت کمزور ہے..." نرس کی بات پر ہاشم کے چہرے کی رنگت بحال ہوئی۔
"بہت بہت مبارک ہو یار' اللہ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے تمہیں۔" سرفراز بھائی نے کھلے دل سے مبارک باد دی۔
"تھینک یو سرفراز بھائی..." ہاشم زبردستی مسکرایا۔
اسے بچی کی پیدائش کا سن کر کچھ زیادہ خوشی کا احساس نہیں ہوا تھا' وہ بھی بختاور کی طرح دل ہی دل میں بیٹوں کی آمد کا منتظر تھا لیکن اس نے اپنے دوست اور اس کی بیوی کے سامنے اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ بختاور کو وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور فائزہ بھابھی بچی کو نہلا کر بختاور کے پاس لائیں تو وہ بے تاب انداز سے اس کے اوپر جھکی۔ بختاور کو اپنے اندر ممتا کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ محبت بھرے انداز سے بچی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔
"ہاشم دیکھو تو کتنی کیوٹ ہے یہ..." بختاور بے تحاشا خوش تھی اور اس خوشی میں اس نے ہاشم کا بجھا بجھا انداز نوٹ نہیں کیا تھا۔
"ہاں..." اس نے ذرا سا بچی کے گالوں کو چھوا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
"ارے یار! شرما کیوں رہے ہو' اپنی بچی کو اٹھا کر

پیار کرو اور اس کے کانوں میں اذان دو۔" سرفراز بھائی کی بات پر اس نے منہ بنایا۔

"ارے چھوڑیں سرفراز بھائی' یہ چونچلے گھر جا کر کر لیں گے۔ ابھی میں کچھ میڈیسن لے آؤں۔" وہ جلدی سے اپنی بات مکمل کر کے دروازے کی جانب بڑھا۔ سرفراز بھائی اور فائزہ بھابھی دونوں کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔ انہوں نے الجھن بھرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا' وہ ہاشم کے رویے کو سمجھ نہیں پائے تھے' جبکہ بختاور ان سب سے بے نیاز اپنی بیٹی کی طرف متوجہ تھی۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری ہے تمہاری بیٹی۔۔۔" فائزہ بھابھی نے بچی کو پیار کرتے ہوئے ایک ہزار کا نوٹ اسے تھمایا' بختاور شرمندہ ہوئی۔

"ارے بھابھی' اس کی کیا ضرورت ہے۔۔۔" اس نے فوراً" منع کیا۔

"بس بس' یہ مروت دکھانے کی ضرورت نہیں' یہ ہماری گڑیا کا حق ہے' اب آپ لوگوں کے پاس اور کوئی تو نہیں' اس لیے ہمیں ہی رسمیں نبھانے دیں۔" فائزہ بھابھی نے محبت سے اسے ٹوکا تو وہ بھی مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

دو دن اسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر شفٹ ہو گئی تھی۔ چھوٹے آپریشن کے بعد بھی ڈاکٹر نے اسے کچھ دن آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن اکیلے ہونے کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ بمشکل اٹھ کر گڑیا کے لیے فیڈر بنانے جاتی۔ ہاشم بچی کی پیدائش کے بعد کچھ چپ چپ سا تھا لیکن بختاور نے اپنی مصروفیت میں اس کا یہ انداز نوٹ نہیں کیا تھا۔ بچی کی آمد کے بعد دودھ کا خرچہ اچھا خاصا بڑھ گیا تھا اور یہ بات ان دونوں کے لیے پریشانی کا باعث تھی' لیکن فی الحال اس کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاشم اپنی نوکری کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا اور بختاور اس کا بھرپور ساتھ دیتی تھی' اس نے ہاشم کی مخالفت کے باوجود بچی کا نام فاطمہ رکھا تھا۔ جب کہ وہ اسے گڑیا کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

"آپ فاطمہ کو اٹھا کر پیار کیوں نہیں کرتے۔۔۔؟" بختاور کو بچی کی پیدائش کے دس دن بعد احساس ہوا کہ ہاشم اسے ہاتھ تک نہیں لگاتا تھا۔

"بھئی۔ اتنی چھوٹی بچی ہے' مجھے تو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔" اس نے لاپروائی سے بہانہ بنایا تو وہ مطمئن ہو گئی۔

اسی رات کے کسی پل بختاور کو بچی کے گلے سے خرخر کے ساتھ عجیب سی آوازیں نکلتی ہوئی محسوس ہوئیں' اس نے بوکھلا کر ہاشم کو اٹھایا' وہ بھی فاطمہ کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ دونوں ہانپتے کانپتے بچی کو لے کر قریبی اسپتال میں پہنچے' بچی کا سانس اکھڑ رہا تھا اور اسپتال پہنچنے کے دس منٹ کے بعد ننھی فاطمہ نے بختاور کے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔ دونوں اس اچانک موت پر ہکا بکا رہ گئے۔

ڈاکٹر نے بچی کی موت کی وجہ سانس کی نالی کی الرجی بتایا تھا۔ اسے پیدائشی دمہ تھا اور وہ دونوں اس بات سے بے خبر تھے۔ فاطمہ کی موت نے بختاور کو شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا۔ وہ بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی تھی۔ اسے بچی کی موت کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک عجیب بیزار کن سا دن تھا۔ بڑے ابا آج کافی دن کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکلے تھے۔ سب ہی نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا' ان کا حلیہ خاصا ملگجا اور شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ بڑی اماں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طیبہ کو اشارہ کیا۔

"بابا! ناشتہ لے کر آؤں آپ کے لیے۔۔۔" وہ ڈرتے ڈرتے ان کے قریب پہنچی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔۔۔" ان کے لہجے میں بے زاری ہی بے زاری تھی۔

"اچھا' صرف چائے بنا دوں۔۔۔؟" شائستہ بیگم نے بھی محتاط انداز میں پوچھا۔

"ہاں بنا دو۔۔۔" وہ لاؤنج کے صوفے پر آ کر بیٹھ گئے۔

"تیمور کہاں ہے؟" انہوں نے دائیں بائیں دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"ٹریول ایجنٹ کے پاس گیا ہے، ٹکٹ کا پوچھنے....."

"کب جا رہا ہے واپس انگلینڈ.....؟" وہ آج خلاف توقع لمبی بات کر رہے تھے۔ شائستہ بیگم نے سکون کا سانس لیا۔

"شاید دس پندرہ دن تک چلا جائے۔" وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

"شکر الحمدللہ، بڑے صاحب نے آج اپنے کمرے کی جان چھوڑی...." بوا رحمت فوراً لپک کر ان کے پاس آئیں اور سرگوشی کے انداز میں گفتگو کرنے لگیں۔

"بوا! آہستہ بولو، کہیں وہ سن ہی نہ لیں...." وہ خوف زدہ انداز میں بولیں۔

"آپ پاس جا کر بیٹھیں نا، یہاں کچن میں کیوں آئی ہیں؟"

"چائے کی فرمائش کر رہے ہیں وہ...." انہوں نے جلدی سے ساس پین میں پانی ڈالا۔

"آپ چھوڑیں چائے کو، میں بنا کر لاتی ہوں...." بوا کی بات پر وہ فوراً کچن سے نکل آئیں، ڈاکٹر جلال صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

"بینش نہیں آ رہی آج کل، خیریت تو ہے نا...؟" انہوں نے اخبار سے نظریں ہٹا کر پوچھا، ان کے اس سوال کو سن کر ان کی بیگم کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"نہیں، آجا تو رہی ہے، آپ ہی اپنا کمرہ بند کیے ہوئے تھے، اس لیے اندر نہیں آئی۔" انہوں نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

"آپ نے تو کچھ نہیں کہا اسے....؟" ان کا کڑا لہجہ شائستہ بیگم کی آدھی جان نکال گیا۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی میں کیوں کہوں گی بھلا ایسا؟" وہ برا مان گئیں۔

"سوچ رہا ہوں، اگلی دفعہ تیمور آئے تو اس کی شادی کر دوں، یا پھر کم از کم نکاح...." ان کا یہ جملہ تیمور نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے سنا تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر پوری قوت سے ابھرا۔ شائستہ بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے خاموش رہنے کی التجا کی، جو اس نے خلاف توقع مان بھی لی۔

"ہاں بھئی برخوردار! کیا ارادے ہیں تمہارے؟" انہوں نے طنزیہ نگاہوں سے تیمور کی طرف دیکھا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، آپ بہتر جانتے ہیں...." اس نے گول مول سا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

"خیر کہہ تو تم بھی بہت کچھ سکتے ہو، اللہ نے ضرورت سے زیادہ ہی عقل و شعور سے نوازا ہے میری اولاد کو۔" ان کے لہجے میں طنز کی آمیزش محسوس کر کے تیمور نے بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدلا، لیکن مصلحتاً خاموش رہا۔ ڈاکٹر جلال خاموشی سے اخبار پڑھنے لگے۔ جب کہ ان کی باتوں نے تیمور کا سارا سکون غارت کر دیا تھا۔



"کیا بات ہے اوریدا! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، جب بڑے ابا کسی کام سے اپنے کمرے سے نکلے تو اسے کارپٹ پر صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا، سامنے ٹی وی چل رہا تھا لیکن اس نے اس کی آواز بند کر رکھی تھی، خود وہ کافی دیر سے قالین کے ڈیزائن کو ازبر کرنے میں مگن تھی۔ اس کے چہرے پر افسردگی کی گہری تہہ تھی۔ ارصم کی باتوں نے اس کے دل و دماغ میں ایک حشر برپا کر رکھا تھا۔

بڑے ابا کی آواز پر وہ اچھل کر کھڑی ہوئی اور بوکھلا کر انہیں دیکھا۔ کئی لمحے تو اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا کہ بڑے ابا نے اسے نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ وہ کھوجتی ہوئی نگاہوں سے اوریدا کا چہرہ پڑھنے میں مصروف تھے۔

"کک کچھ نہیں بڑے ابا! ویسے ہی نیند نہیں آرہی تھی۔" وہ اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے انہیں خاصی پریشان لگی۔

"تمہاری دوست چلی گئی ہے کیا؟" ان کے اگلے سوال پر اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

"نہیں' وہ میرے کمرے میں سو رہی ہے۔" وہ ابھی تک بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کے لہجے میں اتنی مروت نرمی تو کبھی بھی اس کے لیے نہیں رہی تھی۔

"چلو' تم بھی جاؤ اپنے کمرے میں اور سونے کی کوشش کرو۔" ان کا نرم لہجہ اسے لحہ لحہ حیران کر رہا تھا' وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بڑے ابا کبھی اس سے ایسے بھی مخاطب ہو سکتے ہیں' اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے دو دفعہ اپنی آنکھوں کو بری طرح مسل کر دیکھا' یہ واقعی کوئی خواب نہیں تھا۔

"خدانخواستہ بڑے ابا کی طبیعت تو خراب نہیں تھی۔" اس سوچ نے اسے بے چین کیا۔

وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے کھولتے رکی اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ پلٹ گئی' اس کا کمرہ فرسٹ فلور پر تھا۔ وہ جلدی سے لاؤنج کی سیڑھیاں اتر کر کچن کی طرف بڑھی' سامنے بڑے ابا اپنے لیے کافی بنا رہے تھے' اس کے قدموں کی آواز پر وہ پلٹے' اوریدا کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔

"بڑے ابا! مجھے اچانک خیال آیا' آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" اس نے جھجک کر کہا اور فوراً نظریں جھکالیں۔

"نہیں... بس کافی کی طلب تھی' وہ بنا رہا ہوں۔" وہ اب خاصے سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔

"آپ اپنے کمرے میں چلیں' میں بنا کر لاتی ہوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور خلاف توقع وہ مان گئے تھے۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ہاتھ میں پکڑا کافی کا ڈبا شیلف پر رکھ دیا اور خود کچن سے نکل گئے۔

یہ آج کی رات میں اوریدا کے لیے دوسرا خوش گوار جھٹکا تھا' اس کا دل چاہا کہ وہ فوراً ارصم کو کال کر کے اس انہونی کے متعلق بتائے لیکن پھر اچانک یاد آیا کہ وہ اس سے خفا تھا۔ اس سوچ نے ایک دفعہ پھر اسے پریشان کر دیا' رات سے اسی بات نے تو اس کی نیند حرام کر رکھی تھی' اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ ارصم اس کے لیے اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔ اس نے سر جھٹک کر اس سوچ کو اپنے ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور جلدی سے کافی کپ میں ڈال کر بڑے ابا کے کمرے میں چلی آئی' وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑے تھے' جو پچھلے صحن کی جانب کھلتی تھی۔

"بڑے ابا... کافی۔" اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا اور کپ سائڈ میز پر رکھ دیا۔

"تھینک یو۔" اس دفعہ ان کی بات پر اوریدا کو حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ آہستہ سے ان کے کمرے سے نکل آئی اور خاموشی سے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اوریدا نیند میں بھی بے چین تھی اور بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔

"کون تھا وہ شخص' جس کی طرف دیکھ کر یہ اتنی زیادہ جذباتی ہو گئی۔" اپنی پریشانی سے اس کا دھیان بٹا تو اس نے عدینہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔

"کہیں یہ وہی شخص تو نہیں تھا' جس سے وہ محبت کرتی تھی۔" اس کے ذہن میں خیال ابھرا تھا۔

"لیکن وہ شخص تو مر گیا تھا۔" ایک اور سوچ نے اس کا دامن پکڑا۔

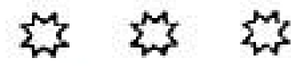
"ہو سکتا ہے' عدینہ نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو اور وہ شخص زندہ ہو۔" اس نے ایک اور اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

تب ہی اس کے سیل فون کی ٹیکسٹ ٹون بجی' اس کا دل بے اختیار دھڑکا' اسے یقین تھا کہ یہ ارصم کی

طرف سے سوری کا میسج ہو گا لیکن جیسے ہی اس نے ان باکس کھولا ' اسے چار سو بیس والٹ کا جھٹکا لگا ' دوسری طرف سرمد بھائی کا میسج تھا۔

"بڑی اماں نے تیمور ماموں سے تمہارے اور میرے پروپوزل کی بات کی ہے ' تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

یہ ٹیکسٹ پڑھتے ہی اس کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ ساری پریشان کن خبریں اسے آج ہی کی تاریخ میں مل رہی تھیں۔ ساری رات اس کی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے گزری ' وہ کوئی ایک سو ایک دفعہ سرمد کا میسج پڑھ چکی تھی ' اسے ابھی تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ بھلا ایسے کیسے ممکن ہے۔ اس نے دل ہی دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی ماہیر سے بات کرے گی اور صاف انکار کردے گی۔



اگلی صبح اتوار تھا وہ دونوں ناشتے سے فارغ ہوئیں تو دن کے دس بجے کے قریب اوریدا کے نمبر پر عبداللہ کی کال آگئی۔ وہ عدینہ سے ملنے کے لیے آنا چاہتا تھا۔ اوریدا نے کن اکھیوں سے اپنے سامنے اخبار پڑھتی عدینہ کی طرف دیکھا۔

"وہ تم سے ملنے کے لیے آنا چاہتا ہے۔" اس نے ہلکا سا جھجک کر کہا۔

"اس سے کہہ دو ' پچھلے ڈھائی سال وہ جہاں تھا ' وہیں رہے ' مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔" عدینہ نے بے رخی کی انتہا کردی۔ اپنی بات کرکے وہ ایک دم اٹھی اور گھر کے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ فون کے دوسری جانب موجود عبداللہ نے اس کا یہ جملہ بخوبی سنا تھا۔

"ایم سوری ' اس کی آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔" اوریدا نے شرمندگی سے کہا۔

"اٹس اوکے ' میں جانتا ہوں ' وہ مجھ سے خفا ہے اور اسے خفا ہونا بھی چاہیے۔" دوسری جانب وہ اس کو حق بجانب سمجھتے ہوئے مسکرایا۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو مجھے بتائیں گے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟" اوریدا کو تجسس ہوا۔

"وہ آپ کی بہت اچھی فرینڈ لگتی ہیں ' کیا انہوں نے نہیں بتایا آپ کو؟" دوسری طرف موجود عبداللہ کو حیرانی ہوئی۔

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں اس کی بہت اچھی دوست ہوں۔" اوریدا کو اس سے گفتگو میں مزہ آنے لگا۔

"اس لیے کہ عدینہ کی والدہ آپا صالحہ اسے کسی قیمت پر بھی کسی انجان دوست کے ہاں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتیں۔" اس کی صاف گوئی متاثر کن تھی۔

"آپ عدینہ کی والدہ کو بھی جانتے ہیں؟" وہ مزید حیران ہوئی۔

"کیا مطلب؟ ہمارا سارا بچپن ایک ہی علاقے میں گزرا ہے اور میں عدینہ کی والدہ کا دینی مدرسہ چلاتا تھا۔" عبداللہ نے ایک اور انکشاف کیا۔

"اوہ۔" اوریدا کو کچھ کچھ معاملہ سمجھ میں آنے لگا۔

"لیکن میں نے تو سنا تھا کہ آپ کی۔۔۔" اوریدا جھجک کر رکی ' وہ بھلا کیسے کسی کے منہ پر اس کے مرنے کی بات کرسکتی تھی۔

"یہی سنا ہوگا کہ میری ایئر کریش میں ڈیتھ ہوگئی؟" اس نے جلدی سے بات مکمل کی۔

"ایئر کریش کا تو نہیں پتا لیکن ڈیتھ کا ضرور پتا تھا ' آپ پلیز مجھے ساری بات بتائیں ' پھر ہی میں کوئی آپ کی ہیلپ کرسکوں گی۔"

اسے بہت زیادہ تجسس ہونے لگا۔ عبداللہ افسردگی سے اسے سارا قصہ سنانے لگا۔ جسے سنتے ہی اوریدا کو اپنی ساری پریشانی ' دکھ اور غم بھول گئے تھے ' وہ بس منہ کھولے حیرانی سے اس شخص کی باتیں سن رہی تھی ' جو لمحہ لمحہ اسے حیران کررہا تھا۔ محبت کی ایسی داستان بھلا اس نے پہلے کب سنی تھی۔



''آملیٹ میں اتنا زیادہ نمک کیوں ڈالا ہے؟'' ارصم ناشتے کی میز پر ایک دم ملازمہ پر برس پڑا۔ بینش کے ساتھ ساتھ آغا جی نے بھی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ گھر میں شادی کے فنکشن ختم ہو چکے تھے اور اب ارصم کی پھپھو کی دو تین دن کے بعد واپسی تھی، اس وقت سب ہی لوگ ناشتے کی میز پر موجود تھے۔

''تم فرائی انڈا لے لو۔'' بینش نے اپنی نند کی موجودگی میں ذرا دھیمے انداز میں کہا۔

''آپ کو اچھی طرح پتا ہے میں فرائی انڈہ نہیں کھاتا۔'' وہ ایک دم کرسی پیچھے کرکے اٹھ کھڑا ہوا اور غصے سے ڈائننگ روم سے نکل گیا۔ ارسلہ اور اس کی ممی نے حیرانی سے بینش کی طرف دیکھا جو ارصم کی اس حرکت پر شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھیں۔

''بیٹا... جب آپ کو پتا ہے، رات سے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، آپ کو خود خیال کرنا چاہیے تھا۔'' آغا جی نے بینش کی شرمندگی کم کرنے کے لیے بات بنائی۔ بینش کے تنے ہوئے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے۔

''آئی ایم سوری آغا جی... مجھے صبح دھیان ہی نہیں رہا، اکچوئلی اسے میرے ہاتھ کے کھانوں کی عادت پڑ چکی ہے۔'' انہوں نے بات سنبھالنے کی کوشش کی جو انہیں خاصی مہنگی پڑی۔

''معاف کیجیے گا بینش بھابی! آپ نے ارصم کو خاصی غلط قسم کی عادتیں ڈال رکھی ہیں، کل کو اسے آپ کے بغیر رہنا پڑ گیا تو کیسے گزارا کرے گا وہ۔'' ان کی نند عمیرہ کا تیکھا لہجہ ان کا دل جلا گیا۔ انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''میرے بغیر...؟'' وہ بے ساختہ بولیں۔ ''اللہ نہ کرے ارصم کو میرے بغیر کہیں رہنا پڑے، میں تو ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔''

''کچھ عرصہ کے لیے تو رہنا پڑے گا، ظاہر ہے وہ آسٹریلیا جائے گا تو تب ہی آپ کو بلا سکے گا۔'' ان کی بات نے بینش کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجا دی، آغا جی نے طنزیہ نگاہوں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا، جو اس بات کو سن کر کچھ مضطرب دکھائی دے رہی تھیں۔

''تب کی تب دیکھی جائے گی، آپ لوگ ناشتا تو کریں نا، میں ذرا جنید اور دلہن کے لیے ناشتے کا کہہ کر آؤں۔'' وہ بہانے سے اٹھیں اور کچن میں ملازمہ کو ہدایات دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ آئیں، جہاں آغا جی پہلے سے موجود تھے۔

''اپنی نند کے ارادے دیکھ لیے نا؟'' ان کی جتاتی ہوئی نگاہوں سے وہ ہلکا سا خائف ہوئیں۔

''میں بات کروں گی اس سے، ارصم کہیں نہیں جائے گا۔'' انہوں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

''لیکن اس کی بیٹی پاکستان میں بھی نہیں رہ سکتی، دیکھا نہیں صبح و شام یہاں کی چیزوں پر تنقید کرتی ہے وہ۔'' آغا جی کی صاف گوئی ہضم کرنا آسان نہیں تھا اور یہ مشکل کام بینش نے بھی مشکل ہی سے کیا تھا۔

''شادی کے بعد بچیوں کے مزاج بدل جاتے ہیں اور وہ وہیں رہتی ہیں جہاں ان کا شوہر انہیں رکھتا ہے۔'' انہوں نے محتاط انداز میں انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

''وہ مشرقی بچیاں ہوتی ہیں جن کی تربیت یہاں کے ماحول میں ہوئی ہوتی ہے۔'' آغا جی نے بھی آج ان کی کسی بھی بات سے متفق نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔

''آغا جی... آپ خوامخواہ خود کو اور مجھے پریشان کرنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔'' وہ چڑ گئیں۔

''وقت پر دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب چیزیں ابھی سے دکھائی دے رہی ہیں۔'' انہوں نے بھی بے زاری کا برملا اظہار کیا۔

''فی الحال تو میں جا کر اس ارصم کو دیکھوں، ناشتے کی میز پر اتنی زیادہ بدتمیزی کر کے گیا ہے۔'' وہ تیر کی طرح کمرے سے نکلیں اور ارصم کے کمرے میں جا کر ہی دم لیا لیکن خالی کمرہ ان کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ جھنجلا کر باہر نکلیں اور ملازمہ سے پوچھا۔

''وہ تو ابھی ابھی اپنے ہاسٹل کے لیے نکلے ہیں۔''

ملازمہ کی بات پر انہیں شاک لگا۔

"ہاسٹل کے لیے لیکن مجھ سے ملے بغیر کیسے جاسکتا ہے وہ۔۔۔" ان کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

"پتا نہیں جی' بہت غصے میں گئے ہیں وہ' مجھے بھی خوامخواہ ڈانٹ دیا تھا۔" ملازمہ نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"اچھا پیچھے ہٹو' راستے میں دیوار چین بن کر کھڑی ہوگئی ہو۔" انہوں نے اپنی جھنجلاہٹ ملازمہ پر اتاری' جو گھبرا کر کوریڈور کے ایک طرف ہوگئی تھی۔

"بینش آنٹی! ذرا ارصم کے کام دیکھیں' میں نے اتنا منع کیا' وہ پھر بھی ہاسٹل چلا گیا۔" وہ جیسے ہی لاؤنج میں پہنچیں تو ارسلہ منہ بنائے وہاں بیٹھی تھی۔ اس کی والدہ کا مزاج بھی کچھ برہم لگ رہا تھا۔

"ہاں اس نے بتایا تھا مجھے' اس کا کوئی اہم ٹیسٹ تھا۔" انہوں نے فوراً" ہی بات بنائی۔

"یہ ٹیسٹ تو ہوتے ہی رہتے ہیں' اب جاکر تو شادی کے ہنگاموں سے فرصت ملی تھی' سوچا تھا ارسلہ اور وہ ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھ لیں گے لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار نکل گیا۔" ان کی نند کو بھی برا لگا تھا اور انہوں نے فوراً" ہی اس کا اظہار کردیا۔

"عمیرہ! تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو' آجائے گا ایک دو دن میں۔" بینش نے زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ خود بھی ارصم کے رویئے پر بری طرح الجھی ہوئی تھیں۔ وہ تو ان کا بہت ٹھنڈے مزاج کا بچہ تھا' جو آج کل آتش فشاں بنا گھوم رہا تھا۔

"بھئی۔ جلدی بلوالینا اسے' میں جانے سے پہلے ارصم اور ارسلہ کی منگنی کا فنکشن کرکے جانا چاہتی ہوں۔" عمیرہ نے انہیں اپنا پروگرام بتایا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔۔۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ انہیں ارصم کو کس طرح دوبارہ گھر واپس بلوانا ہے اور اس کی ایک ہی صورت ہوسکتی تھی' جو انہیں فوراً" ہی سمجھ میں آگئی تھی۔ ان کے چہرے پر ایک پراسراری مسکراہٹ پھیل گئی۔



شانزے کے ساتھ ناراضی کے باوجود سرمد نے اسے اپنے ایک دوست کا فلیٹ کرائے پر لے دیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ زبردستی رباب کو بھی وہیں لے آئی تھی اور یہاں آنے کے بعد اس کی زندگی میں کافی خوش گوار تبدیلی آئی تھی' دو کمروں کا کھلا اور کشادہ سا فلیٹ دونوں کو بہت پسند آیا تھا۔ اسے اپنے پہلے سیریل کا ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملا تھا۔ جس سے اس نے اپنا فلیٹ سیٹ کرلیا تھا۔ رباب کا آخری سمسٹر چل رہا تھا اور وہ اس کی وجہ سے خاصی فکرمند رہتی تھی۔ رباب کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا اور اسے اپنا امتحان دے کر یہاں سے چلے جانا تھا۔

"تم کیوں میری ٹینشن لے رہی ہو یار۔" شانزے اس کے ساتھ کچن میں کھڑی بحث کررہی تھی۔

"میرے جانے کے بعد تم اکیلی اس فلیٹ میں کیسے رہوگی؟" اس نے چاولوں کو دم لگاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنادے گا۔" پہلے سیریل نے اسے کافی اعتماد دے دیا تھا۔ اس کا ڈراما آن ایر آنے والا تھا اور شہر بھر میں اس کے بڑے بڑے بل بورڈز لگ چکے تھے' جس پر شانزے کا خوب صورت دلکش چہرہ سجا ہوا تھا۔

"ایک بات کہوں رباب! اگر تم برا نہ مانو تو؟" وہ پراسرار انداز میں مسکرائی۔

"ہاں بولو۔۔۔" رباب نے سلاد بنانے کے لیے کھیرا کاٹتے ہوئے کہا۔

"میں اکثر سوچتی ہوں' کاش تمہاری شادی سرمد بھائی کے ساتھ ہوجائے۔" شانزے کے شرارتی انداز پر اس نے اسے گھور کر دیکھا۔

"تمہارے سرمد بھائی اپنی کسی کزن کو پسند کرتے ہیں' یہ تم نے ہی بتایا تھا مجھے۔" رباب نے منہ بنا کر یاد دلایا۔

"تو وہ کون سا گھاس ڈالتی ہے انہیں۔۔۔" وہ کھیرے

کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے زور سے ہنسی۔

"ہاں جس کو کوئی نہیں گھاس ڈالتا' اسے میں اپنے سر کا تاج بنالوں۔ اتنی فالتو ہوں میں۔۔۔" رباب نے بھی اس کی بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔

"تم مان جاؤ' انہیں منانا میرا کام۔۔۔" شانزے نے شوخ لہجے میں اسے دوبارہ چھیڑا۔

"شانزے! باز آجاؤ اور اپنی خیر مناؤ' تمہارا ہیرو بھی آنے والا ہے پاکستان اور اس کے عتاب سے تمہیں تمہارا بھائی بھی نہیں بچا سکے گا۔" رباب نے اسے ڈراوادیا۔

"اللہ مالک ہے یار' سوچ رہی ہوں' اس کے آنے سے پہلے ایک آدھ سیریل اور کرلوں' اکٹھے ہی ڈانٹ سن لوں گی۔" شانزے کی بات پر رباب نے جھنجلا کر اس کی طرف دیکھا۔

"شرم کرو' اچھے خاصے انسان کو ہرٹ کررہی ہو۔" اس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"بس ایک دفعہ گاڑی خریدلوں' پھر چھوڑ دوں گی۔" شانزے کے پاس بہانہ تیار تھا۔

"گاڑی تو تم ویسے بھی خرید سکتی ہو' اپنے بابا کی لاہور والی پراپرٹی میں سے کچھ سیل کردو۔" اس نے اسے مفت مشورہ دیا۔

"اس پراپرٹی پر تو خدیجہ پھپھو سانپ بن کر بیٹھی ہیں' ان کا کہنا ہے' وہ شادی کے بعد میرے کام آئے گی۔" اس نے منہ بناکر بتایا۔

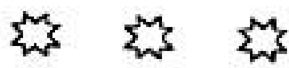
"ہاں کہتی تو وہ ٹھیک ہیں۔" رباب فوراً" ہی متفق ہوئی۔

"سوچ رہی ہوں ایک آدھ چکر لاہور کا بھی لگا آؤں' پھپھو کئی دفعہ فون کرچکی ہیں۔" شانزے کو اچانک یاد آیا۔

"شانزے! ایک بات کہوں' برامت ماننا' اس دفعہ جاؤ تو اپنی پھپھو سے اپنی مدر کے بارے میں ضرور پوچھنا۔" رباب کی بات پر ایک تاریک سا سایہ شانزے کے چہرے پر دوڑا۔ ہر دفعہ یہ موضوع اس کا دل دکھانے کا موجب بنتا تھا۔

"جب انہوں نے کبھی مڑ کر ایک دفعہ بھی میرا نہیں پوچھا تو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے۔"

وہ ناراضی سے کہہ کر کچن سے نکل گئی۔ رباب کو افسوس ہوا کہ اس نے خوامخواہ اسے رنجیدہ کردیا' وہ فوراً" سلاد بناکر اس کے پیچھے گئی' تاکہ اس سے معذرت کرسکے۔



"آخر تم عبداللہ بھائی سے ملنا کیوں نہیں چاہتی ہو؟" اوریدا نے آج کالج میں اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

گھر میں تو وہ سارا وقت بڑے ابا سے میڈیکل کے مختلف موضوعات پر بحث کرتی' اسے بھی ان کی طرح میڈیکل سے عشق ہوگیا تھا۔ بڑے ابا اس کی وجہ سے اوریدا سے بھی بے تکلفی سے بات کرنے لگے تھے۔

"میں تم سے مخاطب ہوں عدینہ۔۔۔" اوریدا نے اس کی خاموشی پر جھنجلا کر کہا۔

"مجھے اب عبداللہ کی ضرورت نہیں رہی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ اس کی اس بات پر اوریدا کو دھچکا لگا۔

"ڈھائی سال تم جس شخص کے لیے دن رات روتی رہی ہو' اب وہ سامنے آگیا ہے تو تب بھی تمہارا رونا نہیں ختم ہورہا۔" اوریدا کو اس پر غصہ آیا۔

"ڈھائی سال میں اس کی ناراضی اور موت پر روتی رہی اور اب اپنی بے قدری پر رونا آتا ہے مجھے۔" اس کے لہجے میں کیا کچھ نہیں تھا' ناراضی' بے وقعتی اور اپنی انا کو ٹھیس پہنچنے کا دکھ۔۔۔ اوریدا ایک لمحے کے لیے چپ ہوگئی۔

"تم ان سے ایک دفعہ بات کرکے تو دیکھو' ان کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔" وہ ہلکے سے توقف کے بعد بولی۔

"لیکن اب مجھے اس کے کسی جواب کی ضرورت نہیں۔ وہ اتفاقاً" مجھ سے ملا ہے۔ خود سے ڈھونڈتا ہوا تو نہیں آیا میرے پاس۔ کیا میرا ایڈریس' آپا کا فون نمبر

اور گاؤں میں میرے گھر کا راستہ نہیں آتا تھا اسے؟" عدینہ کے پاس پوری چارج شیٹ تیار تھی۔

"ہو سکتا ہے' وہ بھی خفا ہو' اسی وجہ سے نہ آیا ہو۔" اوریدا نے اس کا دفاع کیا۔

"ایسی کون سی ناراضی تھی' جس میں اس شخص نے ایک دفعہ بھی مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ وہ زندہ ہے' وہ مجھ سے خفا رہتا' لیکن مجھے اس اذیت میں جلنے کے لیے اکیلا تو نہ چھوڑتا۔" اس کا لہجہ نم ہوا۔

"ہاں۔ یہ تو واقعی غلط کیا انہوں نے۔۔۔" وہ بھی متفق ہوئی۔

"اب بھی اتفاقاً" وہ مجھ سے ٹکرایا تھا' اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ساری زندگی وہ مجھے نہ بتاتا کہ وہ زندہ ہے؟" عدینہ نے اسے لاجواب کیا۔

"اچھا۔۔۔ اب تم مجھے تو بتاؤ' میں کیا کہوں؟ وہ بار بار فون کر رہا ہے مجھے۔" اس نے اپنا مسئلہ بتایا۔

"کہہ دینا' مر گئی ہے عدینہ' اس کی مغفرت کے لیے دعا کرے اور بھول جائے اسے۔" وہ بے لچک لہجے میں گویا ہوئی۔

"یار! کچھ تو گنجائش نکالو۔ محبت کا دامن تو بہت وسیع ہوتا ہے۔" اوریدا نے آخری دفعہ اصرار کیا۔

"محبت کا دامن دنیا کے سب رشتوں سے زیادہ وسیع ہوتا ہے لیکن اس کے پندار کو ٹھیس پہنچے تو اس رشتے میں پھر ایک نقطے کی بھی گنجائش نہیں نکلتی۔" اس کے چہرے پر عجیب سی سختی آگئی تھی' اوریدا نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"تم بتاؤ' ارصم سے بات ہوئی تمہاری۔۔۔؟" عدینہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔۔۔ وہ مجھ سے خفا ہے' کالج میں بھی صبح سامنا ہوا تھا لیکن وہ اگنور کر کے دوسری سائیڈ پر چلا گیا۔" وہ افسردگی سے بتانے لگی۔

"ہر انسان اپنے ذاتی معاملات میں اتنا ہی جذباتی اور امیچور ہوجاتا ہے۔" اوریدا سنجیدہ ہوئی۔

"لیکن اس کی ممی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے' اس طرح تو وہ اپنے بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گی۔" عدینہ پریشان ہوئی۔

"انہیں اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسا ہے' انہوں نے زندگی کے کسی مقام پر شکست نہیں کھائی۔" اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"خیر ایسا تو نہ کہو' زندگی میں اتنے بے رحم فیصلے کرنے والا' خود بھی کسی نہ کسی مقام پر بدترین شکست کا شکار ہو چکا ہوتا ہے' تب ہی تو ایسا ہوجاتا ہے۔" عدینہ نے کہا۔

"تمہیں پتا ہے ماضی میں ارصم کی ممی کی' میرے پاپا کے ساتھ انگیج منٹ ہوئی تھی لیکن پاپا نے میری ماما کو پسند کر لیا۔" اوریدا زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"دیکھا' کوئی نہ کوئی بات تو نکل آئی نا۔" عدینہ اپنے اندازے کی درستی پر مسکرائی۔

"بہرحال تم ارصم کو سمجھاؤ کہ ایسے فیصلے کرنے کے بجائے کسی طرح اپنی ممی کو سمجھانے کی کوشش کرے۔" عدینہ کی بات پر اس نے اثبات میں سرہلایا' لیکن دل ہی دل میں اسے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ بینش کو سمجھانا دنیا کا ناممکن کام ہے۔

"ہاں ایک دفعہ اور بات کر کے دیکھوں گی۔" اوریدا نے اسے تسلی دی تو وہ مسکرا دی۔

"میری دلی خواہش ہے کہ میں تم دونوں کو ہنستا مسکراتا ایک ساتھ دیکھوں۔" عدینہ کی بے غرض محبت پر اوریدا مسکرا دی تھی۔

"اور میری دلی آرزو تھی کہ میں تمہیں اپنی بھابھی بناؤں' لیکن عبداللہ بھائی' اللہ جانے کہاں سے ٹپک پڑے۔" اس نے بھی شرارت کی۔ "اگر تم عبداللہ بھائی کے لیے انکار کردو تو میری آفر برقرار ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ فضول مت بولو۔ گھر چلتے ہیں' مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔" اس نے جان بوجھ کر بات کا رخ بدلا۔

وہ دونوں بڑے ابا کے ساتھ گھر پہنچی تھیں۔ بوا رحمت نے دوپہر کا کھانا لگا دیا تھا۔ بڑے ابا' عدینہ اور اوریدا ڈائننگ میز پر موجود تھے۔ عدینہ انہیں کالج میں

ہونے والے ایک سیمینار کے متعلق بتا رہی تھی، جسے وہ دلچسپی سے سن رہے تھے۔

ایک دم سے آنٹی بینش بڑے پُرجوش انداز میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوئیں۔ اوریدا کے دل کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔ اس نے خوف زدہ نگاہوں سے آنٹی بینش کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھا۔

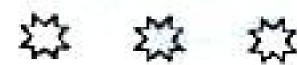
"آؤ، آؤ بینش، کھانا کھاؤ ہمارے ساتھ مل کر....." بڑے ابا نے خوش گوار انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

"نہیں تایا ابا، ابھی کچھ جلدی میں ہوں، شاپنگ پر جانا ہے۔" خوشی ان کے چہرے کے ہر نقش سے عیاں تھی۔

"شاپنگ.... خیریت....." وہ تینوں ہی چونکے۔

"جی تایا ابا! کل شام ارصم اور ارسلہ کی منگنی کا فنکشن ہے، آپ لوگوں کو انوائٹ کرنے آئی تھی۔"

آنٹی بینش نے دھماکا ہی تو کیا تھا۔ اوریدا کے ہاتھ سے پانی کا گلاس پھسلا اور سفید ٹائلوں کے فرش پر جا گرا۔ گلاس اس کے دل کی طرح ٹوٹ چکا تھا لیکن فرق صرف اتنا تھا کہ گلاس کے شیشے فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور اس کے دل کی کرچیاں کسی کو نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ ہراساں نگاہوں سے بس آنٹی بینش کی استہزائیہ نگاہوں کو دیکھ رہی تھی۔



بیٹی کی ناگہانی موت نے بختاور کو نیم پاگل سا کر دیا تھا، وہ سارا سارا دن بیٹھی روتی رہتی، اس موقع پر ہاشم نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر اسے دلاسا دیتا لیکن بختاور کے دل کو کسی صورت بھی چین نہیں آرہا تھا۔

"مجھے لگتا ہے اللہ نے مجھے کسی بات کی سزا دی ہے۔" اس کی باتیں ہاشم کو کوفت میں مبتلا کر رہی تھیں لیکن وہ دانستہ اس بات کا اظہار نہیں کر رہا تھا، کیونکہ اسے بختاور کی ذہنی حالت کا بخوبی اندازہ تھا۔ سرفراز بھائی اور فائزہ بھابھی کو بھی ننھی فاطمہ کی موت

کی خبر سن کر دھچکا پہنچا تھا اور فائزہ بھابھی' بختاور کی دل جوئی کے خیال سے آج کل ہر دوسرے دن اس کے پاس آرہی تھیں۔ وہ کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھی اسے تسلیاں دیتی رہتیں۔

"بختاور! تم قرآن پاک پڑھا کرو' اللہ تمہارے دل کو صبر دے گا۔" انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے خلوص دل سے مشورہ دیا۔

"صبر ہی تو نہیں آرہا بھابھی۔" وہ بلک بلک کر رو پڑی۔

"ابھی تو میں نے اس کے ننھے وجود کی گرمی کو محسوس کرنا شروع کیا تھا۔" وہ روتے ہوئے بمشکل بول رہی تھی۔

"پریشان مت ہو' اللہ جلد تمہاری گود بھر دے گا۔" انہوں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

"مجھے لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی گناہ کی سزا دی ہے' ایک بچی کو دنیا میں آتے ہی واپس لے لیا اور دوسری کو دس دن بعد....." بختاور کو کسی صورت سکون نہیں آرہا تھا۔

"اللہ اپنے پیارے بندوں کو ہی آزمائش میں ڈالتا ہے' اپنا دل چھوٹا مت کرو بختاور....." فائزہ بھابھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے سمجھایا۔

"میں کیا کروں بھابھی! ہر وقت میرا دل بے چین رہتا ہے۔" وہ نم لہجے میں گویا ہوئی۔

"تم زیادہ سے زیادہ استغفار کیا کرو اور اللہ سے دعا مانگا کرو۔" کمرے میں داخل ہوتے ہاشم نے ان کا یہ جملہ بغور سنا اور فوراً ہی بولا۔

"میں تمہیں انگلش لٹریچر کی بہت سی کتابیں لائبریری سے ایشو کروا کر لادوں گا۔" ہاشم کو پتا تھا کہ اسے مطالعے کا کریز ہے۔

"ہاشم بھائی! اسے انگلش لٹریچر کے بجائے' اللہ سے رجوع کرنے دیں' اس کا ذہن پرسکون ہو جائے گا۔"

فائزہ بھابھی کی بات پر ہاشم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن اس کی تیوری کے بل کچھ گہرے ہو گئے تھے۔

وہ دونوں میاں بیوی کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد ہاشم نے اسے سمجھانے کے لیے اچھا خاصا بڑا لیکچر دیا تھا۔ بختاور کا دل کچھ ٹھہر گیا تھا۔

اسی لیکچر کے نتیجے میں اگلے دن بختاور نے ننھی فاطمہ کی چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھا کر ایک بڑے شاپر میں ڈالیں۔ وہ انہیں کسی ایسی جگہ چھپانا چاہتی تھی جہاں پر اس کی نظر نہ پڑے اور انہیں دیکھ کر اس کے دل کو اذیت کا احساس نہ ہو۔ ان چیزوں کے لیے اسے ہاشم کا بڑا ٹرنک ہی بہتر اور محفوظ لگا تھا۔

اس نے افسردگی سے بیڈ کے نیچے پڑے ہاشم کے بڑے ٹرنک کو نکالا' وہ خاصا وزنی تھا۔ اس نے جیسے ہی اسے کھولا' وہ مختلف بوسیدہ کتابوں' کاغذات' فائلوں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اکثر چیزوں پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ شاپر کو اندر رکھنے کے لیے جگہ بنانے لگی' اچانک اس کی نظر اسی باکس میں ایک طرف رکھی کتاب پر پڑی۔ بختاور کو بری طرح جھٹکا لگا۔

اس نے سرعت سے اس کتاب کو اٹھایا اور اس کی گرد پر ہاتھ پھیرا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔ جس پر تمام مسلمان ممالک نے بین لگا دیا تھا اور وہ پاکستان میں اس کی موجودگی خصوصاً" ہاشم کے پاس اس کے ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

یہ شیطان رشدی کی مشہور زمانہ شیطانی کتاب The Satanic Verses تھی۔ اس کتاب کے سرورق پر "شیطانی آیات" کے لکھے گئے الفاظ پڑھ کر بختاور کا دماغ بھک کر کے اڑا۔ وہ صدمے کے عالم میں اس کتاب کو دیکھ رہی تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ہاشم فلیٹ کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہو کر اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ)

نداحسنین

آخری چال

جس طرح ایک فوجی کو اپنی وردی پر ڈاکٹر کو اپنے کلینک میں بیٹھے مریضوں کے قطار پر 'لکھاری کو اپنے قلم پر' کسان کو اپنے کھیت پر ناز ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بیٹے کی ماں کو اپنے خوبرو' اعلا تعلیم یافتہ' فرماں بردار' اعلا عہدے پر فائز بیٹے پر بھی ناز ہوتا ہے۔ اور ان تمام خوبیوں کے ساتھ اگر بیٹا اکلوتا ہو تو پھر تو مانو سونے پہ سہاگہ والا عالم ہوتا ہے۔

خدیجہ خاتون کے لیے بھی عذیر ان کی زندگی کا قیمتی سرمایہ تھا۔ جوانی میں ہی شوہر کے انتقال کے بعد جس محنت مشقت سے انہوں نے پڑھا لکھا کر اسے جوان کیا تھا' یہ تو صرف ان کا دل اور اللہ ہی جانتا تھا۔ ایسے مشکل وقت میں جب دنیا نے ساتھ چھوڑ دیا تھا تب صرف ان کی بہن زلیخا اور اظہار احمد (بہنوئی) نے بہت ساتھ نبھایا۔ اس ساتھ کی بنا پر خدیجہ کے دل میں اپنی بہن اور بہنوئی کی قدر مزید بڑھ گئی تھی۔ اور آج جب عذیر ایک پھل دار درخت کی صورت پھل دینے کے قابل ہو گیا تو ان کے دل میں بھی بیٹے کے سر پر سہرے کے پھول سجانے کی خواہش جاگی اور نظر انتخاب اپنی عزیز از جان' بہن زلیخا کی بیٹی کومل پر جا ٹھہری۔

کومل اپنی نام کی طرح کومل حسن کی مالک تھی۔ ایسا حسن جو شہزادیوں جیسا تھا' کچھ زلیخا نے اکلوتی بیٹی کو بے انتہا لاڈ پیار میں پالا کہ گھر میں گرا ایک تنکا تک اسے اٹھانے نہ دیا۔ اور اس بے جا لاڈ پیار نے کومل کے مزاج پہ بھی خوب اثر ڈالا تھا۔ کہتے ہیں جب اللہ حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ پر یہاں صرف نزاکت ہی نہیں غرور' تکبر' ناز و ادا' خود پسندی اور خود غرضی نے بھی بسیرا کر ڈالا تھا۔ کومل کے خوابوں میں جو شہزادہ اکثر سیاہ کرولا میں آتا تھا وہ کوئی اور نہیں عذیر ہی تھا۔ اس نے اکثر عذیر کی خوابناک آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات دیکھے تھے۔ اور ان ہی جذبات نے اسے یقین دلایا تھا کہ عذیر پہ صرف اس کا حق ہے۔ جلد یا بدیر عذیر نے خالہ جان کو اس کے گھر رشتے کے لیے ضرور بھیجنا تھا۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

عذیر خوشگوار حیرت میں مبتلا ہوا جب خدیجہ نے کومل کے لیے اس کی رائے جانی۔ وہ تو اس کے دل کی ملکہ تھی۔ اتنی حسین' پیاری لڑکی کو کوئی عقل کا اندھا ہی نظر انداز کر سکتا تھا اور وہ عقل کا اندھا تو بہر حال نہیں تھا۔ دل ہی دل میں وہ بہت خوش تھا کہ ماں نے اسی لڑکی کا انتخاب کیا۔ جسے وہ دل دے چکا تھا۔ پہلی ہی فرصت میں ماں کو اقرار میں اپنا جواب دے کر' خالہ کے گھر رشتہ بھیجنے کا عندیہ دیا۔ خدیجہ بیٹے کی ہاں سے پھولی نہ سمائی تھیں۔ جھٹ سے مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے منگوائے اور اگلے ہی دن زلیخا کے گھر روانہ ہو گئیں۔

زلیخا بہن کے۔۔۔ آنے کا مقصد جان کر دل ہی دل میں کوئی لاکھ بار تو اللہ کا شکر ادا کر چکی تھیں۔ ان کے تو من کی مراد تھی کہ بہن کے گھر کا اجالا ان کی بیٹی بنے۔ ان کے دل کی مراد پوری ہو چکی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں کہ بیٹی ماں جیسی خالہ کے گھر بیاہ کر جائے گی اور سدا خوش رہے گی۔ وہ چاروں ایک دوسرے کے دل کے حال سے بے خبر تھے۔ مگر خبر رکھنے والی ذات تو

جانتی تھی کہ اس نے ان سب کی مراد پوری کر دی تھی۔ یوں کچھ ہی دنوں میں چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق، کومل ماں کی دعائیں لے کر باپ کی شفقت کے سائے تلے خالہ کے گھر چھم چھم کرتی عذیر کی ہمراہی میں اتری۔

اکلوتی بہو وہ بھی بہن کی بیٹی، خدیجہ نے خوب نخرے اٹھائے، چاؤ چونچلے کیے۔ دو مہینوں تک وہ بیٹے اور بہو کی خدمتیں کرتی رہیں۔ یہ ماں کا پیار تھا اپنی اولاد کے لیے، مان تھا بیٹے پر کہ وقت آنے پر بیٹا بھی ان کی خوشیوں کا یوں ہی خیال رکھے گا، ان کی خدمت کرے گا۔ یقین تھا بھابھی پر کہ وہ بھی انہیں ماں جیسا عزت و احترام بخشے گی۔ پر ہوتا یوں ہے کہ انسان جب بندوں سے توقعات رکھتا ہے تو بس دھوکا کھاتا ہے۔ وہ اگر یہی توقعات اللہ سے رکھے تو کبھی مایوس نہ ہو۔

شادی کو ڈھائی ماہ ہی گزرے تھے کہ اظہار احمد آفس سے آتے ہوئے ایک اندوہناک حادثے کا شکار



ہو کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ زلیخا پہ جیسے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بھری دنیا میں وہ اکیلی رہ گئیں۔ کومل ماں کے دکھ کو کم کرنے کی خاطر چالیسویں تک میکے آکر رہنے لگی۔ خدیجہ بہن کا دکھ اچھی طرح سمجھتی تھیں۔ خود بھی ایک عرصے تک یونہی تنہا زندگی گزاری تھی۔ تنہائی کی اذیتوں سے خوب واقف تھیں لہٰذا چالیسویں کے بعد بہن کو ہمیشہ کے لیے گھر لے آئیں اور ان کا گھر کرائے پر اٹھا دیا۔

پانچ ماہ گزر جانے کے باوجود بھی کومل کو خدیجہ نے اب تک گھر کے کام میں حصہ لینے کے لیے نہیں کہا تھا۔ زلیخا بھی بیٹی کو بڑی بہن کے گھر یوں عیش و عشرت میں خوش و خرم زندگی گزارتے دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی رہیں۔ اپنی بیٹی کے آرام کے لیے وہ خدیجہ کے ساتھ سارا دن لگی رہتیں کہ بہن کو کبھی شکایت نہ ہو۔ پر کب تک۔ دونوں ہی ضعیف خواتین تھیں۔ دن رات گھر داری' چولہا ہانڈی کرتے کرتے شدید تھکن کا شکار ہو جاتیں۔ اور ایسے ہی ایک دن تھکن سے چور ہو کر خدیجہ شدید بیمار پڑ گئیں۔ بہن کے بیمار پڑنے پر زلیخا گھر کی ساری ذمہ داریاں اٹھانے پر مجبور ہو گئیں اور دن رات ماں کو اکیلا کام کرتے دیکھ کر مجبوراً" کومل کو ان کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ پر یہ ہاتھ بٹانا کومل کو کافی گراں گزر رہا تھا۔ اوپر سے عذیر کا بھی سب کچھ بھول بھال ماں کی خدمت میں لگنا اسے ناگوار گزر رہا تھا۔

خدیجہ کو ملیریا نے آگھیرا تھا۔ اور ان کے یوں بستر سے لگنے پر زلیخا کی مدد کروا کروا کر کومل بے زار ہو گئی تھی۔ اور اسی بے زاری و چڑچڑاہٹ کی وجہ سے اس دن اس نے خدیجہ سے بدتمیزی کر ڈالی۔ بات بہت معمولی سی تھی مگر کومل نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ کچن کی صفائی کر کے انتہائی بگڑے مزاج کے ساتھ کومل کچن سے باہر آئی تھی کہ اسے خدیجہ نے آواز دے کر یخنی بنانے کا کہہ ڈالا جس پر وہ چراغ پا ہو کر غصے سے پھنکاری۔

"خالہ جان! سارا دن آپ نے بستر پر پڑے پڑے حکم ہی دینا ہوتا ہے۔ ذرا دوسروں کا بھی خیال کر لیا کریں۔ اب ایسی بھی کوئی بیمار نہیں پڑیں آپ کہ بندہ گھڑی گھڑی کچھ کھلاتا پلاتا رہے۔ سارا دن پاگلوں کی طرح کچن میں لگی ہوئی ہوں پر ذرا جو خیال ہو آپ کو میرا' بس اپنی ہی فکر لگی رہتی ہے 'یہ چاہیے وہ چاہیے۔" انتہائی غصے سے کہتی ہوئی وہ پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھی تھی کہ سامنے عذیر کو دیکھ کر گڑبڑا گئی۔ اسے پتا بھی نہ چلا تھا کہ عذیر کب اس کے عقب میں آکھڑا ہوا۔

"نہ جانے عذیر نے میری کتنی بات سنی۔" اپنی دھن میں خالہ کو بے بھاؤ کی سنا کر وہ اب پچھتا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی عذیر ماں سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس کی اس بدتمیزی پر کہیں بدظن ہی نہ ہو جائے۔ کومل کا یہ جارحانہ رویہ خدیجہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ سامنے بیٹے کو کھڑا دیکھ کر تکلیف سے ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اور ماں کی آنکھوں سے نکلتے آنسو عذیر کو تڑپا گئے۔

"کس لہجے میں بات کر رہی ہو تم میری امی سے کومل! تمہیں ذرا احساس ہے کہ جس عورت کو تم باتیں سنا رہی ہو۔ وہ تمہیں اب تک بستر پر بٹھا کر کھانا کھلاتی رہی ہے تمہارے نخرے اٹھاتی رہی ہے۔" وہ انتہائی غصے سے بول رہا تھا۔ اسے حقیقی معنوں میں کومل کے رویے سے دکھ پہنچا تھا۔

"عذیر! میں بس اتنا کہہ رہی تھی کہ میں شام کو بنا دوں گی۔ ابھی اس گرمی میں میری حالت خراب ہو رہی تھی۔" عذیر کو غصے میں دیکھ کر اس نے فوراً" پینترا بدلا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے وہ اب بڑی معصومیت سے بول رہی تھی۔

"تم نے جو کہا میں نے سب سن لیا ہے کومل! رہنے دو تم میں خود اپنی ماں کے لیے یخنی بنا لوں گا۔" عذیر کے درشتی سے کہنے پر وہ پہلے حیرت سے اسے دیکھتی رہی اور پھر پیر پٹختی غصے سے کمرے سے نکل گئی۔

عذیر ماں کے پاس۔ بیٹھ کر ان کی دل جوئی کرنے لگا۔ زلیخا غسل کر کے آئیں تو خدیجہ کا اترا ہوا چہرہ دیکھ

کر حیرانی سے اس کا سبب دریافت کرنے لگیں۔ جس پر عذیر نے من وعن سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔



"یہ عذیر کو بھی آج جلدی گھر آنا تھا۔ آج پہلی بار خالہ کے سامنے منہ کھولا تھا اور عذیر نے سب سن لیا۔ اب منانا پڑے گا دونوں ماں بیٹے کو۔ ہونہہ!" غصے سے کمرے میں ٹہلتی وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی۔

تب ہی زلیخا اسے گھورتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"یہ کیا بدتمیزی کر کے آئی ہو تم آپا سے' اتنی منہ پھٹ اور بدلحاظ کیسے ہو گئی ہو تم۔ چلو چل کر معافی مانگو ان سے۔" وہ اسے گھرکتے ہوئے بول رہی تھیں۔

عذیر نے جو بتایا اسے سن کر ان پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

"امی! میں کیوں معافی مانگوں۔ میری کیا غلطی ہے جو میں معافی مانگوں۔" وہ بری طرح بدکی۔

"تمہاری نہیں تھی تو کس کی تھی۔؟ اک ذرا سی بات پر آپا کو کتنا سنا کر آئی ہو تم۔" زلیخا کو اس کی بات پر سخت تاؤ چڑھا۔ کومل کو جھڑکتے ہوئے کہنے لگیں۔

"امی آپ کو نہیں معلوم خالہ نے مجھے کتنا سنایا ہے۔ عذیر نے تو آدھی بات سن کر مجھے اتنا ڈانٹا مجھے بتانے بھی نہ دیا کہ خالہ نے مجھے کیا کیا کہا تھا۔" اسے کوئی اور بہانہ نہ ملا تو جھوٹ بولنے لگی۔

"کیا کہا تھا آپا نے۔" اس کی بات پر زلیخا ٹھٹکیں۔

"کہہ رہی تھیں دن بھر تم کرتی کیا ہو۔ زلیخا نے بالکل تمہاری تربیت نہ کی۔ وہ تو میں ہوں جس نے تمہیں شہزادیوں جیسا رکھا ہوا تھا کوئی اور ساس ہوتی تو کب کی گھر سے نکال باہر کرتی۔"

بس پہلا جھوٹ بولنا مشکل لگتا ہے اور وہ جھوٹ جب خاطر خواہ نتیجہ دیتا ہے تو جھوٹ بولنے کے اگلے تمام مراحل بخوبی طے پا جاتے ہیں اور یوں انسان جھوٹا ہونے کا تاج خوشی خوشی سر پر سجا لیتا ہے۔ کومل بھی اب دھڑلے سے منہ بھر بھر کر جھوٹ بول رہی تھی۔

اور زلیخا کا دل بیٹی کی باتیں سن کر پسیجا جا رہا تھا۔

"عذیر اور خدیجہ نے تو یہ سب نہیں بتایا۔" ساری بات سن کر زلیخا آزردگی سے بولیں۔

"عذیر تو اس وقت آئے ہی نہیں تھے جب خالہ مجھے باتیں سنا رہی تھیں۔ اور خالہ کیوں اپنی غلطی بتائیں گی۔ وہ تو بس میری ہی شکایت لگائیں گی ناں۔" وہ ماں پر اپنے آنسوؤں کا اثر ہوتا دیکھ کر سوں سوں کرتی بول رہی تھی۔

"آپا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" وہ خود کلامی کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

خدیجہ کے کمرے میں پہنچیں تو وہ وہاں اکیلی بیٹھی تھیں۔ عذیر شاید کچن میں تھا۔

"کیا ہوا کومل نہیں آئی۔" خدیجہ کومل کا انتظار کر رہی تھیں کہ اسے پیار سے سمجھا سکیں۔ اور دونوں میاں بیوی کا دل صاف کر سکیں۔ مگر زلیخا کو اکیلا آتا دیکھ کر ٹھٹک کر پوچھنے لگیں۔

"نہیں آپا!" زلیخا اتنا کہہ کر ایک لحظہ کو خاموش ہوئیں اور پھر کچھ سوچتے ہوئے شکوہ کناں ہوئیں۔

"آپا! آپ کو بھی کومل کو میری تربیت نہ کرنے کا طعنہ نہیں مارنا چاہیے تھا۔ میں مانتی ہوں کومل سگھڑ نہیں پر میں شکایت کا کوئی موقع نہ دیتی۔ آپ مجھے کہہ دیتیں میں بتا دیتی سوپ کومل سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں آپ کو۔" اتنا کہہ کر زلیخا وہاں سے فوراً چلی گئیں۔ اور خدیجہ مارے حیرت کے انہیں جاتا دیکھتی رہ گئیں۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ پر دونوں بہنوں کے دلوں میں گرہ سی پڑ گئی۔

اولاد کی محبت بڑی ظالم شے ہے، ہر رشتے ناتے سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ یوں کہ اولاد کی محبت ہی سب سے عزیز ہو جاتی ہے۔ خدیجہ اور زلیخا کی لازوال محبت اب اولاد کی محبت کے نذر ہونے لگی تھی۔ زلیخا اب خدیجہ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھیں جبکہ زلیخا کی اس بدگمانی نے خدیجہ کا دل بھی دکھا دیا تھا جبکہ عذیر اور کومل سب بھول بھال کر پہلے کی طرح رہ رہے تھے۔

چند ماہ اور گزرے تو عذیر کو دبئی کی ایک کمپنی سے جاب کی آفر آئی۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی ساتھ رکھ سکتا تھا۔ مگر پہلے اسے جاب کے سلسلے میں اکیلے ہی دبئی جانا تھا۔ پر یہاں بھی اختلاف نے سر اٹھایا۔ خدیجہ بیٹے کو ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ بیٹا نظروں کے سامنے رہ کر ہی کمائے۔ انہوں نے شوہر کے انتقال کے بعد ساری امیدیں بیٹے سے ہی لگائی تھیں۔ اب اگر بیٹا باہر چلا جاتا تو وہ کس کے سہارے جیتیں۔ جبکہ کومل چاہتی تھی کہ عذیر دبئی کی ملازمت کے لیے حامی بھرے۔ عذیر وہاں جائے گا تو اسے بھی ضرور بلوائے گا۔ اور پھر وہ وہاں آسائشوں بھری زندگی گزارے گی۔ دبئی کے مہنگے مالز میں شاپنگ کرے گی۔ اس کی سہیلیاں تو اس کے دبئی جانے کا سن کر ہی جل اٹھیں گی۔ دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ مسلسل عذیر کو دبئی جانے کے لیے راضی کرتی رہی۔ خود عذیر کی بھی یہی منشاء تھی۔ شاید تب ہی وہ خدیجہ کو روز مناتا اور یقین دلاتا کہ وہ انہیں وہاں جاکر ضرور بلالے گا۔

زلیخا خاموش تھیں۔ مگر ان کا جھکاؤ بھی عذیر کے دبئی جانے میں تھا۔

ان سب کی خواہشوں کو مدنظر رکھ کر خدیجہ نے عذیر کو دبئی جانے کی اجازت دے دی۔ عذیر نے سارے انتظامات مکمل رکھے تھے۔ اسے پہلے ہی یقین تھا کہ جانے کی اجازت دے دیں گی۔ سو اجازت ملتے ہی ایک ہفتے کے اندر اندر وہ دبئی روانہ ہوگیا۔ عذیر کے دبئی جاتے ہی کومل کے رنگ ڈھنگ بدل گئے' عذیر کے رعب میں وہ خالہ کی جو تھوڑی بہت عزت کرلیتی تھی' ان کی بات مان لیتی تھی۔ اب مکمل طور پر اپنی من مانی پر اتر آئی۔ جس بات نے خدیجہ کو سب سے زیادہ حیرت میں مبتلا کیا' وہ زلیخا کی کومل کے لیے خاموش حمایت تھی۔ یعنی بہن سمدھن کا' اور بھانجی روایتی بہو کا روپ دھار چکی تھی۔ بیٹے کے جاتے ہی وہ خود کو بے حد کمزور محسوس کرنے لگی تھیں۔ گھر پر ان کی اجارہ داری ختم ہورہی تھی۔ کومل رفتہ رفتہ گھر کی کرتا دھرتا بن گئی تھی۔

خدیجہ فطرتاً" نرم دل اور نیک طبیعت کی مالک تھیں۔ دور اندیش ضرور تھیں مگر تیز و طرار' جھگڑالو عورتوں کے قبیلے سے تعلق نہیں رکھتی تھیں۔ جبکہ کومل ساس کی خاموشی پر مزید شیر ہوگئی تھی۔ زلیخا بری بہن نہ تھیں مگر بیٹی کی محبت نے ان کے اندر کی مخلص بہن کو کہیں دبا کر رکھ دیا تھا۔ ناز و نعم میں پلی بیٹی عیش و عشرت اور بحیثیت گھر کی ملکہ کے طور پر زندگی گزارتی کس ماں کو بری لگتی ہے؟

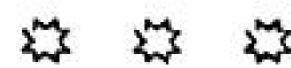
یہ بڑا ہی عجیب دستور ہے دنیا کا۔ اچھائی سے محبت اور برائی سے نفرت تو ہر کوئی کرتا ہے پر جو اچھے لوگ کہلاتے ان میں ایکا نہ ہوتا اور جہاں برے لوگ ہوتے وہ اتحاد بنا کر رہتے۔ ماں جیسا قابل احترام رشتہ جس کا نام سن کر ہی نظریں عقیدت سے جھک جائیں۔ دل میں محبت بھر جائے۔ وہی ماں ایک دوسری ماں کے درد کو جانتے ہوئے بھی زیادتی کررہی تھی۔ حد سے زیادہ بڑھی اندھی محبت انسان کو اکثر غلط فیصلوں اور غلط رویوں کو اپنانے پہ مجبور کردیتی ہے۔ بیٹی کی خاموش حمایت نے دو بہنوں کے رشتے کو رفتہ رفتہ کمزور کرڈالا تھا۔

عذیر کو گئے تین ماہ سے زائد کا عرصہ ہوچکا تھا۔ مکمل انتظام کرنے کے بعد وہ اب ان سب کو اپنے پاس بلانا چاہتا تھا۔ مگر یہاں بھی کومل کی خود غرضی آڑے آگئی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ساس نام کا ٹنٹنا دبئی میں بھی اس کے ساتھ لگا رہے۔ وہ زلیخا کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی کیونکہ ماں کو ساتھ لے جانا اس کے لیے فائدہ مند تھا۔ وہ گھر بھی سنبھال سکتی تھیں۔ اور بناء روک ٹوک کے وہ اس کی کافی مدد بھی کرسکتی تھیں۔ کومل جیسی خود غرض لڑکی کو ماں کی ضرورت بھی فقط کام کے حوالے سے تھی۔ سو اس نے خدیجہ کو دبئی جانے سے روکنے کے بہانے سوچنا شروع کردیئے۔ زلیخا بیٹی کا ارادہ جان کر خوش تھیں۔ دبئی جانے کے شوق نے انہیں بہن کی فکر سے بھی بے پروا کردیا تھا۔

دونوں ماں بیٹی نے خدیجہ کو دبئی جانے سے روکنے کے لیے تراکیب لڑانا شروع کر دیں۔ خدیجہ ان کے خیالات اور نیتوں سے لاعلم نہیں تھیں، مگر اپنی فطرت سے مجبور خاموش تھیں۔ وہ جان چکی تھیں کہ اب پہلے جیسا نباہ ممکن نہیں۔ بہو اور بہن کا پلڑا ان سے بھاری ہے اور وہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ پر کیا وہ اتنی آسانی سے اپنا حق انہیں لوٹنے دیں گی۔

کومل سے انہیں اتنی شکایت نہ تھی جتنی بہن سے تھی۔ زلیخا کو انہوں نے کبھی خود سے الگ نہ سمجھا۔ بیٹے سے محبت انہیں بھی تھی۔ بے انتہا تھی۔ پر انہوں نے اس محبت سے مجبور ہو کر کوئی غلط یا ناانصافی پر مبنی رویہ نہیں اپنایا تھا، نہ ہی بہن یا بھانجی کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی کی تھی۔ پر زلیخا نے ان کے رشتے اور محبتوں کو بھلا کر بیٹی کی ہر جائز و ناجائز بات پر ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو ان کے گھر کے حالات آج یہ نہ ہوتے۔

انہوں نے دبئی جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہی رہنا چاہتی تھیں۔ ان کے دبئی جانے سے انکار سن کر زلیخا اور کومل بے حد خوش تھیں۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان کے کسی چال چلنے سے قبل ہی خدیجہ نے خود ہی دبئی جانے سے انکار کر دیا تھا۔ پر عذیر کے اگلے فیصلے سے کومل اور زلیخا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ عذیر نے ماں کے انکار کے بعد صرف کومل کو دبئی بلایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماں اکیلے نہیں رہ سکتی اس لیے خالہ کو ان کے ساتھ رہنا چاہیے۔ کومل نے زیادہ چوں چراں نہ کی۔ اسے خوف تھا کہ ضد کرنے پر کہیں اس کا جانا بھی کینسل نہ ہو جائے۔ زلیخا کو کومل کے اس فیصلے نے دکھ پہنچایا تھا۔ جس بیٹی کے لیے انہوں نے بہن سے رشتہ خراب کر ڈالا تھا وہ بڑے اطمینان سے انہیں یہاں چھوڑ کر دبئی روانہ ہو گئی تھی۔



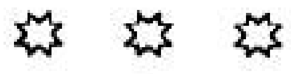
انہیں دبئی گئے ایک سال ہو چکا تھا۔ آج صبح اطلاع آئی تھی کہ ان دونوں کو اللہ نے اولادِ نرینہ سے نوازا ہے۔

"مبارک ہو زلیخا۔ تمہاری بیٹی بھی بیٹے کی ماں بن گئی۔" خدیجہ نے عام سے لہجے میں کہا تھا۔

"تمہیں بھی مبارک ہو آپا۔ تم بھی پوتے کی دادی بن گئی ہو۔" زلیخا نے مسکرا کر آٹا گوندھتے ہوئے جواب دیا۔

ان دونوں کی اولادیں انہیں چھوڑ کر دور جا بسی تھیں۔ سو اب ان کے بیچ جھگڑا ختم ہو چکا تھا۔ بہنوں والا رشتہ دوبارہ استوار ہو چکا تھا۔ نہ شکایت کی ایک دوسرے سے، نہ طعنہ بازی اختیار کی گئی۔ جو درمیان میں فاصلوں کا سلسلہ آگیا تھا وہ خود بخود ختم ہونے لگا۔ اختلاف کی وجہ دور ہوئی تو اختلاف بھی ختم ہو گیا۔

بہنوں کی ازلی محبت پھر سے جاگ اٹھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتیں، خیال رکھتیں، اپنے اپنے دکھ درد بانٹتیں، بچوں کو مل کر یاد کرتیں۔ گھر کے کام کاج کا کیا تھا۔ نہ پہلے جیسی جسم میں طاقت تھی، نہ پہلے جیسا کام کا جنون۔ مل کر ہانڈی بنا لیتیں اور صبر شکر کر کے کھاتیں۔ باہر کے کام کاج کے لیے دن بھر کے لیے ایک ملازم بچہ رکھ لیا تھا۔ جو ان کے باہر کے کام کر دیا کرتا تھا۔ آمدنی کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ خدیجہ کو شوہر کی پنشن بھی ملتی اور بیٹے کی طرف سے بھی اچھی خاصی رقم آتی۔ زلیخا کو شوہر کی پنشن اور گھر کا کرایہ ہر ماہ وقت پر مل جاتا۔ سو گزر بسر اطمینان سے ہو رہی تھی۔



رات کا وقت تھا گو کہ دن گرمی کے تھے پر راتیں پھر بھی ٹھنڈی تھیں۔ اس پل بھی کھڑکی سے آتی ٹھنڈی ہوا بڑی فرحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں بہنیں گھر کے دروازے بند کر کے ایک نظر ڈال کر اب سونے کی نیت سے بستر پہ لیٹی تھیں۔

"جانے کیسا دکھتا ہو گا میرا نواسا۔ بیٹا تو کوئی تھا نہیں جو ارمان پورے کرتی، اب نواسا ہوا ہے تو میلوں دور

ہے۔" نواسے کے خیالوں میں گم زلیخا بولیں۔ خدیجہ ان کی بات سن کر مبہم سا مسکرا دیں۔

"بیٹے والی ماں ہونا بڑے اعزاز کی بات ہوتی ہے آپا۔ اللہ نے مجھے تو نہ بخشا یہ اعزاز' پر صد شکر اللہ تعالیٰ کا کہ میری بیٹی کو یہ نعمت عطا کی۔" زلیخا اب خدیجہ کی جانب کروٹ لے کر ان سے مخاطب تھیں۔

"نہ جانے کیوں بیٹے کو اعزاز سمجھا جاتا ہے زلیخا۔ شاید اس لیے کہ وہ بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ بیٹی کی رخصتی تو فرض ہے ماں باپ' پر بیٹی کے گود میں آتے ہی اس کی رخصتی کی فکر ستاتی ہے پر بیٹے کے گود میں آتے ہی کوئی بھی ماں اس کے رخصت ہونے کا نہیں سوچتی' پر بیٹا پھر بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ اور زلیخا یہ جو اولاد ہوتی ہے ناں' یہ بڑی آزمائش ہوتی ہے اور اس آزمائش میں کامیابی کا دارومدار ان بیجوں پہ ہوتا ہے' جو ہم اب تک بوتے چلے آ رہے ہیں۔ کومل کی گود میں بھی آزمائش اتری ہے۔ اللہ اسے حوصلہ دے اس آزمائش میں پورا اترنے کا۔" بڑی گہری بات کہی تھی خدیجہ نے۔

زلیخا کو چپ سی لگ گئی۔ بہن نے بھانجی کے لیے دعا میں حوصلہ مانگا تھا۔

دل کو عجیب سے احساس نے آگھیرا۔ کچھ پل کمرے میں خاموشی چھائی رہی' اتنی کہ بس چلتے ہوئے پنکھے کی گھرر گھرر کرتی آواز گونجتی رہی۔ بالآخر زلیخا کی آواز نے چھائی خاموشی کے سکوت کو توڑا۔

"آپا! میں نہیں چاہتی تھی کہ تم بیٹے کے ساتھ دبئی جاؤ۔ مجھے لگتا تھا کہ وہاں جا کر بھی ہم لوگ ایک ساتھ خوش نہیں رہ پائیں گے بلکہ مزید جھگڑے بڑھیں گے۔"

زلیخا کے کہنے پر خدیجہ نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر بولیں۔ "جانتی ہوں۔ اسی لیے میں نے خود انکار کر دیا تھا وہاں جانے سے۔ اور۔" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔

زلیخا کو ان کی اس آگہی پر ذرا بھی حیرت نہ ہوئی۔ خدیجہ نے ایک نظر زلیخا کو دیکھا اور سلسلہ کلام پھر سے وہیں سے جوڑا جہاں سے منقطع کیا تھا۔

"اور عذیر کو بھی میں نے ہی منع کیا تھا تمہیں دبئی بلانے سے۔" اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے زلیخا کی طرف کروٹ کر لی۔

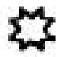
"جانتی ہوں آپا۔"! زلیخا کے لب پھیل کر مسکرائے۔

خدیجہ نے بے فکری سے ایک نظر بہن کو دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ کھڑکی سے ایک ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔

"ہائے بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے آج۔ نیند بڑی اچھی آئے گی۔" زلیخا جمائی لیتے ہوئے بولیں۔

"ہونہہ! اب سو جاؤ تم بھی' مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" خدیجہ نیند سے بوجھل لہجے میں بولیں۔ اور پل بھر میں دونوں بہنیں نیند کی وادی میں جا سوئیں۔

بڑھاپا اکیلے نہیں گزرتا۔ کوئی ساتھی ضرور چاہیے ہوتا ہے۔ ہم سفر تو کب سے ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ اب اولاد بھی پرندوں کی مانند اڑان بھرنے کو تھی' ایسے میں کون ساتھ رہتا۔ تب ہی دور اندیش خدیجہ نے پرندوں کو اڑنے دیا۔ اور بہن کو روک لیا۔ جانتی تھیں وہاں جا کر بہن اکیلی رہتی اور یہ یہاں اکیلی۔ سو لاکھ درجے بہتر تھا کہ ایک دوسرے کی غم گسار بن کر پھر سے بہنیں بن کر ساتھ رہتیں۔ یہ خدیجہ کی پہلی اور آخری چال تھی جو انہوں نے چلی تھی۔ اور زلیخا اس دن سے ہی یہ راز جانتی تھیں جس دن انہوں نے یہ ساری باتیں خدیجہ کو عذیر سے فون پر کہتے سنی تھیں۔ اور اب وہ بہن کے اس فیصلے پر بڑی مطمئن تھیں۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- فریحہ
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ---------- موسیٰ رضا

مصباح اعوان

ستارۂ زیست



وہ ساری رات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو پایا تھا۔ بار بار ایک ہی خیال دل و دماغ پر چھایا رہا۔ دور کہیں ہوتی فجر کی اذان سماعت سے ٹکرائی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ خاموشی میں اس آواز نے اسے جھنجھوڑا تھا۔ وہ اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھا اور اندھیرے میں بٹن پر ہاتھ مارا تو واش روم میں بلب کی روشنی پھیل گئی۔ چند قدم بڑھ کر آئینے میں خود کو دیکھا۔ وجیہہ سے چہرے پر تھپڑ اور گردن پر انگلیوں اور خراشوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ اس کے اندر ایک بار پھر غصے کی شدید لہر ابھری۔ دانت اور مٹھیاں بھینچ کر چند لمحے دیکھتا رہا اور پھر ذہن میں وہی سوچ جس نے اسے پوری رات بے چین رکھا تھا ابھری۔

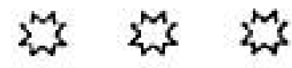
"وہ وہاں ہوگی یا نہیں؟" واپس مڑا اور کمرے میں آکر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر کچھ سوچا۔ پھر اپنے سامنے الٹے پڑے جوگر کو دیکھ کر اس کے ذہن میں کچھ واضح ہوا تھا۔ فیصلہ کر کے تیزی سے اٹھا۔ دوسرا جوگر اور جرابیں ڈھونڈ کر پہنے۔ سردی اور اندھیرے کی پروا کیے بغیر جینز اور آدھی آستینوں والی سفید ٹی شرٹ میں ہی باہر کی طرف بھاگا۔

کل شام جب وہ گھر پہنچا تھا تو بے حد صدمے میں تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اسے اس قسم کی صورت حال کا بھی سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ صدمے کے بعد وہ شدید قسم کا غصہ تھا جو اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔ وہ کسی بھی طرح اس قسم کے سلوک کا مستحق نہیں تھا۔ پھر خود کو اس غصے اور تکلیف سے نکالنے کے لیے کوشش کرنے لگا' کہ اس واقعہ کو بھول جائے۔ جو ہوا سو ہوا۔ اسے بھول جانا ہے اور کبھی دوبارہ وہاں نہیں جانا' بلکہ وہ یہ کالج ہی چھوڑ دے گا۔ وہ کہیں اور جاب تلاش کرلے گا' لیکن اس سب کے باوجود ایک بات اسے بے حد مضطرب کر رہی تھی کہ "وہ وہاں ہوگی یا نہیں۔" ساری رات اس سوچ کو جھٹکنے کے بعد صبح جب اس کی نگاہ جوگر پر پڑی تو اس نے سوچا' اسے وہاں جا کر دیکھ لینا چاہیے۔

مکمل ناول



بھاگتے ہوئے اس کا سانس پھولنے لگا تھا اور دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ روزانہ اس سے کہیں زیادہ بھاگتا تھا۔ روزانہ دوڑنا اور سخت جسمانی ورزش اس کا معمول تھا لیکن آج کل کے واقعہ اور سنسنی کی وجہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ اس نے دروازے پر رک کر سانس بحال کرنے کی کوشش کی۔ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر خود پر قابو پایا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ کرسی کے ساتھ اوندھی پڑی تھی۔ بالکل اسی جگہ جہاں وہ کل گری تھی۔ تقی نے پوری رات سوچا تھا۔ "وہ وہاں ہوگی یا نہیں۔" یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ وہاں ہوئی تو وہ کیا کرے گا۔



ارسہ کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جسم میں طاقت بالکل ختم ہوگئی ہے اور اندر سے کوئی کاٹ رہا ہے۔ عجیب اندھیرا سا تھا۔ پوری طاقت لگا کر آنکھیں کھولنے پر بھی دائرے سے بنتے۔ آہستہ آہستہ اسے محسوس ہوا کہ کوئی سہارا دے کر کچھ پلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ارسہ کڑواہٹ محسوس کرتے ہوئے پی رہی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ یہ مشروب اندر گھوم کر واپس آ رہا ہے۔ متلی کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے اس نے منہ پھیر کر خود کو مزید پینے سے بچایا۔ پلانے والے نے سمجھ کر اسے واپس لٹا دیا۔ بہت دیر بعد جب اس کیفیت سے نکلی اور واپس غنودگی میں جا رہی تھی کہ کوئی پھر سے اٹھانے لگا۔ اس بار وہ اسے دوا کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بمشکل دوائی نگل کر وہ پھر سو گئی۔



صبح تک ارسہ کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔ تقی نے اسے جگا کر اس کے بیڈ کے ساتھ رکھی میز کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا اور خود چلا گیا۔

ارسہ کوشش کر کے اٹھ بیٹھی۔ وہ دو دن بعد ہوش میں [illegible] ہو رہی

تھی۔ اس نے کمرے میں نگاہ دوڑائی' اب اس کا ذہن سوئی سوئی کیفیت سے نکل رہا تھا۔ کمرہ بے حد سادہ تھا۔ ایک بڑی سی میز کمرے کے کونے میں کھڑکی کے سامنے رکھی تھی۔ جس پر لیپ ٹاپ' ٹیبل لیمپ' کچھ کتابیں' نوٹس اور چارجر وغیرہ پڑے تھے۔ اس کے علاوہ دو پلنگ جن میں سے ایک پر وہ خود ابھی بیٹھی تھی اور ان کے درمیان چھوٹی سی کمزور سی میز تھی۔ جس پر اس کا ناشتا اور دوائی رکھی تھی۔ سامنے دو دروازے تھے' ایک دروازہ کھلا تھا جو کچن کا تھا اور دوسرا یقیناً" واش روم کا تھا۔ گردن گھما کر دیکھنے پر نظر آتا' تیسرا دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ یہاں بیٹھے وہ اتنا ہی دیکھ سکتی تھی۔ اس لیے ہمت کر کے اٹھی اور دیوار پکڑتی بند دروازے تک پہنچی۔ اسے دھکیلا' اس کے اندازے کے مطابق وہ واش روم ہی تھا۔ اندر ایک بڑا پرانا شیشہ نظر آیا۔ قریب جا کر دیکھنے پر اسے اپنے ماتھے پر پٹی بندھی نظر آئی پھٹے ہونٹ پر کھرنڈ آ گیا تھا۔ آس پاس کی جگہ نیلی پیلی سی ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ سے ہونٹ کے زخم کو چھوا۔ پھر ٹونٹی کھول کر ہاتھ بہتے پانی کے نیچے رکھے۔ بائیں ہاتھ کی کلائی میں بے حد درد ہو رہا تھا۔ تکلیف برداشت کرتے ہوئے اس نے ہاتھ دھوئے اور گیلے ہاتھ چہرے پر پھیرے۔ مزید کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ بے حد کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے واش روم تک جانا بھی ایک بڑی مشقت ثابت ہوا تھا۔ واپس آ کر پلنگ پر ڈھے گئی۔

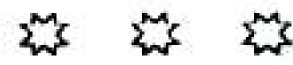
لیکن پھر سے ہمت کر کے اٹھی اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوئی۔ چائے کا کپ' جیم' ڈبل روٹی اور ابلا ہوا انڈہ۔ ایسا ناشتا ارسہ نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ارسہ ناشتے میں بھی چائے پینے کی عادی نہیں تھی اور یہ تو اب ویسے بھی پینے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اس کو سامنے چارپائی کے ساتھ دودھ کا گلاس رکھا دکھائی دیا۔ ارسہ چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھی اور ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا۔ گلاس میز پر رکھ کر چارپائی کے سہارے اٹھی۔ یہ یقیناً" وہی دودھ تھا جو تقی رات کو اسے پلا رہا تھا۔ گلاس کو تقی نے نوٹ پیڈ سے ڈھانپ دیا تھا۔

گلاس تقریباً" بھرا ہوا ہی تھا۔

"اس چائے سے یہی بہتر ہے۔" اس نے سوچا۔

سردی کی وجہ سے دودھ بھی ٹھنڈا تھا۔ ارسہ نے گھونٹ بھرا۔ اس کا ذائقہ اچھا تھا۔ دوسرے تیسرے گھونٹ پر اسے اندازہ ہوا کہ دودھ میں شہد بھی ملا ہوا ہے۔ اس نے گلاس پورا خالی کر دیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے ناشتے میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پھر چارپائیوں اور دیوار کا سہارا لیتے کمرے سے باہر نکل آئی۔ صحن میں چمکیلی دھوپ پھیلی تھی۔ اس گھر میں ایک ہی کمرہ تھا۔ کمرے سے باہر ایک چبوترہ اور آگے کچا صحن تھا اور صحن میں ایک نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ چبوترہ اونچا تھا۔ ارسہ آگے بڑھ کر، ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ زمین ابھی تک سرد تھی لیکن دھوپ سامنے سے پڑ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے اسے سکون محسوس ہوا اور اس کے بے جان وجود میں جان پڑنے لگی۔

"کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟" ارسہ نے سوچنے کی کوشش کی۔



آج سے دو دن پہلے کی شام تھی وہ۔ اوائل سردیوں کے دن تھے لیکن رات اور صبح وقفے وقفے سے ہونے والی بارش کی وجہ سے سردی کی شدت بہت بڑھ گئی تھی۔ شام کو جب ارسہ اور نور اکیڈمی جا رہی تھیں۔ ارسہ نے نور کو بتایا۔

"آج علشبہ اور اس کی کزن دونوں نہیں آئیں گی۔ علشبہ نے ٹیکسٹ کیا تھا۔"

"ہم بھی آج جلدی فارغ ہو جائیں گے۔" نور نے ایک نظر ارسہ کو دیکھا۔ بولی کچھ نہیں لیکن اکیڈمی کے قریب جا کر رک گئی۔

"مجھے نہیں جانا، تم جاؤ، میں واپس جا رہی ہوں۔"

"لیکن کیوں؟" ارسہ کو اچنبھا ہوا۔

"میری مرضی۔" نور ہٹ دھرمی سے بولی۔

"لیکن نور! اکیڈمی کے دروازے سے واپس کیوں جا رہی ہو آخر؟" ارسہ کو اکیلے رہ جانے کے خیال سے پریشانی ہوئی۔

"میں نے کہا نا، میری مرضی، تم جاؤ۔" نور نے بھڑک کر تیز آواز میں کہتے ہوئے قدم واپس موڑ لیے۔ اس کے اونچا بولنے پر ارسہ سہم جاتی تھی۔

"نور ایسا مت کرو پلیز۔" ارسہ منمنا کر رہ گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی چھوٹی بہن کی مرضی کے خلاف اس کے ساتھ واپس جاتی۔ ارسہ نے ایک نظر تیزی سے دور جاتی نور کو دیکھا، پھر مجبوراً" اکیڈمی میں داخل ہوئی اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔

"کاش علشبہ آج آجاتی۔" جس کلاس میں وہ پڑھتی تھیں وہاں پہلے بی ایس سی کی لڑکیوں کی کلاس ہوتی تھی۔ پھر ارسہ لوگوں کی، آج وہ بھی کم ہی آئی تھیں۔ ارسہ پیچھے جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اس کی کلاس ہونی تھی۔

"میں بھی آج نہ ہی آتی۔ نور تو بالکل بھروسے کے قابل نہیں ہے۔ آج کے بعد علشبہ نے نہ آنا ہوا تو میں بھی نہیں آؤں گی۔" اس نے مصمم ارادہ کیا اور کل کا لیکچر دہرانے لگی۔ میڈم نے بڑی لڑکیوں کو فارغ کر کے اسے پڑھایا اور چلی گئیں۔ پھر سر تقی آئے اور اسے نئے باب کے نوٹس دیے۔ اس سے پہلے وہ اگلا لیکچر شروع کرتے، اس نے پچھلے لیکچر کے کچھ سمجھ میں نہ آنے والے سوال سامنے کیے کہ پہلے یہ سمجھا دیں۔ وہ سمجھ کے اس نے اگلے لیکچر کے نوٹس سر کے سامنے کر دیے لیکن سر نے پڑھانے کی بجائے کہا کہ وہ خود یہ پڑھ کر آئے۔ جو سمجھ میں نہیں آئے گا، وہ کل سمجھا دیں گے۔

"یہ پورا باب؟" ارسہ نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔" سر پھر سے بیٹھ کر نشان لگا کر بتانے لگے کہ وہ کیا کیا پڑھ کر آئے۔ اسی اثنا میں اکیڈمی کا پچھلا دروازہ جو اسی کمرے میں کھلتا تھا، ٹھاہ کی آواز کے ساتھ کھلا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا۔ آنے والے ارسہ کے بابا اور ساتھ میں نور تھی لیکن وہ کہہ کیا رہی تھی؟

"دیکھا بابا آپ نے، روز یہی ہوتا ہے یا ہمیں یہ دوسری کلاس میں بھیج دیتا ہے یا اسے لے جاتا ہے۔"

نور انتہائی بدتمیزی سے اونچا اونچا بول رہی تھی۔ ارسہ کو نور کی بات اپنے بابا کا غصے سے مسخ ہوتا چہرہ دیکھ کر سمجھ میں آئی تھی۔ یہ نور کا ایک اور وار تھا۔ وہ کچھ اور سیٹ کر چکی تھی اس پر لیکن یہ کیا تھا؟ اور اسے کتنا مہنگا پڑنے والا تھا۔ یہ وہ قطعاً" نہیں سمجھ پائی تھی اس وقت۔ زیادہ تر کلاسز ختم ہو چکی تھیں موسم کی وجہ سے اسٹوڈنٹس کی اکثریت جا چکی تھی۔

ان کے بابا سر تقی پر بھوکے شیر کی طرح جھپٹے تھے۔ انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر بری طرح پیٹنے لگے، ساتھ ان کے منہ سے گالیوں کا ایک طوفان امڈ رہا تھا۔ ایک لمحے کو ارسہ ٹھٹھر گئی۔ پھر تیزی سے خود کو سنبھال کر آگے بڑھی۔ وہ انہیں روکنا چاہتی تھی۔ اس نے جیسے ہی اپنے بابا کے بازو کو پکڑتے ہوئے انہیں روکنا اور صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔۔۔ ان کے زناٹے دار تھپڑ نے اسے دھول چٹا دی۔ اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ تھپڑ سے اس کا سر دیوار سے لگا اور وہ پلٹ کر اوندھے منہ جا گری۔ پھر نہ اٹھنے کے لیے۔۔۔ یہ ارسہ کو اب تک کی زندگی میں پڑنے والا پہلا تھپڑ تھا۔ اس کے منہ میں مٹی اور خون کا ملا جلا ذائقہ گھلنے لگا۔



رات کے کسی پہر ہوش میں آنے پر بھی وہ سیدھی نہیں ہوئی۔ اسے اب بھی نہیں اٹھنا تھا۔ اس سب کے بعد تو کبھی بھی نہیں۔ اتنا رکیک الزام۔۔۔ جانوروں سے بدتر سلوک۔۔۔ مجھے مارا اور پھینک کر چلے گئے۔ کسی کا سگا باپ ایسا سلوک کر سکتا ہے، اپنی اولاد کے ساتھ۔۔۔؟

مگر پھر کوئی آیا، اس کا بازو دبوچا اور گھسیٹتے ہوئے لے جا کر کسی کمرے میں چارپائی پر پھینک دیا اور خود کہیں چلا گیا۔ اندھیرا روشنی میں بدل رہا تھا۔ پھر کچھ لوگ آ گئے وہاں۔۔۔ ان میں ایک عورت بھی تھی۔ جو اس کا خون صاف کر کے پٹی کر رہی تھی لیکن پھر جو ہوا۔۔۔ وہ اس کی زندگی میں ہونے والی ایک اور بڑی تبدیلی تھی، صرف اس کی ہی نہیں کسی اور کی بھی زندگی بدل گئی تھی۔ ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور انجان لوگوں کے درمیان ایک تعلق، ایک رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ارسہ اور تقی کا نکاح۔۔۔ تقی۔۔۔ اسلام آباد سے کچھ عرصہ پہلے آنے والا کیمسٹری کا نیا ٹیچر۔۔۔

اس نے خوف زدہ ہو کر یہاں سے وہاں دیکھا۔ صبح اب دوپہر میں ڈھل گئی تھی۔ ارسہ وہاں ہی بیٹھے بیٹھے خود پر گزرنے والے واقعات کو سوچ رہی تھی۔ حواس لوٹنے پر اسے ادراک ہوا تھا کہ وہ کن مشکلات میں گھر چکی ہے۔ اب اگر وہ کالج گئی تو لوگوں کا سامنا کس طرح کرے گی؟ وہ سر تقی کے ساتھ آتی جاتی ہے، سر کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ یہ بات چھپ تو نہیں سکتی۔ یہ دیہاتی ماحول ہے، زیادہ تر لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ پھر لوگوں کے سوالوں کے جواب کس طرح دے پائے گی؟ اس سب کے بعد وہ پہلی بار پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ جب روتے روتے سر چکرانے لگا تو اسی طرح بیٹھے بیٹھے پیچھے زمین پر لیٹ گئی۔

"اگر میں کالج ہی نہ جاؤں تو۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" اگلے لمحے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی۔ "ایسے منہ چھپانے سے مشکلات ٹل نہیں جاتیں۔ مجھے پتا ہے نا، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ پھر کالج کیوں نہ جاؤں؟ مجھے پڑھنے کا شوق ہے۔ میری امی بھی مجھے پڑھانا چاہتی تھیں۔ فرسٹ ایئر میں اتنی محنت کی ہے میں نے، اب سیکنڈ ایئر میں لوگوں کے ڈر سے پڑھائی چھوڑ دوں؟ نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔۔۔" نفی میں سر ہلاتے خود کلامی کی۔ "اگر مجھے کسی نے روکا تو میں اس بھوت بنگلے میں مر ہی جاؤں گی۔" اس نے اس ویران، سنسان پڑے گھر کو دیکھا۔ پھر بہت حوصلے سے اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔



تقی کے کالج سے واپس آنے سے پہلے وہ اپنے مسئلے کا حل ڈھونڈ چکی تھی۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ تقی کو اکیڈمی سے اپنا بیگ لانے کو کہے گی لیکن اندر

آئی تو اسے اپنا بیگ تقی کی چارپائی کے دوسری طرف پڑا نظر آگیا۔ تقی اس کا بیگ اور کتابیں جو وہ اکیڈمی لے کر جایا کرتی تھی' بعد میں وہاں سے اٹھا لایا تھا۔ اس نے اپنا بیگ کھولا تو اسے اپنا پاؤچ مل گیا۔ جس میں اس کے گھر کی چابیاں تھیں' جہاں وہ پہلے اپنی امی کے ساتھ رہا کرتی تھی۔

اس کی زندگی میں مصائب کا آغاز تو اس کی امی کی حادثاتی موت کے بعد ہی ہوا تھا۔ امی کی وفات کے بعد جب اس کا باپ اسے لینے آیا تھا' تو ارسہ نے صرف اپنے یونیفارم کے علاوہ چند کپڑوں کے جوڑے اور کتابیں ہی اٹھائی تھیں' کیونکہ اس کے باپ نے بڑے کروفر سے یہ کہہ کر اسے کچھ اور لینے سے منع کردیا تھا کہ اسے وہاں سب ملے گا۔ اس کے باپ کے پاس سب کچھ ہے۔ ارسہ کو واقعی وہاں سب ملا تھا۔ سوائے عزت اور محبت کے۔ اب اسے تقی کی اجازت درکار تھی۔ اپنی چارپائی پر لیٹ کر اس کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ارسہ تقی کے ردعمل سے ڈر بھی رہی تھی۔ اس کے باپ نے تقی کو بری طرح زدوکوب کیا تھا۔ اب وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ جو چاہے سلوک کرتا اس کے ساتھ' اسے کون پوچھنے والا تھا؟ اگر وہ کچھ برا نہ بھی کرتا تب بھی ارسہ کے لیے اس سے نظر ملانا کتنا مشکل ہوگا۔ وہ ساری زندگی سر نہیں اٹھا سکے گی اس کے سامنے۔ تقی حسب معمول کھانا لیتے ہوئے آیا تھا اور اپنے ساتھ اس کے لیے بھی نکال کر اسے دیا۔

یہ تقی کا بڑا پن ہی ہے۔ ارسہ نے سوچا اور خاموشی سے لے کر تھوڑا سا کھالیا۔ پھر ڈرتے ڈرتے اسے مخاطب کیا۔

"سر! میں علشبہ کے ساتھ جاکر اپنے گھر سے اپنا ضروری سامان لے آؤں؟" تقی نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کون سا گھر؟ اس کے بجائے انتہائی خشک لہجے میں۔۔۔ "جو کرنا ہے کرو۔" کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔ ارسہ اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بمشکل اٹھی۔ دل بھر آرہا تھا۔ پٹی کھول کر چادر اوڑھی' بیم با

نکل آئی لیکن ایک لمحے کو چکرا کر رہ گئی' اسے جانا کس طرف ہے؟ یہ اس کا اپنا قصبہ تھا مگر وہ اس طرف کبھی نہیں آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب وہ کس طرف جائے' لیکن پھر اندازے سے کسی طرف جانے کے بجائے وہاں سے گزرتی ایک عورت سے اپنے محلے کا نام بتا کر رہنمائی لی۔ اس نے چادر سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔ آنسو اس کی چادر میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ بہت مہینوں بعد اس طرف آئی تھی۔ علشبہ کے گھر کے دروازے کو دیکھ کر اسے لگا جیسے لمبی مسافت کے بعد لٹی پٹی اپنوں میں پہنچ گئی ہو۔ علشبہ کے گھر کا گیٹ کھٹکھٹانے سے پہلے مڑ کر اس کے مقابل اپنے گھر کو دیکھا۔ اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

"پہلے سب کتنا اچھا تھا۔" اس نے ایک ہچکی لی۔ پھر بہتی آنکھوں کے ساتھ علشبہ کے گھر کا گیٹ دونوں ہاتھوں سے پیٹ ڈالا۔ وہ کن دقتوں سے یہاں تک پہنچی تھی' یہ بس وہی جانتی تھی۔ گیٹ علشبہ کی چھوٹی بہن نے کھولا۔ حیران نظروں سے روتی ہوئی ارسہ کو دیکھ کر پوچھا۔

"ارسہ باجی! کیا ہوا؟" پھر اندر کی طرف منہ کر کے زور سے علشبہ کو آواز دی۔ علشبہ کچن سے نکلی' ارسہ کو دیکھ کر دوڑتی ہوئی اس تک پہنچی۔ بے اختیار اسے گلے لگاتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔

"ارسہ! کیا ہوا؟ کہاں غائب ہو؟ دو دن سے کالج کیوں نہیں آرہیں؟ اور یہ زخم... کس نے مارا ہے تمہیں؟" کوئی جواب دیے بنا ارسہ' علشبہ کے گلے لگی۔ ہچکیوں سے روتی رہی۔

"کچھ تو بولو۔" علشبہ کا دل ہول رہا تھا۔ بہت دیر بعد سنبھل کر پانی پیا اور علشبہ کو ساری بات بتائی۔ پوری بات سن کر علشبہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر صدمے کے عالم میں بیٹھی رہی۔

"میرے خدا! نور ایسا کیسے کر سکتی ہے؟ اور تمہارے فادر... تمہاری شادی ہو گئی۔ وہ بھی سر تقی سے... وہ تو اس علاقے کے ہیں بھی نہیں۔ وہ کون ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ یہ تو شاید ٹیچرز کو بھی نہیں پتا۔" بے یقینی سے تیز تیز بولتے گڑبڑائی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی دوست کو مزید پریشان کر رہی ہے۔

"خیر پرنسپل صاحب کو تو پتا ہی ہوگا' سر کے بارے میں سب۔ ظاہر ہے انہوں نے کچھ سوچ کر ہی یہ کیا ہوگا۔ اللہ بہتر کرے گا تم حوصلہ رکھو۔" اب کہ ڈھارس بندھائی۔ "اتنا کچھ ہو گیا تمہارے ساتھ اور ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ تمہارے کالج نہ آنے پر میں تمہیں کالز کرتی رہی' کسی نے پک نہیں کی اور پھر کل نمبر ہی آف ہو گیا۔ موبائل کی بیٹری ختم ہو گئی ہوگی۔" علشبہ خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

"علشبہ! باقی چیزیں تو میں یہاں سے لے جاؤں گی' پرانا یونیفارم بھی رکھا ہے لیکن آدھی کتابیں اور نوٹس تو وہاں ہی رہ گئے۔" ارسہ نے وہ بات کی جس کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔ اس کی آواز رونے سے بھاری ہو رہی تھی۔

"اچھا... اچھا... کوئی بات نہیں۔ میرے پاس جو ہے سب' ہم مینیج کر لیں گے' تم فکر مت کرو۔" علشبہ نے اسے پریشانی سے نکالنے کی کوشش کی۔ علشبہ کے امی' ابو گھر پر نہیں تھے۔

دونوں نے جا کر ارسہ کے گھر کو کھولا اور ضرورت کی چیزیں اٹھائیں۔ علشبہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ارسہ کو چھوڑنے آئی تھی۔ گھر کا گیٹ اسی طرح کھلا تھا۔ تقی کمرے میں بھی نہیں تھا۔ تینوں نے سامان رکھا۔ علشبہ نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا اور چارپائی پر اپنے بھائی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ارسہ اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت تھکی تھکی اور کمزور لگ رہی تھی۔ وہ ارسہ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ سر کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہے؟ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش رہی۔ وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ آنے والا وقت اس کے لیے خاصا کٹھن ہوگا۔

ارسہ گیٹ بند کر کے اندر آئی۔ پھر کچن کے پچھلے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ تقی سیڑھیوں پر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ اس نے ارسہ کی موجودگی

محسوس کر کے بھی اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ارسہ نم آنکھیں رگڑتی واپس کمرے میں چلی آئی۔



اگلے دن کالج میں بریک سے پہلے پرنسپل صاحب نے ارسہ کو اپنے آفس بلانے پر اس نے بہت سے لوگوں کا متوجہ ہونا محسوس کیا تھا۔ یہ بات کالج میں اس کی توقع سے زیادہ تیزی سے پھیلی تھی۔ سر فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ ارسہ کے اجازت طلب کرنے پر پرنسپل صاحب نے اشارے سے آنے کی اجازت دی۔ پھر فون بند کر کے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"بیٹھیں بیٹا کیسی ہیں آپ؟"

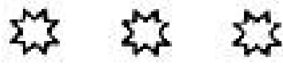
"فائن سر۔" ارسہ نے بہت ہلکی آواز میں جواب دیا۔

"ارسہ بیٹا! آپ ہمارے کالج کی بہترین طالبہ ہیں۔" سر نے بات کا آغاز کیا۔ "جو بھی ہوا وہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ میں نے اسی وقت صداقت صاحب (ارسہ کے بابا کے کاروباری شراکت دار) سے آپ کے والد صاحب کا نمبر لے کر انہیں کال کی تھی... لیکن ان کا رویہ بڑا مایوس کن تھا۔ وہ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ انہوں نے جو آخری بات کی وہ یہ تھی کہ میں اس لڑکی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ مجھے دوبارہ نظر آئی تو میں اسے جان سے مار دوں گا اور مزید اسی قسم کی کچھ باتیں۔" "مزید باتیں یقیناً" وہ ہوں گی جو وہ ابھی ارسہ کے سامنے دہرا بھی نہیں پا رہے تھے۔ پھر کرسی سے ذرا آگے جھک کر مزید کہا۔

"بیٹا اس وقت مجھے جو حل سوجھا وہ میں نے تجویز کے طور پر سب کے سامنے رکھا۔ پھر تقی صاحب کی رضامندی سے یہ نکاح ہوا ہے۔" ارسہ کو بغور دیکھا۔

"بیٹا آپ پریشان مت ہوں۔" پرنسپل صاحب نے پیشانی مسلی۔ "میں تقی صاحب اور ان کے بھائی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ مزید کوئی مسئلہ ہو تو آپ بلا جھجک مجھے کہہ سکتی ہیں۔" ان کے لہجے میں خلوص جھلکتا تھا۔

"یس سر..." ارسہ بمشکل بول پائی۔ اس کے گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹک رہا تھا۔ واقعی کچھ آسمانی اور بہت مقدس رشتے بھی ہمیں راس نہیں آتے۔ جیسے میری ماں کو شوہر اور مجھے باپ... آنکھیں میچ کر کھولیں۔ پرنسپل صاحب نے بات ختم کر کے اسے جانے کی اجازت دی۔ تو ارسہ مرے مرے قدموں سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔



دو ہفتوں بعد زندگی اسی ڈگر پر چلنے لگی جانے کتنی مدت تک چلتی انجام کیا ہوتا۔ اس سب سے بے خبر وہ دونوں بس دن سے رات اور رات سے دن کر رہے تھے۔ ارسہ کے آنے سے پہلے تقی باہر کھانا کھاتا لیکن کبھی کبھار گھر میں بھی بنا لیتا تھا۔ اس لیے کچھ سامان بھی لا چکا تھا جو باقی تھا۔ اس کی لسٹ اور جو چیزیں ارسہ کو ذاتی استعمال کے لیے چاہیے تھیں ان کی لسٹ بنانے کے لیے اس نے ارسہ سے کہا تھا۔ ارسہ کو صرف پڑھنے اور اپنے پودوں میں دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ اس کی ماں نے اس سے کبھی کام کا نہیں کہا تھا نہ اس کو خود کبھی ایسا خیال آیا تھا۔ وہ بہت دل جمعی سے پڑھتی تھی کیونکہ اس کی ماں اس سے صرف اچھے گریڈز چاہتی تھی لیکن اب ظاہر ہے کھانا اور گھر کے دیگر کام ارسہ کو ہی کرنے تھے۔ سو اس نے علشبہ سے پوچھ کر کچھ الٹا سیدھا کھانا بنانا شروع کر دیا تھا۔ تقی جو بھی جیسا بھی ہوتا خاموشی سے کھا لیتا۔ اس کے علاوہ دونوں ایک دوسرے سے مخاطب نہیں ہوتے تھے۔ تقی صرف ضرورت کے وقت بات کرتا تھا اور ارسہ کے لیے یہ بھی مشکل تھا۔ تقی اتنا سنجیدہ اور لیے دیے رہتا کہ ارسہ کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اس سے کوئی بات کر پاتی۔

ارسہ اور تقی کا جو استاد شاگرد والا رشتہ تھا وہ بھی اب ویسا نہیں رہا تھا۔ پہلے جو بات سمجھ میں نہیں آتی تھی وہ بڑے اعتماد سے پوچھ لیا کرتی تھی مگر اب ایسا

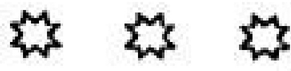
نہیں تھا۔ ارسہ کو اسے مخاطب کرنے سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اسے لگتا کہ وہ اسے مخاطب کرے گی' تو وہ اپنی ساری بھڑاس' سارا غصہ اس پر نکال دے گا۔ کالج میں ان کا تعلق ایک بہت بڑا اسکینڈل بن چکا تھا۔ لوگ کچھ بھولتے نہ اسے بھولنے دے رہے تھے۔

کلاس کی وہ لڑکیاں جو پڑھائی یا دوسری غیر نصابی سرگرمیوں میں کبھی ارسہ کے مقابلے میں آگے نہیں بڑھ پائی تھیں۔ اب اس ساری جلن کا بدلہ لینے کا وقت تھا۔ اس کو دیکھ کر سرگوشیاں کرنا' طنز کرنا' تقی کے حوالے سے باتیں کرنا' پھر ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنا۔ ان کا پسندیدہ مشغلہ بن چکا تھا۔ اس سب کی وجہ سے اس کا اعتماد ختم ہوتا جا رہا تھا۔ پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی ٹیسٹ رپورٹس پر واضح فرق پڑا تھا' بلکہ اب اس کا کالج جانے کو ہی دل نہیں کرتا تھا۔

وہ اکثر کالج جاتے ہوئے پورا راستہ سوچتی' کوئی گاڑی اسے کچل کر نکل جائے یا کالج میں بلاسٹ ہو جائے اور صرف وہ مر جائے۔ زلزلہ آئے اور کالج کی بلڈنگ گر جائے اور وہ اندر ہی دب کر مر جائے۔۔۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اپنی پریشانی' اپنی تکلیف کس کو بتاتی؟ لے دے کر علشبہ ہی تھی لیکن وہ کون سا تجربہ کار عورت تھی۔ وہ بھی تو ارسہ کی طرح ہی کم عمر اور نادان سی لڑکی تھی۔ علشبہ حتیٰ الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کرتی کہ اسے لوگوں کی باتوں کو دل پر نہیں لینا چاہیے اور خاموشی سے اپنا کام کرنا چاہیے مگر ایسا ہو نہیں پایا تھا۔ لوگوں کے رویے اور طنزیہ باتیں۔ اسے کہیں نہ کہیں بہت بری لگتی تھیں۔ وہ بری طرح ہرٹ ہوتی تھی۔ وہ اکثر غائب دماغی کی سی کیفیت میں کالج سے اٹھ آتی۔ جیسے ابھی سامنے کتاب کھول کر بیٹھی تھی اور پڑھ کچھ نہیں رہی تھی۔

کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد اس نے سر اٹھا کر تقی کو دیکھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا' کل کے لیے لیکچرز تیار کر رہا تھا۔ ارسہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس کا

"جانے سر کی زندگی پہلے کیسی تھی۔ کون کون تھا ان کی زندگی میں؟ پتا نہیں کتنے لوگوں کی ذمہ داری تھی ان پر اور مجھے میری تمام ضروریات کے ساتھ ان کے سر تھوپ دیا گیا ہے۔" وہ تقی کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں جانتی تھی۔ کیونکہ تقی نے اس کو اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا' نہ اس سے کبھی کچھ پوچھا تھا لیکن تقی کے رویے سے ایک بات سمجھ چکی تھی۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔



اس دن اردو کی کلاس تھی۔ آخری پیریڈ تھا لیکن سر نہیں آئے تھے۔ سر حمید بڑی عمر کے شفیق سے پروفیسر تھے۔ ارسہ تشریح میں لکھنے کے لیے حوالے کے شعر نوٹ کر رہی تھی۔ جو سر نے لکھوائے تھے لیکن ارسہ نوٹ نہیں کر سکی تھی۔ ارسہ کو شعر یاد نہیں رہتے تھے۔ لکھ کر بار بار دہرانے پڑتے تھے۔ جب ہی کچھ یاد رہتا۔ تھوڑی دیر بعد تقی کلاس میں داخل ہوا۔ سب لڑکیاں اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔ درمیان سے کسی کی آواز آئی۔

"سر! یہ تو سر حمید کی کلاس ہے۔"

"جی۔۔۔ وہ نہیں آئے۔ اس لیے مجھے بھیج دیا گیا ہے۔" تقی نے نظریں گھما کر بولنے والی کو تلاشنا چاہا۔

"سر ان کے فادر کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" رافعہ نے بتایا۔

"ان کے فادر ابھی تک زندہ تھے؟" تقی معصومیت بھری حیرت سے بولا اور ہاتھ میں پکڑی کتاب کھول لی۔ ارسہ سمیت پوری کلاس کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ ابھری۔

"یہ بھی نا۔۔۔ ساتھی ٹیچر کے بارے میں بھی کوئی ایسے لاعلم ہو سکتا ہے بھلا۔" ارسہ نے علشبہ کو دیکھا شاید وہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔

"سر آپ کے فادر ہیں؟" رافعہ نے بڑی ہمت دکھائی تھی۔

"جی بہتر ہیں۔ جو دل ہو' پوچھ تو لیتی ہیں۔" ارسہ

نے سوچا اور جواب کے لیے تقی کی طرف متوجہ ہوئی۔
دو مہینے ہو گئے ہیں ایسے رہتے ہوئے۔ چلو کچھ تو پتا چلے۔ تقی کتاب میں کوئی چیز انہماک سے دیکھ رہا تھا۔
"جی؟" چونک کر سر اٹھایا اور رافعہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"سر آپ کے فادر ہیں؟" رافعہ نے اپنا سوال دہرایا۔
"اپنا پڑھیں بچے شاباش۔" یہ تقی کا جواب تھا۔ اب وہ دوبارہ اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ اس پر رافعہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ جبکہ ارسہ نے سوچا۔
"کچھ نہ ہی پوچھنا بہتر ہے۔"
"گرلز! آپ کچھ پڑھ لیں اور کلاس سے باہر آواز نہ جائے پلیز۔" اور خود شکل پر ڈھیروں بے زاری لیے کلاس سے نکل گیا۔ شاید پورا دن کھڑے کھڑے تھک گیا تھا۔ تقی کا آخری پیریڈ فری ہوتا تھا۔
رافعہ نے پیچھے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ارسہ کو آواز لگائی۔
"ارسہ! تم بتاؤ سر کے فادر ہیں؟ تمہیں تو پتا ہی ہوگا سر کی فیملی کے بارے میں۔" اس بات پر سب لڑکیاں ارسہ کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھنے لگیں، ارسہ نے تھوک نگلا۔ وہ اب کیا جواب دے۔ وہ بھی اتنی ہی انجان تھی جیسے کہ وہ سب۔ ارسہ نے سر گھما کر رافعہ کو دیکھا اور بگڑے لہجے میں بولی۔
"تمہیں کیا انٹرسٹ ہے سر کی فیملی میں؟ اپنے کام سے کام رکھو۔" اور کتاب چہرے کے آگے کر لی۔ اکثر لوگوں کے پاس جب کسی بات کا جواب نہ ہو یا وہ جواب دینا نہ چاہ رہے ہوں، تو الٹا اگلے پر بگڑ کر جان چھڑاتے ہیں۔ ارسہ نے بھی یہی کیا تھا۔



سردی اپنے عروج پر تھی اور اس رات تو سردی اتنی بڑھی کہ ارسہ کو کمبل سردی کی شدت کے سامنے کم لگنے لگا تھا۔ وہ کب سے سردی سے دھیان ہٹا کر سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر بے سود۔ ارسہ کے دانت بجنے لگے تھے۔ پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا اور صبح کب ہونی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ جلدی صبح ہو جائے، ورنہ تو وہ اکڑ کر مر جائے گی۔ اتنی سردی اور اندھیرے میں وہ کیا کرے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اٹھی اور ٹانگیں سینے سے لگا کر بیٹھ گئی اور کمبل اچھی طرح اپنے اردگرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ بہت دیر اسی طرح بیٹھنے کے باوجود بھی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اسے ٹھنڈ اپنے جسم سے لہریں بنا کر گزرتی محسوس ہو رہی تھی۔ ارسہ نے بے بسی سے رونا شروع کر دیا۔ وہ آواز دبا کر گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی مگر کبھی کسی سسکی کی آواز سے کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ بیٹھ کر روتے روتے اب اس کی باقاعدہ ہچکی بندھ چکی تھی۔ کسی احساس کے تحت تقی کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ محسوس کرتے ہوئے اس نے پکارا۔
"ارسہ۔" تقی کی نیند میں ڈوبی آواز پر وہ ساکت ہوئی۔ "ارسہ کیا ہوا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔
"سردی ہے۔" ارسہ بمشکل آواز پر قابو پا کر بول پائی۔ تقی نے ایک جھٹکے سے اٹھ کر لائٹ آن کی۔ ارسہ نے ڈرتے ڈرتے تقی کی طرف دیکھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بلب کی روشنی پڑنے پر اس کے گالوں اور آنکھوں کی نمی چمکنے لگی۔ وہ پتا نہیں کب سے رو رہی تھی۔ تقی اب دونوں ہاتھ سر پر رکھے حیرت سے آنکھوں اور نیم والبوں سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے اسی طرح دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا۔
"تم سردی کی وجہ سے رو رہی ہو؟" آواز میں بھی حیرت نمایاں تھی۔ ارسہ کوئی جواب دیے بغیر اسی طرح دیکھتی رہی۔ تقی نے نفی میں سر ہلایا۔ جیسے الفاظ گم ہو گئے ہوں۔ پھر آگے بڑھ کر اپنا کمبل اٹھایا، اس کو ڈبل کیا اور ارسہ کی طرف مڑا۔
"لیٹو۔" ارسہ لیٹ تو گئی لیکن اگر وہ اپنا کمبل اس کو دے رہا تھا، تو اس نے خود کیا کرنا تھا؟ ارسہ کو نئی

پریشانی لاحق ہوئی۔ تقی نے اپنا کمبل اسے اوڑھا دیا تھا۔ تقی کا کمبل زیادہ بڑا اور بھاری تھا۔ ارسہ نے ایک لمحے کو آنکھیں موند کر سکون محسوس کیا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر تقی کو دیکھنے لگی۔ تقی نے اپنا گرم جیکٹ پہنا۔ پھر نیچے جھک کر اپنے جوتوں سے جرابیں نکال کر پہنیں۔ ادھر ادھر دیکھا تکیے کے ساتھ پڑی ہوئی اونی ٹوپی اٹھا کر پہنی۔ پھر تکیہ اور اپنا موبائل اٹھا کر چارپائی کی چادر اتاری' آگے بڑھ کر لائٹ بند کر لی اور چادر اوڑھ کر سو گیا۔ ارسہ کو اب بھی اس کی فکر ہو رہی تھی۔ اتنی سردی میں بنا کمبل کے وہ کیسے سو پائے گا۔ مگر کچھ ہی دیر بعد تقی کے آہستہ آہستہ خراٹوں کی آواز پر مطمئن ہو کر دانت نکالے اور کمبلوں میں منہ چھپا کر کروٹ لی۔ پھر کچھ ہی دیر بعد نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔



صبح ناشتا بناتے ہوئے ارسہ مسلسل سوچتی رہی کہ وہ تقی سے پوچھے گی کہ وہ رات کو ٹھیک سویا تھا۔ اس کو سردی تو نہیں لگی تھی۔ لاشعوری طور پر تشکر کے جذبے کے زیر اثر شکریے کے طور پر اس سے یہ پوچھنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے ارسہ نے کبھی کوئی بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آج کرنا چاہتی تھی لیکن براہ راست شکریہ ادا کرنا اس کے لیے ایک مشکل امر تھا۔

"ہاں مجھے ضرور پوچھنا چاہیے۔" ایک بار... مصمم ارادہ کرتے ہوئے ناشتا باہر لا کر رکھا۔ ناشتا کرتے ہوئے ارسہ نے تقی کو دیکھا۔ پھر فوراً" نظریں جھکا لیں۔ "اب پوچھتی ہوں۔" پھر چور نظروں سے دیکھا تو احساس ہوا کہ کوئی بات کرنا تو دور کی بات' اس کے لیے نظر بھر کر تقی کو دیکھنا بھی مشکل تھا۔

"سر کو صرف لیکچر کے دوران ہی دیکھا جا سکتا ہے۔" اس نے سوچا' پھر تقی کے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ اس کے چھوٹے چھوٹے پراٹھوں کے بڑے بڑے نوالے لے رہا تھا۔ "کچھ بھی ہو' ایک بار پوچھوں گی ضرور... ون... ٹو... تھری...۔" مگر بولا ہی نہیں گیا۔

ناشتے کے بعد تقی کے لیے چائے لینے کچن میں گئی۔

"چلو پوچھتی ہوں چائے کیسی ہے؟" چائے کا کپ اٹھایا اور خاموشی سے دے کر واپس آ گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ "اف کیا مصیبت ہے' بولا ہی نہیں جاتا کچھ۔" بری طرح جھلائی۔ اپنی اس کم ہمتی پر' کاؤنٹر پر ہاتھ رکھے' سامنے پڑے جگ کو گھورتی رہی۔

"جلدی کرو' دیر ہو رہی ہے۔" باہر سے تقی کی آواز اسے ہوش میں لائی۔ وہ "اوہ..." کہہ کر واش روم کی طرف بھاگی۔ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر آئی۔ شوز پہن کر' چادر اوڑھی۔

تقی چائے پی کر کپ اندر رکھ آیا تھا اور اب موبائل پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ اصل میں ارسہ کے تیار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ ارسہ نے بیگ اٹھایا۔ بیگ رات کو ہی تیار رکھتی تھی۔ تالے سے چابی نکال کر تقی کو تھمائی اور خود دروازے بند کیے۔ گیٹ کو تالا لگا کر تقی کے پیچھے چلنے لگی۔

"چلو اب پوچھتی ہوں۔ چائے کا پوچھوں یا رات کا؟ چائے کا تو تب پوچھنا چاہیے تھا نا۔ اب سردی کا پوچھتی ہوں۔" فیصلہ کر کے' تیز قدم اٹھاتے ہوئے تقی کے قریب جانے کی کوشش کی اور خاموشی سے چلتی رہی۔ یہاں تک کہ کالج کا گیٹ نظر آنے لگا۔ پھر منہ بنایا' سر جھٹکا اور اچانک زوردار آواز میں بول اٹھی۔

"سر آپ کو رات سردی تو نہیں لگی تھی؟" پھر احساس ہوا کہ آواز تو کچھ زیادہ ہی اونچی تھی... مگر... تقی نے کچھ چونک کر اپنی رفتار کم کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"نہیں... سردی نہیں تھی اور میرا نہیں خیال اس علاقے میں کچھ خاص سردی پڑتی ہوگی۔ ہم پہاڑی لوگ ہیں۔ ہمارا اس سردی سے کچھ نہیں بگڑتا۔" اپنے مخصوص متانت بھرے انداز میں جواب دیا۔

"اور ہر بار مسائل صرف رونے سے حل نہیں ہو جائیں گے۔" کچھ توقف کے بعد اپنی بات میں

اضافہ کرتا اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا۔ یعنی کہنا پڑے گا یا مسائل کے حل کے لیے کوشش کرنی پڑے گی۔ مگر ارسہ نے اس بات پر غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ اسی بات پر خوش ہو رہی تھی کہ اس نے ایک بات پوچھ لی ہے اور سر نے اس کا جواب بھی دیا ہے' وہ بھی اتنا لمبا۔

"پہاڑی لوگ....." کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اس نے یوں منہ بنا کر سر ہلایا جیسے کسی تفتیشی آفیسر کے ہاتھ بڑی اہم معلومات لگی ہو۔



ہر تین ماہ بعد کالج میں تمام مضامین کی ایک ٹیسٹ رپورٹ تیار ہوتی تھی۔ ارسہ کی یہ رپورٹ تقی کو ملی تھی۔ اس وقت تو تقی اپنی فائل میں رکھ کر کلاس لینے چلا گیا تھا۔ اب گھر آکر رپورٹ دیکھی تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ ارسہ ہاشم کی رپورٹ ہے۔ تقی صرف ارسہ کی وجہ سے یہاں رکا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا ارسہ یہاں اپنا یہ سال پورا کرلے۔ وہ اسے کہیں اور لے جا کر ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر ارسہ کی پڑھائی کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ کب کا یہاں سے جا چکا ہوتا۔ اس کا کنٹریکٹ بھی اس کے لیے مسئلہ نہ بنتا۔ وہ پرنسپل صاحب سے درخواست کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا حالات کو دیکھتے ہوئے وہ اسے نہیں روکیں گے مگر ارسہ.....

تقی نے کمرے میں داخل ہوتی ارسہ کو دیکھا۔ اسے شدید غصہ آیا۔ حالانکہ وہ غصہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کو نرمی سے سمجھانا چاہتا کہ وہ صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دے' جو آئندہ اس کے کام آتی مگر.....

اٹھ کر اس تک پہنچا اور ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کر کے اس کے ہاتھ میں رپورٹ پکڑائی۔

"یہ ہے تمہاری رپورٹ۔ مجھے بتاؤ؟ ہم کس لیے ہیں اس عذاب میں..... اگر اسی طرح پڑھنا ہے تو بہتر ہے چھوڑ دو..... اپنی وجہ سے مجھے بھی خوار مت کرو' پلیز..... ہر چیز کو ضائع ہونے سے بچاؤ۔" سرخ اور تنے ہوئے چہرے کے ساتھ انتہائی سخت اور کھردرے لہجے میں کہتے ہوئے' اس کا بازو جھٹکا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ رپورٹ ارسہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گری۔ وہ ایک بت کی طرح ساکت کھڑی تھی لیکن آنکھوں سے نکلتے آنسو' ٹھوڑی سے قطروں کی صورت میں پھسلتے جا رہے تھے۔

"کیا میں ہمیشہ سے ایسی ہوں؟ ان حالات میں جب سب مجھے عجیب عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں' ہر وقت کسی انجانے خوف کے حصار میں رہتی ہوں کہ ابھی پھر کچھ ہو جائے گا۔ جیسے پہلے سارے رشتے مجھ سے چھن گئے۔ آپ بھی مجھے چھوڑ دیں گے۔ ایک لمحے کا سکون نہیں ملتا مجھے۔ کیسے پڑھوں میں؟ یاد کیا ہوا' سبق بھول جاتا ہے مجھے..... پھر کیا کروں میں؟ مارکس کیسے آسکتے ہیں؟ میری جگہ کوئی بھی ہو..... آپ بھی ہوں تو نہیں پڑھ سکتے۔ اب وہ اونچی آواز میں روتے ہوئے' شکوہ کناں تھی۔



انگلش کی کلاس ختم ہوئی تھی۔ ارسہ اور علشبہ بھی میڈم کے پیچھے ہی باہر نکل آئیں۔ اگلا پیریڈ سر تقی کا تھا۔ علشبہ نے ہال کے ستون کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے ارسہ کو غور سے دیکھا۔

"ارسہ! کیا ہوا؟ آج بہت چپ چپ ہو۔ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"کوئی بات نہیں ہوئی یار....." سوچ منہ کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔

"ارسہ..... باتیں چھپانے لگی ہو مجھ سے؟" اس سے پہلے ارسہ کوئی جواب دیتی۔ سر بلال پاس سے گزرے۔ وہ میتھس کے پروفیسر تھے۔ دونوں نے بیک وقت سر کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہیں بیٹا آپ لوگ؟" رک کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں سر۔" علشبہ نے جواب دیا۔
"ارسہ آپ کے ٹیسٹ۔۔۔" ارسہ کو دیکھتے ہوئے معنی خیزی سے جملہ ادھورا چھوڑا۔ ارسہ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ اس بات پر پہلے بھی کافی کچھ سن چکی تھی۔
"سوری سر۔ نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہوگا۔"
"چلیں کوئی بات نہیں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ ہم آپ سے بہت سی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔" سر مسکراتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ تقی پاس سے گزر کر کلاس میں جارہا تھا۔ علشبہ نے سلام کیا لیکن ارسہ 'بلال صاحب کی طرف ہی متوجہ رہی' جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ ارسہ نے سر بلال کی بات سمجھ کر سر ہلایا۔
"ان شاء اللہ سر! میں آپ کی توقعات پر پورا اتروں گی۔" اس نے واقعی اب توجہ سے پڑھنے کا تہیہ کیا تھا۔ سر بلال سے بات کرکے دونوں کلاس کے دروازے تک آئیں۔
"مے آئی کم ان سر!" علشبہ نے پوچھا۔
"نو۔۔۔" انتہائی قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے فرمایا گیا۔
"ہیں۔۔۔ کیوں؟" دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا۔
"جب ٹیچر کلاس میں ہے' تو آپ باہر کیا کررہی تھیں؟"
"ہم سر بلال سے بات کررہے تھے۔" علشبہ نے جواباً کہا۔
"بہرحال۔۔۔ آپ کو مجھ سے پہلے کلاس میں ہونا چاہیے تھا۔ اب باہر ہی رہیں۔"
"یہ کیا۔۔۔" دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔
"سر آپ ابھی تو کلاس میں آئے ہیں۔ ہم باہر گھوم نہیں رہے تھے۔ آپ نے بھی دیکھا۔ ہم سر سے بات کررہے تھے۔" علشبہ چپ رہ سکتی تھی بھلا۔ اس کے جواب میں سر چار قدم آگے آئے اور کلاس روم کا دروازہ بند کردیا۔ یوں منہ پر دروازہ بند ہونے پر' ایک لمحے کو دونوں کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ لیٹ تھیں مگر پورا ایک منٹ بھی نہیں۔ ان سے آگے لڑکیاں ابھی سیٹوں پر بیٹھ رہی تھیں ہنہ۔
"تم نے دیکھا اس آدمی کو؟" ارسہ کی آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔
"ہاں دیکھا۔۔۔ ڈائنو گز پر نہیں ایکشنز پر یقین رکھتا ہے۔" علشبہ ہنستے ہوئے بولی۔ ارسہ کو حیرت ہوئی۔ اس کے ہنسنے پر۔
"ان کے ڈائنو گز بھی اتنے ہی برے ہوتے ہیں۔" اس کے ذہن کے پردے پر کل شام کا منظر تازہ ہوا۔
"کل تو بری رپورٹ پر اتنی سنا رہے تھے۔ آج خود ہی کلاس سے نکال دیا۔"
"اچھا واقعی؟ ویسے تو بولتے ہوئے بڑے کیوٹ لگتے ہیں۔" علشبہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
"ابھی جب تم سر سے بات کررہی تھیں' مجھے لگا تم ابھی رودو گی اور اب تم ہنس رہی ہو۔" ارسہ نے الجھ کر پوچھا۔
"دیکھا۔۔۔ میں اچھی ایکٹریس بن سکتی ہوں نا؟" علشبہ نے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔
"ہاں ضرور۔۔۔" ارسہ نے دانت پیسے۔ دراصل علشبہ کو بھی اتنی ہی بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ صاف نظر آرہا تھا۔ یہ ٹیچر اسٹوڈنٹ والا معاملہ نہیں ہے۔ وہ اس وقت ارسہ کی وجہ سے ہی باہر کھڑی تھی مگر ارسہ کے "دیکھا تم نے اس آدمی کو" کہنے پر فوراً سنبھل گئی۔ وہ جانتی تھی ارسہ پہلے ہی پریشان ہے۔ وہ مزید اس کو بددل ہونے سے بچانے کے لیے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کررہی تھی۔
"یار سب کیا سوچ رہے ہوں گے' جنہوں نے ہمیں ایسے دیکھا اور پوری کلاس ہنس رہی ہوگی ہم پر۔" ارسہ بسورنے لگی۔
"اوہ۔۔۔ کم آن ارسہ! یہ چیز اسٹوڈنٹ لائف کا

چھوڑے یار۔ کل کو بھولی‘ اسے یاد کرکے۔“ علشبہ ارسہ کا بازو پکڑ کر کینٹین کی طرف چلتے ہوئے بولی۔

”اور جہاں تک بات ہے کلاس کے ہنسنے کی‘ تو تم اگلے پیریڈ سے ہی نوٹ کرنا شروع کردو کہ کس کی کس بات پر اسی قسم کی انسلٹ ہوتی ہے۔ جس کی عزت ہوتی جائے۔ اس کا نام نوٹ کرلو۔ تم دیکھنا دو دن میں ہی پوری کلاس کے نام لکھے ہوں گے تمہارے پاس۔۔۔ اس بات پر کوئی روتا ہے یوں؟ پاگل ہو بالکل۔۔۔“

”میں اس بات پر کبھی ہنس نہیں سکتی۔“ ارسہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ علشبہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ارسہ۔۔۔ پلیز نا یار۔۔۔ کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر لے لیتی ہو؟“ علشبہ بے چارگی سے گویا ہوئی۔

”علشبہ یہ چھوٹی بات نہیں ہے۔ دنیا میں کسی کو میری ضرورت نہیں۔ میں ایک ناکارہ چیز ہوں۔ دوسروں پر بوجھ۔۔۔ تم سمجھ نہیں سکتیں‘ یہ کتنی تکلیف دہ بات ہوتی ہے۔“ علشبہ کی طرف جھک کر بڑے پر درد لہجے میں اسے بتایا۔

”تم خدا ہو‘ جو کسی کو تمہاری ضرورت ہو گی؟ صرف تمہیں تمہاری ضرورت ہے اور کیوں بوجھ بنی ہوئی ہو دوسروں پہ۔۔۔ خود کو اتنا مضبوط کرو کہ کسی پر کوئی بوجھ نہ رہے۔ ہاں اس میں کچھ وقت ضرور لگے گا اس وقت کا انتظار حوصلے اور حکمت عملی سے کرو۔ اس طرح روتے بسورتے‘ مظلوم بن کر نہیں۔ تمہیں اس سوچ سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے کہ تم ناکارہ ہو اور کچھ کر نہیں سکتیں۔ تم انسان ہو اور انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔ بشرطیکہ پاگل مخبوط الحواس نہ ہو۔ بس اور کچھ نہیں‘ یہی چاہیے دماغ۔۔۔ دماغ کو مثبت سوچ کا پیٹرول دو اور مثبت سوچ‘ دعا توکل اور امید سے ملے گی۔ چھوٹے بڑے‘ اچھے برے واقعات کو کوئی خود پر حاوی ہی کیوں ہونے دے۔۔۔ ہوں۔۔۔“ انتہائی کڑے لہجے میں کہا گیا تھا۔ دونوں نے جھٹکے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ عکرشہ باجی تھیں۔ ایم اے فائنل ایر کی اسٹوڈنٹ۔

”آپ۔۔۔“ ارسہ کے لب ملے۔

”ہاں جی! پاس سے گزرتے تمہارا شکوہ کانوں میں پڑا تو۔۔۔ یہ جواب شکوہ تھا۔“ ارسہ نے جھینپ مٹانے کو مسکرانے کی کوشش کی۔

”ویسے میرا بچہ۔۔۔! تمہارے پاس تو یہ حسن اضافی خوبی ہے۔ خوب صورتی اور معصومیت کیا امتزاج ہے واہ۔ کون نہ مرجائے حسن و خوب صورتی کے اس پیکر پہ۔۔۔“

”آپ ارسہ پر کوئی غزل تو نہیں لکھ رہیں؟“ علشبہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”یہ کام ہم تقی صاحب پر چھوڑتے ہیں۔“ عکرشہ نے آنکھ ماری۔ ساتھ ہی قہقہہ لگایا ارسہ گھبرا کر پانی کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی لیکن عکرشہ باجی کی باتوں نے اسے پریشانی اور ناامیدی کے اس حصار سے نکلنے میں مدد دی تھی جس میں وہ کل شام سے قید تھی۔



جیسے ہی بریک ہوئی‘ ارسہ اور علشبہ بھی باقی لڑکیوں کی طرح دھوپ سینکنے گراؤنڈ کی طرف جانے کے لیے کلاس سے نکلیں۔ مس ثمو سیڑھیوں سے اترتی دکھائی دیں۔ دونوں نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا تو مس ثمو نے مسکرا کر خوش دلی سے جواب دیا۔

”بچے! ایک گلاس پانی پلادیں۔“

”شیور میم۔۔۔“ دونوں مستعدی سے اسٹاف کی طرف بڑھیں۔ کیونکہ ٹیچرز کے لیے پانی اسٹاف روم میں ہی رکھا جاتا تھا۔ انہیں مس ثمو بہت پسند تھیں۔ خاص طور پر ارسہ کو بڑی خوشی ہوتی تھی ان کا کوئی کام کرکے۔

اسٹاف روم میں تقی بھی بیٹھا تھا۔ اور دو اور ٹیچرز بھی۔ ارسہ نے ایک نظر تقی کو دیکھا۔ وہ مگن سا بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ارسہ نے کانچ کے نفیس سے گلاس

میں پانی بھرا اور باہر لے آئی۔ کالج کی تینوں خواتین ٹیچرز اسٹاف روم سے باہر دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ ارسہ نے پانی کا گلاس مس ثمرہ کی طرف بڑھایا۔ جو انہوں نے "تھینکس" کہتے ہوئے پکڑ لیا۔

"ارسہ! مجھے بھی پانی لا دو۔" مس صدف کا لہجہ ہمیشہ کی طرح خشکی لیے ہوئے تھا۔

"یس میم۔" ارسہ نے تھوک نگلا۔ وہ ہمیشہ پاک اسٹڈیز کی اس ٹیچر سے خائف ہوتی تھی۔ دونوں نے پھر اسٹاف روم کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔

"علشبہ!" مس صدف نے پکارا' تو دونوں نے رک کر سوالیہ نظروں سے ٹیچر کو دیکھا۔ "ارسہ' تم پانی لے آؤ۔" مس صدف نے دانت پیسے۔

"جی۔" ارسہ تیزی سے اسٹاف روم کی طرف چلی گئی۔

"علشبہ! تم ارسہ کی اسسٹنٹ ہو یا باڈی گارڈ؟" مس صدف نے تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہم فرینڈز ہیں اور اسکول سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں' ہمیں ساتھ رہنا اچھا لگتا ہے۔ اس میں اسسٹنٹ یا باڈی گارڈ والی کیا بات ہے۔" اعتماد سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا علشبہ کا خاصہ تھا۔ چاہے سامنے کوئی بھی ہو۔

"ہاؤ سوئٹ' اتنے پرانے دوست کہیں کہیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مجھے تو یاد بھی نہیں' میرے ساتھ اسکول میں کون کون تھا۔" مس ثمرہ ہمیشہ کی طرح چہرے پر میٹھی سی مسکان لیے بولی تھیں۔

"کیا آپ میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا؟" اس بار مس سدرہ نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ کبھی نہیں' جہاں اختلاف ہوتا ہے' وہاں وہ "اکثر" میری مان لیتی ہے۔ "کبھی" میں اس کی۔" علشبہ مسکرائی۔

"بہت اچھے بھئی۔۔۔" جواب میں دونوں ٹیچرز بھی ہنس پڑیں۔

"ٹھیک ہے' آپ جائیں۔" مس صدف نے اسے وہاں سے ہٹایا۔ علشبہ چلی گئی۔ چوکیدار نے ان کے سامنے پڑا اور چائے لا کر رکھی تھی۔ ارسہ بھی پانی لے آئی تھی۔ اب پانی کا گلاس ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور مس نے چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔ مس ثمرہ پڑا کا پیس الگ کر کے سیدھی ہوئیں تو ارسہ کو دیکھا۔

"ارسہ پانی رکھ دیں یہاں۔" ان کے سامنے چھوٹا سا بینچ پڑا تھا۔ ارسہ نے جھک کر گلاس بینچ پر رکھا اور جانے کے لیے مڑی۔

"ارسہ۔۔۔ تمہاری اور سر تقی کی اسٹوری بڑی اِن ہے آج کل۔" مس صدف کی آواز تھی۔ ارسہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اب یہ کیا شروع کرنے والی تھیں۔ باقی دونوں ٹیچرز نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ پھر مس ثمرہ "پلیز ایکس کیوزمی" کہتے ہوئے پڑا ہاتھ میں پکڑے وہاں سے اٹھ گئیں اور چائے کا کپ وہاں ہی چھوڑ دیا۔ ارسہ رک گئی تھی لیکن جواب کوئی نہیں دیا' وہ کہتی بھی کیا۔

"بتاؤ نا کیا سین ہے؟" اسے ان الفاظ پر دھچکا سا لگا۔ یہ ایک عورت' اس سے بڑھ کر ایک استاد کے الفاظ تھے۔ وہ مس صدف کے جوتوں پر نظروں جما کر کھڑی رہی۔

"سر یہاں تو بڑے موڈ میں رہتے ہیں' گھر میں بھی ایسے ہی ہیں؟" ساتھ چائے کی چسکی لی۔ ارسہ خاموش کھڑی جوتوں کی نوک دیکھتی رہی۔

"ویسے سر تقی ہیں بہت ہینڈسم۔" مس سدرہ کی آواز پر ارسہ نے ایک نظر ان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گلہ ابھرا۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی۔ "ارسہ بھی بہت کیوٹ ہیں۔ کپل اچھا ہے۔" میم سدرہ نے اضافہ کیا۔

"لیکن مس' ابھی ان کاموں کے لیے بہت عمر نہیں پڑی تھی اس کی۔" مس صدف کو ناگوار گزری تھی یہ بات۔

"کہاں کے رہنے والے ہیں یہ لوگ؟ تم ملی ہو سر تقی کی فیملی سے؟" پھر کچھ یاد آنے پر پوچھا۔ ارسہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"یا اللہ مجھے غائب کردے یہاں سے۔" علشبہ ہوتی تو بات سنبھال لیتی۔ اس کے تو حواس کام کرنا چھوڑ دیتے تھے۔ ایسی صورت حال میں۔ لڑکیوں کو تو چپ کرا سکتی تھی لیکن ٹیچرز۔ ان کا کیا کرتی؟

"دیکھیں مس! نہ کوئی آگے' نہ پیچھے' تعلیم' نہ کوئی عمر۔ کیا مستقبل ہے اب اس کا؟" بڑی جتاتی نظروں سے مس سدرہ کو دیکھا۔ ارسہ اگلے ہی لمحے پھوٹ پھوٹ کر رونے والی تھی۔ اس کا منہ سرخ ہو چکا تھا اور جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ مس صدف نے مزید کچھ کہنے سے پہلے پزا کا بڑا لقمہ لیا۔ پزا ٹھنڈا ہونے سے پہلے اس سے بھی تو لطف اندوز ہونا تھا' جبکہ مس سدرہ اس کو دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلا رہی تھیں۔

"ارسہ! یہ ٹیسٹ ہیں۔ ان کی لسٹ بنا کر کلاس میں ڈسٹری بیوٹ کردیں۔" تقی تیزی سے ارسہ کے قریب آیا اور ارسہ کی طرف رول کیے ہوئے پیپرز بڑھائے۔

"اوہ سوری۔" تقی نے مس صدف اور مس سدرہ سے کہا۔ جیسے اپنے دھیان میں ہو اور اب اس بے دھیانی پر شرمندہ ہو۔ ارسہ پیپرز پکڑ کر تیزی سے کلاس روم کی طرف بڑھ گئی۔

"اٹس اوکے سر! پزا لیں۔" مس صدف نے بڑی خوب صورتی سے مسکراتے ہوئے آفر کی۔

"نو تھینکس۔" تقی تکلفاً" مسکرایا۔

"ارے سر! آپ کو ڈائٹ کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں جوائن کریں۔" مس صدف نے اصرار کیا۔ (اس عورت کی بے باکی' اس کے مسیجز' اس کی کالز۔ توبہ ہے۔)

"نہیں شکریہ۔" اب کے تکلفاً" مسکرانے کی بھی زحمت نہیں کی اور اسٹاف روم کی طرف بڑھ گیا۔ اب کسی دھوپ چھاؤں نے اثر نہیں کرنا تھا۔ تقی نے صرف ارسہ کو وہاں سے ہٹانے کے لیے یہ کیا تھا۔ جب ارسہ باہر نکلی تھی۔ تقی نے خفیف سا سر گھما کر اس کو باہر نکلتے دیکھا۔ یہاں سے ایک ٹیچر کی کرسی کا پچھلا حصہ نظر آرہا تھا۔ تقی کی نظروں نے باہر تک اس کا تعاقب کیا۔ باہر سردیوں کی سنہری دھوپ پھیلی تھی۔ اس نے سوچا۔ اسے بھی چل کر باہر بیٹھنا چاہیے۔ اس لیے اس نے اخبار لپیٹا اور باہر جانے کے لیے اٹھا۔ باہر نکل کر اس نے ارسہ کو ایک نظر دیکھا۔

وہ اسے بے حد پریشان لگی۔ وہ لاشعوری طور پر وہاں ہی رک کر دیکھنے لگا۔ اس تک آواز پہنچ رہی تھی لیکن آواز واضح نہیں تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ جب ارسہ نے نفی میں سر ہلایا' تب اس کے چہرے پر جو تکلیف تھی وہ بہت واضح محسوس ہوئی تھی اسے۔ تقی کے دماغ میں الارم سا بجا کہ اسے کسی طرح ارسہ کو وہاں سے ہٹانا ہے۔

وہ تیزی سے واپس آیا۔ دراز سے آج کا ٹیسٹ نکالا۔ اس نے ابھی دو تین پیپرز ہی چیک کیے تھے۔ ان چیک کیے ہوئے پیپرز کو اوپر رکھا اور بے حد تیزی سے ارسہ تک پہنچ کر اسے وہاں سے ہٹایا۔ اب واپس آکر بیٹھ گیا تھا۔ ٹیسٹ چیک نہیں تھے۔ وہ گھر جا کر اس سے واپس لے سکتا تھا۔ مگر یہ تھا کیا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا مگر اس سب میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے بے حد بری لگ رہی تھی۔ وہ بریک ٹائم اوور ہونے تک گم صم بیٹھا رہا۔

اور ارسہ کلاس روم کی طرف گئی تھی۔ علشبہ کلاس کے دروازے پر ہی کھڑی ارسہ کا انتظار کر رہی تھی۔ ارسہ ایک ہاتھ میں پیپرز دبوچے اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی سختی سے بھینچے تقریباً" بھاگتے ہوئے کلاس میں اپنی کرسی تک آئی۔ گالوں پر آنسو ایک قطار کی صورت بہہ رہے تھے۔ علشبہ کو پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ کیا ہوا؟ اس نے بس کرسی کے ہتے پر بیٹھ کر دونوں بازوؤں میں اسے بھینچ لیا۔ اس کے پاس تسلی دینے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ ارسہ کے ہاتھ میں پکڑے پیپرز بکھر گئے تھے۔ جیسے ارسہ خود بکھر گئی تھی۔

"علشبہ! میں مرجاؤں گی۔ میں مرجاؤں گی۔ لوگوں کی ایسی باتیں مجھے مار دیں گی۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ یہ سب برداشت کرسکوں۔" وہ روتے

ہوئے بول رہی تھی اور آواز میں اتنا درد' اتنی تکلیف تھی کہ علشبہ کے بھی آنسو نکل آئے۔

"بہت درد ہوتا ہے مجھے۔۔۔ بہت ہرٹ ہوتی ہوں میں۔ یہ پزا کھاتے ہوئے' مزا لینے والی بات نہیں ہے۔ جب وہ پوچھتی ہیں' کیا سین ہے؟ وہ سمجھ نہیں سکتیں مجھ پر کیا گزرتی ہے۔ جب وہ کہتی ہیں' یہ سب کرنے کی عمر نہیں تھی میری۔ جب وہ مجھے بتاتی ہیں میرا اب کوئی مستقبل نہیں۔۔۔ تو کوڑے لگتے ہیں مجھے' زخم بن جاتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتیں کہ ان زخموں پر مرہم رکھنے والا بھی کوئی نہیں۔ اگر اسی طرح زخم لگتے رہے' تو مر جاؤں گی میں۔۔۔" ارسہ نے سختی سے آنکھیں بھینچ کر کھولیں۔

"ششش۔۔۔" علشبہ نے اسے خود سے الگ کیا۔ اس کے آنسو پونچھے اور اپنے بھی۔۔۔ وہ خود اس سے زیادہ رو رہی تھی۔ مگر ایسے نہیں چل سکتا تھا۔

"تمہیں ہمت نہیں ہارنی ارسہ۔ ہمت ہارو گی تو واقعی مر جاؤ گی' کسی کو اجازت مت دو کہ وہ تم پر چڑھائی کر سکے۔ خاموش رہو گی تو اسی طرح پیچھے پڑے رہیں گے لوگ۔ خیر اب میں دیکھتی ہوں' کون تم سے کوئی ایسی ویسی بات کرتا ہے۔" پھر نیچے بیٹھ کر تیزی سے پیپرز سمیٹے اور ارسہ کو پانی لا کر پلایا۔ بریک ٹائم ختم ہونے کو تھا۔ اسے اپنی دوست کو مزید تماشا نہیں بننے دینا تھا۔

کالج سے گھر تک کا راستہ بہت مشکل سے طے کیا تھا ارسہ نے۔ عجیب سی تھکن پورے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ شام کو بستر پر لیٹ کر بے آواز روتے ہوئے سوچتی رہی کہ زندگی میں ہر چیز کیوں الٹ سی ہے۔ وہ ایسا کیا کر سکتی تھی کہ حالات کچھ سازگار ہو جاتے۔

"دھندلا گئی ہے' ہر چیز' منزل کیا راستوں کے نشان تک مٹ گئے ہیں۔ کہاں جاؤں۔۔۔ کس سے مدد مانگوں۔ مدد۔۔۔ اللہ سے۔۔۔" اس کے دل سے آواز آئی۔

"یا اللہ میں تھک گئی ہوں' عاجز آگئی ہوں۔ میں اور برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ بہت زیادہ ہے' مجھے بچالے' مجھے بچالے' مجھ پر رحم فرما۔" اپنی سسکیاں' چیخیں دباتے اللہ کو پکارا اور بے شک اللہ کو پکارنے والے خالی ہاتھ نہیں رہتے لیکن صبح تک وہ اس سب کی وجہ سے بخار میں جل رہی تھی۔

کالج نہ جانے پر علشبہ نے تقی سے پوچھا تھا اور ارسہ کے بیمار ہونے کا سن کر پریشان ہوئی۔ دوسرے دن پھر ارسہ کے کالج نہ آنے پر اس نے تقی سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ جا کر ارسہ کو دیکھ سکتی ہے۔ وہ گھر سے اجازت لے کر آئی تھی پھر کیا اعتراض ہونا تھا۔ گھر کے مین گیٹ پر تالا لگا تھا۔

"ارسہ کو باہر نہیں نکلنا ہوتا۔ مجبوری کی صورت میں پچھلا گیٹ اندر سے کھولا جا سکتا ہے۔" تقی نے تالا کھولتے ہوئے علشبہ کو وضاحت دی۔ جس کی ضرورت نہیں تھی۔ "میں جانتی ہوں سر۔" علشبہ نے کہا۔

صحن میں ارسہ نیم کے ٹنڈ منڈ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کچی زمین پر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ علشبہ تیزی سے اس تک آئی۔

"ارسہ!" علشبہ نے اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے پکارا۔ ارسہ نے آہستگی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔

وہ ننگے پیر بیٹھی تھی۔ کپڑوں اور ہاتھوں' پاؤں پر مٹی لگی تھی۔ ہونٹوں پر جمی پیڑی' الجھے بال' مسلے ہوئے کپڑے' خالی خالی سی ویران آنکھیں جن میں علشبہ کو دیکھ کر بھی کوئی خاص تاثر نہیں ابھرا۔ وہ اسے بالکل اس درخت کی طرح اجڑی ہوئی لگی۔ علشبہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔ پہلے علشبہ اسے دیکھتی تو وہ اسے شہزادی کی طرح لگتی تھی۔ شہزادی کو فقیرنی کے روپ میں دیکھنا اس جیسی مخلص دوست کے لیے ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ علشبہ کی آنکھوں میں گلابی ڈورے ابھرے۔ تقی اسے دیکھ کر اندر چلا گیا۔

"یہاں۔۔۔ اس طرح کیوں بیٹھی ہو ارسہ۔۔۔"

"دھوپ میں بیٹھی ہوں۔" ارسہ کی آواز میں بھی

نقاہت نمایاں تھی۔
"نہیں... اٹھو یہاں سے۔ اس طرح مت بیٹھو یہاں۔" علشبہ اسے اٹھا کر اندر لائی۔
"میں کھانا لے آؤں۔" تقی کھانے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔
علشبہ کو اس پر بھی بہت ترس آیا۔ وہ بھی تو ابھی گھر آیا تھا۔ اب بنا آرام کیے اتنی دور کھانا لینے جاتا اور ارسہ سارا دن کی بھوکی تھی۔ پتا نہیں صبح بھی کچھ کھایا تھا یا نہیں۔ اب اس حالت میں پانی تک پوچھنے والا کوئی نہیں تھا یہاں۔ اسے بے اختیار رونا آرہا تھا اس وقت' ارسہ کو اس حالت میں دیکھ کر... علشبہ نے اس کے کپڑے بدلوائے۔ ہاتھ' منہ اور پیر اچھی طرح دھلوا کر کنگھی کی۔ تب اسے کچھ سکون ملا۔ تقی کھانا لے کر جلدی ہی آگیا تھا۔ علشبہ نے کھانا نکال کر زبردستی ارسہ کو کھلایا۔ وہ بار بار "میرا جی نہیں چاہ رہا' بس کرو' الٹی ہو جائے گی۔ اچھا تم خود بھی تو کچھ کھاؤ۔" کہتی جارہی تھی۔ لیکن علشبہ نے اسے کھانا اور دوا کھلا کر ہی دم لیا۔ جبکہ تقی نے ایک نوالہ تک نہیں کھایا تھا۔ علشبہ نے کھانا نکال کر پہلے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی تھی' مگر وہ "مجھے بھوک نہیں ہے' آپ لوگ کھائیں۔" کہتے ہوئے کچن کے پچھلے دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔



تین چھٹیوں کے بعد آج ارسہ کالج آئی تھی۔ علشبہ' ارسہ کو دیکھ کر تیزی سے اٹھ کر اس تک آئی۔
"کیسی طبیعت ہے اب؟" اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر فکرمندی سے پوچھا۔
"میں ٹھیک ہوں۔" ارسہ بے اختیار علشبہ کے گلے لگی۔
"تم جیسے دوست اللہ ہر کسی کو دے۔" باقی کلاس کے ساتھ سلام دعا کر کے اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آمین..." علشبہ ہنسی۔
"ویسے میں سمجھ رہی تھی' تم کل آؤ گی' کیا طبیعت کل بھی خراب تھی؟"
"نہیں... کل ٹھیک تھی میں۔ سر نے منع کر دیا تھا آنے سے۔" ارسہ نے بتایا۔
"انہیں سر نے منع کر دیا' کیوں؟" علشبہ کو ذرا حیرت ہوئی۔
"ہاں... پتا ہے کل نا' سر نے مجھے کیمسٹری کے نوٹس دیے اور کہا کالج جانے کے بجائے گھر بیٹھ کر یاد کر لوں۔ جتنا بھی یاد کر سکتی ہوں میں' یا پھر ریسٹ کروں اور اگر بور ہوتی ہوں تو ان کا لیپ ٹاپ استعمال کر سکتی ہوں' کوئی پاس ورڈ نہیں لگا اور evo لیپ ٹاپ والے بیگ میں ہی رکھی ہے۔" ارسہ بڑے بشاش لہجے میں بتا رہی تھی۔
"پھر... کیا تھا لیپ ٹاپ میں؟" علشبہ پرجوش ہوئی۔
"کیا..." ارسہ نے کندھے اچکا کر "کیا" کو کھینچا۔ "مجھے تو لیپ ٹاپ استعمال کرنا ہی نہیں آتا۔" وہ تو بس تقی کی اس آفر پر خوشی تھی۔
"کیا... تم نے آن ہی نہیں کیا؟" علشبہ کے جوش پر پانی پھرا۔
"یار... مجھے تو کمپیوٹر تک آپریٹ کرنا نہیں آتا۔ لیپ ٹاپ کا کیا کرتی' خراب ہو جاتا تو...؟"
"تو ہو جاتا... ارسہ' تھوڑی ڈھیٹ ہو جاؤ یار... زندگی آسان ہو جائے گی' یقین کرو۔" علشبہ کو بڑی مایوسی ہوئی تھی۔
"پاگل خراب ہو جاتا تو وہ کیا سوچتے کہ میں کتنی پینڈو ہوں۔ مجھے کسی چیز کا پتا ہی نہیں۔"
"نہیں پتا تو نہیں پتا' اب انسان کو ہر چیز کا تو پتا نہیں ہو سکتا نا۔ جب تم استعمال کرو گی تو تمہیں آجائے گا' ان کو کون سا پیدا ہوتے ہی ہر چیز کا پتا تھا۔ انہوں نے بھی تو کہیں نہ کہیں سے سیکھا ہو گا یا ہم آس پاس استعمال ہوتے دیکھ کر سیکھ جاتے ہیں چیزوں کو۔ اور تم کیا اس چیز کو لے کر احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہو۔"

علشبہ نے جیسے ڈانٹا۔

"ہاں۔۔۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں کہاں سے کچھ سیکھ سکتی تھی، کہیں آتی جاتی تو تھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ رات پی ٹی وی پر آٹھ بجے والا ڈراما دیکھا کرتی تھی۔ اب تو وہ بھی گیا۔ پھر تم ایک دوست ہو اور تم خود زیادہ عقل مند نہیں ہو۔"

"کیا۔۔۔؟" علشبہ نے گھورا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ تم بہت عقل مند ہو۔" ارسہ نے ہمیشہ کی طرح فوراً ہار مان لی۔ "ویسے تم کبھی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوتیں علشبہ؟" علشبہ ہنس پڑی۔

"ہوتی ہوں یار۔۔۔ سب ہی ہوتے ہیں، کسی نہ کسی وجہ سے۔۔۔ لیکن ہونا نہیں چاہیے۔ ہم کسی کی اچھی چیز کا مقابلہ اپنی کمتر چیز سے کرتے ہیں تو احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں اور وہی بندہ اپنی کسی کمی یا محرومی کو لے کر انہی احساسات سے دوچار ہو رہا ہوتا ہے۔ پھر کیا فرق ہوا۔۔۔ اس میں اور ہم میں؟ ہیں تو سب ہی انسان نا۔۔۔ ہم ایویں متاثر ہوتے پھرتے ہیں۔ اپنے جیسے ہی انسانوں سے۔۔۔ سوچو ذرا! جو اللہ نے نہیں دیا اور نہیں دینا۔ وہ کوئی حاصل کر سکتا ہے۔ اپنے بل پر؟ نہیں نا؟ اصل میں ہم سب ہی ایک جتنے بے بس محتاج اور عام انسان ہیں۔ پھر کیا ضرورت پڑی ہے کسی دوسرے انسان کی وجہ سے کچھ ایسا ویسا فیل کرنے کی۔"

"ہاں۔۔۔ واقعی!" ارسہ نے دھیان سے سنا اور پھر سمجھ کر سر ہلایا۔

"اور خود کو دیکھو کس بات سے متاثر ہو رہی ہو۔" علشبہ کا انداز مذاق اڑانے والا تھا۔ اب وہ ہنس رہی تھی۔

"کوئی نہیں۔۔۔ وہ تو میں نے ایسے ہی کہا، بس۔۔۔" اس نے علشبہ کے بازو پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"اچھا۔۔۔ وہ خود کیا کرتے ہیں لیپ ٹاپ پر؟" علشبہ نے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ بہت کچھ۔۔۔ کبھی نوٹس بناتے ہیں وہاں سے دیکھ کر۔ مووی، میوزک اور خبریں وغیرہ سنتے ہیں، کبھی باتیں کرتے ہیں۔ جیسے کال پر کرتے ہیں نا لوگ ایسے۔۔۔ کبھی۔۔۔"

"کس سے باتیں کرتے ہیں؟" علشبہ نے فوراً ٹوکا اور پوچھا۔

"لوگوں سے۔۔۔"

"کن لوگوں سے۔۔۔" علشبہ نے سر پیٹا۔

"مجھے کیا پتا۔۔۔ میں تھوڑا ہی جانتی ہوں کسی کو۔۔۔"

"تو بات کیا کرتے ہیں؟"

"وہ پشتو میں باتیں کرتے ہیں۔ جو میرے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔" ارسہ نے سر پکڑ کر جواب دیا۔

"تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔" علشبہ ہنس پڑی۔

"مجھے پتا ہے۔" ارسہ بھی مسکراتے ہوئے بیگ کھولنے لگی۔



تقی پرنسپل کو فون کر رہا تھا۔ آج جمعہ تھا، وہ کل یعنی ہفتے کی چھٹی کی بات کر رہا تھا۔ ارسہ کے کان کھڑے ہوئے۔

"کل کی چھٹی۔۔۔ کیوں۔۔۔؟" وہ کمرے سے باہر چبوترے پر ادھر ادھر چلتے ہوئے بات کر رہا تھا۔ ارسہ کوشش کے باوجود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ چھٹی کی کیا وجہ بتا رہا ہے سر کو۔ تقی جیسے ہی اندر آیا۔ ارسہ نے بے اختیار پوچھا۔

"آپ کل کالج نہیں جا رہے؟"

"نہیں۔۔۔ کل میں اسلام آباد جاؤں گا۔ کچھ کام ہے۔ آگے پھر اتوار ہے۔ ایک رات رہ کر اتوار کی شام واپس آ جاؤں گا۔" ارسہ کو دیکھ کر بولا۔ اسے کچھ حیرت ہوئی کہ وہ پڑھ رہی تھی یا اس کی باتیں سن رہی تھی۔ ارسہ کا سانس اٹکا۔ وہ رات اکیلے کیسے رہے گی۔ پھر پوچھ ہی لیا۔

"میں رات کو اندھیرے میں کیسے رہوں گی؟"

"رات کو اندھیرے میں کیا ہوتا ہے؟ اور میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔" تقی نے سوال کیا۔ پھر خود ہی واضح بھی کر دیا کہ مجھ سے کوئی امید مت

رکھنا۔ ارسہ کو کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی بات۔ جب پہلے دن تقی نے کلاس میں آ کر اپنا مختصر سا تعارف کرایا تھا' تب اس نے بتایا تھا کہ اس نے اسلام آباد میں تعلیم مکمل کی ہے اور اس سے پہلے وہاں ہی جاب کر رہا تھا۔ جب پرنسپل صاحب نے اسے یہاں آنے کا کہا تھا کہ یہاں تعلیم کا بہت رجحان اور تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ اگر وہ یہاں آ جائے تو یہ اس کے لیے اور یہاں کے اسٹوڈنٹس کے لیے اچھا رہے گا۔ اگر اس نے اسلام آباد میں ہی پڑھا تھا اور وہاں ہی جاب بھی کرتا تھا' تو امکان تھا کہ اس کا خاندان بھی وہاں ہی ہو۔ اس لیے وہ ارسہ کو وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ شاید تقی کی فیملی اسے قبول نہ کرے۔ یہ بھی ممکن تھا اس نے ابھی تک ان کو اس بارے میں کچھ بتایا ہی نہ ہو۔۔۔ یا جو بھی تھا مگر ارسہ فی الوقت اس بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ رات کو اکیلے نہیں رہ سکتی تھی اور چاہتی تھی تقی بھی اس بات کو سمجھے' مگر۔۔۔ ارسہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

تقی اب کمرے کا دروازہ مقفل کر کے چیک کرنے والے کچھ پیپرز لے کر اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ کیونکہ کمرے کی واحد کرسی پر ارسہ براجمان تھی اور میز پر کتابیں اور نوٹس پھیلائے پڑھ رہی تھی مگر اب مزید پڑھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کا دھیان ہٹ چکا تھا۔ وہ ہر منٹ بعد اپنی کتاب سے نظریں ہٹا کر گردن موڑ کر تقی کو پریشانی سے دیکھتی اور پھر واپس کتاب پر نظر ڈال کر اپنا ٹاپک سمجھنے کی کوشش کرتی' مگر ناکام رہتی۔ تنگ آ کر دونوں ہاتھ کتاب پر رکھ دیے' گردن سیدھی کی' آنکھیں بند کر کے لمبی سانس لی اور پھر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

تقی نے ایک دم اپنا پین رکھ کر اسے دیکھا۔ وہ کب سے اس کی بے چینی نوٹ کر رہا تھا۔ تقی اتنا اچانک متوجہ ہوا تھا کہ ارسہ اس پر سے اپنی نظریں بھی نہیں ہٹا سکی تھی۔

''کل صبح جلدی جاؤں گا اور شام کو جلدی واپس آ جاؤں گا۔ رات نہیں رہتا۔ ٹھیک ہے؟ ہو گیا۔۔۔ اب پڑھو اپنا۔'' ارسہ نے گردن سیدھی کی۔ خجالت سے مسکرا کر دل میں سوچا۔

''جی ہاں۔۔۔ ہو گیا۔'' پھر دھیان سے پڑھنے کی کوشش کی۔ اس بار کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔



کالج میں جب تقی اپنا پیریڈ لینے نہیں پہنچا تو لڑکیوں نے ارسہ سے پوچھا کہ۔۔۔

''سر کیوں نہیں آئے؟''

''سر کام سے گئے ہیں۔ اس لیے نہیں آئے۔'' ارسہ نے مختصر جواب دیا۔ چھٹی پر لاشعوری طور پر اس کی نگاہیں تقی کو کھوج رہی تھیں۔ اس کے کہیں نظر نہ آنے پر دل پر ویرانی سی چھا گئی۔ وہ کالج سے نکلی اور گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ کالج کے اندر باہر بہت رش تھا۔ اتنے لوگوں میں بھی اسے اپنا آپ تنہا اور غیر محفوظ لگ رہا تھا۔ تین مہینے ہو گئے تھے تقی کے ساتھ آتے جاتے۔ آج اس کا نہ ہونا بہت محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے روڈ کراس کیا تو اسے کسی نے پیچھے سے پکارا۔

''ارسہ۔۔۔!'' تقی آ گیا۔ وہ فوراً مڑی مگر وہ تقی نہیں تھا اور جو تھا۔ اس کا سامنا ہونے کی بالکل امید نہیں تھی اسے۔

''احسن بھائی۔۔۔'' ارسہ کی آواز بڑبڑاہٹ کے مشابہ تھی۔ احسن تیزی سے اس تک آیا۔

''ارسہ! یہ سب کیا ہے۔۔۔ تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔۔۔ میں اس شام پھپھو کی طرف گیا تو مجھے نور نے بتایا۔۔۔ لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا۔۔۔ تم ایسی تو نہیں ہو۔۔۔ شاید انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔۔۔ میں۔۔۔ میں تمہارے لیے فکر مند ہو رہا تھا لیکن میرا ٹرانسفر لاہور ہو گیا ہے۔ اس لیے پہلے آ نہیں سکا۔۔۔ خیر۔۔۔ ابھی آؤ میرے ساتھ گھر جا کر بات کرتے ہیں۔'' تیزی سے بولتے ہوئے ارسہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لے جانا چاہا۔

ارسہ نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور احسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔

"میں ایسی ہی ہوں... نور نے جو بتایا ہے وہ سچ ہے۔ کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔" احسن ٹھہر سا گیا۔

"ارسہ!" صدمے سے اسے دیکھا۔

"میں نے تم سے محبت کی ہے... اپنے گھر والوں کی مخالفت کے باوجود تم سے شادی کرنا چاہی اور تم..."

"اور میں ایک بدکردار لڑکی ہوں اور آپ کو اپنے انتخاب پر افسوس ہے... ہے نا؟" اس نے احسن کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں..." احسن نے حقارت سے کہتے ہوئے چند لمحے اسے دیکھا اور جھٹکے سے مڑ کر چلا گیا۔ ارسہ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔ پسینے سے بھیگی لرزتی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑا۔

ہوں... محبت... مجھ سے اتنی ہی محبت تھی میری اتنی ہی فکر تھی، تو اسی شام پتا چل جانے پر بھی مجھے پوچھنے تک نہیں آئے۔ اس شام کیا، اتنے عرصے تک میرا خیال نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں گی... کس حال میں ہوں گی؟ اب تین مہینے گزر جانے کے بعد، میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں گی، تو آپ ضرور یقین کرلیں گے میری بات کا۔ مجھے آپ سے کوئی کیریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں چاہیے احسن بھائی، بس یہ ہو کہ آپ، نور اور بابا مجھے کبھی دوبارہ نظر نہ آئیں۔ میں آپ کی وجہ سے اپنی زندگی میں اور کوئی مصیبت نہیں چاہتی۔"



ارسہ گھر پہنچ کر تقی کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آنگن میں شام کے سائے بڑھنے لگے تھے۔ ارسہ اداس سی بیٹھی، کھڑکی سے باہر صحن کو دیکھ رہی تھی۔

"تقی آجائیں پلیز..." صرف تقی کے نہ ہونے سے ہر چیز سے اتنی ویرانی، اتنی اداسی ٹپک رہی تھی۔ جانے وہ اس وقت کہاں تھا۔ ارسہ نے بڑی مشکل سے اپنے خیالات سے پیچھا چھڑا کر کتاب کھولی۔ اب مغرب کے بعد اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ارسہ نے اٹھ کر سارے گھر کی لائٹیں آن کردیں اور کھڑکی بھی بند کردی۔ دروازے تو کالج سے آکر ہی بند کیے بیٹھی تھی۔ احسن بھائی سے سامنا ہونے پر عجیب ہی خوف دامن گیر ہوا تھا۔ مگر اب اندھیرے کے خوف نے بھی اس کے دل میں پنجے گاڑنے شروع کردیے تھے۔

"تقی کب آئیں گے؟" اس نے پریشانی سے سوچا۔ وہ کرسی پر بنا کوئی حرکت کیے بیٹھی تھی۔ اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر تقی آج نہ آیا تو... اور اگر وہ کبھی واپس نہ آیا تو...؟ وہ یہ بات سمجھتی تھی کہ تقی کے دل میں اس کی کوئی جگہ نہیں ہے اور جس طرح کے حالات کے نتیجے میں وہ اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ وہ تقی کے دل میں شاید ہی کوئی مقام بنا پاتی۔ وہ بھی اس صورت میں اگر تقی کی زندگی میں کوئی اور عورت نہ ہوئی۔ پھر اس کا خاندان... اُف... اس نے اضطراب سے ٹہلنا شروع کردیا۔ پھر تقی کی چارپائی کے نیچے پڑے اس کے سوٹ کیس پر نظر پڑی تو تیزی سے آگے بڑھ کر اسے گھسیٹ لیا۔

یہ ایک بڑا سوٹ کیس تھا اور تقی کے کپڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے ترتیب یاد رکھ کر کپڑے نکالنے شروع کیے۔ بہت ساری شرٹس ترتیب سے پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ ابھی پیک تھیں۔ جینز، ڈریس پینٹس، اسٹائلش جیکٹس، ہر کپڑا ہی برانڈڈ تھا۔ ایک فولڈر فائل کھڑی کرکے ایک طرف رکھی گئی تھی۔ ارسہ نے نکال کر کھولی۔ سب سے اوپر ان کا نکاح نامہ تھا۔ وہ بہت دیر اسے دیکھتی رہی۔ باقی اس کے اوریجنل ڈاکومنٹس تھے۔ اس کی ڈگریاں، سرٹیفکیٹس، اس کا اکیڈمک ریکارڈ زبردست تھا۔ ایک کمپیوٹر کے کسی کورس کا سرٹیفکیٹ تھا اور ایک ٹیچنگ سرٹیفکیٹ۔ یعنی وہ پہلے اسلام آباد میں بھی ٹیچنگ ہی کررہا تھا۔ وہ غور سے سب دیکھتی رہی۔ کانووکیشن ڈے کا ایک بڑا گروپ فوٹو تھا۔ ان میں اس نے تقی کو ڈھونڈنے کی کوشش کی اور پھر پہچاننے میں کامیاب رہی۔ اسے بہت خوشی ہوئی تھی اس پر۔ پھر

بہت دیر دیکھ کر فائل بند کر دی۔ سوٹ کیس کی ایک پاکٹ میں پیسے تھے۔ اس نے نکال کر گنے۔ ساڑھے تیرہ ہزار تھے۔ پھر واپس رکھ دیے۔ ایک موبائل فون کا ڈبا' پکڈ پرفیوم' گھڑی اور اسٹڈ کے کیرز' باہر کھٹکے کی آواز پر ارسہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کو ساری ترتیب بھول گئی۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سوٹ کیس بند کر کے واپس دھکیلا۔ پھر کھڑے ہو کر خود پر قابو پاتے ہوئے آواز سننے کی کوشش کی۔ گلی میں کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کچھ دیر ایک موٹر سائیکل کے گزرنے کی آواز آئی اور بس۔۔۔

ارسہ نے پھر سوٹ کیس کھول کر کپڑے اور دوسری چیزوں کی ترتیب دیکھی اور پھر کچھ مطمئن ہو کر بند کر دیا۔ پھر بے ارادہ ہی واش روم جا کر دیکھا۔ وہاں تقی کی ایک قمیص تھی۔ جو اس نے کل اتاری تھی۔ تقی ایک شرٹ ایک ہی دن پہنتا تھا۔ ارسہ تقی کی قمیص لے کر اپنی چارپائی پر آبیٹھی اور منہ پر رکھ کر لیٹ گئی۔

"آہ۔ تقی کی خوشبو۔" آہستگی سے مسکرائی۔

"یہاں سب سے قیمتی ایک تقی ہیں اور ان کے ذاتی استعمال کی چیزیں۔" پھر سوچا۔ "میں بھی کتنی پاگل ہوں نا' اگر تقی نے واپس نہ آنا ہوتا تو اپنی ساری چیزیں اس طرح چھوڑ کر جاتے اور اگر وہ مجھے کہتے ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں تو۔۔۔ میں انہیں روک سکتی تھی بھلا۔" سر جھٹکا۔

اتنے میں عشاء کی اذان ہونے لگی۔ دفعتاً" وہ چونکی۔ قمیص منہ سے ہٹائی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "باہر تو رات ہو گئی ہے۔ اب رات اور اندھیرے کا خوف اس پر حاوی ہوا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس کو لگا کچن میں کوئی ہے۔ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کے جسم میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی کہ وہ اٹھ کر کچن کا دروازہ بند کر سکے۔ یہ اس کی اپنی سوچ کی وجہ سے پیدا ہونے والے خوف کا نتیجہ تھا۔ اگلے لمحے وہ اپنی پوری طاقت صرف کرتے ہوئے اٹھی اور کچن کا دروازہ ٹھاہ کی آواز سے بند کر دیا۔ خوف سے اس کے جسم پر لرزا طاری ہو گیا تھا۔ گیٹ بجنے کی آواز آئی تو ارسہ کی چیخ نکل گئی۔

ایک لمحے کے لیے اس کو لگا تھا کہ کچن کا دروازہ بجایا ہو اندر سے کسی نے' جو اس نے ابھی بند کیا تھا۔ گیٹ وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ کون ہو سکتا ہے۔ میں اس وقت باہر نہیں نکل سکتی۔ واپس اپنی چارپائی پر دونوں ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ارسہ۔۔۔!" بہت دیر دروازہ بجانے کے بعد تقی نے گھبرا کر اسے آواز دی تھی۔

"تقی۔۔۔" ارسہ نے تیزی سے بھاگ کر گیٹ کھولا اور کندھے سے نیچے تقی کا کوٹ دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ تقی نے دیکھا' وہ کانپتے ہوئے رو رہی تھی۔

"ارسہ۔۔۔ کیا ہو گیا؟ دروازہ کیوں نہیں کھول رہی تھیں؟ سب ٹھیک ہے؟" وہ بے طرح پریشان ہوا۔ جو بھی تھا یہ لڑکی تھی تو اس کی ذمہ داری۔

"تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟" آخر تقی نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا اور زور دے کر پوچھا۔

"اندھیرا ہے۔" ارسہ نے پیراگراف کے دو الفاظ ہی بولنے ہوتے تھے۔ آگے خود سمجھو۔ وہ اندھیرے سے ڈر رہی تھی۔ تقی نے سمجھ کر گہری سانس لی۔

"تو صحن کی لائٹ جلا لی ہوتی اور اندھیرا کہاں ہے؟ دیکھو! اتنی روشنی تو ہے چاند کی۔" ارسہ نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا اور پھر صحن میں پھیلی میٹھی چاندنی کو۔ ہاں واقعی اندھیرا کہاں ہے؟ اگر تقی جیسا چاند اس کی زندگی میں رہے تو اندھیرا ٹھہر سکتا تھا بھلا۔ اس نے سوچا۔

"اندر چلو سردی ہے۔" تقی بولا تو ارسہ چونک کر پیچھے ہٹی۔ تقی نے سارے شاپنگ بیگز ایک ہاتھ میں منتقل کیے اور گیٹ بند کر کے آگے بڑھ گیا۔

"دن بہت چھوٹے ہیں۔ ہر کام جلدی کرنے کے باوجود بھی میں لیٹ ہو گیا۔" اپنی چارپائی پر بیٹھ کر شاپنگ بیگ ارسہ کی طرف کھسکائے۔ "یہ تمہاری چیزیں ہیں۔"

ارسہ تقی کی طرف رخ کر کے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ تقی کے ہونے سے دل میں اترنے والے اطمینان کو محسوس کرتے ہوئے جھک کر دیکھنے لگی کہ اس کے

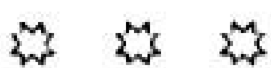
لیے کیا آیا ہے؟ اس میں سوٹ تھے۔ تین بے حد خوب صورت ڈیزائنر سوٹ' ارسہ نے اب دل میں خوشی کو سر ابھارتے محسوس کیا۔ جس کے رنگ چہرے پر بھی پھیلنے لگے تھے۔ اسے تینوں سوٹ بہت پسند آئے۔ دوسرے بیگ میں جوتے تھے۔ وہ نکال کر پہننے لگی' تو دیکھا۔ اس کے پاؤں گندے تھے اور کچھ زخمی بھی۔ وہ ننگے پاؤں گیٹ کھولنے کے لیے بھاگی تھی اور کچے صحن میں چھوٹے چھوٹے پتھر' کنکر پاؤں میں چبھے تھے۔ اب آہستہ آہستہ حواس واپس آنے پر درد محسوس ہو رہا تھا۔ جوتے بھی بہت اچھے تھے مگر سائز بڑا تھا۔ تقی اپنی گردن کا پچھلا حصہ دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔ ارسہ نے تیسرے بیگ کو دیکھا تو بول پڑا۔

"اس میں کھانا ہے۔" تقی اپنے لیے کچھ نہیں لایا تھا۔ وہ تو یہاں بھی بازار سے سبزی لینے جاتا تو اپنے لیے کچھ خرید لاتا تھا اور اب اسلام آباد سے اپنے لیے کچھ نہیں لایا تھا' ناقابل یقین۔

"تم نے کھانا بنایا؟" تقی نے پوچھا تو اسے یاد آیا کہ اس نے تو کالج سے آکر کچھ کھایا ہی نہیں تھا۔ بنانا کیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے سخت بھوک اور سردی لگ رہی تھی۔ "سردی" اس کی شال کہاں تھی؟ وہ بس ایک پتلا سا سوئیٹر پہنے ہوئے تھی۔ ارسہ نے تقی کی چارپائی کے پار اپنی چارپائی کی طرف دیکھا تو اسے وہاں اپنی شال پڑی نظر آئی اور ساتھ ہی اپنے تکیے پر پڑی تقی کی شرٹ۔ "اوہ خدا۔ میں کن حالوں میں بیٹھی ہوں۔" جواب نہ ملنے پر تقی "اچھا کھانا نکالو" کہتے ہوئے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

ارسہ کہنا چاہتی تھی کہ اسے یہ چیزیں بہت اچھی لگی ہیں اور تقی کا اس طرح اس کے لیے کچھ لانا اس کے لیے بہت اہم اور خوشی کی بات ہے مگر۔

تیزی سے اٹھ کر شال اوڑھی اور شرٹ تہ کرکے اپنے تکیے کے نیچے چھپائی۔ "حد ہوتی ہے ارسہ بدحواسی کی بھی۔ کسی چیز کو حاوی ہی تو نہیں ہونے دینا ہوتا خود پر۔ عکرشہ باجی مجھے آپ کی ہر بات ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ سوائے اس وقت کے جب واقعی یاد رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"



"علشبہ!"

"ہوں۔" علشبہ نے نوٹس سے سر اٹھا کر پہلے سر کو دیکھا اور پھر ارسہ کو۔

"کیا ہے؟"

"سوری!" ارسہ شرمندہ ہوئی۔ یہ سر تقی کی کلاس تھی۔ کچھ دیر بعد ٹیسٹ ہونے والا تھا۔ علشبہ پوری طرح پڑھنے میں منہمک تھی۔ جب ارسہ نے اپنے دھیان میں اسے بلایا۔

"کوئی بات نہیں بولو۔" علشبہ نے سر کو دیکھ کر آہستگی سے کہا۔

"سر تقی کی ڈریسنگ کیسی ہوتی ہے؟ مطلب تمہیں کیسی لگتی ہے؟" ارسہ کو اس وقت اپنا یہ سوال بے تکا لگا مگر پوچھ ہی لیا جو اس کے دل میں تھا۔ آواز بہت آہستہ رکھی کہ کہیں ڈانٹ ہی نہ پڑ جائے۔ تقی کی کلاس میں کوئی بولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ہی تقی خود کوئی فالتو لفظ منہ سے نکالتا تھا۔

"بہت اچھی ہوتی ہے' کیوں؟" علشبہ نے جواب دے کر پوچھا۔

"ویسے ہی پوچھ رہی تھی یار کہ واقعی اچھی ڈریسنگ ہوتی ہے یا صرف مجھے ہی لگتی ہے۔"

"نہیں۔ اچھی ہوتی ہے۔ واقعی اچھی ہوتی ہے۔" علشبہ نے ایک لمحے کے لیے الجھ کر ارسہ کو دیکھا' پھر سامنے دیکھنے لگی۔

"یار پتا نہیں کیوں۔ مجھے سر کی ہر چیز اچھی لگتی ہے۔ کچھ بھی برا نہیں لگتا۔ یہاں تک کہ جو چیز یہ استعمال کے بعد پھینک دیتے ہیں' میرا جی چاہتا ہے' وہ بھی اٹھا کر محفوظ کر لوں۔ ان کا صرف آس پاس ہونا بھی سکون دیتا ہے۔" ارسہ رک رک کر بولی۔

"یعنی تمہیں سر سے محبت ہو گئی ہے۔" علشبہ چہرہ بے تاثر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

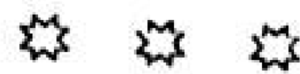
''شاید..... لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا نا۔'' ارسہ افسردہ ہوئی۔

''کیوں.....'' علشبہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یار مانا کہ ہم ایک دوسرے کے نکاح میں ہیں مگر پتا نہیں یہ رشتہ قائم بھی رہے گا یا نہیں۔ ہمارے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ میں اتنے عرصے سے ان کے ساتھ ہوں مگر پھر بھی ابھی تک ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی' کچھ بھی نہیں۔'' نہیں پر زور دیا۔ ''پتا نہیں کل کیا ہونے والا ہے۔ پھر بھی مجھے یہ دل کے قریب کیوں محسوس ہوتے ہیں؟'' ارسہ نے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ ''ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا نا۔'' اس کی آواز بھیگ رہی تھی۔

علشبہ پر واضح ہوا کہ ارسہ' تقی کو کھونا نہیں چاہتی۔ وہ چاہتی ہے کہ یہ رشتہ قائم رہے گا۔ اگر خدانخواستہ یہ رشتہ قائم نہ رہتا تو اس کی دوست کا صرف گھر ہی نہیں دل بھی اجڑتا اور اصل میں دل کے اجڑنے کا مطلب ہی دنیا اجڑنا ہوتا ہے۔ علشبہ نے اسے' خود کو مضبوط کرو' ایک انسان پر دنیا ختم نہیں ہوتی' ٹائپ کی کوئی نصیحت نہیں کی۔ اس کی بجائے اس نے ارسہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''سنو ارسہ! ایسا ویسا کچھ نہیں ہونے والا۔ پتا ہے کیوں؟'' ذرا توقف کیا۔ ''کیونکہ میں تمہارے لیے بہت دعا کرتی ہوں اور پتا ہے نا دعا میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔ تم بھی بس دعا کرو۔ دل میں برے خیالات کو جگہ مت دو۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔'' علشبہ کے دلاسہ دینے کا انداز اتنا اچھا تھا' وہ اتنے پریقین لہجے میں بولی تھی کہ ارسہ کے دل کا بوجھل پن یک دم غائب ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائیں۔ مگر تقی کے ڈر سے جلد ہی مسکراہٹ کا گلا گھونٹ کر اپنے نوٹس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔



دو مہینے اور اسی طرح گزر گئے تھے۔ جب کالج کا دو دن کا ٹور پلان ہوا لیکن تقی نے دو دن کی مزید چھٹی لی اور ارسہ کو لے کر اسلام آباد آ گیا۔ ارسہ نے جب تقی سے ٹور کا پوچھا تھا تو الٹا تقی نے اس سے سوال کیا تھا۔

''کیا تم ان لوگوں کے ساتھ ٹور پر جانا چاہتی ہو' جو ہمیں کالج میں بھی اپنا وقت سکون سے نہیں گزارنے دیتے؟'' اس پر ارسہ خاموش ہو گئی تھی۔

ارسہ پہلی بار تقی کے خاندان سے ملنے والی تھی' جانے سب کا ردعمل کیا ہوتا۔ وہ پریشان تھی کہ اسے کوئی آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔ ایک طرف وہ جاننا چاہتی تھی کہ تقی کا اصل کیا ہے؟ اس کی فیملی کیسی ہے؟ وہ پہلے کہاں اور کس طرح رہا کرتا تھا؟ اس کی زندگی میں کون کون ہے؟ مگر دوسری طرف خوف زدہ بھی تھی۔ رد کیے جانے کا خوف' بے عزت کر کے تقی کی زندگی سے الگ کیے جانے کا خوف۔ وہ اس طرح بے دخل' اور بے گھر نہیں ہونا چاہتی تھی مگر آج یا کل یہ تو ہونا ہی تھا۔ ارسہ نے سارا سفر ان ہی سوچوں میں گم رہتے' طے کیا تھا اور اب اسلام آباد کے ایک بے حد خوب صورت دو منزلہ گھر کے سامنے کھڑی تھی۔

تقی کے ساتھ اندر داخل ہوتے اس کی ٹانگیں بری طرح کانپنے لگی تھیں۔ تقی بار بار مڑ کر اسے دیکھتا لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہی تھی۔ وہ بالآخر جھنجلا کر بیگ اٹھائے آگے بڑھ گیا۔ ارسہ کے سامنے تین سیڑھیاں تھیں اور آگے داخلی دروازہ جہاں تقی ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔ دروازہ آہستہ آہستہ خود ہی بند ہو رہا تھا۔ اندر تقی کی پرجوش آواز کے ساتھ کسی عورت کی آواز سن کر ارسہ کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ اسے اپنے سینے میں دل کے مقام پر باقاعدہ درد محسوس ہوا۔ اسے وہ دن یاد آیا جب وہ اسی طرح اپنے باپ کے ساتھ یوں ہی کسی انجان' اجنبی گھر میں داخل ہوئی تھی تو اسے کیا سننے کو ملا تھا۔ وہ عورت اس کی ہاک باز' اتنی خوب صورت اور اتنی مہربان ماں کے بارے میں جن الفاظ میں بات کر رہی تھی وہ ایسے الفاظ تھے جن کی بازگشت کی وجہ سے اس کی کتنی ہی راتیں آنکھوں

میں کئی تھیں۔ چنگھاڑتی ہوئی آواز میں ارسہ اور اس کی ماں کو گالیاں دیتے ہوئے اسے جانے کو کہہ رہی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ اس کے لیے اس گھر میں ان کی زندگیوں میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ اسے کبھی یہاں نہیں رہنے دے گی۔

زندگی میں پہلی بار ارسہ کو کسی نے دھتکارا تھا۔ اس کے وجود کی نفی کی تھی۔ وہ یہ تکلیف ساری زندگی بھول سکتی تھی' نہ ہی اس ناپسندیدگی کا وہ بھیانک انجام۔۔۔ "اب پھر یہی ہوگا' تقی بھی میرے باپ کی طرح مجھے تنہا چھوڑ کر منظر سے غائب ہو چکا ہے۔ میں پیدا ہی ذلیل و خوار ہونے کے لیے ہوئی ہوں۔" اس نے اپنے دانت سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ کنپٹی کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ نظریں سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے دروازے تک گئیں۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور اندر سے ایک بہت حسین اور باوقار عورت چہرے پر مہربان مسکراہٹ لیے باہر نکلتی دکھائی دی اور پیچھے آتا تقی۔ ارسہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ اس نے آج تک اتنا خوب صورت اور پرنور چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

"ستڑے مہ شے بچے (کیا حال ہے بچے؟) باہر ولے ولاڑ اے (باہر کیوں کھڑی ہو؟) راشہ (آؤ۔)" ارسہ ہونق ہوئی۔ انہوں نے دھیان دیے بغیر آگے بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے اسے گلے لگایا۔ پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھام کر ماتھے پر بوسہ دیا۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے سے برسوں بعد ملی ہو۔ "اتنی محبت۔۔۔" ارسہ نے پیچھے کھڑے تقی کو دیکھا۔ آنکھوں میں بے یقینی ابھری۔

"یہ میری آپا ہیں۔ میری بڑی بہن۔" تقی نے تعارف کرایا۔

"دے لہ پختونہ ورزی۔" (اسے پشتو نہیں آتی۔) اب کہ وہ ان خاتون سے مخاطب ہوا تھا وہ ایک دم ہنس پڑیں۔

"خہ۔۔۔ خہ۔۔۔" (اچھا۔۔۔ اچھا۔)

"تم شکل سے بالکل پٹھان لگا' مجھے۔" ارسہ کے برف ہوتے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر تقی کی طرف مڑیں۔ "یہ تو بہت پیارا دکھتا ہے۔" اب کہ تقی کو دیکھ کر کہا۔ تقی اثبات میں سرہلا کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"آجاؤ بچے۔" انہوں نے بھی تقی کے پیچھے قدم بڑھائے۔ پیار کی حدت سے ارسہ کے اندر زندگی کی حرارت پیدا ہونے لگی تھی۔ آپا اس کے کانپنے کو تو سردی سے محمول کر سکتی تھیں' مگر اس کی شکل سے اصل معاملہ سمجھ میں آیا تھا۔ وہ اسے اس مشکل سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"یہ تقی کی آپا ہیں۔ انہوں نے کچھ برا بھلا تو کہا ہی نہیں۔" ارسہ خوب صورتی سے سجے لاؤنج میں ہیٹر کے سامنے بیٹھنے تک یہی سوچ رہی تھی۔ آپا اس کے ساتھ بیٹھی تھیں اور اپنے پختون لہجے میں چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہی تھیں۔ تقی سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر انہیں سن رہا تھا۔ تقی کی اردو بہت اچھی تھی لیکن پھر بھی جب وہ بولتا تو سننے والے کو اندازہ ہو جاتا کہ وہ پٹھان ہے۔ یہ سب ارسہ کی سوچ کے برعکس بہت اچھا تھا۔ تقی کے گھر کا کوئی فرد اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ واقعی ارسہ نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا۔

آپا کے علاوہ دلشاد سے تعارف ہوا۔ وہ ان کی ملازمہ تھی۔ آپا نے ارسہ سے اس کے خاندان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں' تقی نے ان کو کیا بتا رکھا تھا۔

دونوں کو بہت سا کھلانے پلانے کے بعد وہ ارسہ کو ایک بیڈ روم میں چھوڑ گئی تھیں کہ وہ یہاں آرام کرے۔ ارسہ کتنی ہی دیر تحیر کے عالم میں بیڈ پر بیٹھی رہی۔ تو یہ تقی کا وہ خاندان جس کا خیال اگر سوتے میں آتا تو خوف و ڈر کی وجہ سے اس کی نیند اڑ جاتی۔ بیٹھے ہوئے آتا تو کھڑی ہو جاتی۔ کھڑے ہوئے آتا تو رگ و جان میں اضطراب دوڑ جاتا۔ یہ کوئی خواب تو نہیں ہے۔ یا کسی خواب کا خوب صورت حصہ اور کچھ ہی دیر میں وہ خواب کے بھیانک حصے میں داخل ہونے والی ہے۔ وہ بہت وقت انہی سوچوں میں گم رہی۔ پھر کسی نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا' تو چونک کر حال میں واپس

آئی۔

یہ دلشاد تھی۔ جو اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ ارسہ کو حیرت ہوئی۔ کھانا اب تیار ہوا ہے' تو کچھ دیر پہلے جو اتنا کھایا تھا' وہ کیا تھا؟ اسے بالکل بھوک نہیں تھی مگر باہر تو جانا ہی تھا۔ اس نے سوچا شاید کھانے کی میز پر کسی اور سے تعارف ہو مگر وہاں تقی اور آپا ہی تھے۔

یہاں آئے ہوئے انہیں آج چوتھا دن تھا۔ ان چار دنوں میں اس نے آپا کے ساتھ اسلام آباد دیکھا تھا اور آپا نے ڈھیروں شاپنگ بھی کرائی تھی اسے۔ وہ شکر منا رہی تھی کہ اس کی کچھ دن اپنے بدمزہ کھانوں سے جان چھوٹی۔ کبھی نمک مرچ زیادہ' کبھی کم' کبھی ہانڈی سے عجیب کچا کچا ذائقہ آنے لگتا۔ روٹی اکثر جل جاتی' اس نے تقی کی برداشت کو سلام کیا۔

اسے یہاں دوسری صبح ناشتے کا واقعہ یاد آیا۔ قیمے کے پراٹھے بنے تھے۔ وہ اور آپا ناشتے کی میز پر بیٹھی تھیں۔ جب تقی باہر سے آتا دکھائی دیا۔ شاید واک کرکے آیا تھا۔ آپا نے اسے ساتھ ناشتا کرنے کو کہا تو۔۔۔

"میں فریش ہو کر آتا ہوں۔" کہہ کر اوپر چلا گیا۔ دلشاد نے تقی کے لیے جو پراٹھا لا کر رکھا' وہ ایک طرف سے ذرا سا جلا ہوا تھا۔ آپا نے فوراً" اس کی جگہ دوسرا لانے کا کہا۔ پھر ارسہ کو بتانے لگی کہ تقی کھانے میں بہت نقص نکالتا ہے۔ اس کو بہت کم چیزیں پسند آتی ہیں۔ جلا ہوا پراٹھا دیکھ کر تو وہ ناشتا کیے بنا ہی اٹھ جاتا ہے۔ ارسہ کو اس بات پر اتنی حیرت ہوئی کہ ہاتھ میں پکڑا نوالہ منہ میں رکھنا ہی بھول گئی۔ تقی تو سب کچھ کھا لیتا تھا۔ پھر یہ کس تقی کی بات کر رہی تھیں۔

آپا نے اسے خاندانی تصویروں والا البم دکھاتے ہوئے سب کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہ چار بہن بھائی تھے' سب سے بڑی آپا' پھر ولی بھائی' پھر زرمینے اور آخر میں تقی۔ تقی بہت چھوٹا تھا۔ جب ان کے والدین کی وفات ہو گئی تھی۔ آپا نے ہی تقی کو پالا تھا۔ وہ انہیں اکثر "مصورے" کہہ کر بلاتا تھا۔

تقی کی چھوٹی بہن زرمینے ان لوگوں سے اگلی صبح ملنے آئی تھیں۔ ان کے انداز میں بڑی آپا جیسی گرم جوشی تو نہیں مگر سرد مہری بھی نہیں تھی۔ بس سادہ سا انداز تھا۔ جیسے پہلی بار کسی سے ملنے پر اکثر لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ بھی شادی شدہ اور بچوں والی تھیں۔ ان کا ایک بڑا خاندان تھا۔ وہ بس تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھیں۔ پھر ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ولی بھائی آسٹریلیا میں اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھے اور آپا کے دونوں بیٹے بھی وہاں ہی ماموں کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے۔ آپا کے شوہر کا انتقال ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ ان کا آبائی گھر سوات لوئر دیر میں تھا۔ جب ہی اس روز تقی نے کہا تھا۔ "ہم پہاڑی لوگ ہیں۔" وہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد یہاں شفٹ ہوئی تھیں۔ اس لیے ان کی اردو اتنی اچھی نہیں تھی۔ ارسہ کو ان کی باتیں سن کر بڑا مزہ آتا تھا اور کبھی ہنسی بھی۔۔۔ ارسہ کا سارا دن ان کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ ان سے ہر بات کر لیتی تھی۔ بالکل ایسے جیسے اپنی ماں سے کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت ارسہ لان میں بیٹھی یہاں گزرنے والے وقت کو سوچ رہی تھی اور تقی ٹیرس پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

ارسہ نے سفید سوٹ اور جینز کا اسٹائلش سا جیکٹ پہن رکھا تھا۔ بالوں میں جوڑا' جو اب تقریباً" کھل چکا تھا۔ دوپٹا بس بائیں بازو پر ذرا سا اٹکا تھا اور باقی نیچے گھاس پر پڑا تھا۔ گود میں میگزین رکھے' کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں موندے بہت پرسکون اور مطمئن سی بیٹھی تھی۔ سامنے میز پر جوس کا گلاس رکھا تھا۔ سفید کپڑوں پر پڑتی دھوپ کی وجہ سے اس کے اردگرد نور کا ہالہ سا بن رہا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے کسی ملکہ کی طرح شان سے بیٹھی سردیوں کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

تقی اسے دیکھنے میں اتنا محو ہوا کہ ٹائم کا ہوش ہی نہیں رہا۔ وہ بالکل بھول چکا تھا کہ اسے اپنے دوست سے ملنے جانا ہے۔ وہ ٹیرس سے اتر کر لان میں آیا اور ارسہ کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس تک

پہنچا۔ جس کے گال دھوپ میں دہک رہے تھے۔ اس وقت تقی کو لگا کہ اس نے آج تک ارسہ سے زیادہ شان دار لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچا آج اسے بات کرہی لینی چاہیے۔ ارسہ نے کسی کی موجودگی محسوس کرکے آنکھیں کھولیں اور تقی کو دیکھ کر بوکھلا کر سیدھی ہوئی اور اپنا دوپٹا سنبھالا۔ تقی اس کے تاثرات دیکھ کر جھلا گیا۔

"یعنی کہ حد ہے۔ ابھی اتنے سکون سے بیٹھی تھی۔ میں کوئی دیو ہوں جو مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کا سارا اطمینان اڑن چھو ہوجاتا ہے۔" تقی کا موڈ آف ہوچکا تھا۔

"آپا کہاں ہیں؟" غصے میں یہی منہ میں آیا تو ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"آ... اندر... اندر ہوں گی۔" ارسہ نے اس کے غصے سے گھبرا کر اٹکتے ہوئے جواب دیا۔ تقی جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا۔

"م نہیں کیا ہوا؟" پھر گھبراہٹ میں سامنے پڑا جوس کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں سارا خالی کردیا۔

"ویسے یہ ہوتے کہاں ہیں؟ نظر ہی نہیں آتے۔" پھر کندھے اچکا کر گلاس اٹھا کر کچن کی طرف چل پڑی۔ اسے تقی ہیلمٹ اٹھا کر باہر نکلتا دکھائی دیا۔



رات کو ارسہ اپنے بیڈ روم میں تقی کا لایا ہوا سوٹ دیکھ رہی تھی۔ جو تین سوٹ تقی لایا تھا۔ ان میں یہ سب سے بہترین تھا۔ علشبہ کو بھی یہی سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ سلائی بھی وہی کرا کے لائی تھی۔ ارسہ نے ابھی تک پہنا نہیں تھا۔ اس نے شیشے میں دیکھتے ہوئے سوٹ خود سے لگا کر دیکھا۔

"اس کی فٹنگ کچھ زیادہ ہی نہیں؟ پہن کر چیک کرتی ہوں۔" وہ دل میں تقی سے پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ واپس کل جائیں گے یا پرسوں؟ مگر تقی کا غصہ... وہ ڈھنگ سے کوئی بات ہی نہیں کرپاتی تھی۔ "میرے خیال میں کل ہی واپس جانا ہوگا۔ چلو پھر ابھی نہا کر پہنتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کیسا لگتا ہے۔ یہاں میں خود ہی تو ہوں۔" خود سے باتیں کرتی مسکرائی۔ ٹائم دیکھا۔ ساڑھے دس... ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے کاسمیٹکس کے سامان کو دیکھ کر مسکرائی۔ آج اس کا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔

فیصلہ کرکے نہانے چل دی۔ نہا کر بال خشک کیے۔

"اف گرم پانی سے نہا کر بھی سردی لگ رہی ہے۔" پھر اپنے کارنامے پر مسکراتی باہر آئی لیکن سامنے دیکھتے ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ تقی بیڈ پر... آنکھوں پر بازو رکھے لیٹا تھا۔ "یہ کہاں سے آگئے؟" اس نے انگلی کا ناخن دانتوں میں دبایا۔ اس کے دوپٹے کا کچھ حصہ تقی کے کندھے اور کمر کے نیچے دبا تھا۔ اپنی جگہ کھڑی سوچتی رہی کہ اب کیا کروں؟

"یہ یہاں سو رہے ہیں تو پھر میں کہاں سوؤں گی؟" آہستہ آہستہ چلتی بیڈ کے قریب آئی۔ پریشانی میں یہ بھی نہیں دیکھ پائی کہ اس سوٹ میں کیسی لگ رہی ہے۔ فی الحال اسے بس تقی کے نیچے دبا اپنا دوپٹا چاہیے تھا۔ تقی کو غور سے دیکھا' وہ سو ہی رہا تھا۔ پھر جھک کر اپنا دوپٹا کھینچا۔ اسی اثنا میں لائٹ چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ جا کر یو پی ایس سے لگے انرجی سیور آن کرتی' تقی نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے بیڈ پر کھینچ لیا۔ ارسہ کے منہ سے دبی دبی چیخ ہی نکل سکی۔



وہ آپا کے کہنے پر ایک دن مزید ٹھہر کر اگلے دن واپس آگئے تھے۔ ڈیڑھ ماہ سے پھر وہی روٹین تھی۔ تقی پہلے سے کچھ زیادہ ہی خفا معلوم ہوتا تھا۔ اب اس کی وجہ ارسہ کی سمجھ میں آگئی تھی مگر جھجک اور خفت و ندامت کی وجہ سے اپنے رویے کی وضاحت نہیں کرپا رہی تھی۔ وہ صبح ناشتا بنا رہی تھی اور تقی باہر صحن میں اپنی روٹین کی مشکل مشکل ورزشیں کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک ارسہ کو چکر سا آیا تھا۔ اس نے کاؤنٹر تھام کر خود کو سنبھالا۔

پھر ناشتا کرنے کو بھی اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا

تھا۔ وہ بس بے دلی سے ناشتا ٹھونستی رہی۔ تقی روز کی طرح بے حد سنجیدگی سے کھا کر اٹھ گیا۔ کالج میں پہلی ہی کلاس میں ارسہ کو متلی محسوس ہوئی۔ وہ علشبہ کے ساتھ کلاس سے باہر آئی۔ صبح جو تھوڑا بہت ناشتا کیا تھا اب وہ بھی نکل گیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں سر کو بتاتی ہوں۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جائیں۔" علشبہ نے فکر مندی سے اس کا زرد پڑتا چہرہ دیکھ کر کہا۔

"نہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں اب۔ یہ صبح سے بلکہ کل سے طبیعت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔" ارسہ نے علشبہ کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے جانے سے روکا۔

"کل سے۔۔۔ اور تم نے ابھی تک ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔" علشبہ نے گھورا۔

"کچھ نہیں ہوا، چلو کلاس میں۔۔۔" چھٹی سے پہلے ارسہ کو پھر ایک بار باہر آنا پڑا تھا۔ اب اسے بری طرح چکر آ رہے تھے۔ تقی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے حسب معمول ارسہ کو آتے دیکھ کر چلنا شروع کر دیا۔ علشبہ نے آگے بڑھ کر تقی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ارسہ بھی ان لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔

"کیا ہوا ارسہ۔۔۔؟" تقی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ واقعی بیمار اور نڈھال سی لگی۔

"کچھ نہیں۔۔۔ متلی ہو رہی ہے بار بار۔۔۔" ارسہ کے لیے اب بولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

"سر آپ اسے اسپتال لے جائیں، یہ کل سے بیمار ہے۔" علشبہ کے کہنے پر تقی نے ایک بار پھر ارسہ کو دیکھا۔

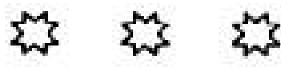
"کل سے بیمار ہے۔" اسے تو پتا ہی نہیں چلا۔ پھر ذرا چونک کر بولا۔ "ہاں چلو۔"

"میں بھی ساتھ چلوں؟" علشبہ نے پوچھا۔

"نہیں علشبہ تم گھر جاؤ یار۔۔۔ تمہاری امی پریشان ہوں گی۔" ارسہ نے اسے روکا۔

"ٹھیک ہے، تم اپنا خیال رکھنا۔"

تقی کالج سے نکل کر قریبی ہسپتال کی طرف چل پڑا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں، وہ آ بھی رہی یا نہیں۔ ارسہ کن دقتوں سے بیگ سنبھالتے ہسپتال تک پہنچی تھی۔ تقی کو اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ارسہ کی نظروں میں زمین آسمان گھوم رہے تھے۔ قدم کہیں رکھتی اور پڑ کہیں اور رہا تھا۔ بیٹھنے کو بینچ ملا تو اس نے شکر کا کلمہ پڑھا۔



ارسہ اپنی باری پر چیک کرانے اندر گئی۔ تقی باہر ہی بیٹھ کر انتظار کر رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک کیا اور پھر معاملہ سمجھ کر اس سے پوچھا۔

"تم ارسہ ہو نا؟ عاصمہ کی بیٹی؟"

"جی۔۔۔" وہ بھی ڈاکٹر تو سین کو جانتی تھی۔ اپنی امی کے ساتھ پہلے بھی ان کے پاس آتی رہتی تھی۔

"تمہاری امی کا تو انتقال ہو گیا ہے نا؟"

"جی۔۔۔" ارسہ نے ہولے سے سر ہلایا۔

"کس کے ساتھ آئی ہو؟" ڈاکٹر نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "سر کے ساتھ۔۔۔"

"کون سر۔۔۔؟" ڈاکٹر نے یونیفارم میں ملبوس لڑکی کو کچھ الجھ کر دیکھا۔ ارسہ فوراً "سر تقی" کہنے والی تھی، مگر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ ان کو کیا پتا سر تقی کون ہیں۔ یہ تو سر کو نہیں جانتی نا۔

"بولو۔۔۔" ارسہ اب بھی کوئی جواب نہیں دے پائی۔ "نام کیا ہے سر کا؟"

"سر تقی۔۔۔"

"رضیہ باہر سے تقی نام کے بندے کو بلائیں۔" رضیہ نامی نرس ابھی ابھی اندر داخل ہوئی تھی۔ "جی اچھا۔۔۔" کہتے ہوئے دروازے سے ہی واپس ہولی۔

تقی اندر آیا تو ڈاکٹر نے اسے بیٹھنے کا کہا اور پھر چبھتے لہجے میں پوچھا۔

"یہ آپ کی اسٹوڈنٹ ہیں۔"

"جی یہ میری وائف ہیں۔ اتفاق سے اسٹوڈنٹ بھی۔۔۔" تقی، ارسہ سے کہیں زیادہ سمجھ دار اور معاملہ فہم تھا۔ "ارسہ کی بچی۔۔۔" تقی نے اسے گھورا۔

"ہوں۔۔۔ ہزبینڈ، وائف ایسے ہوتے ہیں۔" ارسہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے سوچا لیکن اس کا وائف کہنا اسے کہیں بہت اچھا بھی لگا تھا۔

"اوہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ کتنا عرصہ ہوا ہے آپ کی شادی کو ارسہ؟" اب کی بار ذرا مسکرا کر پوچھا گیا۔ "چھ ماہ۔۔۔" جواب تقی کی طرف سے آیا۔

"مبارک ہو۔۔۔ آپ کی وائف امید سے ہیں۔" ڈاکٹر کی بات پر تقی کی مسلسل ہلتی ٹانگ ساکت ہوئی۔ ارسہ نے بھی اپنے ہاتھوں سے نظریں ہٹا کر ڈاکٹر کو دیکھا۔ پھر واپس غائب دماغی سے گود میں رکھے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔

"یہ بہت اچھا ہوا۔ عاصمہ نے اپنی بیٹی کو پہلے ہی اپنے گھر کا کردیا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کے بعد یہ اب کہاں رہ رہی ہوگی۔ اس کے تو فادر بھی نہیں ہیں۔ جہاں تک میرے علم میں ہے قریبی رشتہ دار وغیرہ بھی کوئی نہیں۔" ڈاکٹر صاحبہ کو صحیح وقت یاد نہیں تھا۔ ارسہ کی امی کو وفات ہوئے دس ماہ سے اوپر کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ارسہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تقی کو ہی "جی" کہنا پڑا۔ جبکہ ارسہ سوچ رہی تھی۔

"تقی کی چپ کو توڑنے کے لیے اتنی ہی بڑی بات کا ہونا ضروری تھا۔ ورنہ ہماری زندگیاں جمود کا شکار ہو رہی تھیں۔ روز ایک سا دن۔۔۔ لیکن تقی کا ردعمل کیا ہوگا۔ کوئی مثبت تبدیلی آئے گی یا یہ اسے ایک اور مصیبت کی طرح لے گا؟ اگر۔۔۔" تقی نے جھک کر اس کا بیگ اٹھایا۔

"چلو۔۔۔" تو ارسہ چونک کر اٹھی اور تقی کے پیچھے باہر نکل آئی۔ اس نے تقی اور ڈاکٹر کی کوئی بات نہیں سنی تھی۔ وہ اسی غائب دماغی سے روڈ کراس کرنے جا رہی تھی۔ تقی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا اور اس کے کان کے قریب جھکا۔

"ارسہ! یہ اتنی بڑی گاڑی ہے۔ اس کے ٹائر دیکھو۔ اوپر سے گزرتے بھی دس منٹ لگائے گی۔" ارسہ منہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تقی نے تھوک نگلا۔ اس کا ہاتھ ٹھنڈا اور نم تھا اسے لگا یہ ابھی کھڑے کھڑے گر جائے گی۔

"نہیں کچھ نہیں۔۔۔ تمہاری مہربانی ہے اسی طرح چلتی رہنا۔ بس گھر آنے والا ہے۔" تقی کا لہجہ معذرت خواہانہ ہو گیا۔



گھر پہنچ کر ارسہ نے جوتے اتارے اور دونوں پاؤں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔ اس کی ہمت بالکل جواب دے گئی تھی۔ تقی اس کے لیے پانی لے آیا۔ پھر ایک پلیٹ میں کچھ کھجوریں دھو کر اس کے سامنے لا کر رکھیں۔ ارسہ نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا تو تقی "رکو" کہتے ہوئے تیزی سے مڑا اور ایک ڈونگے میں پانی بھر لایا۔

"اس میں ہاتھ دھو لو۔" ارسہ کسی معصوم بچے کی طرح اسے دیکھتے ہوئے اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔

تقی کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا تو وہ کھجوریں کھانے لگی لیکن یہ کیا۔ اس میں تو گھٹلی کی جگہ بادام ہے۔

"یہ اس میں کیسے آیا؟" اس نے سوچا۔ پھر ایک ایک کرکے ساری کھجوریں کھول کر دیکھیں۔ سب میں ہی بادام تھا۔ اس کے لیے یہ نئی بات تھی۔ پہلے بادام اور کھجوریں الگ کرکے رکھیں۔ پھر مزے سے سب کھا گئی۔ اسے یہ ذائقے بہت بھلے لگے اور اپنی توانائی بحال ہوتی محسوس ہوئی۔

ارسہ برتن اٹھا کر کچن میں آئی تو تقی کچن میں تھا۔ بلیو جینز اور گرے آدھی آستینوں والی ٹی شرٹ میں اس کے بازوؤں کے مسلز نمایاں ہو رہے تھے۔ ارسہ نے دیکھا وہ روٹی بنا رہا تھا۔ سوا چار ہو گئے تھے۔ صبح ناشتے کے بعد اب تک اس نے دو کپ چائے ہی پی ہوگی۔ اب اسے بھوک لگی تو خود ہی روٹی بنانے لگا۔ ارسہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"میں روٹی بناتی ہوں۔" تقی جھینپ گیا۔

"نہیں۔۔۔ تم بیمار ہو، جا کر چینج کرو، میں بنا لیتا ہوں۔"

"میں ٹھیک ہو گئی ہوں۔" ارسہ کی صورت

نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے خود روٹی بنائے۔ اسے پتا تھا اسے روٹی پکانی نہیں آتی۔

''نہیں۔۔۔ میں بنالوں گا تم جاؤ۔'' وہ بس اسے وہاں سے بھیجنا چاہتا تھا۔ ارسہ، تقی کے ساتھ بحث نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے مجبوراً وہاں سے نکل آئی۔ پھر کپڑے بدل کر ہاتھ منہ دھو کر بیٹھی تو تقی روٹی بنا چکا تھا۔ تقی نے ارسہ کی طرح پہلے میز دونوں چارپائیوں کے درمیان لاکر رکھی۔ پھر سالن اور پانی پھر روٹی لینے چلا گیا لیکن روٹی میز پر رکھنے کے بجائے کھڑا رہا۔ ارسہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو اس نے انگلی اٹھا کر وارن کیا۔

''روٹی جیسی بھی ہوئی۔ تم ہنسو گی نہیں۔'' ارسہ مسکرائی، نفی میں سر ہلا کر بولی۔

''نہیں ہنسوں گی۔ آپ بھی تو نہیں ہنستے تھے میرے میپس (نقشوں) پہ۔۔۔''

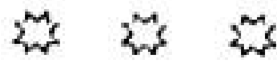
تقی زور سے ہنس پڑا۔ ''تمہاری بات اور ہے۔'' ارسہ نے پہلی بار اسے ہنستے دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں سکیڑے مبہوت سی اسے دیکھے گئی۔ اس نے روٹی رکھی تو ارسہ نے دیکھا۔ تقی نے بھی اس کی طرح ہی سب سے بہترین روٹی سب سے اوپر رکھی تھی۔ روٹیاں گول کے قریب بھی نہیں تھیں اور کچھ زیادہ ہی جل گئی تھیں۔

''روٹی بنانا مشکل کام ہے۔ دوسری بنانے تک پہلی جل جاتی ہے۔'' وہ منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔

ارسہ نے ہنسی روکنے کے لیے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا۔ تقی کو پتا تھا اسے سخت ہنسی آرہی ہے مگر اس نے ''ہنس لو'' نہیں کہا۔ رکے نا، میں نے تو بھی تو اتنا عرصہ ہنسی ضبط کرتے گزارا ہے۔ اب تقی سے خود روٹی نہیں کھائی جارہی تھی۔ پھر جلد ہی ہاتھ روک کر بولا۔

''اب چائے تم ہی بنالینا۔ میں مارکیٹ جاتا ہوں۔ گوشت اور پھل لانے ہیں۔'' یہ ڈاکٹر کی ہدایت تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' ارسہ ہاتھ کے اشارے سے اسے برتن اٹھانے سے روک کر خود اٹھی اور برتن کچن میں لے جانے لگی۔



تقی کمرے سے باہر چبوترے پر بیٹھا تھا۔ نہ مارکیٹ گیا تھا، نہ گراؤنڈ میں کھیلنے۔ کسی نقطے پر نظریں جمائے، گہری سوچ میں گم تھا۔ شاید کسی الجھن کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ ارسہ نے چند لمحے دیکھنے کے بعد پکارا۔

''سر! چائے۔''

''ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔'' وہ چونکا۔

ایک ہاتھ سے چائے کا کپ اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ کر احتیاط سے اپنے ساتھ بٹھایا۔ ارسہ اس کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے تو وہ کبھی محسوس ہی نہیں کرپائی۔ جب بھی وہ قریب آتا اسے جان کے لالے پڑے ہوتے تھے۔ وہ بہت خاموش تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ارسہ نے اس کی خاموشی محسوس کرتے ہوئے آہستہ سے گردن موڑ کر اس کو دیکھا۔ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بہت افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ارسہ ایک دم خوف کا شکار ہوئی۔ وہ جانے کیا کہنے یا کرنے والا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک ارسہ نے اس کے چہرے پر خوشی کی چمک واضح طور پر دیکھی تھی۔ وہ یقیناً خوش تھا۔ یہ اس کی مسکراہٹ بتاتی تھی۔ اتنے مہینوں میں پہلی بار اس کا رویہ بہت دوستانہ تھا۔ جس کی وجہ سے ارسہ نے پریشانی کے بوجھ میں کمی محسوس کی تھی۔ اجنبیت کا گراف گرا تھا۔ پھر اب ایسا کیا ہوگیا تھا؟ ارسہ کی سوچوں کو بریک لگے۔ جب تقی نے ہلکی آواز میں بولنا شروع کیا۔

''ارسہ!'' تھوڑے توقف کے بعد پھر بولا۔ جیسے بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو یا سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ بات کہاں سے شروع کرے۔

''میں جانتا ہوں۔۔۔ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو اور شاید کبھی رہ بھی نہ سکو۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری زندگی میں جتنی مشکلات ہیں۔ ان سب کی بنیادی وجہ

میں ہوں۔ میرے لیے اس طرح بات کرنا بہت مشکل ہے مگر میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک خود غرض انسان ہوں۔ میری خود غرضی نے ہی تم سے تمہارا سب کچھ چھین لیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو تم آج اس حال میں نہ ہوتیں۔ اگر وہاں سے بات شروع کروں جب میں یہاں آیا اور کیسے آیا تو۔۔۔ اس سے پہلے میں اسلام آباد کے ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول میں پڑھاتا تھا۔ یہ ڈگری مکمل کرنے کے بعد میری پہلی جاب تھی۔ میں اپنے بھائی کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے جو کام ملا وہ کیا۔ پھر یہاں اپوائنٹ ہوا۔ پہلی بار کالج میں، پہلی جو کلاس لی تھی وہ تمہاری کلاس تھی۔ اتنی بڑی کلاس میں، اتنی زیادہ لڑکیوں کے درمیان، جس نے مجھے متوجہ کیا، وہ تم تھیں، ان شارٹ اپنی پوری زندگی میں کسی سے اس حد تک متاثر نہیں ہوا۔ یہ صرف تمہاری خوب صورتی، تمہاری معصومیت نہیں تھی۔ کالج کے تمام ریکارڈ بریک کرتا ہوا، تمہارا فرسٹ ایر کا رزلٹ، تمہارے سب ٹیسٹ، کلاس میں تمہارا سوبر اور منفرد انداز یہاں تک کہ ٹیچرز میٹنگ میں بھی کئی مرتبہ تمہارا ذکر ہوتا تھا اور پرنسپل اتنے احترام اور فخر سے تمہارا نام لیتے کہ میں سوچتا تھا کہ کوئی اتنا پرفیکٹ کیسے ہو سکتا ہے۔" اس نے ایک لمبی سانس لی۔ ارسہ کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا۔ وہ ذہین اور محنتی تھی۔ اس لیے اس کا رزلٹ اچھا آیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اس نے کبھی خود کو اتنا خاص خیال نہیں کیا تھا، جتنا وہ بتا رہا تھا۔ یہ انکشاف اسے حیران کر رہا تھا کہ وہ اتنی خاص تھی کہ اس کھڑی ناک والے مغرور سے بندے کو متاثر کر گئی تھی۔

"ارسہ! یونی ورسٹی اور یہاں کالج میں بھی کتنی ہی لڑکیوں نے مجھے متوجہ کرنے اور میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی مگر میں ایسی کوشش تمہارے لیے کرنا چاہتا تھا اور شاید کرتا بھی۔ اگر مجھے یہ پتا نہ چل جاتا کہ تمہاری منگنی ہو چکی ہے اور تم اپنے منگیتر کو پسند بھی کرتی ہو۔" ارسہ نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔

"منگنی والی بات ان تک کیسے پہنچی؟"

"یہ سن کر بہت برا محسوس ہوا تھا۔ جیسے دل خالی خالی سا ہو گیا ہو۔ کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا، تب ان دنوں پرنسپل صاحب نے تمہیں اکیڈمی بھی بلا لیا تھا کہ تمہیں ایکسٹرا پڑھایا جائے۔ بے بسی کی انتہا پر تھا میں۔ چاہتا تھا تم نظر ہی نہ آؤ اور کبھی سوچتا، چلو اتنا بھی غنیمت ہے، تمہیں دیکھ تو لیتا ہوں۔ کبھی سوچتا تھا تمہیں اگنور کروں۔ کیونکہ تم میری تو کبھی نہیں ہو سکتیں۔ جانتا تھا تمہاری اور میری دنیا بالکل الگ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر تمہارے دل میں کوئی اور بستا ہے۔ آہ۔۔۔ میں بتا نہیں سکتا، کس طرح کی متضاد سوچیں مجھے بے چین رکھتی تھیں۔ اب صورت حال اس سے زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ اور میں نے خود کی ہے۔" ارسہ کو لگا وہ رو رہا ہے۔ تقی خاموش ہو گیا تھا مگر ارسہ ساکت بیٹھی رہی وہ جانتی تھی، ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی۔ تقی نے گہری سانس لے کر خود پر قابو پاتے ہوئے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

"ارسہ! اس روز اکیڈمی میں جب وہ سب ہوا۔۔۔ میری غلطی تھی۔ مجھے اندر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ میں نے تمہیں اکیلا بیٹھے دیکھ کر سوچا بھی تھا کہ اندر نہ جاؤں۔ تم تو چھوٹی اور معصوم ہو۔ تم ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ مجھے تو سمجھنا چاہیے تھا لیکن تمہارا ٹائم ویسٹ نہ ہو اس خیال سے تمہیں وہ نوٹس دینے آ گیا۔ میرا ارادہ نوٹس دے کر فوراً وہاں سے نکل جانے کا تھا مگر تمہارے سوال پر رکنا پڑا اور اس طرح اتنا ٹائم گزر گیا۔" ذرا توقف کے بعد بولا۔ "تمہارے فادر کا مجھے تھپڑ مارنا، اس قسم کے الزام گالیاں۔۔۔" آنکھیں بھینچتے ہوئے سر جھٹکا۔۔۔ "وہ بھی تمہارے سامنے۔۔۔ بہت زیادہ تھا یہ۔۔۔ آپ جس سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے سامنے اس طرح کی کوئی چھوٹی سی بات بھی نہیں ہونی چاہیے یہ بہت انسلٹنگ تھا۔

پھر تمہارا میری زندگی میں شامل ہو جانا اور میرے پاس بھی تمہیں دینے کو ایسا کچھ نہیں تھا۔ جو تمہارے

شایانِ شان ہوتا۔ جو اس پریشانی کے بعد تمہاری زندگی میں کوئی آسانی لے کر آتا۔ یہ گھر جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا نہ کوئی سامان' ضرورت کی کئی چیزیں بھی نہیں تھیں۔۔۔ سہولتیں کیا ہوتیں۔۔۔ کالج میں بھی ہم لوگوں کے لیے موضوع بن کر رہ گئے تھے۔ اس ساری صورت حال نے میرے دماغ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ اچانک ہر چیز کنٹرول سے باہر نکلنے لگی تھی۔"

ارسہ کو سخت افسوس ہوا' اس کی سوچ جان کر۔۔۔ وہ اس کے التفات کی ایک نگاہ کو ترس رہی تھی اور اس نے کیا' کیا سوچ کر خود کو ہلکان کر رکھا تھا۔ اب بندہ پوچھے ان سے' خوشی کب سے مادی چیزوں سے مشروط ہونے لگی۔ میں کیا مادہ پرست لگتی ہوں ان کو۔

"میں تمہیں وقت دینا چاہتا تھا۔ آپا نے بھی ساری بات سن کے یہی کہا تھا کہ تمہارا خیال رکھوں۔ تمہیں تنگ نہ کروں' کوئی زبردستی نہ کروں تمہارے ساتھ۔۔۔ تاکہ وقت آنے پر تم اپنی مرضی' اپنی خوشی کے مطابق فیصلہ کر سکو۔ اسلام آباد میں جب تم لان میں بیٹھی تھیں' میں تم سے یہی کہنے آیا تھا۔ تمہیں یہی سب بتانا چاہتا تھا لیکن تم۔۔۔ خیر۔۔۔ اصل میں جب میں اس ماحول۔۔۔ ان سوچوں سے کسی حد تک آزاد ہوا تو میرا دل تمہاری طرف کھنچنے لگا تھا۔ تم سے فاصلہ برقرار رکھنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ میرے لیے۔۔۔ یقین کرو میں نے پوری کوشش کی تھی تم سے دور رہوں۔۔۔ لیکن اس رات۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں نے ارادتاً کچھ نہیں کیا' میں تو صرف تمہیں بتانے آیا تھا کہ کل ہم واپس جائیں گے' تم تیار رہنا۔۔۔ اس رات کے بعد تمہاری ناگواری۔۔۔ بلکہ اپنے لیے نفرت واضح محسوس کر سکتا تھا میں۔۔۔" اس نے اپنے بال مٹھیوں میں بھینچے۔ "مجھے معاف کر دو ارسہ!"

ارسہ کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔ ہاں اس نے واقعی نفرت محسوس کی تھی اپنے دل میں تقی کے لیے۔۔۔ لیکن اس کی وجہ وہ نہیں تھی جو وہ سمجھ رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے' اب اس معافی کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نہیں کہتا تم مجھے لازما" معاف کرو۔۔۔ نہیں کرنا۔۔۔ مت کرو۔۔۔ سزا دو۔۔۔ جو چاہے سزا دو۔"

(سزا۔۔۔ اف اب آپ چپ ہی کر جائیں تو بہتر ہے' بہت بول لیا آپ نے۔۔۔) ارسہ کو ترس آ رہا تھا اس پر۔۔۔ وہ سمجھتی تھی صرف وہی مشکل میں ہے۔۔۔ مگر تقی اس سے زیادہ تکلیف میں تھا۔ یہ اس کو آج پتا چلا تھا۔ ارسہ کا معصوم سا دل اس کی پریشانی کا سوچ کر پگھلا۔

"اگر تم بچے کی ذمہ داری نہیں چاہتیں' میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں' اپنے منگیتر سے شادی کرنا چاہتی ہو یا اس کے علاوہ کچھ۔ بلا جھجک اپنی خوشی سے فیصلہ کرو۔ تم جو بھی فیصلہ کرو گی مجھے منظور ہو گا۔ میں تمہیں پوری طرح سپورٹ کروں گا۔" اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ کسی نے گیٹ زور سے دھڑ دھڑایا۔ لوہے کے گیٹ کی زوردار آواز پر دونوں اچھل کر رہ گئے۔ شام گہری ہو چکی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی مگر دونوں کو اس کا احساس نہیں تھا۔

"تم اندر جاؤ۔۔۔" وہ کہتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ ارسہ نے چائے کے کپ کو دیکھا۔ جس کا ایک گھونٹ بھی نہیں لیا گیا تھا۔ بھاپ اڑاتا چائے کا کپ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔



گیٹ پر ساتھ والی ثمینہ باجی کا بیٹا تھا۔ "مما کہہ رہی ہیں۔۔۔ پانی بھر لیں' میں موٹر چلانے لگی ہوں۔" پیغام پہنچا کر واپس بھاگ گیا۔ پانی بھرنا تقی کی ہی ذمہ داری تھی۔ ارسہ باہر ہوتی تو پانی کی بوتلیں اٹھا لیتی اور تقی خاموشی سے اٹھانے دیتا۔ وہ کہیں اور مصروف ہوتی تو کولر اور دو بوتلیں خود ایک ہی بار اٹھا کر لے آتا۔ پینے کا تازہ پانی بھر کر کچن میں رکھا اور واپس آیا۔ ارسہ اپنی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی تھی۔

تقی ارسہ کے مقابل اپنی چارپائی پر اسی کے انداز میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کیا ارسہ کو کچھ نہیں کہنا تھا؟ اس نے چھ مہینوں کی بات کی تھی۔ اتنی لمبی بات کے بعد اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا؟ تقی کی آنکھوں

میں بے قراری ابھری۔ وہ اتنی خاموش کیوں ہے؟ ارسہ نے اچانک بولنا شروع کیا۔

"میری پیدائش سے پہلے میرے والدین میں علیحدگی ہو چکی تھی۔ امی اور میں نانا کے گھر رہتے تھے۔ مجھے میری نانی نے بتایا تھا کہ میرے امی بابا کی پسند کی شادی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے دادا نے بابا کو گھر سے نکال دیا تھا لیکن وہ کچھ عرصہ ہی اپنی پر آسائش زندگی کے بغیر رہ پائے تھے۔ پھر ان دو چیزوں دولت اور اپنی محبوب بیوی (جو ان کے بچے کی ماں بھی بننے والی تھی) پر دولت کو ترجیح دی اور امی کو چھوڑ کر دادا کی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔ آپ کو یا کسی کو بھی اس بات پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہوں نے مجھے ایسے کیسے چھوڑ دیا۔ وہ ایسے ہی ہیں۔ "بزدل اور خود غرض"! امی اس بارے میں بات نہیں کرتی تھیں۔ میں نے بابا کو تصویر کے علاوہ پہلی بار امی کی ڈیتھ کے بعد دیکھا تھا اور پھر وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ جس پر میری سوتیلی امی اور بابا کا زبردست جھگڑا ہوا تھا مگر پھر وہ "مصلحتاً" خاموش ہو گئیں۔ جس کی وجہ اب سمجھ میں آتی ہے۔ خیر ان کے علاوہ اس گھر میں ایک میری سوتیلی بہن نور اور دو چھوٹے بھائی فیضان اور مبشر تھے۔

نور کا رویہ شروع میں میرے ساتھ اچھا تھا لیکن بعد میں۔۔۔ دراصل وہ اپنے ماموں کے بیٹے احسن بھائی کو پسند کرتی تھی اور وہ بھی اس کو بہت محبت اور توجہ دیتے تھے مگر یہی بات نور کو میرے لیے بالکل پسند نہ آئی۔ ایک دن میں برآمدے میں بیٹھی تھی۔ میرے سامنے نور اپنے ماموں کے گھر گئی مگر جلد ہی بہت غصے میں لوٹی اور میرے پاس آکر زور' زور سے چلانے لگی۔ وہ مجھے گالیاں دے رہی تھی۔ بہت برا بھلا کہہ رہی تھی کہ میں احسن بھائی کو اس سے چھین لینا چاہتی ہوں۔ وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گی۔

احسن بھائی اپنی امی کو میرے لیے پروپوزل لانے کو کہہ رہے تھے۔ اس بات کی وجہ سے نور آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ مجھے احسن بھائی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے نور کو یقین دلانے کی بہت کوشش کی تھی مگر نور کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھی۔ اب وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ شامل ہو گئی تھی' ان کے ہر منصوبے میں' دونوں مل کر روز کوئی نہ کوئی الزام میرے سر دھر دیتیں اور بابا کی طبیعت سے واقف ہونے کی وجہ سے کامیاب بھی رہتیں۔ کچھ ہی عرصے میں حالات ایسے ہو گئے تھے کہ بابا اچھے خوش گوار موڈ میں بھی مجھے دیکھ لیتے تو ان کے ماتھے پر بل آجاتے۔

اکیڈمی میں جو ہوا' وہ سب بھی فریم کیا گیا تھا۔ میں اس سے بچ نہیں سکتی تھی' کیونکہ وہ سب ملے ہوئے تھے۔ نوکر تک ان کے تابع تھے۔ وہ سب وہاں اس طرح نہ ہوتا تو کہیں اور ہو جاتا لیکن وہاں ہونے کا نقصان یہ ہوا کہ آپ بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔" ارسہ آنسو ضبط کرتے ہوئے' بہت روانی سے بول رہی تھی۔

"جو بھی ہوا اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ مجھے پتا ہے آپ کی نیت بری نہیں تھی۔ آپ اس بات کو لے کر گلٹی فیل مت کریں' پلیز۔" تقی ساکت بیٹھا اسے سن رہا تھا۔

"ایک اور بات۔ جس نے آپ کو بھی پریشان کیا ہوا ہے اور میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا کہ میری منگنی والی بات آپ تک کیسے پہنچی؟ کالج کی اور لڑکیوں نے بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھا تھا۔" اس بات پر تقی کے تاثرات بدلے تھے۔ "نور نے یہ بات احسن بھائی سے کہی تھی' تاکہ وہ مجھ سے دور رہیں۔ احسن بھائی نے بھی یہی سوال کیا تھا مجھ سے' لیکن میری کوئی منگنی نہیں ہوئی۔ کبھی نہیں ہوئی۔" نور روتے ہوئے بولی۔

"کیا واقعی؟" تقی بے اختیار بول پڑا۔

"جی۔۔۔ لیکن آپ سے ایسا کس نے کہا؟

"مجھے۔۔۔ میں پہلے چھٹی سے پانچ منٹ پہلے کالج سے نکل آیا کرتا تھا نا۔ اس روز کالج گیٹ پر ایک لڑکی کار سے نکلتے ہوئے کسی سے کہہ رہی تھی۔ آپ ارسہ کا پیچھا چھوڑیں اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ وہ اپنے منگیتر کو پسند کرتی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے یہ

سب وہ مجھے سنا رہی ہو۔ وہ لڑکی غصے میں تھی۔ اس لیے اس کی آواز خاصی اونچی تھی۔ ہاں یہ۔ وہ نور ہی تھی جو اکیڈمی میں بھی تمہارے ساتھ آتی تھی۔"

"اس دن احسن بھائی کا برتھ ڈے تھا۔ انہوں نے نور کو اس کے اسکول سے پک کیا اور پھر مجھے لینے آئے تھے۔ تاکہ ہمیں لنچ پر لے جاسکیں۔ وہ ہمیشہ نور کو اپنی برتھ ڈے پر لنچ پر لے جاتے تھے۔ اب مجھے بھی لینے آئے تھے۔ نور اسی وجہ سے غصے میں تھی اور شاید وہاں سے ہی کچھ اور لڑکیوں نے سنا ہو گا یا کسی ایک نے سنا ہو گا اور آگے بات کی ہو گی۔" تقی سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ اس سے زیادہ آج تک کسی بات نے یوں مضطرب نہیں کیا تھا مگر اس بات کی حقیقت کیا تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے ایک لمبا عرصہ اتنی تکلیف میں گزارا تھا۔

ارسہ تھوڑی دیر سوچنے کے لیے رکی کہ اسے مزید کس بات کی وضاحت کرنی تھی، پھر بولی۔ "سر! میرے بابا نے آپ کے ساتھ جو کیا میں اس پہ بہت شرمندہ ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ کچھ نہیں ہوا۔ بھول جاؤ اس کو۔ ہم کبھی اس پر دوبارہ بات نہیں کریں گے۔" ارسہ کو ٹوکتے ہوئے قطعیت سے بولا۔

"اوکے۔۔۔" ارسہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ گھر اور سہولیات کی بات کر رہے تھے۔ میں نے جس گھر میں ہوش سنبھالا' وہ اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا لیکن وہ میری زندگی کا خوب صورت دور تھا۔ میں کبھی اس چیز کو لے کر احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئی کہ میرے پاس اچھا بڑا گھر اور قیمتی چیزیں نہیں ہیں۔ اگر کبھی ایسا خیال آیا بھی تھا تو اب احساس ہوتا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ خوشی ان چیزوں کی محتاج نہیں ہوتی' اگر ہوتی تو اپنے باپ کے عالی شان گھر میں گزرا وقت مجھے بھیانک خواب کی طرح نہ لگتا۔ خوش وہی لوگ رہتے ہیں جو اپنے پاس موجود نعمتوں پر راضی رہتے ہیں اور شکر ادا کرتے ہیں۔ ورنہ خواہشات کی تو کوئی حد نہیں ہوتی۔ سب جانتے ہیں یہ بات اور ہمیں یاد بھی رکھنی چاہیے۔" تقی کو اپنی جھنجلاہٹیں یاد آئیں۔ وہ کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔

"آپ سہولیات سے نہیں اپنے رویے سے میری زندگی میں آسانی لاسکتے تھے مگر آپ تو مجھے اپنی زندگی میں شامل کر کے لاتعلق ہی ہو گئے۔ کبھی مجھے جاننے' سننے کی کوشش ہی نہیں کی۔" ارسہ نے آج ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔

"آئم سوری ارسہ! میں مانتا ہوں۔ میں کچھ غلط فہمیوں کا شکار ہو گیا تھا لیکن تم نے بھی تو ایسی کوئی کوشش نہیں کہ یہ سب بہتر ہو جاتا۔"

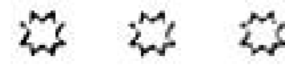
"آپ اپنے چہرے پر نولفٹ کا بورڈ چسپاں کیے رکھتے تھے۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ آپ سے کوئی بات کرتی' بلکہ مجھے تو ضرورت کی' مختصر سی بات کرنا بھی ہمیشہ مشکل لگا ہے۔ آپ نے پتا نہیں کیا سوچ سوچ کے اپنے اور میرے درمیان پہاڑ کھڑے کر رکھے تھے۔ آپ تک کیسے پہنچ پاتی اور دوسرا یہ کہ۔۔۔" تقی جواب میں کچھ کہنے والا تھا۔ پھر "ہاں بولو" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"دوسرا یہ کہ مجھے لگتا تھا کہ آپ مجھے سخت ناپسند کرتے ہوں گے۔ کیونکہ مجھے زبردستی آپ پر مسلط کر دیا گیا تھا اور میں سوچتی تھی ہو سکتا ہے آپ پہلے سے شادی شدہ ہوں' منگنی شدہ ہوں اور نہیں تو شاید کہیں کمیٹڈ ہوں۔ کچھ بھی ممکن تھا۔" تقی ہنس دیا۔ ارسہ نے اسے قدرے الجھ کر دیکھا۔

"ارسہ صرف میں نے ہی نہیں کچھ اخذ کیا اپنی طرف سے' تم نے بھی کیا۔ نولفٹ کا بورڈ شادی شدہ' منگنی شدہ' کمیٹڈ۔۔۔ اب تو جانتی ہو' ایسا کچھ نہیں تھا مگر خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔" تقی نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "اب سو جاتے ہیں' تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"جی بالکل سو جاتے ہیں۔" ارسہ تیزی سے بولی اور لیٹ بھی گئی۔ (اگلی بات ابھی نہیں کر سکتی تھی۔) تقی کو بھی تھوڑی حیرت ہوئی' اس کے اس طرح اچانک بات ختم کرنے پر۔

"ارسہ! کھانا کھاکر۔" تقی نے ٹوکا۔
"جی اچھا۔" ارسہ جھینپ کر کہتے ہوئے پھر اٹھ بیٹھی۔ کھانا کھاکر، سونے تک ان کی آپس میں مزید کوئی بات نہیں ہوئی۔ اگرچہ کہنے سننے کو اور بہت کچھ تھا مگر آج جو باتیں ہوئی تھیں، دونوں اپنی اپنی جگہ ان ہی کو سوچنے اور سمجھنے میں مصروف تھے۔



وہ اتوار کی سنہری، خوش گوار سی صبح تھی۔ ارسہ کی آنکھ اپنے وقت پر ہی کھل گئی تھی۔ وہ کمبل ہٹاتے ہوئے اٹھی اور تقی کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرف کروٹ لیے بے خبر سو رہا تھا۔ تقی کو سوتے ہوئے دیکھنا اس کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ سوتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنی معصومیت ہوتی کہ ارسہ کے لیے نظریں ہٹانا مشکل ہو جاتا۔ وہ استحقاق سے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور اپنی جگہ سے اٹھی۔ آج وہ ناشتے میں کچھ خاص بنانا چاہتی تھی۔ ارسہ ناشتا تیار کرکے تقی کو اٹھانے آئی۔ وہ ابھی تک اسی طرح بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس کی نیند میں خلل تو نہیں ڈالنا چاہتی تھی مگر ناشتا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔
"سر!" تھوڑا جھجک کر تقی کا کندھا ہلایا۔ پہلے کبھی قریب نہیں جاتی تھی۔ دور سے اس وقت تک آوازیں دیتی رہتی جب تک وہ اٹھ نہ جاتا۔
"سر اٹھیں ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"
"ہوں اچھا۔" تقی آنکھیں مسلتا اٹھ بیٹھا۔ تقی کے منہ ہاتھ دھونے تک ارسہ نے ناشتا میز پر لاکر رکھا۔
تقی "واہ" کہتے ہوئے ناشتے سے انصاف کرنے لگا۔ اسے رغبت سے کھاتے دیکھ کر ارسہ کو خوشی ہو رہی تھی۔ اپنا ناشتا ختم کرکے وہ اٹھی اور تقی کو چائے دی۔
"تم خود چائے کیوں نہیں پیتیں؟" تقی نے آج پوچھ ہی لیا۔
"ویسے ہی، مجھے پسند نہیں۔" سادگی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔
"کمال ہے۔" تقی بہت حیران ہوتا تھا اس بات پر۔ ارسہ چائے بالکل نہیں پیتی تھی۔ تقی کی کوئی کال آ رہی تھی۔ موبائل سائلنٹ تھا اور اسکرین بار بار روشن ہو رہی تھی۔
"سر آپ کی کال آ رہی ہے شاید۔" ارسہ کی نظر پڑی تو بولی۔
"سر کی بچی، آتی رہے کال، یہ تم مجھے "سر" کیوں کہتی ہو۔ جیسے کسی اجنبی سے بات کی جاتی ہے۔ جب تم مجھے سر کہہ کر مخاطب کرتی ہو تو مجھے لگتا ہے تم کہہ رہی ہو حد ادب۔۔۔ فری ہونے کی کوشش مت کرنا۔ یہ جو تم مجھے سر سر کہہ کر چڑھاتی رہی ہو نا اس کے لیے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔" تقی منہ بناتے ہوئے بولا۔ ارسہ کا منہ پہلے تو حیرت سے کھلا، پھر ہنسی آئی مگر ضبط کرتے ہوئے بولی۔
"جی اسی بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے مجھے کلاس سے باہر نکالا تھا نا۔ اس کے لیے میں بھی آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"
"تمہیں ابھی تک یاد ہے۔" تقی ہنسا۔
"مجھے ہمیشہ یاد رہے گا، کیونکہ ایسا میرے ساتھ پہلی اور آخری مرتبہ ہوا ہے۔"
تقی کو یاد آیا کہ اس نے کیوں ارسہ کو کلاس میں نہیں آنے دیا تھا۔ "تم نے مجھے اگنور کیوں کیا تھا؟" تقی نے ابرو اچکایا۔
"میں نے اگنور نہیں کیا تھا۔ میں سر سے بات کر رہی تھی۔"
"جو بھی تھا لیکن تمہارے تاثرات بڑے مزے کے تھے اس وقت۔" تقی کی آنکھوں میں شرارت ابھری۔
"کیا۔۔۔؟" ارسہ نے مصنوعی غصے سے گھورا۔ "تو ٹھیک ہے، پھر میں کالج میں بھی "سر" نہیں کہوں گی اب۔"
"کیا واقعی؟" تقی نے آنکھیں پھیلائیں۔
"جی بالکل۔۔۔ اور اب مجھ پر اس طرح رعب

جمانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"
ارسہ نے بیویوں والی دھونس جمائی۔ پھر موبائل کی طرف اشارہ کرکے خالی کپ اٹھاتے وہاں سے اٹھ گئی۔ تقی قہقہہ لگاتے ہوئے موبائل کی طرف متوجہ ہوا۔



بے یقین ہونے سے پہلے دعائیں سن لی گئی تھیں۔ غلط فہمیوں کے بادل جو ان کے درمیان دوری اور اجنبیت کا موجب بنے ہوئے تھے' چھٹ گئے تھے۔ ایک وقت لگا تھا' مگر اب ارسہ کو اپنی کوئی تکلیف یاد نہیں رہی تھی۔ وہ معمول کے کام نپٹا کر کتابیں لے کر صحن میں آ بیٹھی تھی۔ تقی ناشتے کے بعد کہیں چلا گیا تھا اور اب خود ہی پیچھے گیٹ سے اندر آگیا تھا۔ کچن سے ایک ٹوکری میں مالٹے اور پلیٹ لے کر ارسہ کے ساتھ آکر بیٹھا۔
"چلو مالٹے کھاتے ہیں۔"
اس وقت ارسہ کو کچھ ایسا ہی کھانے کی خواہش ہورہی تھی۔ وہ ایک دم مسکرائی۔
"ضرور۔۔۔" اسے اپنے دل میں خوشی اور طمانیت کی لہریں اٹھتی محسوس ہورہی تھیں۔
"پہلے مقابلہ ہوگا۔ سب مالٹے چھیل کر اس پلیٹ میں رکھیں گے۔ پھر کھائیں گے۔ اب چھیلنا شروع کرو' دیکھتے ہیں کون زیادہ چھیلتا ہے۔" تقی ٹوکری میں آٹھ مالٹے رکھ کر لایا تھا۔
ارسہ نے مسکرا کر "اوکے" کہتے ہوئے چیلنج قبول کیا۔
اس نے نفاست سے چھیلتے ہوئے بمشکل تیسرا مالٹا اٹھایا تھا کہ تقی نے تیزی سے باقی سارے مالٹے چھیل کر ہاتھ اٹھا دیے۔ "میں جیت گیا۔" جبکہ جلدی چھیلنے کے چکر میں بہت سے مالٹے زخمی کردیے تھے۔
"نفاست بھی کسی چیز کا نام ہے۔" ارسہ نے ناک چڑھائی۔
"میڈم مقابلہ نفاست کا نہیں' زیادہ چھیلنے کا تھا۔" اس نے مکھی اڑائی۔
"اوکے۔۔۔" ارسہ کو مانتے ہی بنی۔ "لیکن اب یہ کھائے گا کون؟"
تقی نے ٹوکری ہٹا کر پلیٹ درمیان میں رکھی۔ "تم دیکھتی جاؤ۔" ارسہ اور وہ چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ارسہ مسکرا کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہنستا مسکراتا' باتیں کرتا کتنا مختلف لگ رہا تھا۔ اس کے وجیہہ چہرے کو زندگی کی رونق اور جاذب نظر بنا رہی تھی۔
"ارسہ۔۔۔!"
"جی۔۔۔" وہ تھوڑا چونکی۔
"ارسہ! تم بے بی کی ذمہ داری سے پریشان تو نہیں ہو؟ سچ بتانا۔"
"نہیں زیادہ پریشان نہیں ہوں۔" ارسہ مسکرائی۔
"اور کم پریشان کس بات پر ہو؟" تقی نے بے ساختہ پوچھا۔
"میں سوچ رہی ہوں' میں بہت موٹی ہوجاؤں گی۔ کالج میں عجیب لگے گا' ہے نا؟" اس نے تائید چاہی۔ تقی ہنس پڑا۔
"نہیں یار۔۔۔ اتنی کیوٹ لگوگی تم۔ کب سے تمہیں اتنا سلم دیکھ رہا ہوں۔ کچھ چینج تو ہونا چاہیے نا۔ ویسے دو' تین ماہ میں پیپرز ہوجائیں گے۔ پہلے ہی فری ہوجاؤگی کالج سے' کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"
"ہاں واقعی۔۔۔" ارسہ نے مطمئن ہوکر مالٹے کی پھانک منہ میں رکھی۔ پھر تھوڑا سوچ کر گویا ہوئی۔ "میں ایک نیا یونیفارم بنالوں گی' ٹھیک ہے؟"
"بالکل ٹھیک۔۔۔" تقی نے اتفاق کیا۔
"خوش۔۔۔؟" تقی نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکایا' جبکہ اس کی آنکھوں میں کوئی الجھن تیر رہی تھی۔
"میں ناخوش کیوں ہوں گی؟" ہاتھ میں پکڑی پھانک واپس پلیٹ میں رکھی۔
"تقی آپ نے دیکھا۔ ابھی تو بے بی اس دنیا میں آیا بھی نہیں اور کتنی چیزیں ٹھیک ہوگئی ہیں۔" وہ حیا سے جھکی پلکوں کے ساتھ بول رہی تھی۔
تقی کے اندر جیسے ٹھنڈک اتری۔ کتنا اچھا لگا تھا'

اس کے منہ سے اپنا نام سنتا۔" ہاں واقعی۔۔۔ کتنی چیزیں ٹھیک ہوگئی ہیں۔" ارسہ کے چہرے پر نظریں گاڑھے بھرپور انداز میں مسکرایا۔

"بالکل۔۔۔" ارسہ نے سرہلایا۔ "کسی انسان کا اس طرح کی نعمت پر ناشکراپن جچتا ہے؟"

"بٹ ارسہ! اسلام آباد میں وہ سب کیا تھا؟ وہ میری غلط فہمی تو نہیں ہوسکتی۔" ارسہ جو ابھی تقریر کے موڈ میں آئی تھی۔ اس کی بات پر جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"نہیں۔۔۔ غلط فہمی تو نہیں تھی۔" اب ارسہ سے سر نہیں اٹھایا جارہا تھا۔

"تو۔۔۔"

"کیا آپ اس سب کو بھول نہیں سکتے؟" ارسہ نے فرار کی راہ تلاشنی چاہی۔

"ویل۔۔۔ بھول تو جاؤں گا ہی۔۔۔ لیکن۔۔۔"

"وہ مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ ازدواجی زندگی کا کیا مطلب ہوتا ہے 'میریڈ لائف' میاں بیوی کے حقوق و فرائض کیا ہوتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اگلی صبح مجھے آپا نے سمجھائی تھیں۔" ارسہ نے تقی کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہہ دیا۔

"کیا؟" بات سمجھنے کے بعد تقی کی آنکھیں پھٹیں۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

"یعنی تم نے آپا کو بتادیا کہ میں۔۔۔ یعنی تمہیں آپا نے بتایا کہ۔۔۔ یعنی تم۔۔۔" تقی کوئی بھی جملہ مکمل نہیں کرپایا تھا۔ "ار۔۔۔ سہ!" اب دونوں ہاتھ منہ پر رکھے رکوع میں جھکا تھا۔ ارسہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر حوصلہ دیتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔۔۔ لیکن اب میں مینس ایبل (سمجھ دار) ہوچکی ہوں۔"

"کیا کہا؟" تقی جھٹکے سے سیدھا ہوا۔

"مینس ایبل"۔ تقی کے حلق سے قہقہہ برآمد ہوا۔

"فائنلی۔۔۔ اتنی سمجھ دار بیوی میرے لیے بہت بڑا گفٹ ثابت ہوسکتی تھی مگر بچت ہی ہوئی۔" ارسہ کو اس کی آخری بات سمجھ نہیں آئی مگر سرہلادیا۔



یہ اسلام آباد کے ایک پرائیویٹ اسپتال کا کمرہ تھا۔ تقی اپنی بیٹی کو احتیاط سے اٹھائے کھڑا تھا۔ ارسہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں خوشی اور تشکر کے جذبات کے تحت نم ہورہی ہیں۔ وہ سرجھکائے اپنی بیٹی کو دیکھے جارہا تھا۔ آپا نے تقی کے لیے کرسی ارسہ کے بیڈ کے قریب رکھی' ارسہ کا ماتھا چوما اور باہر نکل گئیں۔

"تقی بیٹھ جائیں۔" ارسہ نے کہا۔

"ارسہ۔۔۔ دیکھو۔۔۔ دیکھونا۔۔۔ یہ ہماری بیٹی ہے۔" ارسہ کے قریب ہوکر بچوں کی طرح اسے دکھانے کی کوشش کررہا تھا۔ ارسہ نے بھی نم آنکھوں سے مسکراتے اثبات میں سرہلایا۔

"اللہ نے ہمیں کیا عطا کردیا۔ کتنی بڑی خوشی دے دی۔ میں اللہ کا شکر ادا کیسے کرپاؤں گا؟" اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہورہا تھا۔ پھر رخ پھیر کر خود پر قابو پاتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا اور خاموشی سے سر جھکائے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگا اور ارسہ' تقی کو۔ اسے شام کو ڈسچارج ہوجانا تھا۔

"ارسہ! جب یہ بڑی ہوجائے گی' تب تم اس کی آپا لگو گی۔ جیسے میری آپا۔ تمہیں پتا ہے' آپا کی اور میری عمر میں بیس سال کا فرق ہے اور تمہارا ہوا اٹھارہ کا۔"

"میرا سترہ کا۔ میں چار دن بعد سترہ سال کی ہوجاؤں گی۔" ارسہ نے تصحیح کی۔

"سترہ کیسے؟ سولہ میں میٹرک اور اٹھارہ میں انٹر اور تم انٹر کرچکی ہو۔"

"نہیں۔۔۔ میں ایک سال آگے ہوں۔ میں نے ایک سال پہلے اسکول جانا شروع کردیا تھا۔" ارسہ نے فخر سے بتایا۔

"سمجھ گیا۔ تم آفت کی پرکالا ہوگی۔ اس لیے تمہاری اماں نے تمہیں۔ ایک سال پہلے اسکول بھیج دیا۔" تقی نے دانت نکالے۔ وہ ایک نظر ارسہ کو دیکھتا اور واپس اپنی گود میں سوئی نرم و نازک گلابی سی بچی کو دیکھنے لگتا۔

"جی نہیں۔۔۔ میری اماں کو مجھے پڑھانے کا شوق تھا۔ اس لیے مجھے ایک سال پہلے اسکول میں داخل کرایا تھا۔"

"تم مجھ سے آٹھ سال چھوٹی ہو۔" تقی پر ابھی ابھی انکشاف ہوا تھا۔ "میں پچیس کا ہوں۔"

ارسہ کو پہلے ہی پتا تھا۔ ایک اور ریسرچ کے مطابق عورتیں مردوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلات نوٹ کرتی ہیں اور یاد بھی رکھتی ہیں۔ ارسہ نے اس دن بڑی باریک بینی سے تقی کے ڈاکومنٹس کا جائزہ لیا تھا۔

"لیکن آپ نے ایک سال کیا کیا؟ بائیس سال میں ماسٹرز مکمل ہونا چاہیے تھا۔ ایک سال اسلام آباد میں جاب کی، ایک سال یہاں ہوگیا۔ اب آپ کو ابھی چوبیس کا ہونا چاہیے تھا نا۔"

"تم ایک سال آگے ہو سکتی ہو۔ میں ایک سال پیچھے نہیں ہو سکتا۔" تقی نے منہ بنایا۔ "خیر تمہیں تو ویسے ہی ہر کام جلدی جلدی کرنے کا شوق ہے۔ جلدی اسکول گئیں۔ جلدی شادی کی اور اب جلدی ہی اماں بھی بن گئیں۔"

"تقی۔۔۔" اس کی طرف رخ کیا۔

"ویسے تو ایک منٹ بھی خاموش نہیں رہ سکتے۔ اتنا عرصہ چپ کیسے رہے تھے؟"

"ہاں واقعی۔۔۔ پتا نہیں کیوں، میری بولتی بند ہوگئی تھی لیکن اس میں بھی تمہارا ہی قصور ہے۔ تم نے مجھے اتنا ڈرا کے رکھا ہوا تھا اور ابھی بھی ڈراتی ہو۔"

"میں ڈراتی ہوں۔۔۔؟" ارسہ پر صدماتی کیفیت طاری ہوئی۔ "بس اب کچھ مت بولیے گا آپ۔"

"جی اچھا۔۔۔" بڑی فرماں برداری سے فرمایا گیا مگر جس طرح خاموشی سے اس کو دیکھ رہا تھا۔ ارسہ کو اندازہ تھا ابھی پھر کوئی پھلجھڑی چھوڑے گا۔

"ویسے اب میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم اتنی دیر بعد سینس ایبل کیوں ہوئیں۔"

"آہ۔۔۔ تقی! اٹھیں اور جائیں یہاں سے۔"

"تم مجھے جانے کا کہہ رہی ہو؟" تقی کو جیسے یقین نہ آیا۔

"آپ نے دیکھا۔ مما آپ کے بابا کو کیا کہہ رہی ہیں۔ تم ذرا میری پرنسز کو بڑا ہونے دو، پھر دیکھنا۔" ارسہ نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ وہ آنکھیں بند کرکے لفظ "مما" کی مٹھاس محسوس کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اب کوئی بات نہیں کروں گا میں تم سے۔" تقی نے فیصلہ کن انداز اپنایا اور خاموش ہوگیا۔ ارسہ نے گردن موڑ کر تقی کو دیکھا اور مسکرائی۔

"تقی!" تقی نے ان سنا کیا۔

"تقی۔۔۔ ی۔۔۔" اب کی بار چیخ سے مشابہ آواز میں بلایا۔

"کیا ہے؟" اب کی بار وہ نظر انداز نہ کر سکا۔

"خاموش تو خود بھی نہیں رہ سکتیں نہ تم۔"

"ایسا ہی ہے۔" ارسہ مسکرائی اور سیدھی ہوتے ہوئے نظریں چھت پر گاڑ دیں۔

"مجھے دنیا میں صرف ایک مرد سے محبت ہوئی ہے اور وہ آپ ہیں اور میری دنیا آپ سے شروع ہو کر آپ پر ختم ہوتی ہے۔ یہ سب میں اس وقت نہیں کہہ پائی تھی، جب آپ نے کہا تھا۔" تقی اس کو دیکھتے ہوئے ایک ایک لفظ دھیان سے سن رہا تھا۔

"ارسہ! میں کب سے یہ سننا چاہتا تھا یار۔ تب نہیں تو کیا اس کے بعد بھی تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں ملا کہ تم مجھے یہ سب بتاتیں؟ اگر یہ سب کہنے کے لیے تم آج کی طرح کسی خاص موقع کا انتظار کر رہی تھیں نا۔۔۔ تو تم بہت بے وقوف ہو۔"

ارسہ نے واپس چھت کی طرف دیکھتے ہوئے افسوس سے کہا۔ "مجھے پتا ہے۔ میں بہت سی غلطیاں کرتی ہوں۔"

"ان غلطیوں کے باوجود بھی تم مجھے دل و جان سے قبول ہو۔ اگر وقت پیچھے جائے اور مجھے انتخاب کا موقع دیا جائے، تب بھی میں تمہارا ہی انتخاب کروں گا۔" تقی نے بات ہی ختم کر دی۔

"تقی آپ اتنے خاص ہیں کہ مجھے آسانی سے مل

بھی نہیں سکتے تھے۔ مجھے لگتا تھا' میرے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ اتنا برا کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا ہے۔ ماں' باپ' گھر اور میری عزت بھی۔ اس الزام کے بعد میں خود اپنی نظروں میں گر گئی تھی۔ میں رات کو اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتی تھی مگر اس وقت ذلت اور بے عزتی کا احساس اتنا گہرا تھا کہ مجھے بھول گیا تھا' میں کہاں ہوں۔ کتنا اندھیرا ہے اور کس ویرانے میں پڑی ہوں۔ مجھے بس یہی احساس تھا کہ میرے منہ پر مٹی لگی ہے۔ جو لوگوں کے جوتوں سے وہاں پہنچی تھی۔" اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا اور کنپٹی سے بہتا ہوا بالوں میں جذب ہو گیا۔ "اس کے بعد بھی ذہنی اذیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوتی کہ میں زندہ کیسے ہوں۔

لیکن آپ کو پتا ہے تقی! اتنا سب برا ہونے کے باوجود بھی کچھ چیزیں بہت مثبت تھیں' جنہیں میں تب محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ کیا ہوتا اگر آپ کوئی بد فطرت انسان ہوتے؟ اگر آپ اگلی صبح اکیڈمی نہ آتے یا پرنسپل کو بلا کر نہ لاتے؟ کیا ہوتا اگر آپ میرے ساتھ نکاح جیسا پاکیزہ رشتہ نہ جوڑتے اور میرے باپ کے تھپڑ اور گالیوں کا بدلہ مجھ سے لینے کی کوشش کرتے۔ کیا ہوتا اگر آپ کی فیملی مجھے قبول نہ کرتی۔ جس طرح انہوں نے مجھے محبت اور عزت دی۔ اگر ایسا نہ کرتے تو میرا مقام کیا ہوتا؟ آپ اس شام بھی بات نہ کرتے اور ہمارے درمیان غلط فہمیاں اسی طرح برقرار رہتیں' اس صورت میں مجھے پریگننسی پیریڈ میں کس قسم کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا؟

ایک وقت تھا جب میں سوچتی تھی کہ اس کے بعد میں کبھی خوش ہو ہی نہیں سکتی۔ چونکہ وہ تکالیف کا ایک لمبا دور تھا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ تکلیف کی مدت کم یا زیادہ ہو سکتی ہے۔ ہمیں ہرگز ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے دیکھیں' آج میں اتنی خوش ہوں کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ اللہ نے مجھے میری توقعات سے بڑھ کر نوازا ہے۔

ایک مرتبہ عید پر مجھے امی نے بہت خوب صورت اور قیمتی سوٹ دلایا تھا۔ جب میں نے پہن کر دیکھا تو میں بہت خوش ہوئی مگر اگلے ہی لمحے ایک سوچ کی وجہ سے میری خوشی پھیکی پڑ گئی کہ اتنا اچھا سوٹ پہن کر کیا کروں گی؟ کون دیکھے گا مجھے جانا ہی کہاں ہوتا ہے۔ پھر میں نے امی سے پوچھا۔ کیا اس دنیا میں مکمل خوشی نہیں مل سکتی؟ امی نے کہا' نہیں' پوری خوشی تب ملے گی۔ جب ہم پل صراط سے گزر کر جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ وہی دائمی خوشی ہو گی۔ تب ہم ہمیشہ خوش رہیں گے۔ یعنی دنیا میں دائمی خوشیاں تو کسی کو مل ہی نہیں سکتیں' کیونکہ دنیا تو اس لیے بنائی ہی نہیں گئی۔ اس کے لیے تو جنت بنائی گئی ہے۔" تقی کی مسکراہٹ ظاہر کرتی تھی کہ وہ اس بات سے متفق ہے۔

☆

وہ ایک تو کم زور تھی دوسری گہری سانولی رنگت پر قدرتی سنہرے بالوں نے اسے مزید مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ دیکھنے والے یہی سمجھتے جیسے اس نے خود کو قابل دید بنانے کے لیے اپنے بالوں کو سنہری رنگت دی ہو۔ جب کالج میں تھی تو اکثر لڑکیاں اسے ٹوک دیتی تھیں۔

"تم نے بال کیوں رنگے ہیں؟"

"اگر رنگنے ہی تھے تو کوئی اور رنگ دیا ہوتا۔"

"ہاں یہ رنگ تم پر بالکل نہیں جچ رہا۔" ایک کے بعد ایک لڑکی اپنی اپنی بولی بولنا شروع ہو جاتی اور شروع میں تو وہ صفائی پیش کرتی قسمیں کھاتی کہ یہ اس کے قدرتی بال ہیں پھر جب لڑکیاں ہنستیں اور بنانے والے کی شان میں قصیدے پڑھتی ہوئی جاتیں تو اس کا دل

محتاج تھے۔ کیونکہ وہ ہر فن مولا تھی۔

خدا نے اگر کہیں اسے محروم رکھا تھا تو کہیں نوازا بھی تھا۔ ایک تو اس کی آواز میں بے پناہ مٹھاس تھی، جس سماعت سے ٹکراتی وہ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ دوسرے پڑھنے میں بہت اچھی تھی۔ شروع سے ہر کلاس میں اول آتی رہی تھی پھر بھی ابا نے بی اے کے بعد اسے مزید پڑھنے کی اجازت نہیں دی اور شاید اماں بھی نہیں چاہتی تھیں جب ہی اسے گھر داری میں لگا دیا تھا۔ جبکہ اس کے بعد کی شمائلہ رو رو کر پاس ہونے کے باوجود ما...کر رہی تھی۔ پھر مریم کو

کہ سب سے چھوٹی تھی لیکن انٹر کے بعد ہی ابا نے

نگہت عبداللہ



چاہتا ان کا منہ نوچ لے۔ اب وہ ایسی بنائی گئی تھی تو اس میں اس کا کیا قصور تھا۔

"پتا نہیں بنانے والے نے میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں کیا ہے۔" وہ حد درجہ شاکی تھی۔ مزید ستم ظریفی کہ باقی سب بہن بھائی خوب صورت ہی نہیں بہت خوب صورت تھے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ جب ہی اس کے مزاج میں چڑچڑاپن اور بدلحاظی عود کر آئی تھی۔

پہلوٹھی کی اولاد تھی اس کے باوجود اماں ابا میں سے کسی کی توجہ حاصل نہیں کر پائی تھی۔ بلکہ وہ اسے یوں نظر انداز کرتے جیسے اشعر، شمائلہ اور مریم سے پہلے کوئی وجود دنیا میں آیا ہی نہ ہو حالانکہ سب اسی وجود کے

اس کی شادی کر دی تھی۔ کیونکہ اس نے خود ہی مزید پڑھنے سے انکار کر دیا تھا اور پھر اس کے لیے اچھے رشتے بھی موجود تھے۔ رشتے تو شمائلہ کے لیے بھی بہت آتے تھے لیکن اسے یونیورسٹی جانے کا شوق تھا۔ اس لیے اس نے اماں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ماسٹرز سے پہلے شادی نہیں کرے گی اور اماں ابا کو اس کی یعنی شمائلہ کی فکر بھی نہیں تھی۔ فکر تھی تو اس کی جس کے لیے بھولے سے بھی کسی نے جھولی نہیں پھیلائی تھی اور وجہ صاف نظر آتی تھی۔ اماں اسے دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتیں جس سے وہ اور چڑ جاتی تھی اور پھٹ پڑتی۔

"جب یہ طے ہے اماں کہ مجھے ساری زندگی آپ کی



نظروں کے سامنے رہنا ہے تو دل پر پتھر رکھ لیں۔ آپ کی آہیں میری قسمت نہیں بدل سکتیں۔"

"اے شکل اچھی نہیں ہے تو منہ سے بات تو اچھی نکالا کر۔" یہ اماں کا مخصوص جملہ تھا۔

"جن کی شکلیں اچھی ہیں وہ کون سی اچھی باتیں کرتے ہیں۔" اس نے سلگ کر سر جھٹکا تھا۔

"اچھا چل ہانڈی روٹی کی فکر کر۔" اماں نے جھٹ اسے کچن کا راستہ دکھایا کیونکہ جب وہ بولنے پر آتی تو پھر اسے چپ کرانا مشکل ہو جاتا تھا۔

"ہانڈی روٹی بس ان ہی کاموں کے لیے رہ گئی ہوں میں۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں آئی تو پھر اس کی بڑبڑاہٹ ابا کی دھاڑ پر تھمی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوتے ہی چلائے تھے۔

"کہاں ہے نامراد، مردود، آج میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"الٰہی خیر۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا جبکہ اماں بوکھلا گئیں۔

"کیا ہو گیا ہے۔ خیر تو ہے؟"

"اپنے لاڈلے کی خیر مناؤ۔ اشعر۔ اشعر۔" ابا اماں سے کہہ کر اشعر کو پکارنے لگے۔ تو وہ کچن سے نکل کر بولی۔

"اشعر ابھی نہیں آیا ابا!"

"آئے گا بھی کیسے جب تک جیبیں خالی نہیں کرے گا۔ حرام خور۔۔۔ میں بھی کہوں دو دن سے کیسے اتنی شرافت سے دکان پر آبیٹھتا ہے۔ کم بخت، موقعے کی تلاش میں تھا۔ ادھر میں نماز کے لیے نکلا ادھر وہ سارا گلہ خالی کر گیا۔" ابا غصے سے بولتے ہوئے چارپائی پر ڈھے گئے۔

"کون اشعر!" اماں کے انجان بننے پر ابا کا پارہ مزید جس حساب سے چڑھا اس سے وہ خائف ہو کر اندر چلی آئی۔

"کیا ہوا؟" شمائلہ نے اسے دیکھ کر ابا کی آواز کی سمت اشارا کر کے پوچھا تو وہ تلملاتے ہوئے کہنے لگی۔

"حد کرتی ہیں اماں بھی۔ یوں بن جاتی ہیں جیسے اشعر کی حرکتوں سے واقف ہی نہ ہوں۔"

"اب کیا کیا ہے اس نے؟"

"ابا کی دکان سے پیسے اٹھا کے لے گیا ہے بلکہ چوری کر کے گیا ہے۔" اس نے بتایا تو شمائلہ نے صرف سر جھٹکا وہ بھی بے نیازی سے۔ جس پر وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ کیونکہ ادھر ابا چلا چلا کر بول رہے تھے۔

"بس اب میرے گھر کے دروازے بند ہو گئے اس پر۔ خبردار جو تم نے اسے گھر میں گھسایا تو۔" ابا کے فیصلے کا اماں پر جانے کیا اثر ہوا۔ وہ بہرحال رات بھر جاگتی رہی تھی کہ جانے کس وقت اشعر آجائے۔ اس کے کان دروازے پر ہی لگے رہے تھے لیکن کوئی دستک سنائی نہیں دی۔

پھر فجر میں اس نے گھر کا کونا کونا دیکھ ڈالا کہ شاید اشعر دیوار پھلانگ کر آیا ہو اور کسی کونے میں پڑ کر سو گیا ہو لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ اماں سر پر دوپٹہ باندھے سو رہی تھیں اور ابا کے خراٹوں میں ایسی غراہٹ جیسے اپنے شکار پر جھپٹنے کو تیار ہوں۔ وہ دبے پاؤں کچن میں آگئی۔ اس کے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ رتجگے سے زیادہ اشعر کی فکر نے دماغ ہلا ڈالا تھا کہ جانے وہ رات بھر کہاں رہا ہو گا حالانکہ وہ کوئی بچہ نہیں تھا پھر جو حرکت اس نے کی تھی اس کی سزا اسے ضرور ملنی چاہیے تھی

لیکن وہ کیا کرتی، دل کے ہاتھوں مجبور تھی جو تضحیک کا نشانہ بننے کے باوجود سب کی خیر مانگتا تھا۔ حالانکہ یہی اشعر اس سے چھوٹا ہونے کے باوجود اسے عجیب و غریب ناموں سے پکارتا تھا۔ بے شک وہ برا مانتی تھی اس سے جھگڑتی بھی تھی لیکن اس کے لیے کبھی برا نہیں سوچتی تھی۔

"یا اللہ! اشو جہاں بھی ہو اسے اپنی امان میں رکھنا۔" وہ چائے پیتے ہوئے مسلسل اشعر کی امان مانگتی رہی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد شمائلہ معمول کے مطابق تیار ہو کر یونیورسٹی چلی گئی۔ لیکن ابا خاصی تاخیر سے دکان

کے لیے نکلے تھے اور اتنی دیر جو وہ گھر میں رہے تو مسلسل انگارے چباتے رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا اماں بالکل چپ تھیں ورنہ سارا محلّہ سنتا۔ پھر جاتے جاتے ابا اماں کو تنبیہہ بھی کر کے گئے تھے کہ اگر اشو کو گھر میں گھسایا تو وہ انہیں نکال باہر کریں گے۔

"اماں۔" ابا کے جانے کے بعد وہ اماں کے پاس آئی۔

"کیا ہے۔" اتنی دیر سے خاموش اماں اسے کاٹ کھانے کو دوڑیں۔

"اب تجھے کیا تکلیف ہے۔"

"اٹھیں ناشتا کرلیں۔" اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا تب شاید اماں کو احساس ہوا۔

"و نہیں مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔ پتا نہیں میرے بچے نے کچھ کھایا ہے کہ نہیں۔" اماں رونے لگیں۔

"او ہو اماں! اب اشو کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے کہ اس کے منہ میں فیڈر دینی پڑے گی' پھر پیسے لے کر بھاگا ہے۔ بھوکا نہیں ہو گا۔" وہ خود بھی پریشان تھی لیکن اماں کو تسلی دے کر زبردستی منہ ہاتھ دھونے کے لیے اٹھا دیا اور چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھی تھی کہ ٹیلی فون کی بیل پر جھٹکے سے واپس پلٹی تھی۔ اس کے خیال میں اشعر ہو گا جب ہی ریسور اٹھاتے ہی بے تابی سے بولی۔

"ہاں اشو! کہاں ہو؟"

"خوش قسمت ہے اشو جس کے لیے کوئی تڑپتا ہے۔" ادھر جانے کون تھا وہ ٹھٹک گئی۔

"کون؟"

"ایسی ہی تڑپ کا طلب گار۔" بڑی عاجزانہ درخواست تھی۔ وہ سلگ گئی۔

"دیکھو! دماغ خراب مت کرو اگر کوئی اور کام نہیں ہے تو کچھ کھا کر سو رہو۔" اس نے کہہ کر فون پٹخ دیا اور جلدی سے ناشتا لے کر اماں کے پاس آئی تو وہ پوچھنے لگیں۔

"کس کا فون تھا۔"

"کسی کا نہیں' یہ بتائیں اب اشو کا کیا کرنا ہے؟"

"کیا کرنا ہے؟" اماں الٹا اسے دیکھنے لگیں۔

"میرا مطلب ہے اس نے بہت غلط حرکت کی ہے۔ ابا کا غصہ ناجائز نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ اس کی حمایت مت کیجیے گا۔ اور نہ اس کے لیے پریشان ہوں۔ آجائے گا دھکے کھا کر منحوس۔" اس کے آخری لفظ پر اماں کو پتنگے لگ گئے۔

"وہ منحوس ہے اور تو کیا ہے۔"

"اس سے بڑی منحوس۔" وہ کہہ کر اماں کے پاس سے ہٹ گئی۔

فون کی بیل پھر بج رہی تھی۔ اگر اشو کا خیال نہ ہوتا تو وہ اپنے کام میں مصروف رہتی مجبوراً ہاتھ میں پکڑی پتیلی پٹخ کر بھاگی تھی۔

"ہیلو۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں کہ کچھ کھا کر سو رہوں لیکن ڈرتا ہوں۔" وہی آواز' وہ جھنجلا گئی۔

"اُف۔!"

"پلیز فون بند مت کرنا۔" اس نے فوراً کہا تو وہ زچ ہو کر بولی۔

"کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔"

"بتاؤں گا۔" اس کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ ہنسنے لگی۔ ہنستی چلی گئی۔ ادھر شاید وہ حیران تھا یا اس کی ہنسی میں کھو گیا تھا۔

"سنو کوئی فائدہ نہیں۔" وہ بمشکل ہنسی رکنے پر بولی تھی۔ "میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتی' کیونکہ میں خود ایک مسئلہ ہوں۔"

"یہ تم سے کس نے کہا؟" اس کے پوچھنے پر وہ پھر بگڑ گئی۔

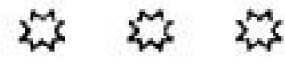
"کسی نے بھی کہا ہو تمہیں کیا اور تم کیا بار بار یہ نمبر ملا رہے ہو کوئی اور نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"ہے۔ بہت نمبرز ہیں لیکن مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔" اس کی بات پر وہ اچھل پڑی۔

"ہیں۔ ! کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"آرام سے سنو تو بتاؤں۔ تم تو فوراً ہی ہتھے سے اکھڑ جاتی ہو۔"
"کیونکہ میں ایسی ہی ہوں۔" اس نے کہہ کر فون پٹخ دیا اور وہ جو کوئی بھی تھا اسے فالتو، نکما جیسے القاب سے نوازتے ہوئے واپس کچن کی طرف جارہی تھی کہ اماں کی آواز سن کر اچنبھے میں گھر گئی۔
"یہ اماں کس سے باتیں کررہی ہیں۔" زیر لب خود سے کہتے ہوئے وہ کمرے میں آئی اور اماں کی بات سنتے ہی ٹھٹک کر انہیں دیکھے گئی۔ اماں موبائل فون کان سے لگائے یقیناً "اشعر" سے کہہ رہی تھیں۔
"نہیں نہیں، تم ابھی گھر مت آنا۔ تمہارے ابا بہت غصے میں ہیں اور دیکھو پیسے سنبھال کر خرچ کرنا۔"
"اماں!" اس نے انتہائی تاسف سے پکارا تھا جواب میں اماں نے یوں گھورا کہ وہ مزید کچھ کہہ نہ سکی۔ البتہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن میں آئی۔ پھر رات میں وہ شمائلہ سے الجھ رہی تھی۔
"تمہیں پتا ہے اس گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اماں بھی اشو کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ اسے مشورے دے رہی تھیں پیسے سنبھال کر خرچ کرنا۔"
"ظاہر ہے ناں ہیں۔" شمائلہ کولڈ کریم سے اپنے پیروں کا مساج کرتے ہوئے لاپروائی سے بولی۔
"ماں ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اولاد کے برے کاموں میں بھی ان کا ساتھ دیا جائے۔" وہ مزید سلگ کر بولی تو شمائلہ چڑ گئی۔

"اوہو تو تم مجھے کیوں سنا رہی ہو؟"
"کیوں؟ تم اس گھر کی فرد نہیں ہو؟" اس نے چیخ کر ٹوکا تو شمائلہ ذومعنی انداز میں بولی۔
"بس کچھ دنوں کی بات ہے۔"
"کیا مطلب؟" اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں شمائلہ ہنسنے لگی تو وہ کچھ عجیب سا محسوس کرتے ہوئے بس اسی قدر بولی۔
"تو تم۔۔۔"
"میں نہیں وہ۔۔۔ وہ مرمٹا ہے مجھ پر۔ کہتا ہے مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔" شمائلہ مزے سے اور بھی جانے کیا کیا بتائے جارہی تھی لیکن اس کا ذہن اسی بات پر اٹک گیا تھا۔
"مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔۔۔" اور اگلے دن وہ انجان کال ریسیو کرتے ہی اس پر چڑھ دوڑی۔
"تم کتنے جھوٹے مکار ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں ہر لڑکی سے ایک ہی بات کہتے ہو کہ مجھے جس کی تلاش تھی وہ تم ہو۔" ادھر وہ ارے ارے کررہا تھا لیکن وہ سن ہی نہیں رہی تھی۔ آخر وہ زور سے چلایا۔
"شٹ اپ۔۔۔" وہ ایک دم خاموش ہوگئی تو قدرے رک کر وہ جیسے ضبط سے بولا تھا۔
"تمہیں میری توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔۔۔ مانا کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم جو چاہو کہہ دو۔"
"تم میرے قابل نہیں ہو!" وہ قدرے سناٹے میں آگئی تھی۔ "کیا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہے جو مجھ سے کم۔۔۔"
"تم میں کیا کمی ہے؟" وہ اس کی دور سے آتی آواز سن کر پوچھ رہا تھا۔
"ہیں۔" اس نے چونک کر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر آواز دبا کر پوچھنے لگی۔
"کون ہو تم۔ تمہارا نام کیا ہے؟"
"میں کون ہوں؟ اب تو میں خود بھی نہیں جانتا۔ ہاں تھوڑا تھوڑا یاد ہے، کبھی لوگ مجھے جانِ عالم کے نام سے پکارتے تھے اور میں صرف نام کا ہی نہیں سچ مچ ایک عالم کی جان تھا۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔
"اور اب؟" اس کی آواز ہنوز دھیمی تھی۔
"اب تو میں اور میری تنہائی۔ گزشتہ پانچ سالوں سے میں اپنی تنہائی سے باتیں کررہا تھا۔ تھک گیا تو ٹیلی فون کا سہارا لیا اور پھر مجھے تم مل گئیں۔ جانے کیوں مجھے لگا جیسے تم بھی میری طرح تنہائی کا شکار ہو۔۔۔ ہو ناں؟" وہ جانے کیسی آس سے پوچھ رہا تھا۔ اس نے

اپنے آس پاس دیکھا پھر آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔



وہ بچپن سے اپنے لیے جو رویے اور لہجے دیکھتی اور سنتی آرہی تھی ان کے باعث تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کبھی اس کی سماعت میں بھی کوئی اپنے نرم دلنشیں لہجے سے امرت گھول سکتا ہے۔ بے نام سفر تھا اور بالکل انجانا جس کی شاید کوئی منزل ہی نہیں تھی اور یہ نہیں تھا کہ اس نے آنکھ بند کر کے اس راہ پر قدم رکھ دیے تھے۔ خود کو بہت سمجھایا بہت روکا تھا اور ابھی بھی روکتی تھی۔ کبھی تو دل مان جاتا لیکن اکثر بغاوت کر جاتا تھا اور وہ اس سے یوں باتیں کرتی جیسے صدیوں کی آشنائی ہو بہت عام سی باتیں ہوتی تھیں۔

"ابھی تم کیا کر رہی تھیں؟"

"واؤ! یہ تو میری فیورٹ ڈش ہے۔"

کبھی حیرت سے کہتا۔ "گھر کا سارا کام تم کرتی ہو؟" پھر سراہتا۔

"گڈ..... اس کا مطلب ہے اس گھر کی سب سے اہم فرد تم ہو۔ باقی سب تمہارے محتاج۔" اور ایسی ہی باتوں میں کہیں جانے انجانے میں وہ اس کے دل کے تار چھو لیتا تھا۔

"تمہاری آواز میں ایسی خوب صورت کھنک ہے کہ دل چاہتا ہے تم بولتی رہو۔ پتا ہے میں ساری زندگی تمہیں خاموشی سے سن سکتا ہوں۔"

اور اس دن وہ بہت دیر تک آئینے کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ بولتی ہنستی پھر رونے لگتی۔

میں اسے بتادوں گی کہ بس آواز ہی آواز ہے۔ اس نے سوچا ضرور لیکن کہتے کہتے رہ گئی۔ اچانک خائف ہو گئی تھی کہ اگر اس نے بھی سب کی طرح تمسخر اڑا کر فون پٹخ دیا تو پھر وہ باتیں کس سے کرے گی۔ دن بھر میں چند لمحے تو میسر آتے تھے جب وہ خود کو بھی بھول جاتی تھی۔

اسے کیا پتا میں کیسی ہوں۔ اس نے بھی نہیں پوچھا اور اگر کبھی پوچھ لیا تو کہہ دوں گی میں دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہوں۔ ہاہا... اپنی سوچ پر وہ خود ہی ہنسی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کی روٹین وہی تھی لیکن مزاج بدل گیا تھا۔ پہلے جو اماں اور بہن بھائی کی باتوں کا چٹاخ پٹاخ جواب دیتی تھی اور کام کے دوران بھی جو مسلسل کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی تھی تو اب ایسا نہیں تھا۔ اس کی اپنی دنیا سج گئی تھی۔ جس میں مگن ہو کر یہ نہیں تھا کہ وہ اطراف کا ہوش بھلا بیٹھی تھی۔ سب خبر رکھتی تھی۔ شمائلہ کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی جھولی پھیلائے آن موجود ہوتا تو پہلے کی طرح وہ کملائی اور کڑھتی نہیں تھی۔ مزید مہمانوں کے جانے کے بعد اماں سے رشتے کی پوری تفصیل پوچھتی اور شمائلہ کی شادی میں دلچسپی ظاہر کرتی تھی۔ اماں اس کی اس تبدیلی پر حیران بھی تھیں اور خوش بھی اس پر مستزاد اسے کم روی کے طعنے دینے بھی چھوڑ دیے تھے۔ اس کے برعکس شمائلہ کے لیے کوئی رشتہ آتا تو اماں اس سے نظریں چرانے لگتیں۔ البتہ اشو جو مزید بگڑ کر گھر لوٹا تھا وہ اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتا تھا۔

"تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے ٹرے سجا سجا کر اندر بھیجتی رہو۔" اس وقت بھی وہ اس کے سامنے بیکری کے لوازمات کے شاپرز رکھ کر ہنستا ہوا گیا تھا۔ اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا نہ اس کے دل سے ہوک اٹھی۔ سلیقے سے ہر شے ٹرے میں منتقل کی پھر شمائلہ کو بلانے اندر آئی تو اس کی تیاری دیکھ کر بے ساختہ بولی۔

"ماشاءاللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو۔"

"میں ہوں ہی پیاری۔" شمائلہ نے اترا کر کہا۔ تو اس نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ پھر بیڈ کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے بولی۔

"میں نے ٹرے اور ساتھ چائے بھی بنادی ہے۔ لے جاؤ۔"

"وہ تو میں لے جاؤں گی یہ بتاؤ کیسے لوگ ہیں۔ میرا مطلب ہے اشو بتا رہا تھا یہ لمبی سی گاڑی میں آئے ہیں اور خواتین دیکھنے میں ہی ڈیفنس وغیرہ کی لگ رہی ہیں۔" شمائلہ نے پرشوق انداز میں پوچھا تو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں جاتے ہوئے سرسری سا دیکھا ہے۔"

"تم بھی بس۔" شمائلہ چلی گئی تو وہ کچھ دیر کمرے میں ہی رہی پھر رات کا کھانا بنانے کی غرض سے کچن میں آئی تھی کہ شمائلہ تن فن کرتی ہوئی آئی اور اس سے بولی۔

"جاؤ تمہیں اماں بلا رہی ہیں۔"

"مجھے..." اس نے حیرت اور ناسمجھی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تمہیں' جاؤ برتن اٹھالو۔" شمائلہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ابھی تو مہمان موجود تھے پھر برتن اٹھانے کا کیا سوال۔

"پتا نہیں۔" وہ پہلے الجھی پھر سر جھٹک کر ڈرائنگ روم میں آئی تو اسے دیکھتے ہی ایک خاتون بولیں۔

"یہ صاعقہ ہے؟"

"جی' یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے۔" اماں نے کہا تو خاتون فوراً بولی تھیں۔

"ہم اس کے لیے آئے ہیں۔"

"جی!" اماں نے بے اختیار اسے دیکھا۔ ان کی نظروں میں جتنی غیر یقینی تھی اس سے کہیں زیادہ غیر یقینی سے وہ ان خواتین کو دیکھ رہی تھی۔

"بہت تعریف سنی ہے ہم نے اس کی کہ بہت سگھڑ، سلیقہ شعار ہے آپ کی بیٹی ہم اپنے بیٹے کے لیے ایسی ہی لڑکی چاہتے ہیں۔" خاتون اماں سے مخاطب تھیں۔ اور وہ سراسیمہ الٹے پیروں جو چلی تو اپنے کمرے میں بھی ایسے ہی داخل ہوئی تھی۔

"میں نے تو صاف منع کردیا۔" عقب سے شمائلہ کی آواز سن کر وہ ایک دم پلٹی تھی۔

"مجھے اچھی نہیں لگتیں ایسی عورتیں نری بناوٹ۔ بھئی بندہ جیسا ہے ویسا ہی نظر آئے۔ بن بن کے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔" شمائلہ تلملا تلملا کر بول رہی تھی۔ اس ہی حساب سے اس کا بدن بل کھا رہا تھا۔

"ویسے بھی میں تو اسے پسند کرتی ہوں۔ وہ میں نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا نہیں تھا۔" شمائلہ کی خجالت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"ارے بھئی وہی..." شمائلہ جانے کسے یاد دلانے جا رہی تھی کہ فون کی بیل سن کر وہ بلا ارادہ ہاں ہاں کرتے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔ یوں بھی وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سر جھٹک کر ہیلو کہا تو ادھر سے وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا تھا۔

"کیا ہو رہا تھا۔" اس کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہوگئی۔

"ارے! کیا بہت تھک گئیں۔ کیا کر رہی تھیں؟" وہ اس کی گہری سانس کو تھکن پر محمول کر کے پوچھنے لگا۔

"کچھ نہیں بس ایسے ہی... میرا مطلب ہے کوئی خاص کام نہیں کر رہی تھی۔" وہ جانے کیوں ہنسی، عجیب سی ہنسی تھی جو غالباً محسوس کر کے ہی وہ پوچھ رہا تھا۔

"کچھ چھپا رہی ہو؟"

"ہیں..." وہ چونکی پھر سنبھل کر بولی۔ "تم مجھے جانتے ہی کتنا ہو۔"

"بہت زیادہ نہیں لیکن پھر بھی جانتا ہوں۔"

"مثلاً..." اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ تم بہت اچھی بہت پیاری لڑکی ہو۔ ساری دنیا کو اپنا غلام بنا سکتی ہو۔ کیونکہ تمہارے اندر ایثار اور خدمت گزاری کا جو جذبہ ہے وہ شاید ہی کسی اور میں ہو۔" وہ بہت دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ صاعقہ کی آنکھوں میں اچانک ڈھیر سارا پانی جمع ہوگیا۔

"ہیلو۔۔۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔" اس نے پکار کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔

"پتا نہیں۔"

"تجھے پتا ہے اور ایک اور بات بتاؤں۔" اس نے کہا تب ہی اماں کے پکارنے پر اس نے گھبرا کر فون بند کر دیا اور تیزی سے باہر آئی تو اماں کے ساتھ مہمان خواتین جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

"اچھا تو پھر آپ کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔" مہمان خاتون نے اماں کو اصرار سے دعوت دی پھر اسے دیکھ کر مسکرائیں اور جاتے جاتے اس کے ہاتھ میں اچھے خاصے نوٹ تھما گئی تھیں۔

"اے اللہ تیرا شکر میری بیٹی کا نصیب جاگا۔" اماں خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ جبکہ اشو اور شمائلہ نے اس کے ساتھ ساتھ مہمان خواتین کا ریکارڈ بھی لگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

"آخر انہیں کیا نظر آیا صاعقی (صاعقہ) میں؟ عقل پر پتھر پڑ گئے یا سچ مچ اندھی تھیں؟"

"کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔" وہ کچھ نہیں بولی لیکن دل میں ان دونوں سے اتفاق کر رہی تھی اور شاید حیران تو اماں بھی تھیں لیکن بظاہر اشو اور شمائلہ کو گھرک رہی تھیں پھر بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگتیں تو وہ نظریں چرا جاتی۔

اگلے دن مارے تجسس کے شمائلہ بھی اماں، ابا کے ساتھ لڑکا دیکھنے چلی گئی تو پہلی بار خود سے نظریں چرا کر دل نے خوش گمانیوں کا دامن تھام لیا۔ وہ بظاہر ادھر ادھر کے کاموں میں مصروف تھی لیکن در حقیقت اماں، ابا کی واپسی کی منتظر تھی۔ وقت کسی طرح گزر ہی نہیں رہا تھا اور آج فون بھی خاموش تھا۔ ورنہ وہ اس سے باتیں کر کے دھیان بٹا لیتی۔ اشو بھی پتا نہیں کہاں غائب تھا۔ وہ اکیلی سارے گھر میں چکراتی پھری۔ پھر جب ڈور بیل بجی تو اس کا دل قابو میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

خود کو بمشکل بھاگنے سے روکا اور جا کر دروازہ کھولا تو اماں اسے دیکھ کر بولیں۔

"اٹھو نہیں ہے کیا؟" اس نے ابا کے ڈر سے نفی میں سر ہلایا لیکن ابا کی نظریں اسی پر تھیں اور خلاف عادت کچھ کہے بنا وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"دروازہ بند کرلو۔" اماں کہتے ہوئے ابا کے پیچھے چلی گئیں تو اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے شمائلہ کو دیکھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں جلن آمیز چبھن کے ساتھ تمسخر بھی تھا۔

"کیا ہوا؟" ڈوبتے دل کے ساتھ اس کے ہونٹ ہلے تھے۔

"ہائے بے قراری!! اندر تو چلو۔" شمائلہ کہتے ہوئے تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گئی تو وہ اس کے پیچھے مرے مرے قدموں سے آئی تھی۔

"کیا بتاؤں صاعقہ اتنے امیر کبیر لوگ۔ اتنا شاندار بنگلہ، یہ لمبی لمبی گاڑیاں نوکروں کی فوج۔" امارت کا نقشہ کھینچتے ہوئے شمائلہ کی آنکھوں میں حسرت بھری چمک تھی۔

"اور وہ...؟" وہ... وہ... اس کا دل وہ وہ کی تکرار کررہا تھا۔

"سچ میں تو بہت امپریس ہوئی۔ کھانا بھی بہت شاندار تھا۔ پیٹ بھر گیا لیکن نیت نہیں بھر رہی تھی۔" اس کا دل چاہا بڑھ کر شمائلہ کو جھنجوڑ کر کہے۔

"یہ سب چھوڑو۔ اس کا بتاؤ وہ کیسا ہے؟" لیکن وہ ضبط سے کھڑی رہی کیونکہ شمائلہ کا جواب جانتی تھی۔

"پہلے خود کو تو دیکھو۔"

"اب دیکھو اماں ابا کیا فیصلہ کرتے ہیں؟" شمائلہ پیروں سے سینڈل نکالتے ہوئے پھر کہنے لگی۔ "راستے میں اماں کی باتوں سے تو لگا جیسے وہ رضامند ہوں لیکن ابا بالکل خاموش تھے۔"

"کیوں؟" اسے خود نہیں پتا اس کے منہ سے یہ ایک لفظ کیسے نکل گیا تھا۔

"اس لیے کہ لڑکا ہے تو بہت خوب صورت لیکن"

شمائلہ اسے سولی پر چڑھا کر مزہ لے رہی تھی۔ اس نے اپنا پورا وزن اپنے پیروں پر منتقل کیا تھا۔

"سچ بہت افسوس ہوا، بے چارہ لنگڑا ہے۔" شمائلہ نے افسوس بھی یوں کیا جیسے جب ہی تو تمہارے لیے آئے اور وہ اگر پیروں کو مضبوطی سے نہ جما چکی ہوتی تو یقیناً ڈھے جاتی۔ جبکہ اب سن ہوگئی تھی۔

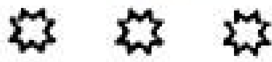
"خیر میں اس کی تصویر لائی ہوں۔ ابھی دکھاتی ہوں۔" شمائلہ کہتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ تو وہ ایسے ہی گم صم بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔

"ہاں۔" شمائلہ کپڑے تبدیل کرکے واش روم سے نکلی تو اپنا پرس کھول کر تصویر نکالنے لگی پھر اس کے ہاتھ میں تصویر تھما کر بولی۔

"دیکھو کتنا خوب صورت ہے۔" اس نے بے اختیار آنکھیں بند کرلیں تو شمائلہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"دیکھ تو لو۔"

"مجھے نہیں دیکھنی۔" وہ تصویر بیڈ کارنر پر پھینک کر لیٹتے ہی لحاف میں چھپ گئی۔



صبح اس کی چندھی آنکھیں شدت گریہ کے باعث نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔ آنکھوں میں جلن الگ مچ رہی تھی۔ چولہے کے پاس کھڑے ہونا عذاب ہوگیا تھا۔ پھر بھی اس نے سب کے لیے ناشتا بنایا اور ابا کے جاتے ہی معمول کے کاموں میں لگ گئی۔ آج شمائلہ جانے کس خوشی میں ابھی تک پڑی سو رہی تھی۔ وہ تو کبھی یونیورسٹی گول نہیں کرتی تھی۔ اماں چلا چلا کر اسے اٹھانے کی کوشش کررہی تھیں۔ پھر اسے پکار کر بولیں۔

"اے صاعقہ! دیکھو تو اسے کیوں ابھی تک پڑی سو رہی ہے۔ اتنا دن چڑھ آیا۔"

"دن ہی چڑھا ہے ناں اماں قیامت تو نہیں آگئی۔" شمائلہ غالباً لحاف میں سے منہ نکال کر چنگھاڑ سے بولی تھی۔

پتا نہیں قیامت کیسی ہوتی ہے۔ اس نے کپڑے مشین میں ڈالتے ہوئے سوچا پھر بٹن گھما کر اماں سے دوپہر کے کھانے کا پوچھنے اندر آئی تو شمائلہ کہہ رہی تھی۔

"اماں آپ ان سے پوچھتیں تو سہی کہ انہیں ہمارے گھر کا پتا کس نے دیا؟"

"کسی نے بھی دیا ہو۔" اماں نے اسے دیکھ کر شمائلہ کو ٹالا تھا پھر اس سے پوچھنے لگیں۔ "کپڑے دھل گئے تمہارے؟"

"بس آخری چکر ہے۔ آپ بتائیں دوپہر کے کھانے میں کیا پکے گا؟" اس نے شمائلہ کی بات سے خود کو انجان ظاہر کر کے پوچھا۔

"کچھ بھی پکالو۔ مگر تھیں مریم بھی آئے گی۔ پلاؤ شوق سے کھاتی ہے۔ پلاؤ کے ساتھ سالن روٹی بھی بنا لینا۔" اماں نے کہا تو شمائلہ فوراً" بولی۔

"ہاں سالن روٹی ضرور ہو۔ میں پلاؤ نہیں کھاتی۔"

"مجھے پتا ہے۔" وہ کہہ کر وہیں سے پلٹ آئی تھی۔ پھر جو وہ کچن میں مصروف ہوئی تو اسے مریم سے حال چال پوچھنے کی فرصت ہی نہیں ملی نہ اس کے بچے کو گود لینے کی۔ یوں بھی وہ سمجھ گئی تھی کہ اماں نے اسے خاص طور سے کیوں بلایا ہے۔ لیکن اس کے اندر کوئی تجسس نہیں تھا جب ہی اس نے اندر سے آتی آوازوں پر کان نہیں دھرے اور اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس دوران وقفے وقفے سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ جس پر کام کرتے ہوئے اس کے ہاتھ رکے ضرور تھے لیکن وہ بھاگ کے سننے نہیں گئی۔ گو کہ شمائلہ نے ہر بار اسے پکار کر فون اٹھانے کو کہا تھا پھر اسے خود ہی اٹھانا پڑا اور ہر بار وہ فون کرنے والے کو گالیاں دیتے ہوئے اندر گئی تھی آخر میں اماں سے الجھ رہی تھی کہ وہ یہ پرانے زمانے کا ٹیلی فون سیٹ پھینکیں اور سی ایل آئی لگوائیں۔

بہر حال کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شمائلہ اور مریم اسے گھیر کر بیٹھ گئیں۔ دونوں اس سے چھوٹی تھیں اور اس وقت اس کی آپا جان بنی ہوئی تھیں۔

مریم پتا نہیں اماں کی زبان بول رہی تھی یا وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ اس رشتے پر ہامی بھرلے۔ اور شمائلہ مریم سے اتفاق بھی کرتی لیکن آخر میں یہ بھی ضرور کہتی کہ تم سوچ لو۔

اور وہ کیا سوچتی خود سے آگاہی نے اسے اپنی ہی نظروں میں بے مایہ کر دیا تھا۔

"پھر میں اماں سے کیا کہوں؟" آخر میں مریم نے پوچھا تو وہ دل گرفتگی سے بولی۔

"ابھی کچھ مت کہو۔"

"ہاں ٹھیک تو ہے۔ دو چار دن کی بات تو نہیں ہے۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے خوب اچھی طرح سوچ لو۔" شمائلہ نے فوراً" اس کی تائید کرتے ہوئے کہا پھر مریم سے بولی۔ "تم اماں سے کہہ دو 'جلدی مچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ شکل صورت کا کیا ہے وہ تو اللہ کی بنائی ہوئی ہے' باقی تو ہر فن مولا ہے صاعقہ۔" اس نے شمائلہ کی طرف دیکھنے سے گریز کیا جو گھما پھرا کر اس کی کم روپی جتا رہی تھی۔

"ٹھیک ہے لیکن سوچنے میں زیادہ وقت نہیں لگانا۔ ایسا نہ ہو۔" مریم بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ گئی تو وہ چائے بنانے کا کہتے ہوئے پھر کچن کی طرف آرہی تھی کہ فون کی بیل پر رک گئی۔

"اب تو میں وہ گالیاں دوں گی کہ...." شمائلہ غصے میں اٹھی تھی کہ اس نے روک دیا۔

"نہیں رہنے دو۔ اس وقت نادیہ فون کرتی ہے۔" اس نے جا کر ریسور اٹھا کر ہیلو کہا تو وہ پوچھنے لگا۔

"کیا بہت مصروف ہو....؟"

"ہاں۔" اس کے اختصار پر وہ کہنے لگا۔

"تو بتا دو کب فارغ ہو گی۔ میں اس وقت فون کر لوں گا۔"

"نہیں ٹھیک ہے۔ میرا مطلب ہے میں اب فارغ ہوں۔"

"تھینک گاڈ! پتا ہے میں اس وقت سے یہ سوچ کر پریشان تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہتیں۔" اس نے کہا تو وہ سوچ کر بولی۔

"پریشان کیوں۔ تمہیں ایسے وقت کے لیے تیار رہنا چاہیے کہ میں کبھی اچانک غائب بھی ہو سکتی ہوں۔"

"غائب مطلب؟" اس نے فوراً ٹوکا۔

"مطلب میری شادی ہو سکتی ہے یا پھر میں مر سکتی ہوں۔"

"اللہ نہ کرے۔ ہاں شادی والی بات ٹھیک ہے۔ کیا تمہاری شادی ہو رہی ہے؟"

"پتا نہیں، کوئی اور بات کرو۔" اس کے اندر کا بوجھل پن اس کی آواز میں در آیا تھا جسے اس نے شدت سے محسوس کیا تھا۔

"سنو! میں نہیں جانتا تمہارے نزدیک میری کتنی اہمیت یا کیا حیثیت ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی۔"

"ایک تم ہی تو ہو۔۔۔" اس کا دل اسی لے پر دھڑکا تھا۔

"لیکن میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ کہ میرے لیے اس ساری دنیا میں ایک صرف تم ہو اور میں تم سے کہوں گا اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔"

"دکھ۔۔۔ دکھ تو بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔"

"اس چھوٹے سے لفظ میں کیا کچھ ہے یہ بھی تو دیکھو۔" اس کی بات پر وہ جانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

"ہیلو صاعقہ۔۔۔" قدرے رک کر اس نے پکارا تو وہ آہستہ سے ریسیور رکھ کر کچن میں جا چھپی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اسے اپنے گھر میں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ کیونکہ اماں نے اسے مسلسل اپنی نظروں میں رکھ لیا تھا۔ اور ان کی نظروں میں ایک ہی سوال تھا۔

"کیا سوچا تم نے؟ اس کے بعد جیسے باور بھی کراتی تھیں کہ اس کے بعد کوئی نہیں۔۔۔ لیکن کوئی تھا۔ رنڈوا چار بچوں کا باپ جس کی بیوی چوتھے بچے کی پیدائش پر جانبر نہیں ہو سکی تھی اور اب اسے بچوں کے لیے گھر میں عورت کی ضرورت تھی۔

ضرورت؟؟ تو وہ ضرورت تھی۔ چاہت تو نصیب والے ہی بنتے ہیں۔ اور اس کے ایسے نصیب کہاں۔ وہ تو احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے لیے ایسے ہی رہ گئے ہیں۔ بہرحال ایسوں میں ہی اسے انتخاب کا تھوڑا غرور ضرور مل گیا تھا۔

"سنو، تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" اس وقت شمائلہ نے بہت تیکھے انداز میں پوچھا تو فوری طور پر وہ سمجھی نہیں۔

"کیسا مسئلہ؟"

"وہ جو تمہارے لیے رشتے آئے ہوئے ہیں۔ روز فون کر کے پوچھتے ہیں کہ کب آئیں۔ اماں کب تک انہیں آس میں رکھیں گی؟"

شمائلہ کی وضاحت پر وہ بے دلی سے بولی۔ "میں کیا کہوں میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔"

"کیا؟ اتنے دنوں سے تم نے کچھ سوچا ہی نہیں۔ سنو بات وہ کرو جو گلے کو ہضم ہو۔" شمائلہ جانے کیوں چڑی ہوئی تھی۔

"میں نے سچ کہا ہے۔ تمہیں سچ ہضم نہیں ہو رہا تو میں کیا کروں۔ چلو ایسا کرو تم بتا دو۔" اس نے کہا تو شمائلہ تپ کر بولی۔

"میں کیوں بتاؤں۔ زندگی تمہیں گزارنی ہے۔"

"جب صرف زندگی گزارنی ہے تو وہ تو یوں بھی گزر رہی ہے۔" وہ عجیب سے احساس میں گھری تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم نے بھی خواب سجا رکھے ہیں۔" شمائلہ کی ہنسی میں تمسخر تھا۔

"ہاں، لیکن میرے خوابوں میں کوئی حسین راہگزر نہیں ہے۔ رنگ بھی مٹیالا ہے۔ ایسا ہی جیسے میرے ناخن ہیں۔" وہ اپنے ناخن دیکھ رہی تھی۔ شمائلہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن جانے کیوں چپ ہو گئی تھی۔ شاید اس پر ترس آیا تھا آخر کو ماں جائی تھی۔

"خیر تم اماں سے کہہ دو میں انہیں ایک دو دن میں بتا دوں گی کہ مجھے لنگڑے کے خدمت گار بننا منظور ہے یا چار بچوں کی آیا۔۔۔" آخری 'آیا' پر اس کی آنکھوں میں ہلکی

سی چمک لہرائی تھی جس پر شمائلہ چونکی تھی اور اس سے پہلے کہ کوئی سوال کرتی وہ وہاں سے اٹھ آئی لیکن اس کا اپنا ذہن آخری بیا میں اٹکا تھا۔

"کیا کروں۔ کیا اپنے دکھ اس کی جھولی میں ڈال دوں۔"

رات کتنی دیر تک وہ خود سے پوچھتی رہی۔ کبھی جواب ہاں میں آتا کبھی ناں میں۔

"کیا ہو گا زیادہ سے زیادہ وہ بھی سب کی طرح مجھ پر ہنس لے گا۔"

"یونہی سہی۔" اس نے سوچ لیا اور اگلے دن جب اس کا فون آیا تو وہ اپنی ہمتیں یکجا کرنے میں لگی رہی۔

"کیا بات ہے۔ تم کچھ بول کیوں نہیں رہیں؟" آخر اس نے ٹوکا تھا۔

"وہ میں...." وہ پریشان ہو گئی۔

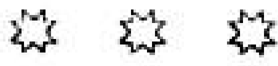
"ہاں کہو۔ کہو ناں...!" دوسری بار مان بھرا اصرار تھا اور کوئی تو تھا جسے اس پر مان تھا۔ اس نے اسی مان کی ڈوری تھام لی۔

"تم مجھ سے شادی کرو گے...؟" دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ گہری خاموشی۔ جبکہ اس کا سارا دھیان اس کی طرف تھا۔

"جواب دو۔ ہاں یا نہ۔ بولو نا۔ خدا کے لیے کچھ کہو۔ میرا ہاتھ تھامو گے۔ تھام لو۔ نکال لو مجھے اس گرداب سے۔" وہ ٹوٹ گئی، بکھر گئی۔ منتیں کرنے لگی۔ "میں تمہیں بہت سکھ پہنچاؤں گی۔ میں، میں ہر فن مولا ہوں۔ سارے کام منٹوں میں کر لیتی ہوں۔ تمہیں کسی کام کے لیے کہنا نہیں پڑے گا' سب تیار ملے گا اور بدلے میں کچھ مانگوں بھی نہیں۔ بس یہ مان مجھے بخش دو۔ ہمیشہ کے لیے 'ہیلو ہیلو ہیلو۔" وہ بے قراری سے پکار رہی تھی اور اسی روانی سے اس کے آنسو چھلک رہے تھے۔ دوسری طرف سے فون بند نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ بولا نہ ہنسا۔ کاش ہنس لیتا تو یہ تسلی ہو جاتی کہ وہ بھی اوروں جیسا ہے۔ اس کی چپ نے تو مار ڈالا۔

اور اس روز شاید زندگی میں پہلی بار وہ سب کی فکر چھوڑ کر لحاف میں جا چھپی تھی۔ وہ سوئی نہیں تھی بس سوتی بن گئی۔ وقفے وقفے سے اماں کی پکار پھر تشویش۔

"اے دیکھو تو کیا ہوا ہے اسے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔ ایسے تو کبھی نہیں سوئی۔" اس نے کسی بات پر کان نہیں دھرے۔ اپنے مٹیالے خوابوں میں پناہ ڈھونڈتی رہی تھی۔



جب خدمت گار ہی بننا تھا تو پھر لنگڑا ہو یا رنڈوا کیا فرق پڑتا تھا۔ لیکن یہاں اس نے پہلے چار بچوں کا سوچا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں جانے انجانے میں وہ بچوں کے ساتھ زیادتی کر بیٹھی تو محشر میں اس کی پکڑ نہ ہو جائے۔ اس نے لنگڑے کے حق میں منظوری دے دی تو اماں نے اسی وقت ادھر فون کھڑکا دیا تھا۔ اس کے بعد شمائلہ کی شامت آ گئی۔ اماں اس کے سر پر سوار' صفائی دھلائی' یہ کرو وہ کرو۔ جس نے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ ہاتھ سے زیادہ زبان چلا رہی تھی اور بار بار ایک ہی بات۔

"مجھ سے نہیں ہوتا اماں.... صاعقہ سے کہیں ناں۔"

"نہیں صاعقہ اب کوئی کام نہیں کرے گی۔ چند دن کی مہمان ہے۔" اماں کا جواب بھی اس کے اندر کے سناٹے کو نہیں توڑ سکا تھا۔

شام میں وہی دو خواتین اور ان کے ساتھ تیسری لڑکے کی بہن غالباً "تجسس" کے ہاتھوں مجبور ہو کر آئی تھی اور اسے دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔ یقیناً "شاکڈ" تھی۔

میرے اتنے خوب صورت بھائی کے لیے یہ....!! اس نے ایسی ہی نظروں سے اپنی ماں کو دیکھا تھا۔ پھر کچھ کھسر پھسر بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد شاید وہ ماں کے سمجھانے پر ہی اس کے پاس آ کر بیٹھی تھی۔

"تمہارا نام...؟"

"صاعقہ...."

"مجھے پتا ہے کیونکہ اتنے دنوں سے گھر میں تمہارا ذکر ہو رہا ہے۔ میں حمزہ کی چھوٹی بہن ہوں۔ لیکن میں

اسے بھائی جان وغیرہ نہیں کہتی۔ تمہیں بھی بھابھی نہیں کہوں گی۔ اب یہ مت پوچھنا کیوں۔" اس نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی۔

"تمہارا نام...؟"

"پنکی۔ اصل نام تو کچھ اور ہے جو شاید اب میرے ممی ڈیڈی کو بھی یاد نہیں ہوگا اس لیے بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" پنکی خاصی باتونی تھی۔ جتنی دیر بیٹھی مسلسل بولتی رہی اور وہ بس اسے دیکھتی رہی، محسوس کرتی رہی اس کی باتوں میں کہیں کہیں تفاخر بھی جھلک رہا تھا اور یہ بھی کہ وہ اسے اپنے بھائی کے ساتھ میچ کرتی نہیں لگ رہی۔ جب ہی ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے پہلی بار وہ تصویر اٹھا کر دیکھی جو شائلہ سے لے کر اس نے یونہی رکھ دی تھی۔ وہ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا کہ اس میں کوئی عیب بھی ہو سکتا ہے۔

پتا نہیں یہ شروع سے ٹانگ سے محروم ہے یا کسی حادثے میں۔ سوچتے ہوئے اسے اس سے اس وقت ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔

پھر اگلے روز دوپہر میں پنکی آگئی اور اماں سے پوچھ کر اسے اپنے ساتھ بیوٹی پارلر لے آئی۔ شہر کا مہنگا ترین پارلر جہاں چار گھنٹے وہ ایک ہی زاویے سے آنکھیں بند کر کے بیٹھی رہی اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے آئینے میں وہ خود کو دیکھتی نہیں رہ گئی تھی کیونکہ چار گھنٹے کی محنت نے اسے کوئی حور پری نہیں بنا دیا تھا۔ بس یہ تھا کہ مستقل بے توجہی کے باعث جو چہرہ بے رونق ہو گیا تھا وہ قدرے صاف اور چمکتا ہوا لگ رہا تھا اور بال رنگنے سے بھی کافی فرق پڑا تھا۔ باقی نین نقش وہی تھے۔ پنکی بیوٹیشن سے اسی سے متعلق بات کر رہی تھی۔ پھر جب اسے واپس گھر چھوڑا تو کہنے لگی۔

"تمہیں شادی تک روزانہ اسی پارلر جانا ہے۔ پک اینڈ ڈراپ کے لیے ممی گاڑی بھیج دیں گی ٹھیک...؟"

اس نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"مجھے یقین ہے چند دنوں میں تم اچھی لگنے لگو گی۔

پنکی کا انداز جتانے والا نہیں تھا۔ غالباً" بے دھیانی میں کہہ گئی تھی۔ لیکن اس نے بری طرح محسوس کیا اور دل چاہا کہ کہہ دے اپنے لنگڑے بھائی کے لیے کوئی اس جیسی دیکھ لو۔

"میں چلتی ہوں اور ہاں حمزہ نے تمہارے لیے یہ بھیجا ہے۔" پنکی نے کہتے ہوئے گاڑی کے اندر سے ایک گفٹ بیگ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی "پنکی او کے بائے" کہہ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"ہونہہ..." وہ سر جھٹک کر اندر آگئی تو اماں اسے دیکھنے لگیں جبکہ شائلہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

"ارے! تم تو کافی چینج ہو گئی ہو۔" پھر اماں سے کہنے لگی۔ "دیکھیں اماں! یہ ایسے ہی سر جھاڑ منہ پھاڑ پھرتی تھی۔ اگر شروع سے خود پر توجہ دیتی تو اب تک دو بچوں کی ماں بن چکی ہوتی۔"

اماں نے اس سے نظریں ہٹا کر شائلہ کو دیکھا لیکن بولیں کچھ نہیں۔

پھر چند دنوں میں اتنا ضرور ہوا کہ اسے آئینے میں خود کو دیکھنا اچھا لگنے لگا تھا اور جہاں تھوڑی خود پسندی آئی وہاں قسمت سے شاکی ہو گئی کہ اس کے نصیب میں لنگڑا کیوں لیکن اب جبکہ شادی میں چند دن رہ گئے تھے تو وہ منع بھی نہیں کر سکتی تھی اور منع کرتی بھی تو کس بنیاد پر۔

وہ جو اس کے سارے دکھ لینے کی بات کر رہا تھا وہ طویل خاموشی کے بعد آج اس سے پوچھ رہا تھا۔

"سنو! کیا واقعی تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"نہیں..." وہ اچانک سخت ہو گئی تھی۔

"نہیں!! پھر اس دن...؟"

"محض مذاق تھا۔" وہ فوراً" بولی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" اس نے بھی فوراً" کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

"جھوٹ کیوں بولوں گی۔ کیا تمہیں یاد نہیں اس سے پہلے میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اچانک غائب ہو سکتی ہوں۔ میری شادی ہو سکتی ہے۔ تو میری شادی

اس وقت طے تھی۔"
"تم خوش ہو اس شادی سے؟" اس نے رک کر پوچھا تو وہ ضبط سے بولی تھی۔
"ناخوش بھی نہیں ہوں۔"
"وضاحت کرو گی؟"
"نہیں اور اب تم مجھے فون مت کرنا۔ میں نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں۔" وہ کہہ کر فون رکھنا چاہتی تھی کہ ادھر اس نے سمجھ کر فوراً "روکا۔
"ایک منٹ' اتنا بتا دو کیا تم نے کبھی تنہائی میں مجھے سوچا تھا؟" وہ خاموش ہو گئی۔
"جواب دو۔ ہاں یا نہ۔ بولو نا۔ خدا کے لیے کچھ کہو۔" وہ اس کے بعد بھی کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس نے کریڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دیا تھا۔



"یہ میں ہوں؟" آئینے میں ایک ٹک خود کو دیکھتے ہوئے اس کا دل بار بار یہی تکرار کر رہا تھا۔ لیمن کلر کا جھلملاتا شرارہ سوٹ 'میچنگ جیولری اور یقیناً "میک اپ کا کمال تھا جو وہ واقعی خوب صورت لگ رہی تھی اور یہ پہلی بار تھا کہ اس کی نظریں خود پر سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ دروازہ کھلنے بند ہونے کی آواز اس نے سنی ہی نہیں۔ جب حمزہ نے سلام کیا تب وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بیساکھی کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں بہت دھیرے دھیرے حمزہ کے چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کے ایک پیر پر جا ٹھہری تھیں۔
"میں تمہارا تھینک فل ہوں کہ تم نے مجھے میرے ادھورے وجود کے ساتھ قبول کر لیا۔" وہ اس کے سامنے آ بیٹھا پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "یقیناً" تم بہت بڑے ظرف کی مالک ہو۔"
ظرف۔ اس نے تلخی سے سوچا۔ نہ میرا ظرف بڑا ہے نہ تمہارا۔ ہم دونوں مجبور تھے۔
"میرے پاس تمہیں دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔" وہ کہنے لگا۔ "اور جو تم کہو گی۔ تمہاری خوشی میرے لیے سب سے اہم ہے۔ ان اولین لمحوں میں،

میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"
"یہ تکلیف کیا کم ہے کہ۔۔۔" اس نے خود ہی اپنی سوچ پر پہرے بٹھا دیے۔
اب جو بھی ہے جیسا بھی ہے زندگی اس کے ساتھ گزارنی ہے۔" اس نے سمجھوتا ضرور کر لیا لیکن دل میں ایک پھانس چبھی رہ گئی تھی۔
صبح وہ اپنے معمول کے مطابق فجر میں ہی اٹھ گئی۔ اطمینان سے نماز پڑھی۔ اس کے بعد سمجھ میں نہیں آیا کیا کرے۔ گھر میں تو اسی وقت سے روٹین کے کام شروع ہو جاتے تھے۔ یہاں پتا نہیں کیا معمول تھا۔ اس نے کھڑکی سے ذرا سا پردہ سرکا دیا اور وہیں کرسی پر بیٹھ کر اجالا پھیلتے ہوئے دیکھنے لگی۔ حالانکہ یہ سب اس کے لیے نیا نہیں تھا لیکن پھر بھی نیا تھا کیونکہ یوں فراغت سے وہ پہلی بار کائنات کو منور ہوتے دیکھ رہی تھی۔ جب سورج کی پہلی کرنیں براہ راست اس کی آنکھوں پر پڑیں تب پردہ برابر کر کے اس نے رخ موڑا تو نظروں کے سامنے حمزہ آ گیا۔ وہ سینے تک کمبل اوڑھے بے خبر سو رہا تھا۔ وہ پہلے بے دھیانی میں اور پھر پورے دھیان سے بھی اسے ہی دیکھے گئی۔
"ایسے وجیہہ چہرے کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر یہ مکمل ہوتا تو کتنی لڑکیاں بلکہ ہر لڑکی اس پر مرتی اور اس وقت میری جگہ کوئی پری وش ہوتی۔ اور یہی بات اسے کم مائیگی اور کم روی کے احساس سے نکلنے نہیں دے رہی تھی۔
وہ معذور ہے تب ہی وہ اس کی زندگی میں آئی ورنہ تو وہ اسے کبھی دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔ یہ سوچ یہ احساس اتنا زور آور تھا کہ رات اس کی محبتیں بھی اسے زائل کرنے میں ناکام رہی تھیں۔
"صاعقہ!" وہ پکارنے کے ساتھ اٹھ رہا تھا۔ وہ چونک کر پہلے بلا ارادہ اٹھ کھڑی ہوئی پھر خیال آنے پر اس کی بیساکھی اٹھا لائی۔
"تھینک یو۔" وہ اس کے ہاتھ سے بیساکھی تھام کر مسکرایا پھر پوچھنے لگا۔ "تم کب اٹھیں۔۔۔"

"میں فجر میں اٹھنے کی عادی ہوں۔" وہ جواب دیتے ہوئے اس کے ایک پیر کی چپل بیڈ کے نیچے سے نکالنے کے لیے جھک گئی۔ تو شانوں پر ڈھلک آنے والے بال حمزہ نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

"تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں۔"

رنگنے سے خوب صورت لگنے لگے ہیں۔" اس کی صاف گوئی پر وہ انجان سا بن گیا۔

پھر جب تک وہ واش روم سے نکلتا اس نے عادت کے مطابق بیڈ کی چادر ٹھیک کرنے کے ساتھ ادھر ادھر بکھری پھولوں کی پتیاں سمیٹ دیں۔ جس پر حمزہ نے واش روم سے نکلتے ہی اعتراض کیا۔

"یہ سب تم نے کیوں کیا۔ ابھی ملازمہ آتی ہو گی۔" وہ خاموش رہی تھی۔

"اچھا چلو! ممی ناشتے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔" حمزہ نے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تو وہ اسی خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

ڈائننگ روم میں حمزہ کے ممی ڈیڈی اور پنکی جانے کس بات پر بحث کر رہے تھے کہ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ اس نے سلام کیا اور جب دیکھا کہ حمزہ آرام سے بیٹھ گیا ہے تب وہ بھی بیٹھ گئی۔

"لو بیٹا! جو تم پسند کرو۔" ممی اسے اپنی مدد آپ کا کہہ کر خود ڈیڈی کو ناشتہ سرو کرنے لگیں تو اس نے کن انکھیوں سے حمزہ کو دیکھا اور اس کی طرح سلائس کے ساتھ انڈے کی پلیٹ اٹھالی۔

"ہاں حمزہ..." پنکی جیسے اچانک یاد آنے پر بولی تھی۔ "رانیہ کا فون آیا تھا۔ بہت رو رہی تھی۔"

"شٹ اپ۔" حمزہ نے ہلکے انداز میں پنکی کو ٹوکا تو وہ چیخ کر بولی۔

"واٹ شٹ اپ۔ تم نے اسے..."

"آئی سے شٹ اپ..." حمزہ کی آواز تیز ہو گئی تب ممی نے مداخلت کی۔

"پنکی! خاموشی سے ناشتا کرو۔"

"نہیں کرنا مجھے ناشتا۔" پنکی غصے سے اٹھ کر چلی گئی تو وہ جو انجان اور لاتعلق تھی، خائف ہو گئی اور ناشتے کے بعد کمرے میں آئی تو جھجکتے ہوئے حمزہ سے کہنے لگی۔

"آپ کو پنکی کو ڈانٹنا نہیں چاہیے تھا۔"

"پاگل ہے وہ۔" حمزہ نے سر جھٹکا تھا۔ پھر اسے دیکھ کر بولا۔ "ڈونٹ کیئر۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔"

"پنکی ناراض ہو گئی ہے۔" وہ بیٹھی تب بھی وہی بات۔

"نہیں۔ کہا نا پاگل ہے۔ ابھی دیکھنا تھوڑی دیر میں بھاگی چلی آئے گی۔ ویسے اگر وہ ناراض ہو بھی جائے تو..."

"اچھا نہیں لگے گا۔" وہ بے ساختہ بولی تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم صلح پسند ہو۔ اچھی بات ہے۔" وہ بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر پوچھنے لگا۔ "اور کیا کیا پسند ہے تمہیں؟"

"آپ بتائیں؟" اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو الٹا اس سے پوچھ لیا۔

"مجھے۔" وہ ایک لحظہ رک کر گویا ہوا۔ "کائنات کی ہر وہ شے جسے دیکھتے ہی خدا یاد آئے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ حسن پرست ہیں۔" وہ بے ساختہ بولی تھی۔ حمزہ نے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنی بات کی وضاحت کرنے لگا تھا کہ ملازمہ دروازے میں آکر بولی۔

"صاحب! بی بی کے گھر والے آئے ہیں۔"

"انہیں یہیں لے آؤ۔" حمزہ ملازمہ کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اس کے بازو کے حلقے سے نکل کر کچھ فاصلے پر جا بیٹھی۔

شمائلہ اور مریم آئی تھیں۔ شاید ناشتا وغیرہ لے کر، ان کے خیال میں بڑے لوگوں کی صبح بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی لیکن ان دونوں کو فریش دیکھ کر شمائلہ کو حیرت ہوئی اور بے ساختہ اظہار بھی کر گئی۔

"ارے، میرا تو خیال تھا ہمیں گھنٹہ بھر تم لوگوں کے اٹھنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"آپ کا خیال درست ہو سکتا تھا اگر جو صاعقہ

عادت کے مطابق فجر میں نہ اٹھ گئی ہوتیں۔" حمزہ نے شمائلہ سے کہتے ہوئے محبت بھری نظر اس پر ڈالی تھی۔

"کمال ہے۔ ایک ہی رات میں آپ اس کی عادات سے بھی واقف ہو گئے۔" شمائلہ کی ہنسی عجیب تھی یا شاید حمزہ کو محسوس ہوئی جو وہ نظر انداز کر کے اٹھنے لگا تو صاعقہ فوراً" اس کی بیساکھی لے آئی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں حمزہ بھائی؟" مریم نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"ماما کے پاس تاکہ آپ لوگ ایزی ہو کر اپنی بہن سے باتیں کریں۔" اس کے جواب پر شمائلہ فوراً" بولی۔

"ہم تو آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میرا مطلب ہے بہن سے تو ہم گھر جا کر باتیں کر لیں گے۔"

"گھر جا کر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی! ابھی ہم صاعقہ کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پھر شام کو آپ آیئے گا۔" شمائلہ نے کہہ کر شوخی سے صاعقہ کو دیکھا لیکن وہ متوجہ نہیں تھی۔

"اچھی بات ہے۔" وہ کیوں کس لیے کا سوال اٹھائے بنا کمرے سے نکل گیا تب شمائلہ اس سے بولی۔

"چلو صاعقہ! تم تیار ہو نا یا چینج کرو گی؟"

"نہیں لیکن..." وہ کچھ پریشان ہو گئی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"کیا لیکن؟ ہمارے ہاں کا یہی رواج ہے۔ اماں نے بھی کہا ہے تمہیں ساتھ لے کر آئیں۔ کیوں مریم؟" شمائلہ نے تصدیق کے لیے مریم کو مخاطب کیا تو گو کہ وہ ان دونوں سے چھوٹی تھی لیکن جلد شادی ہو جانے کے باعث تجربے میں بڑی ہو گئی تھی تب ہی سمجھ داری سے کہنے لگی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شمائلہ! لیکن پہلے اسے اپنی ساس اور میاں سے تو اجازت لینے دو۔ ایسے ہی تو ہمارے ساتھ نہیں چل پڑے گی۔"

"ایسے ہی کیوں؟ ابھی میں نے حمزہ کو بتایا تو ہے اور اس نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا۔"

"پھر بھی جاؤ صاعقہ! تم اپنی ساس سے پوچھ لو۔" مریم نے کہنے کے ساتھ اسے جانے کا اشارہ کیا تو وہ ممنون نظروں سے اسے دیکھتی کمرے سے نکل گئی۔

اسے نہیں یاد کبھی اماں نے اسے اپنے سینے میں بھینچ کر چٹاچٹ پیار کیا ہو جیسے اب کر رہی تھیں تب ہی وہ حیران اور بوکھلا بھی گئی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے اماں! کیا میں شمائلہ اور مریم کی طرح خوب صورت ہو گئی ہوں۔" اس نے کہا تو شمائلہ زور سے ہنسی جس پر اماں اسے گھور کر بولیں۔

"خوب صورتی نصیب میں ہوتی ہے بیٹی اور تو بڑے نصیبوں والی ہے۔"

"بس رہنے دیں اماں۔ بڑے نصیبوں والی! مجھے تو اس پر ترس آرہا ہے۔ بے چاری ساری زندگی بیساکھی پکڑے کھڑی رہے گی۔" شمائلہ نے نخوت سے سر جھٹکا اور اماں یقیناً" اسے بے نقط سنانے والی تھیں لیکن اس نے اماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ اس کی خاطر خود پر جبر کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

"سوری، تمہیں برا لگا۔" شمائلہ کو احساس نہیں ہوا تھا بلکہ مزید اس پر جتانا چاہتی تھی۔ وہ سمجھ کر بھی مسکرا دی۔

"نہیں تم جانتی ہو۔ میں کبھی خود فریبی میں مبتلا نہیں ہوئی۔"

"اوہو یہ تم دونوں کیا باتیں کرنے لگیں۔ تم بیٹھو صاعقہ اور مجھے بتاؤ حمزہ بھائی نے تمہیں منہ دکھائی میں کیا دیا۔" مریم نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے ساتھ بٹھا کر شوق سے پوچھا تو وہ بے ساختہ بولی۔

"سب کچھ..."

"مطلب...؟" شمائلہ کو تجسس ہوا۔

"مطلب انہوں نے کہا وہ میری ہر خواہش پوری کریں گے۔ ویسے فارملٹی کے لیے انہوں نے یہ انگوٹھی پہنائی تھی۔" اس نے بتاتے ہوئے اپنا انگوٹھی والا ہاتھ سامنے کر دیا۔

"ڈائمنڈ۔" اشتیاق سے دیکھتے ہوئے مریم کی آنکھیں چمکنے لگیں اور شمائلہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ ٹیلی فون کی بیل بجنے لگی وہ کیونکہ کھڑی تھی اس لیے فون

سننے چلی گئی لیکن چند لمحوں میں ہی بڑبڑاتے ہوئے واپس آئی تو مریم نے بلا ارادہ پوچھ لیا۔

"کس کا فون تھا؟"

"پتا نہیں کوئی گونگا تھا۔" شمائلہ کے جواب پر اس کی دھڑکنیں مدھم ہوئی تھیں اور ذہنی رو بھٹکنے لگی تھی کہ اس کے سیل فون پر مسیج ٹون نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ اس نے سیل آن کیا۔ حمزہ کا مسیج تھا۔

"مس یو۔ Miss u۔"

☆ ☆ ☆

اس کی شادی کو دو مہینے ہو گئے تھے۔ بظاہر سب ٹھیک تھا بلکہ بہت اچھا۔ حمزہ کے پاپا بڑے بزنس مین تھے اور ان کا ایسا ہی انداز تھا۔ اس کا سامنا ہوتا تو جیسے رک کر پوچھتے۔

"کیسے ہو بیٹا...؟"

"سب ٹھیک ہے نا۔"

"کوئی پرابلم تو نہیں۔"

"اوکے بی ہیپی۔" وہ آگے بڑھ جاتے تب اس کی سانس بحال ہوتی اور ماما کا لیا دیا انداز تھا۔ جبکہ پنکی کی اپنی دلچسپیاں تھیں، موڈی بھی تھی، کبھی بہت اچھے موڈ میں ہوتی اور کبھی بیزار نظر آتی۔ اس وقت جانے کس موڈ میں تھی کہ اسے کچن سے کھینچتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئی اور بیڈ پر بٹھا کر پوچھنے لگی۔

"تم ہر وقت کچن میں کیوں گھسی رہتی ہو؟"

"ہر وقت تو نہیں بس اس وقت ایک دو ڈشز بنا لیتی ہوں یا پھر جب حمزہ کا چائے کافی کا موڈ ہوتا ہے تب۔" اس کے جواب پر پنکی خاموش ہو گئی تو قدرے رک کر وہ پوچھنے لگی۔

"کیا تم یہی پوچھنے کے لیے مجھے یہاں لائی ہو۔"

"نہیں مجھے تم سے ایک اور بات کرنی ہے۔" پنکی نے کہا تو وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"پہلے یہ بتاؤ تم حمزہ کے ساتھ خوش ہو۔" پنکی ایک دم اس کے سامنے یوں بیٹھی تھی جیسے اسے جھنجوڑنے کا ارادہ ہو تب ہی وہ اندر سے خائف ہو گئی۔

"بتاؤ!" پنکی نے واقعی اس کا ہاتھ پکڑ کر جارحانہ انداز میں ہلایا تب وہ جی کڑا کر کے بولی۔

"ہاں میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔"

"اب وجہ بھی بتا دو؟" پنکی نے کہا تو وہ الجھ گئی۔

"مطلب...؟"

مطلب تم کیوں خوش ہو ایک ایسے شخص کے ساتھ جو تمہارے ساتھ چل نہیں سکتا۔ تمہیں کہیں لے جا نہیں سکتا۔" پنکی کو ۔ جانے کیا ڈپریشن تھا۔

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے پنکی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"کیوں فرق نہیں پڑتا۔ کیا تمہارے پاس دل نہیں ہے۔ دماغ نہیں ہے۔ تم سوچتی نہیں ہو کہ کاش حمزہ اپنے پیروں پر چل سکتا۔ تمہیں اس کی بیساکھی بری نہیں لگتی؟"

"جب حمزہ کو میری صورت بری نہیں لگتی تو مجھے اس کی بیساکھی بھی بری نہیں لگتی۔" اس کے جواب پر پنکی بری طرح جھنجلا گئی۔

"او گاڈ! کیسی لڑکی ہو تم۔ حمزہ کو تمہاری صورت کیوں بری لگے گی۔ تم اس کی پسند ہو۔ اس کی ضد تھی کہ وہ شادی کرے گا تو تم سے ورنہ کسی سے نہیں۔" پنکی نے اسے دشت حیرت میں دھکیل دیا تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھے گئی۔

"یہی سچ ہے۔ میں نے اور ماما نے تمہیں حمزہ کی وجہ سے قبول کیا ہے۔ ورنہ اس کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک حسین، سمجھیں۔"

"نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں حمزہ کی پسند کیسے ہو سکتی ہوں۔ اس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں اگر دیکھ لیتا تو۔"

"اچھا تم حمزہ سے پوچھنا۔" پنکی اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

"کیا پوچھوں...؟"

"یہی کہ خیر چھوڑو۔ مجھے اصل میں کوئی اور بات کرنی تھی۔" پنکی کو اصل بات یاد آئی تو سر جھٹکا۔

"اور کیا بات؟" وہ پھر خائف ہوئی۔

"اصل میں حمزہ میرا ایک ہی بھائی' مجھے بہت پیارا ہے۔ جب ایکسیڈنٹ میں اس کی ایک ٹانگ ضائع ہوئی تو یقین کرو میں بہت روئی تھی ہر وقت اس کے ساتھ لگی رہتی اور یہ غم مجھے کھائے جا رہا تھا کہ حمزہ کبھی دونوں پیروں پر نہیں چل سکے گا لیکن پھر پاپا نے مجھے تسلی دی کہ وہ حمزہ کی مصنوعی ٹانگ لگوا دیں گے لیکن۔" پنکی خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگی کہ اس نے گھبرا کر ٹوک دیا۔

"لیکن کیا؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے؟"

"ہے ممکن لیکن حمزہ نہیں مانا۔ میں نے اس کی اتنی منتیں کیں اب بھی کرتی ہوں اور وہ جو میری کوئی بات رد نہیں کرتا یہاں پتا نہیں کیوں کچھ سنتا ہی نہیں چاہتا۔ تم' تم کہو اس سے۔" پنکی نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گا۔ کیونکہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ تم اس کی پسند ہو۔ وہ اپنی پسند پا کر بہت خوش ہے۔ لیکن میں اس کی خوشی کو اور انداز سے سوچتی ہوں میرا مطلب ہے میں چاہتی ہوں وہ تمہارے ساتھ گھومے پھرے۔ لائف انجوائے کرے۔ سمجھ رہی ہو نا۔"

اور وہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھ رہی تھی۔ پنکی نے پھر کہا تھا کہ تم اس کی پسند ہو اور اس کا ذہن اسی بات میں الجھ رہا تھا۔ وہ پنکی سے ہاں بھر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ حمزہ واش روم میں تھا۔ اسے یہ بہت غنیمت لگا کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ دل کی طرح اس کے چہرے پر بھی غیر معمولی خاموشی پھیل گئی ہے۔ ساتھ سوالیہ نشان بھی تھے۔ کیونکہ وہ تو ابھی تک حمزہ کی محبتیں سمجھنے سے قاصر تھی۔ کہاں یہ بات کہ وہ اس کی پسند ہے۔ اگر وہ اپنی کم روی سے آگاہ نہ ہوتی اور تضحیک کا نشانہ نہ بن چکی ہوتی تو اس وقت اس کی کیفیت مختلف ہوتی۔ دل خوشی سے بے قابو ہوتا اور حیران ہو ہو کر سوچتی کہ حمزہ نے اسے پہلے کہاں دیکھا اور پسند کیا کہ وہ اس کی چاہ بن گئی۔ پھر اس سے اِٹھلا کر پوچھتی بھی۔ لیکن اب تو وہ حیران سے زیادہ پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی نیا مذاق تو نہیں ہونے والا۔ وہ بہت کچھ سہہ چکی تھی لیکن اب اپنی تضحیک' تذلیل نہیں سہہ پائے گی۔

"یا اللہ! میں کیا کروں۔ انتہائی بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تب ہی واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑتے ہوئے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن حمزہ دیکھ چکا تھا فوراً "نہیں ٹوکا جب بیٹھ گیا تب پکار کر بولا۔

"صاعقہ' میرے پاس آؤ۔" وہ سرعت سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے۔ تم رو رہی تھی؟" حمزہ کے نرم لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔ اس نے انکار کیا نہ اقرار' سر جھکا لیا تو وہ اس کی پیشانی پر جھولتی لٹ اپنی انگلی سے ہٹاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کسی نے کچھ کہا ہے یا میری کوئی بات بری لگی ہے؟"

"نہیں بس یونہی۔"

"کیا یونہی۔۔۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے سمجھ گئی کہ وہ جانے بنا چین نہیں پائے گا تب بمشکل بات بنائی۔

"وہ اماں کا فون آیا تھا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ارے کیا ہوا ہے انہیں۔ کیا زیادہ طبیعت خراب ہے۔" حمزہ نے تشویش سے پوچھا۔

"پتا نہیں' زیادہ بات نہیں ہوئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کچھ دنوں کے لیے اماں کے پاس رہ آؤں۔" اسے اچانک فرار سوجھ گیا۔

"ہاں کیوں نہیں' ضرور جاؤ۔ یوں بھی جس طرح تم ان کی خدمت کر سکتی ہو شائلہ تو نہیں کر سکتی۔" حمزہ نے اجازت دینے کے ساتھ کہا تو وہ دل ہی دل میں بات بن جانے پر شکر کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

اماں کے ہاں آئے اسے تیسرا دن تھا۔ اس دوران حمزہ مسلسل اس سے رابطے میں تھا۔ کبھی فون کرتا ـــــ کبھی میسج گویا اسے پل پل کاٹنا دشوار تھا۔ اماں اس کے لیے حمزہ کی بے قراری دیکھ کر اس پر نہال ہوتی رہتیں۔ جبکہ اسے ابھی ڈور کا کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ اس وقت وہ پنکی کی باتیں سوچ رہی تھی۔

"تم حمزہ کی پسند ہو۔ اس کی ضد تھی کہ وہ شادی کرے گا تو تم سے ورنہ نہیں۔" پھر وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔ "میں نے اور ماما نے تمہیں حمزہ کی وجہ سے قبول کیا ہے۔"

پنکی کی صاف گوئی کے باعث وہ اس کی دوسری باتیں نہیں بھلا پا رہی تھیں نہ وہ حمزہ کی محبتوں سے منکر تھی۔ سچائیوں میں ہی الجھ رہی تھی کہ مریم نے آکر ایک دم اپنے بچے کو اس کی گود میں ڈال دیا۔

"ارے۔" وہ اچھل پڑی۔ "تم کب آئیں؟"

"ابھی۔۔۔" مریم کھلکھلاتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئی۔ "اماں نے بتایا تم آئی ہوئی ہو تو میں چلی آئی۔ تمہارے سسرال آنا تو بہت مشکل ہے۔"

"کیوں؟" وہ جو بچے پر جھکی تھی۔ سر اونچا کر کے مریم کو دیکھنے لگی۔

"اتنی دور جو رہتی ہو۔ بندہ ہزار کا نوٹ تو صرف کرائے کے لیے رکھے۔ خیر یہ بتاؤ کیسی ہو۔ حمزہ بھائی کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں۔"

"کوئی خوشخبری؟" مریم کی معنی خیز مسکراہٹ سے وہ جھینپ گئی۔

"ابھی تو تم اپنی خوشخبری سنبھالو۔" اس نے بچہ مریم کی گود میں ڈال دیا۔

"کیوں تمہیں شوق نہیں ہے؟" مریم نے کہا پھر اس کا گال چھو کر بولی۔

"ویسے صاعقہ! شادی کے بعد تم بہت پیاری ہو گئی ہو۔"

"کیسے پیاری ہو گئی ہوں۔ شکل تو وہی ہے میری۔ ناک نقشہ بھی کہیں بدلتا ہے۔" وہ بے دھیانی میں اپنے چہرے کا ایک ایک نقش چھونے لگی۔

"تو پہلے تمہارا ناک نقشہ کون سا برا تھا۔ بس تم خود پر توجہ نہیں دیتی تھیں۔ صرف بال کلر کرنے سے ہی کتنا فرق پڑا ہے۔ یہ تم پہلے بھی کر سکتی تھیں۔"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔" وہ تنگ آکر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو جا کہاں رہی ہو۔" مریم نے فوراً ٹوکا۔

"اماں کو دیکھوں کب سے پکانے میں لگی ہیں۔ مجھے تو مہمانوں کی طرح بٹھا دیا ہے۔ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔" اس نے کہا تو مریم ہنستے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے اب تم پرائی ہو چکی ہو۔"

"تو کیا کروں مجھ سے نہیں فارغ بیٹھا جاتا۔"

"اچھا ابھی تو بیٹھو۔ یہ بتاؤ کتنے دن رہو گی؟" مریم نے اس کا ہاتھ کھینچ کر بٹھا دیا۔

"باقاعدہ دن طے کر کے نہیں آئی تھی۔ جب دل چاہے گا چلی جاؤں گی۔"

"کیا کہنے تمہارے دل کے ہمارے تو دل کے ارمان دل میں ہی رہ جاتے ہیں۔ ابھی جب آرہی تھی تو میری ساس ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھیں جلدی آنا' جلدی آنا۔" مریم یہ دکھڑے پہلے بھی روتی تھی تب وہ اس پر ترس کھاتی تھی۔ اب ہنس کر بولی۔

"ہاں تو بے چاری تمہارے بغیر نہیں رہ سکتیں نا۔"

"بس رہنے دو۔ بے چاری ہونہہ۔" مریم نے جل کر سر جھٹکا تب ہی ٹیلی فون کی بیل بج اٹھی۔

"اے دیکھنا کس کا فون ہے۔" اماں کچن سے چلائی تھیں۔

"حمزہ بھائی کا ہو گا۔ تم جاؤ۔"

"کوئی نہیں حمزہ میرے سیل پر کال کرتے ہیں۔" وہ کہتے کے ساتھ لیٹ گئی تو مریم منے کو اس کے پاس لٹا کر چلی گئی۔

پھر شام میں ماما اسے لینے آگئیں تو جہاں وہ ان کی

آمد پر حیران تھی وہاں اماں ان کے آگے بچھی جارہی تھیں۔
"آپ بیٹھیں ناں، یہاں بیٹھیں۔"
"میں پھر کسی دن فرصت سے آؤں گی، ابھی تو میں صاعقہ کو لینے آئی ہوں۔" ماما سہولت سے کہہ کر اس سے مخاطب ہوگئیں۔ "بیٹا حمزہ تمہارے بغیر بہت اداس ہے۔ تم اتنی دیر اس سے دور مت رہا کرو۔ بے شک روزانہ گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے آجایا کرو لیکن۔"
"جی جی میں بھی اس سے یہی کہہ رہی تھی کہ پہلے اسے اپنے میاں کا خیال کرنا چاہیے۔" اماں نے فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملا کر کہا تو اس سے پہلے کہ اماں اپنے حساب سے سمجھ کر مزید کچھ بولتیں وہ فوراً چلنے کو تیار ہوگئی۔
"تمہاری بہن شمائلہ کی کہیں بات ہوگئی۔ آئی مین انگیجمنٹ؟" راستے میں ماما نے اس سے پوچھا تو وہ جو اپنے کسی خیال میں تھی چونک کر بولی۔
"جی، جی نہیں۔"
"کیوں؟ خوب صورت لڑکی ہے پھر کیوں ابھی تک۔"
"وہ اصل میں ماسٹرز کر رہی ہے۔" وہ ان کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔
"ہوں۔" ماما خاموش ہوگئیں انداز سوچتا ہوا تھا پھر کہنے لگیں۔ "مجھ سے مسز رانا نے کہا ہے اپنے بیٹے کے لیے کہ کوئی لڑکی بتاؤں۔ مجھے تمہاری بہن کا خیال آیا۔ ابھی میں نے خاص طور سے شمائلہ کو دیکھا ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ مسز رانا اور ان کے بیٹے کی بھی یہی ڈیمانڈ ہے۔"
"اور آپ کے بیٹے کی ڈیمانڈ کیا تھی؟" اس نے سوچا اور خاموشی سے انہیں دیکھے گئی۔
"میرا خیال ہے تم پہلے اپنے پیرنٹس سے بات کرلو۔ اگر وہ کہیں گے تو پھر میں مسز رانا کو لے جاؤں گی۔" انہوں نے آخر میں اسے دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔
پھر ماما اسے گھر پر اتار کر چلی گئیں۔ انہیں کہیں اور جانا تھا اور وہ اس نئی بات کو سوچتے ہوئے سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس کی سماعت سے پنکی کی آواز ٹکرائی تھی۔
"یہ صاعقہ ہے۔" اس نے رک کر دیکھا پنکی کے ساتھ اس کی ہم عمر لڑکی بیٹھی تھی۔ خوب صورت اسٹائلش۔
"صاعقہ! یہ رانیہ ہے۔ میری بیسٹ فرینڈ۔" وہ سلام کرنا چاہتی تھی کہ رانیہ چیخ نما آواز کے ساتھ بولی تھی۔
آئی کانٹ بلی لیو۔۔۔۔ (میں یقین نہیں کرسکتی)
"تم جاؤ صاعقہ! حمزہ تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔" پنکی نے فوراً کہا تو وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے کمرے میں آئی تو بیڈ پر نیم دراز حمزہ اسے دیکھتے ہی گنگنانے لگا۔

تیرے بنا سانس بھی چلتی تھی
تیرے بنا دل بھی دھڑکتا تھا
یاد نہیں تھا یاد آیا

وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔
"مانتی ہوں آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ سارے میں اپنی محبت کا اشتہار لگادیں۔"
"مطلب۔۔۔۔؟"
"مطلب ابھی ماما نے سب کے سامنے کہہ دیا کہ حمزہ تمہارے بغیر اداس ہے۔" اس نے بتایا تو ہنستے ہوئے حمزہ نے اسے اپنے سینے سے لگالیا۔
"غلط تو نہیں کہا ماما نے۔"
"لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔" اس کے روٹھے انداز پر وہ بے چین ہوگیا۔
"سوری، سوری جانو آئندہ احتیاط کروں گا۔" وہ اس کے سینے سے سر ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تو وہ نرمی سے اس کا گال چھو کر بولا۔
"اب یہ بھی بتادو کہ تمہیں اور کیا کیا اچھا نہیں لگتا۔"
"اور۔۔۔۔" سوچتے ہوئے معاً اسے یاد آیا کہ اول

روز اس نے پوچھا تھا کہ اور کیا کیا تمہیں پسند ہے۔
اس وقت وہ پنکی کے ناراض ہونے پر خائف تھی۔ پنکی کو حمزہ نے ڈانٹا تھا جب اس نے کہا تھا۔

"حمزہ رانیہ کا فون آیا تھا۔ بہت رو رہی تھی وہ۔"

"رانیہ۔" اپنی ہی سوچ میں اس کے منہ سے نکلا تھا اور حمزہ چونک گیا۔

"رانیہ!! تم رانیہ کو جانتی ہو؟" اب وہ چونکی تھی۔

"نہیں وہ ابھی آتے ہوئے سرسری ملاقات ہوئی ہے۔ پنکی بتا رہی تھی اس کی بیسٹ فرینڈ ہے۔"

"اور.... اور کیا بتایا پنکی نے۔" وہ جانے کیا جاننا چاہ رہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"اور تو کچھ نہیں۔"

"ہاہ...." وہ گہری سانس کھینچ کر بات بدل گیا۔ "تم نے بتایا نہیں اماں کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"ماشاءاللہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ میرا خیال تھا آپ آئیں گے۔ اماں کو دیکھنے نہ سہی مجھے لینے۔" وہ شاکی نہیں تھی لیکن حمزہ کو لگا تھا۔

"مجھے تمہیں لانے لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن شاید تمہیں اچھا نہ لگے کہ میں تمہارے گھر والوں کے سامنے لاٹھی ٹیکتا ہوا آؤں۔" وہ اس کی بات پر جز بز ہو کر بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" پھر ایک دم اسے پکار کر کہنے لگی۔ "حمزہ آپ آرٹیفشل ٹانگ کیوں نہیں لگوا لیتے بلکہ آپ کو بہت پہلے لگوا لینی چاہیے تھی۔"

"ہاں سب نے کہا لیکن...."

"لیکن کیا؟" اسے حمزہ کا خاموش ہو جانا محسوس ہوا تھا۔

"اچھا پہلے تم مجھے چائے پلاؤ۔ بہت دن ہو گئے تمہارے ہاتھ کی چائے پیے۔" یہ پہلا موقع تھا کہ حمزہ نے خود اسے اٹھا دیا تھا۔ وہ خاصی بدمزہ ہوئی کہ جو بات کہنے کے لیے اسے سوچنا پڑ رہا تھا وہ اتفاقیہ طور پر اچانک ہو گئی تھی تو حمزہ جیسا کہ پنکی نے کہا تھا کہ وہ سننا ہی نہیں چاہتا تو اسے ٹوکا تو نہیں لیکن اپنے پاس سے بہانے سے ہٹا دیا تھا گو کہ وہ اس سے دوبارہ بھی کہہ سکتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر حمزہ بیساکھی کے سہارے ہی کیوں چلنا چاہتا ہے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ صرف حمزہ کے لیے ہی نہیں پورے گھر کے لیے اہم ہو گئی تھی۔ کیونکہ ہر فن مولا تھی۔ ہر کام ذمہ داری سے کرتی تھی تو ماما نے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا تھا اور اب اکثر باتوں میں اس سے مشورہ بھی کرنے لگی تھیں۔ اسے یہ سب اچھا لگنے لگا تھا۔ لیکن وہ جو اول روز بلکہ یہاں آنے سے بھی پہلے اس کے اندر یہ احساس جڑ پکڑ گیا تھا کہ وہ چاہت نہیں ضرورت ہے۔ چاہت تو نصیب والے ہی بنتے ہیں تو اتنی اہمیت حاصل ہونے اور خصوصاً" حمزہ کی چاہتوں پر ایمان لانے کے باوجود وہ اس احساس سے نکل نہیں پاتی تھی۔ کبھی خائف ہوتی کبھی بے چین۔

اس وقت وہ اسی احساس میں گھری حمزہ کی ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ رات بہت دیر تک وہ لیپ ٹاپ پر مصروف رہا تھا' شاید پرنٹر بھی استعمال کیا تھا کتنے پیپرز بکھرے پڑے تھے۔ اس نے پہلے فالتو پیپر ڈسٹ بن میں ڈالے پھر کام والے پیپرز احتیاط سے ایک دوسرے پر جما کر ٹیبل کی دراز میں رکھنے لگی تھی کہ وہاں پہلے سے موجود پیپر پر اس کی نظریں جم گئیں۔ جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس نے وہ پیپر نکالا تو اس کے نیچے ویسا ہی دوسرا موجود تھا پھر وہ ایک کے بعد ایک دیکھتی چلی گئی جیسے اس کے نام کا ورد کیا گیا تھا۔ پھر ایک پیپر پر کچھ اور بھی لکھا تھا۔ اس نے وہ ہاتھ میں لے کر نظروں کے سامنے کر لیا۔ اس کے نام کے ساتھ اس کی اماں کے گھر کا ٹیلی فون نمبر بھی لکھا تھا۔ پھر اس کی باتیں۔

وہ کہتی ہے مجھ سے شادی کرو گے۔ جواب دو ہاں یا ناں۔ خدا کے لیے کچھ کہو۔ میرا ہاتھ تھامو گے۔

"اف۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا گئی۔ تمام پیپرز دراز ـــــ میں بند کر کے وہ وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن اچانک ماؤف ہو گیا تھا۔ کتنی دیر گزر گئی۔ وہ ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کیے ساکت بیٹھی تھی اور

جانے کب تک بیٹھی رہتی کہ بیساکھی کی آواز پر وہ ایک دم اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی اور واش بیسن کا نل کھولتے ہی اس کی آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ وہ روتی جاتی اور منہ پر پانی کے چھپاکے مارتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے آئینہ دیکھا۔ خود اسے اپنا چہرہ عجیب سا لگا۔

ایسی ہی تو ہوں میں، ہمیشہ مذاق کا نشانہ بنی پھر یہ حمزہ میرے ساتھ کون سا نیا مذاق کرنے جا رہا ہے۔ خوب صورت لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے میرا انتخاب کیوں کیا۔ میں اس کی پسند کیسے بنی۔ کیا صرف فون پر بات کر لینے سے وہ سوچتی چلی گئی۔ پھر کچھ ٹھان کر ہی واش روم سے نکلی تھی۔ اسے دیکھ کر حمزہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی۔

"کیا بات ہے صاعقہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"آپ ذرا ذرا سی بات پر پریشان کیوں ہو جاتے ہیں۔ کچھ نہیں ہوا مجھے میں بالکل ٹھیک ہوں۔" ضبط کے باوجود اس کے لہجے میں ناگواری در آئی تھی۔ جسے محسوس کر کے حمزہ خاموش ہو رہا تھا۔

"میں چائے لاتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور منٹوں میں چائے لے کر واپس آئی تو اس کے پاس بیٹھ گئی۔

حمزہ کی نظریں اس کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ غالباً" اس کے رونے کا سبب سوچنے لگا تھا اور وہ سمجھ کر اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"کیسی محبت کرتے ہیں آپ مجھ سے کہ میری بات ہی نہیں مانتے۔ اس کا مطلب ہے....."

"ایک منٹ۔" وہ ٹوک کر پوچھنے لگا۔ "کیا بات نہیں مانی میں نے تمہاری؟ وہ جو میں نے آرٹیفشل ٹانگ لگوانے کا کہا تھا۔"

"اوہ تو تم اس لیے خفا ہو؟" وہ کچھ نہیں بولی سر جھکا کر اس کے ہاتھ کی پشت پر ابھری نس کو انگلی سے چھیڑنے لگی۔

"بے وقوف ... اتنی سی بات پر اتنے آنسو بہا ڈالے پھر اس روز تم نے کہا تو نہیں تھا پوچھا تھا۔ نہیں تو اسی وقت لگوا لیتا۔" اس نے اتنے پیار سے کہا کہ وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"سمجھو لگ گئی۔" وہ مسکرایا تو اس نے پھر نظریں جھکا لیں۔

"اور کوئی بات؟" حمزہ نے اپنی نس پر حرکت کرتی اس کی انگلی پکڑ کر پوچھا تو وہ آہستہ سے بولی۔

"ایک اور بات....."

"کہو۔ ایک نہیں ہزار باتیں کہو، سب مانوں گا۔"

"منوانی نہیں پوچھنی ہے۔ ایک بات اور آپ وعدہ کریں سچ بتائیں گے۔" اس نے یونہی سر جھکائے ہوئے کہا تو کچھ دیر وہ خود ہی قیاس کرتا رہا پھر کہنے لگا۔

"میں نے پہلے کبھی تم سے کچھ غلط کہا ہے۔ جھوٹ بولا ہے۔ اگر تمہیں کہیں ایسا لگا ہو تو بتاؤ....."

"نہیں، آپ نے کبھی غلط بیانی نہیں کی۔ ابھی بھی سچ بتائیں آپ نے مجھے شادی سے پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا۔؟" اس نے ایک دم سے سوال کر کے اسے دیکھا تو ایک لحظہ کو اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

"بتائیں حمزہ۔ میں نہیں چاہتی مجھے کسی اور کی زبانی کوئی ایسی بات پتا چلے جسے سن کر میرا مر جانے کو دل چاہے۔"

"دیکھو صاعقہ میں تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا لیکن سچائی بیان کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ لہٰذا تم اس بات کو چھوڑ دو۔" حمزہ کے لہجے میں عاجزی تھی پھر بھی وہ اڑ گئی۔

"نہیں میں جاننا چاہتی ہوں کیونکہ مجھے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ میں آپ کی پسند ہوں اور آپ کی ضد تھی کہ شادی کریں گے تو مجھ سے ورنہ نہیں۔"

"یہ، یہ تم سے کس نے کہا؟" وہ حیران اور کچھ بوکھلایا بھی تھا۔

"خاص طور سے کسی نے نہیں۔ شادی والے روز کوئی کہہ رہا تھا۔" اس نے پنکی کا نام نہیں لیا پھر کہنے لگی۔ "ایسے ہی کسی روز میں کچھ اور بھی سن سکتی ہوں۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ خود۔" حمزہ

نے گہری سانس کھینچتے ہوئے بیڈ کی پر سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کیں تب وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جانے کیسی اذیت تھی جس کا تصور بھی وہ سہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ قریب تھا کہ وہ اپنی ضد اپنا سوال واپس لے کہ وہ بولنے لگا۔

"یہ چند سال پہلے کی بات ہے اس وقت میں مکمل تھا۔ زندگی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ مجھ پر مہربان تھی اور میں بجائے رب العزت کا شکر ادا کرنے کے اپنا حق سمجھتے ہوئے یاروں دوستوں کے ساتھ موج مستی میں وقت گزار رہا تھا۔ لڑکیاں مجھ پر مرتی تھیں لیکن میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا یہ نہیں تھا کہ میں بہت مغرور تھا بس میرا اپنا اسٹائل میری اپنی سوچ تھی۔ میں خواہ مخواہ لڑکیوں کے ساتھ فلرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں سوچتا بس جو اچھی لگے گی اس کے ساتھ سیریس ہو جاؤں گا اور پھر مجھے پنکی کی دوست رانیہ اچھی لگی۔ وہ بھی میری طرف مائل تھی اور ابھی ہماری ایک دو ملاقاتیں ہی ہوئی تھیں کہ ....." وہ جانے کس خیال سے کانپ گیا تھا۔ اس نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا لیکن بولی کچھ نہیں تو خاصی تاخیر سے وہ پھر گویا ہوا۔

"اس روز میں اپنے دوست کاشی کے ساتھ کہیں جا رہا تھا کہ دور سے بس اسٹاپ پر ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ کاشی نے بھی اسے دیکھا تھا۔ گہری سانولی رنگت پر سنہری بال۔ عجیب مضحکہ خیز لگ رہی تھی کہ ہم دونوں کے قہقہے ابل پڑے۔ اس کا ریکارڈ لگاتے ہوئے ہوئے ہم دونوں بے تحاشا ہنس رہے تھے تب اوپر والے کو شاید اپنی تخلیق کا مذاق اڑانا پسند نہیں آیا اور ہمارا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ کاشی تو موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا اور میں۔" اس کی شاید آواز ساتھ چھوڑ گئی اور وہ سناٹے میں آچکی تھی۔

"جانے کتنے دن میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا پھر ہوش میں آتے ہی میری نظروں میں اس لڑکی کا چہرہ سما گیا۔ میں آنکھیں بند کرتا یا کھولتا ہر طرف مجھے وہ ہی نظر آنے لگی اور میں احساس جرم میں مبتلا اپنا سکھ چین سب کھو بیٹھا۔ اللہ سے توبہ کرتا معافی مانگتا پھر بھی میرا دل مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران رانیہ نے مجھے بہت سہارا دینے کی کوشش کی لیکن میرا ضمیر مجھے بری کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ سوتے جاگتے وہ لڑکی یوں میرے حواسوں پر چھا گئی کہ مجھے لگتا زندگی بس صرف وہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اس دوران گھر والے میرے لیے کتنے پریشان رہے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب چاہتے تھے کہ میں آرٹیفشل ٹانگ لگوا لوں لیکن میں تیار نہیں ہوا کیونکہ اللہ کی بنائی صورت کا مذاق اڑا کر جو گناہ میں نے کیا اس کے مقابلے میں یہ سزا بہت کم تھی کہ میں ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ مجھے تو اس سے بڑی سزا۔"

"سزا....." چھناکے سے کچھ ٹوٹا تھا وہ ایک دم چیخ پڑی۔

"نہ ضرورت نہ چاہت۔ سزا؟" تو آپ نے مجھے اپنے لیے سزا کے طور پر منتخب کیا۔ میں سزا ہوں۔ میں آپ کے لیے سزا ہوں حمزہ!"

"وہ نہیں صاعقہ!" وہ ایک دم بہت پریشان ہو گیا۔

"کیا نہیں۔" وہ حواسوں میں نہیں رہی تھی۔

"ابھی آپ نے خود کہا کہ آپ اس سے بڑی سزا کے مستحق تھے۔ یوں آپ نے سوچا ہو گا کہ جس پر ہنسے تھے ساری زندگی اس کی صورت دیکھتے رہیں ایسا ہی ہے ناں۔" وہ کرب سے آنکھیں بند کر کے نفی میں سر ہلانے لگا۔

"لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ بری بھلی جیسی بھی ہوں اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دے سکتی۔ کہاں سزا بن کر نازل ہو جاؤں۔ نہیں۔"

"صاعقہ تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میری بات سنو۔" شدت جذبات سے حمزہ کی آواز پھٹ رہی تھی۔

"بس اب کچھ نہیں سننا مجھے۔" وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر تیزی سے کھڑی ہوئی تو بڑی زور کا چکر آیا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تو دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"صاعقہ۔" وہ اس کی طرح پھرتی سے نہیں اٹھ

سکتا تھا لیکن اٹھنے ضرور لگا تھا۔ "کیا ہوا صاعقہ؟"

وہ ان سنی کر کے آگے بڑھی پھر دروازے سے پلٹ کر بولی تھی۔

"آپ کی سزا ختم ہوئی حمزہ! وہ سزا جو آپ نے خود اپنے لیے تجویز کی تھی۔ میں جا رہی ہوں۔"

"صا۔۔" حمزہ کا اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہ گیا تھا۔



"اچھا ہوا تم آ گئیں۔" اماں خوش ہو کر اسے گلے لگا کر بولیں۔ "میں ابھی تمہیں فون کرنے والی تھی۔"

وہ اماں سے نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ معمول سے زیادہ صفائی نظر آ رہی تھی۔

"تمہاری ساس نے بھیجا ہو گا نا تمہیں۔" اماں اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہنے لگیں۔

"سمجھ دار عورت ہے۔ سوچا ہو گا بڑے لوگوں سے تم ڈھنگ سے بات کر سکو گی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں اماں کون بڑے لوگ؟" اس نے تنگ آ کر ٹوکا تو اماں متعجب ہوئیں۔

"ہیں! تمہیں نہیں پتا۔ تمہاری ساس نے شمائلہ کے لیے جو رشتہ بتایا تھا شام میں انہیں لے کر آ رہی ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ ہاں ذکر کیا تھا انہوں نے۔" اس نے بمشکل اپنی حیرت چھپائی تھی۔

"پھر تم بتاؤ چائے کے ساتھ ناشتے میں کیا کیا رکھیں۔" اماں کو اپنی خوشی میں اس کا اترا چہرہ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتا جو دل چاہے رکھ دیجیے گا۔" اس کے جھنجلانے پر اماں ٹھٹکی تھیں۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے میری۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ بھاری بھی ہو رہا ہے۔" وہ ضبط کرتے کرتے بھی رو پڑی۔

"ارے۔" اماں نے اسے لپٹا لیا۔ "تمہیں پہلے بتانا چاہیے۔ چلو لیٹ جاؤ، ادھر نہیں، آؤ ادھر آؤ۔ میں شمائلہ سے کہتی ہوں تمہیں موسمی کا جوس نکال دے۔" اماں اسے لٹانے تک بولتی جا رہی تھیں پھر شمائلہ کو دیکھا وہ اپنی خوب صورتی کو مزید چمکانے میں لگی ہوئی تھی۔

"اے بس کرو۔ دیکھو بن آئی ہے۔ ذرا اس کے لیے موسمی کا جوس نکال دو۔" اماں نے شمائلہ سے کہا تو اس سے پہلے وہ بول پڑی۔

"رہنے دیں اماں میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"چلو جب دل چاہے بتا دینا۔" شمائلہ نے جان چھڑائی تو اماں اسے سخت سست کہتے ہوئے خود ہی جوس نکالنے چلی گئیں اور وہ لحاف میں چھپ جانا چاہتی تھی تاکہ اپنی بدقسمتی کا ماتم کر سکے۔ اس نے حمزہ سے کہا تھا۔

"میں نہیں چاہتی مجھے کسی اور کی زبانی کوئی ایسی بات پتا چلے جسے سن کر میرا مر جانے کو دل چاہے۔" اور اس کا سچ مچ مر جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ لیکن یہ اپنے اختیار میں نہیں تھا اور اختیار تو آنسوؤں پر بھی نہیں رہا تھا جو آنکھوں کے کناروں سے نکل نکل کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اماں جوس لے کر آئیں تو اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں لیکن اماں نے زبردستی اسے اٹھا کر جوس پلایا۔

"بس اماں! اب میں سو رہی ہوں۔ مجھے مت اٹھائیے گا۔" اس نے پھر لیٹتے ہی لحاف سر تک کھینچ لیا تھا۔

پھر وہ یوں سوئی کہ مہمانوں کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اس کی آنکھ اماں کی آواز پر کھلی تھی جو اس کے سرہانے کھڑی جانے کس سے کہہ رہی تھیں۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی بتا رہی تھی سر بھی بھاری ہو رہا ہے۔ مجھے تو خوشخبری لگ رہی ہے۔"

"خوشخبری؟" اس نے بے اختیار منہ پر سے لحاف ہٹایا تو ماما کو کھڑے دیکھ کر سٹپٹا گئی۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا! تمہیں صبح بتانا چاہیے تھا میں اسی وقت تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی۔" ماما نے

اس کے گال پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ جزبز ہونے لگی۔
"چلو اٹھو فریش ہو جاؤ پھر ڈاکٹر کے ہوتے ہوئے گھر چلیں گے۔" ماما کو وہ منع نہیں کر سکی۔ سستی سے اٹھ کر واش روم چلی گئی اور جب منہ ہاتھ دھو کر نکلی تو کمرے میں صرف شمائلہ تھی۔
"ماما اکیلی آئی ہیں۔ میرا مطلب ہے دوسرے مہمان بھی تو آنے تھے۔" اس نے شمائلہ سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر بولی۔
"وہ بھی آئے تھے۔ پھر تمہاری طبیعت کا سن کر تمہاری ساس نے انہیں رخصت کر دیا۔"
"اور تمہارا کیا معاملہ رہا؟"
"پسند آگئی میں انہیں باقاعدہ منگنی کی تاریخ طے کر کے گئی ہیں۔" شمائلہ بہت خوش تھی۔ وہ اسے مبارک باد دے کر بالوں میں برش کرنے لگی۔
"تم واپس یہیں آؤ گی یا ساس کے ساتھ گھر چلی جاؤ گی۔" شمائلہ نے الماری کھولتے ہوئے پوچھا۔
"پتا نہیں۔" وہ برش رکھ کر کمرے سے نکلی تو ماما اسی کے لیے کھڑی تھیں۔ اماں سے اجازت لے کر اسے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے چل پڑیں۔ وہ ایک لحظہ کو اماں کے پاس رکی پھر ماما کے پیچھے آگئی۔
ماما نے پہلے گائنا کولوجسٹ سے اس کا چیک اپ کرایا تو اس نے انہیں دادی بننے کی خوشخبری سنائی۔
"نائس۔۔۔" ماما واقعی خوش ہو گئیں جبکہ وہ اندر سے خائف ہو چکی تھی کیونکہ اس کی اپنی زندگی کی ناؤ ڈول رہی تھی۔ بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ جب گاڑی گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوئی تب چونکنے کے ساتھ وہ پریشان ہو گئی۔
"ماما! مجھے اماں کے گھر جانا تھا۔"
"ارے پہلے حمزہ کو تو گڈ نیوز سناؤ۔ کتنا خوش ہو گا وہ۔ چلو۔" ماما نے اس کی طرف کا دروازہ کھول دیا تو ناچار اسے اترنا پڑا۔ خود کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے وہ ماما کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہی رک گئی تھی۔
"حمزہ! مبارک ہو۔ تم باپ بننے والے ہو اور میں دادی۔" ماما نے خوش ہو کر حمزہ کو بتایا تو اس نے ذرا سی پلکیں اٹھائیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش تھی کہ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی چلی آئی۔
"تم آرام کرو صاعقہ اور اپنی غذا اور دوا کا خیال رکھنا اور حمزہ! تمہیں بھی اس کا خیال کرنا ہے۔ چائے کافی بنانے کے لیے ملازم موجود ہیں۔ بار بار صاعقہ کو دوڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔" ماما ان دونوں کو ہدایات دینے کے ساتھ تنبیہہ کرتے ہوئے چلی گئیں تو وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔
"تم۔" حمزہ کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔
"آپ بہت برے ہیں۔" اس نے ایک دم ہاتھ نیچے گرا دیے۔ مجھے اپنی محبتوں کے حصار میں جکڑ کر کیا سمجھتے ہیں کہ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ رہ لوں گی میں آپ کے بغیر۔"
"لیکن میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ میرے لیے زندگی صرف تم ہو۔" حمزہ نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں میں منہ چھپا کر جذبات سے بوجھل آواز میں بولا۔
"زندگی صرف تم ہو۔ سنا تم نے بات تلافی کی۔ ہوتی تو میں تم سے معافی مانگ لیتا لیکن یہاں تو عالم یہ تھا کہ دل دھڑکتا ہی تمہارے نام سے تھا۔ تب میں نے رب سے تمہیں مانگا۔ جانتی ہو میں نے کیا کہا تھا۔ میں نے کہا تھا یا اللہ جب میری سزا کے دن تمام ہو جائیں تو جزا کی صورت مجھے صاعقہ عطا کرنا۔"
"آپ۔۔۔" اس نے حمزہ کے سینے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو وہ نیم مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا کر بولا تھا۔
"تم سزا نہیں جزا ہو۔"





یومِ کشمیر پر آزادی کے متوالوں کے نام

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لُٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجان
ان ہاتوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟
اے پوچھنے والے پردیسی!
یہ طفل و جواں
اُس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجان
جگ مگ جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

فیض احمد فیض

جو آج میرے پاس بڑی دیر تک رہا
وہ میرا غم شناس بڑی دیر تک رہا

چہرے پہ اپنے ہجر کی اک دھول تھی عیاں
یہ درد مجھ کو راس بڑی دیر تک رہا

وہ معتبر جہاں میں اس طرح سے ہوا
اس پر میرا لباس بڑی دیر تک رہا

اخبار میں نمایاں تھی شب خون کی خبر
پھر خوف اور ہراس بڑی دیر تک رہا

ڈالا گیا تھا دیس کے محسن کو قید میں
ہر شخص ہی اداس بڑی دیر تک رہا

بھولا نہیں میں اس سے بچھڑنے کا حادثہ
جو میرے آس پاس بڑی دیر تک رہا

عابد معروف

میں آرزوئے جاں لکھوں یا جانِ آرزو
تو ہی بتا دے ناز سے ایمانِ آرزو

آنسو نکل رہے ہیں تصور میں بن کے پھول
شاداب ہو رہا ہے گلستانِ آرزو

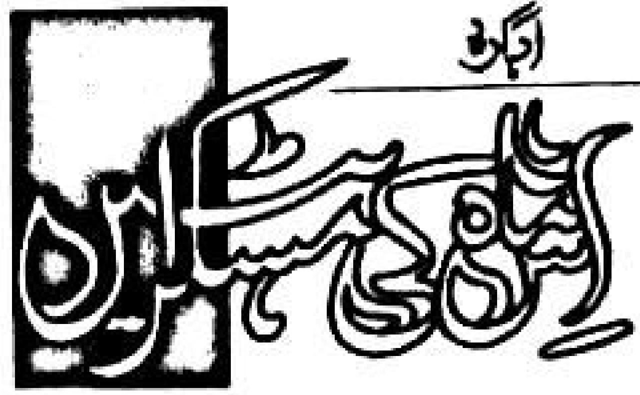
ایمان و جاں نثار تیری اک نگاہ پر
تو جانِ آرزو ہے، تو ایمانِ آرزو

اک وہ کہ آرزوؤں پہ جیتے ہیں عمر بھر
اک ہم کہ ہیں ابھی سے پشیمانِ آرزو

دل میں نشاطِ رفتہ کی دھندلی سی یاد ہے
یا شمع وصل ہے تہِ دامانِ آرزو

اختر کو زندگی کا بھروسا نہیں رہا
جب سے لٹا چکے سر و سامانِ آرزو

اختر شیرانی



شروعات

بیوی: آپ بہت بھولے ہیں۔ آپ کو کوئی بھی بیوقوف بنا سکتا ہے۔

شوہر: شروع تو تمہارے ابا نے ہی کیا تھا۔

علیشہ بیگ۔ کراچی

اظہار ہمدردی

ایک صاحب کوچ میں سوار ہوئے تو کنڈیکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔ "سر! کل آپ۔ کوچ سے اترنے کے بعد خیریت سے گھر پہنچ گئے تھے نا؟" "ہاں مگر تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟" ان صاحب نے حیرت سے کہا۔

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ کل ایک مسافر کوچ میں سوار ہوا تو آپ اسے اپنی سیٹ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے جبکہ اس وقت کوچ میں صرف آپ دو ہی مسافر تھے۔ باقی سب سیٹیں خالی پڑی تھیں۔" کنڈیکٹر نے آہستہ سے جواب دیا۔

ماریہ عمران۔ سکھر

آگہی

بیوی نے شوہر کا موبائل دیکھا تو فون بک میں لڑکیوں کے نمبر کچھ اس طرح سے محفوظ تھے۔

پڑوسن کی بچی
نئی بچی
پرانی بچی
سامنے والی بچی
اوپر والی بچی
کالج والی بچی

یہ دیکھ کر بیوی خوش ہوگئی اور دیکھنے کے لیے کہ میرا نمبر کس نام سے ہے بیوی نے اپنے نمبر سے جب کال ملائی تو اسکرین پر لکھا ہوا تھا "پاگل کی بچی"

فاکہہ سہیل۔ کراچی

لاجواب

فریدہ نے نسیمہ سے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کیا سوچ کر ان صاحب سے شادی کا فیصلہ کیا ہے وہ تو تمہارے مقابلے میں بڑی عمر کے ہیں۔ ان کے منہ میں دانت تک نہیں اور وہ گنجے بھی ہیں۔"

"یہ تو کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔" نسیمہ نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ تو پیدائش کے وقت بھی ایسے ہی تھے۔"

زینب خان۔ لاہور

دفاع

مقدمے کی سماعت آخری مراحل میں تھی۔ ملزم نے مطالبہ کردیا کہ وہ اپنے وکیل صفائی کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہے' اس لیے اسے وکیل تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔ جج صاحب بولے۔

"پولیس نے تمہیں ڈاکا ڈالتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔ دکان دار نے بھی تمہیں پہچان لیا ہے' زیورات بھی تمہارے قبضے سے برآمد ہوئے ہیں' اس کے علاوہ' تم آٹھ مرتبہ کے سزا یافتہ ہو' تمہارے خیال میں اب کوئی دوسرا وکیل تمہارے دفاع میں کیا کہہ سکتا ہے؟"

ملزم نے جواب دیا۔

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

یسریٰ قریشی۔ چکوال

قیمت

گاہک: اس ٹائی کی قیمت کیا ہے؟
دکان دار: "چالیس روپے۔"
گاہک: چالیس روپے میں تو جوتے کے دو جوڑے آجاتے ہیں۔"
دکان دار: مگر جناب جوتے آپ گلے میں نہیں لٹکا سکتے۔"

عائشہ ملک۔ خانیوال

انتقام

شادی کی پانچویں سالگرہ پر بیوی نے اپنے شوہر سے کہا۔
"ڈربے میں جو بڑا سا مرغا موجود ہے۔ اسے نکال کر ذبح کر دو تاکہ شادی کی سالگرہ کی خوشی میں اچھے کھانے پکائے جاسکیں۔"
شوہر نے سخت لہجے میں کہا۔ "پانچ سال پہلے جو کام ہوا تھا' اس کا انتقام تم اس بے چارے مرغے سے کیوں لینا چاہتی ہو؟"

ممتاز طارق۔ حیدر آباد

کشش

شریر طالب علم نے استاد سے استفسار کیا۔
"جناب عالی! عورت کی کشش اور زمین کی کشش میں کیا فرق ہے؟" "کچھ زیادہ نہیں" استاد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"دونوں ہی آدمی کو خاک میں ملا دیتی ہیں۔"
ارم فاطمہ۔ ٹھٹھہ

سوال

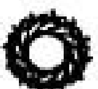
ایک ڈاکٹر اپنی مریضہ کا ذہن اس کے شروع ہونے والے آپریشن سے ہٹانے کے لیے اس سے مہنگائی پر گفتگو کر رہا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ اس کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے بیٹے کا میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا ہے تو اس پر کتنا مالی بوجھ بڑھ گیا ہے۔
آخر میں چلتے چلتے اس نے مریضہ سے کہا۔
"آپ سے کل آپریشن تھیٹر میں ملاقات ہوگی' آپ کوئی سوال پوچھنا چاہتی ہیں؟"
"میں کس چیز کے پیسے دے رہی ہوں۔ شادی کے یا ٹیوشن کے؟"

رابیل ابڑو۔ لاڑکانہ

پہلی بار

عابد کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس روز اس کی بیوی نے اسے دفتر فون کر کے بتایا تھا کہ آج وہ پہلی بار کھانا تیار کرے گی' لیکن جب عابد گھر پہنچا تو اس کی بیوی کچھ مایوسی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے' ہاتھ اور چہرہ مرچ مسالوں اور چکنائی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ مردہ سے لہجے میں اس نے بتایا کہ کھانے میں سلاد اور چٹنی کے سوا کچھ نہیں ہے۔
"لیکن تم نے تو بتایا تھا کہ تم دو تین ڈشیں تیار کرو گی اور گھر میں تمام سودا سلف موجود تھا؟" عابد نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں... ڈشیں تو میں نے تقریباً" تیار کر ہی لی تھیں۔" بیوی نے بتایا۔
"لیکن جب میں گوشت بھون رہی تھی تو بوٹیوں میں آگ لگ گئی۔ آگ بجھانے کے لیے میں نے انہیں چکن کے قورمے میں ڈبو دیا لیکن قورمہ سویٹ ڈش میں گر گیا اور سویٹ ڈش کا باؤل فرش پر گر کر ٹوٹ گیا۔ اس دوران چولہے کی آگ بھی بری طرح بھڑک اٹھی۔ اسے بجھانے کے لیے مجھے اس پر رائتہ ڈالنا پڑا۔"
ابھی بیوی کی داستانِ غم جاری تھی کہ عابد ہاتھ اٹھا کر بولا۔
"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... میں سلاد اور چٹنی کھا کر ہی گزارا کر لوں گا۔"

مریم... شریف آباد



خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

گڑیا شاہ ــــــــــ کہروڑ پکا

بے مقصد سب لوگ مسلسل بولتے رہتے ہیں
شہر میں دیکھو سناٹے کی دہشت کتنی ہے
لفظ تو سب کے ایک جیسے ہیں کیسے بات کھلے
دُنیا داری کتنی ہے اور چاہت کتنی ہے

سیّدہ نسبت زہرا ــــــــــ کہروڑ پکا

دل کے نازک آنگن میں کیسی پاگل لڑکی ہے وہ
ڈھیروں پھول کھلا لیتی ہے سُرخ گلابوں کے موسم میں

اقراٗ، ثمرہ ــــــــــ کراچی

یاد رہے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ثمرہ جاوید ــــــــــ بسم اللہ پور

ورق ورق پر تیری حقیقت
تیرا فسانہ تیری محبت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی
تیری ہی یادوں کے باب نکلے

رافیہ بتول ــــــــــ گھوٹکی

نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

زوباریہ خالد ــــــــــ لاہور

پھر اس کی یاد، پھر اس کی طلب پھر اس کی باتیں
اے دل تجھے لگتا ہے سکوں راس نہیں

صبا نوشاہی، مینا بخاری ــــــــــ ڈوگہ گجرات

جنوری کی سردیوں میں ایک آتش دان کے پاس
گھنٹوں تنہا بیٹھنا بجھتے شرارے دیکھنا
جب کبھی فرصت ملے تو گوشۂ تنہائی میں
یاد ماضی کے پرانے گوشوارے دیکھنا

حورین زینب ــــــــــ کہروڑ پکا

وہ زخم دے کے مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے
اب اس سے بڑھ کے طبیعت شناس کیا دے گا
وہ میرے اشک بجھائے گا کس طرح محسنؔ
سمندروں کو وہ صحرا کی پیاس کیا دے گا

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر ــــــــــ کراچی

رستہ کٹھن، دھوپ میں شدت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اس کو محبت بھی بہت تھی
پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

شبنم شمشاد ــــــــــ یزمان

کبھی آگئیں یوں ہی بے سبب
کبھی چھا گئیں یوں ہی روز و شب
کبھی شور میں کبھی چپ سی ہیں
یہ بارشیں بھی تم سی ہیں!

نخبہ اکرم ــــــــــ گاؤں گوبیکی

زرد موسم کے اُجال لمحوں میں
ہم رو پڑے یونہی ہنستے ہنستے
یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے
کہ تھک گئیں آنکھیں خواب بنتے بنتے

ثناء عبدالقیوم ــــــــــ بنکہ چیمہ

برف ایسی کہ پگھلتی نہیں پانی بن کر
پیاس ایسی کہ بجھاتے ہوئے تھک جاتا ہوں
اچھی لگتی نہیں اس درجہ شناسائی بھی
ہاتھ ہاتھوں سے ملاتے ہوئے تھک جاتا ہوں

کبریٰ عباسی ــــــــــ ہری پور

میں نے مہتاب کی کرنوں سے بچایا تھا جسے
دھوپ اوڑھے ہوئے پھرتا ہے وہ بازار میں

شگفتہ جاہ

یادگار کا نیٹ موبائل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کی عیادت فرمائی تو اس سے پوچھا۔

• تمہیں کس چیز کی خواہش ہے؟"

اس نے کہا۔ گندم کی روٹی کو جی چاہتا ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جس کے پاس گندم کی روٹی ہو، اپنے بھائی کے ہاں بھیج دے۔"

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب کسی کا مریض کسی چیز کی خواہش ظاہر کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اسے کھلا دے۔"

بازار کی تجاوزات،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک دن بازار سے گزرے دیکھا کہ لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ بولے۔

"کسی کو یہ اختیار نہیں ہے۔ مسلمانوں کے بازار نمازیوں کے مصلے کی طرح ہیں۔ جو لوگ آج آگے بڑھ گئے ہیں وہ کل اس کو چھوڑ دیں۔"

(کنز العمال۔ جلد 3۔ صفحہ 172)

اقوال حضرت علیؓ،

☆ زندگی اس کے لیے نہ گزارو جس کے لیے تم زندہ ہو بلکہ زندگی اس کے لیے گزارو جو تمہاری وجہ سے زندہ ہے۔

☆ حضرت علیؓ سے پوچھا گیا انسان سب سے برا کب بنتا ہے؟ آپؓ نے فرمایا۔ جب وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھنے لگے۔"

☆ جو شخص اپنے ہر کام کو پسند کرتا ہے اس کی عقل میں نقص آ جاتا ہے۔

☆ مجھے کنجوس آدمی پر تعجب ہوتا ہے جو زندگی تو مفلسوں کی طرح گزارتا ہے مگر آخرت میں حساب مالداروں والا دیتا ہے۔

سیدہ نوبا سجاد۔ کہروڑ پکا

امام غزالیؒ کہتے ہیں،

☆۔ بھوک سے پہلے کھانا مکروہ بھی ہے اور مذموم بھی۔

☆۔ کھانے میں عیب نہ نکالو، ناپسند ہو تو مت کھاؤ۔

☆۔ جو مہمان خود آجائے اس کے لیے تکلف نہ کرو اور جس کو خود بلاؤ اس کے لیے تکلف میں کچھ کمی نہ کرو۔

☆۔ مجلس کے اندر بیٹھ کر قریب تر لوگوں کی مزاج پرسی کرو۔ میزبان کو انتظار نہ کراؤ۔ وقت پر پہنچا کرو۔

☆۔ مہمان کے آگے کھانا رکھنے سے پہلے اہل وعیال کا حصہ نکال لو۔

حکایت سعدی،

ایک درویش ساری رات عبادت کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو دعا مانگی لیکن غیب سے آواز آئی کہ تیری دعا قبول نہ ہوگی۔ فضول وقت برباد نہ کر۔"

دوسری رات وہ پھر عبادت میں مصروف رہا اور صبح کے وقت پھر دعا مانگنے لگا۔ اس کے ایک مرید کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ اس کی دعا رد ہوگئی ہے وہ درویش کو عبادت میں مصروف دیکھ کر بولا۔

"جب آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کی دعا قبول نہ ہوگی تو کیوں مشقت اٹھاتے ہیں؟"

درویش کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے بولا۔ "تو ٹھیک

کہتا ہے لیکن میں کیا کروں کہ اس دروازے کے سوا کوئی اور دروازہ بھی تو نہیں ہے۔"

شیخ سعدیؒ نے اس حکایت کے ذریعے یہ بات بتائی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا نہیں اور عقل مند آدمی ہر حالت میں چاہے دعا قبول ہو یا نہیں، اللہ سے ہی مانگتا ہے۔

نصیحت،

• جس پر نصیحت اثر نہ کرے، وہ جان لے کہ میرا دل ایمان سے خالی ہے۔

(حضرت ابوبکر صدیق رضؓ)

• اہل بصیرت کے لیے ہر ایک نگاہ عبرت اور ہر ایک تجربے میں نصیحت ہے۔

(حضرت علیؓ)

• تو جتنی چاہے مجھے نصیحت کر، حبشی کی سیاہی کبھی دھونے سے دور نہیں ہوتی۔

(شیخ سعدیؒ)

• کسی کو ایسے فعل سے جو خود تیری ذات میں ہے، منع نہ کر جب تک کہ تو خود اس کو ترک نہ کر دے۔

(بقراط)

• مبارک ہیں وہ لوگ، جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔

(ثوبان ثوری)

عذرا ناصر۔ اقصیٰ ناصر۔ کراچی

درویش کی دعا،

بیان کیا جاتا ہے کہ زمانے کا ستایا ایک درویش ایک امیر کے دروازے پر گیا اور صدا لگائی۔ یہ امیر بہت کنجوس اور مغرور تھا۔ درویش کی صدا سن کر اس نے اسے خیرات کی جگہ جھڑکیاں دیں۔

اس امیر کے ہمسائے میں ایک غریب نابینا شخص رہتا تھا۔ درویش امیر کی ڈیوڑھی سے مایوس لوٹا تو نابینا نے اسے اپنا مہمان بنا لیا اور جو کچھ میسر تھا، درویش کے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ اخلاق اور مروت کی باتوں سے اس کا دل خوش کیا۔

درویش اس کے حسن سلوک سے بہت مسرور ہوا۔ ہاتھ اٹھا کر اس کی خیر و فلاح کے لیے دعا مانگی اور رخصت ہو گیا۔

نابینا شخص نے درویش کے ساتھ یہ اچھا سلوک لالچ کی وجہ سے نہیں بلکہ ترس کھا کر کیا تھا۔ ایک وقت کا کھانا کھلا دینا کوئی ایسی بڑی بات بھی نہ تھی۔ لیکن اللہ کو اس کی یہ نیکی پسند آئی۔ اس کے حق میں درویش کی دعا قبول ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی کے چند قطرے ٹپکے اور اس کی اندھی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو سب حیران ہوئے اور ذرا دیر میں درویش کی کرامت کا سارے شہر میں چرچا ہو گیا۔ یہ خبر اس کنجوس اور مغرور امیر نے سنی تو حسرت سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"افسوس! یہ شاہباز میرا تھا جو نابینا کے جال میں پھنس گیا۔ یہ دولت تو میرے لیے تھی جو اسے مل گئی۔"

ہمسائے نے یہ بات سنی تو کہا۔

"یہ شاہباز تجھے کس طرح مل سکتا تھا جو حریص چوہے کی طرح دانت نکوسے ہوئے ہے۔"

شیخ سعدیؒ نے اس حکایت میں یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو ہر وقت بھلائی پر آمادہ رہنا چاہیے۔ نہ جانے کب اور کس رنگ میں اللہ کی رحمت اس کے دروازے پر آ جائے۔ اگر اس کا رویہ درست نہ ہوا تو وہ فیض یاب نہ ہو سکے گا۔

کردار کی پہچان،

• تمہارا چال چلن اس بات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تم کس چیز کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔

• اگر میرے قلم سے نکلے ہوئے ایک فقرے یا میری زبان سے نکلے ہوئے ایک لفظ نے میرے دوست یا دشمن کے دل کو تسکین بخشی تو میرے لیے یہ دنیا بھر کی تمام نعمتوں سے افضل ہے۔

(مشہور انگریزی شاعر ملکاس)

سدرہ بتول۔ ملتان

دکھ،

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے، اسے

دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کر لیتا ہے۔ دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لیے نرم پڑ جاتا ہے پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بہ خوشی سرزد ہونے لگتے ہیں۔ دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتا ہے۔

(بانو قدسیہ)

عائشہ انصاری۔ حیدر آباد

رشتہ،

ہم کسی سے رشتہ جوڑتے ہیں تو اس کی نہ کوئی وجہ موجود ہوتی ہے مگر بعد میں وہ وجہ ختم ہو جاتی ہے اور صرف رشتہ رہ جاتا ہے۔

حمیرا نوشین۔ منڈی بہاؤ الدین

دور بھاگ،

قسمت کی بگڑ سے، جھگڑے اور مقدمہ بازی سے، بد همسایہ کے پڑوس سے، غیبت کرنے اور سننے سے، فحش ناولوں اور رسالوں سے، نشہ بازوں سے، بری صحبت سے۔

ممکن نہیں،

جیسی صحبت میں بیٹھے اور ویسا نہ بنے، ہر کام میں جلدی کرے اور نقصان نہ اٹھائے۔ ہمت اور استقلال کو شعار بنائے اور مراد کو نہ پہنچے، عورتوں کی صحبت میں بیٹھے اور رسوا نہ ہو، دوسروں کے جھگڑے میں پڑے اور پھر آفت میں نہ پھنسے، دنیا سے دل لگائے اور پشیمان نہ ہو، زیادہ باتیں کرے اور کوفت نہ اٹھائے۔

آتی ہے،

محنت و دیانت اور کفایت شعاری سے دولت، بے ادبی کرنے سے بد نصیبی، فضول خرچی سے مفلسی، بڑوں کی صحبت میں بیٹھنے سے عقل، غیبت کرنے اور سننے سے بیماری، مصیبت و تکلیف میں صبر کرنے اور شکوہ نہ کرنے سے راحت، یتیم بیوہ اور وقف کا مال ناحق کھانے سے بربادی۔

ظاہر مت کر،

کسی کا عیب، دل کا بھید، سفر کرنے کی سمت، اپنی تجارت کا فائدہ اور نقصان امانت کی بات، پوری طاقت، زیادہ ضرورت۔

عینی سحر۔ ہری پور

باتیں یاد رکھنے کی،

٭ کسی بڑی چیز کے حاصل ہو جانے سے چھوٹی چیز کو بھلا نہ دیں کیونکہ جہاں سوئی کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تلوار کام نہیں آتی۔

٭ تجربہ انسان کو غلط فیصلے سے بچاتا ہے مگر تجربہ غلط فیصلے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

٭ کوشش کیجیے جن کے ساتھ عمر گزارنے کا سودا طے کرنا ہو ان سے دل ملیں یا نہ ملیں، ذہن ضرور ملتے ہوں۔

عمارہ رفیق۔ فاضل پور

اچھا کام،

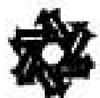
روزانہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو کہتا ہے اگر کوئی اچھا کام کرنا ہے تو کر لو کیونکہ آج کے بعد میں کبھی بھی پلٹ کر نہیں آؤں گا۔

مدیحہ نورین مہک۔ برنالی

انداز نظر،

ایک شخص کی کلہاڑی کھو گئی تو اس کے دل میں شک بیٹھ گیا کہ کلہاڑی پڑوسی کے بیٹے نے چرائی ہے۔ اس نے لڑکے کی چال کا بغور جائزہ لیا تو اس کی چال بالکل چوروں کی سی لگی۔ اس نے لڑکے کے چہرے کے تاثرات دیکھے۔ وہ بھی چوروں جیسے تھے۔ اس نے لڑکے کا انداز گفتگو دیکھا وہ بھی بالکل چوروں جیسا تھا۔ مدعا یہ کہ لڑکے کی ساری حرکات و سکنات چور ہونے کی چغلی کھاتی تھیں۔

لیکن ایک دن وہ کسی کام سے باہر نکلا تو راستے میں کلہاڑی پڑی مل گئی اور تب سے اسے لڑکے کی تمام حرکات و سکنات میں معصومیت نظر آنے لگی۔







خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں
اللہ تعالیٰ آپ کو ہم کو صحت و سلامتی کی بہترین حالت میں رکھے۔ آمین

پہلا خط بنگلہ صدر گوگیرہ ضلع اوکاڑہ سے فاطمہ اور خدیجہ کا ہے، لکھتی ہیں۔

ڈھم ڈھما ڈھم ڈھم۔ نہیں نہیں جناب یہ ڈھول کی نہیں بلکہ ہمارے دل کی آواز ہے۔ جو 3 جنوری کو رات 7 بجے میری سسٹر خدیجہ کے انکشاف پر نکلی تھی۔ انکشاف نہیں بلکہ بریکنگ نیوز اور وہ یہ تھی کہ اس دفعہ خط لکھ دو میں پوسٹ کروآؤں گی۔ دراصل بات کچھ یہ ہے کہ مابدولت پر توکب سے بازار میں "لورلور" (اکیلے) پھرنے پر پابندی عائد ہو چکی ہے۔ تو پھر سارے "غیر قانونی" کام کروانے کے لیے خدیجہ کے۔ "ترلے" کرنے پڑتے ہیں۔ اب جلدی خط پوسٹ کروانے کے لیے بستر بھی خود بچھانے پڑیں گے (کیونکہ یہ کام خدیجہ کے ذمہ ہے) چلو کوئی بات نہیں ضرورت کے وقت تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔ وہ تو پھر میری کیوٹ سی سسٹر ہے۔

یہاں پر ایک گزارش کرنی تھی کچھ ریڈر سسٹرز کو شکایت ہوتی ہے کہ رومانس کم ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ رسالے وغیرہ مڈل کلاس گھرانوں میں ہی زیادہ پڑھے جاتے ہیں اور ابھی تک بہت سے والدین رسالے پڑھنے پر معترض ہیں۔ میرے گھر میں بھی یہی سچویشن ہے۔ ہم ابھی تک پی ٹی وی کے ڈرامے دیکھتے ہیں۔ ہمارے گھر کیبل نہیں ہے۔ پچھلے دنوں ایک ڈرامے میں رومانٹک سین تھا۔ بھائی نے چینل بدل دیا۔ اگر ہمیں رومانس دیکھنا ہو تو میڈیا کم نہیں ہے۔ ہم صاف ستھرا ادب چاہتے ہیں۔ جو کچھ دیر کے لیے ٹینشن ریلیز کر سکے۔ اگلا ناول سمیرا حمید کا ہونا چاہیے۔

ایمل رضا اور سمیرا حمید کے لکھنے کا انداز ایک جیسا ہے۔ (میرے نزدیک) پر اس دفعہ ایمل کا افسانہ کچھ متاثر نہ کر سکا۔ (معذرت) صدف آصف کی کہانی کافی ڈفرنٹ تھی۔ ویلڈن صدف آصف جی۔ سروے کے سوالات دلچسپ تھے۔ مہناز یوسف کا تیسرے سوال کا جواب دلچسپ تھا۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے کہ بارے میں میرا خیال ہے کہ بہن "ن۔ف" سے معذرت کے ساتھ کہ ان کے ساتھ کوئی اتنا بھی ظلم نہیں ہوا اور نہ ہمارے معاشرے میں کیا کیا نہیں ہوتا۔ ان کے شوہر ان کے ساتھ تھے۔ ساس نندوں کو ان کے ساتھ کوئی ذاتی عناد نہیں تھا۔ بھئی، مجھے تو یہی لگا کہ انہوں نے اپنی خود ساختہ مظلومیت کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ میری دو سسٹرز بھی اسی طرح بہت بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم کا حصہ ہیں۔ ہمارا بھی جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ جس میں میرے دو بھائیوں کے خاندان اور ہماری فیملی رہتی ہے۔ معمولی شکایات تو پیدا ہو ہی جاتی ہیں۔ باقی اللہ کا شکر ہے یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔

میں اپنی طرف سے خط مکمل کر چکی تھی مگر جب رات کو خاک نشین پڑھا تو دل نے گواہی دی کہ محفل تو شفق

افتخار نے لوٹ لی ہے۔ زبردست 'امیزنگ' میں حسنی کی موت پر منال کے ساتھ روئی ہوں۔ میرا تکیہ میرے ان آنسوؤں کا گواہ ہے۔ ویسے اگر حسنی نہ مرتا تو بھی کہانی میں ایک تشنگی رہ جاتی تھی۔ ویلڈن شفق جی۔ فراز اینڈ میں کہاں سے ٹپک پڑا۔ پھر بھی یہ اس کی اعلا ظرفی تھی کہ زارا کے ساتھ کھڑا ہوا بٹ اگر وہ حسنی کے ساتھ مصطفیٰ کی جگہ دکھایا جاتا تو پھر زیادہ بہتر تھا۔ اچھا اب میں ایک تحفے کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔ یہ تحفہ جو کہ ایک دل کی صورت میں ہے۔ میری بہن خدیجہ کے نازک نازک ہاتھوں کا کمال ہے۔ اور اس نے ضروری تاکید کی ہے کہ اسے ریڈی میڈ نہ سمجھا جائے۔ یہ دل دنیا میں ہر اس انسان کے پاس ہے۔ جس سے خدیجہ پیار کرتی ہے۔

ج: پیاری فاطمہ! سدا خوش رہو اور خدیجہ کو ہماری طرف سے بہت بہت پیار۔ خدیجہ کی ہنرمندی کا شاہکار 'خدیجہ آپ کا دل' تو سیدھا ہمارے دل میں اتر گیا۔ بہت خوب صورت' بہت شاندار۔ فاطمہ نے تو صرف خط لکھا ہے آپ نے تو اپنا سونے جیسا دل ہی ہمیں دے دیا ہے۔ شکریہ۔ اور بھئی فاطمہ! پورا شعاع پڑھ کر تبصرہ کرنا تھا نا۔ یہ تو آپ نے عقل مندی کی کہ روئیں نہیں۔ آنسو بہت قیمتی ہوتے ہیں انہیں خوامخواہ لٹانا فضول خرچی ہے۔

اور یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں کہ آپ پر پابندی کیوں لگ گئی ہے؟

سیدہ نسبت زہرا نے کہروڑ پکا سے لکھا ہے

اتنے سال گزر گئے حیرت کی انتہا ہوتی ہے کہ وقت کیوں اتنی تیزی اور جلدی سے گزرتا ہے۔ پہلی شعاع کو پڑھتے بہت کچھ یاد آرہا ہے آپ نے اتنے اچھے انداز میں لکھا کہ "ایک عمر گزار کر بھی اس کی حقیقت نہیں کھلتی۔

گزری زندگی کا ہر ایک لمحہ میرے دل و دماغ کو جھنجوڑ رہا ہے کہ آخر میں نے کیا تو کیا؟ یہ سوال بے چین کررہا ہے۔ انسان اپنی طرف سے بہت کوشش کرتا ہے پھر بھی نجانے کتنے دکھ اور پچھتاوے رہ جاتے ہیں کہ کاش اس نے بہتر کرتے۔ بہرحال جو گزر گیا وہ گزر گیا۔

وہ سبق کتابوں میں درج تھا ہی نہیں
جو سکھایا ہمیں زمانے نے!!!

اب آتے ہیں رسالے کی طرف سروے' بہت اچھا رہا' مختلف خیال کے لوگوں کی رائے جان کر اچھا لگا' حرا قریشی لفظوں کے ذریعے حیران کررہی ہیں واہ واہ بہت خوب۔ نوال افضل آپ نے اتنا مختصر کیوں لکھا؟ آمنہ ولید ممتاز یوسف 'ملائکہ کوثر سب کو پڑھ کر اچھا لگا۔ بریکنگ نیوز بہت مختلف سب کی تھیں۔

رابعہ انعم نیوز اینکر کو پڑھا۔ شاہین رشید کے سوال بہت خوب پتا نہیں لوگوں کی زندگیاں' فیس بک' انٹرنیٹ پر ہی ختم جارہی ہیں۔ ہر چیز کا مثبت پہلو ہوتا ہے مگر پاکستانی عوام کچھ زیادہ ہی اس کے نشے میں گم ہے یہ سچ معلومات ملتی ہیں پر صرف باتوں' دوستی پر ٹائم ویسٹ کرنا ہی ہے ایک طرح۔!

"جب تجھ سے ناتا جوڑا (ب'ف کراچی)" سچ آپ کی باتیں پڑھ کر حقیقت کا ادراک ہوا' واقعی زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی امی سے بولا کہ آپ مجھے بتائیں' آپ کے لیے لکھتی ہوں۔ اس سلسلے میں 'امی ہاتھ نہیں آرہیں بس ہنستی ہیں۔ آج تو میں نے اتنا دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ میری خود کی ہوگئی ہوتی تو آج آپ کی منتیں ترلے نہ کررہی ہوتی۔ اب امی کا قہقہہ شاندار اور مزے کا ہے۔ ہاہاہا۔ امید پہ دنیا قائم۔ میری امی کبھی تو بتائیں گی۔ صبر آزما انتظار۔

ہماری امی اور بڑے بھائی نے ہمارے لیے بہت محنت کی ہے۔ اور آج ہم سب بہن بھائی تعلیم یافتہ ہیں۔ ادھر لڑکیوں کو پہلے پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ ہمیں دیکھتے ہوئے بہت ساری فیملیاں پڑھنے لگیں۔ پروردگار کا کرم کہ جینے کا طریقہ سکھایا اور مزید سیکھنے کی خواہش۔

میں PHD کرنے کے لیے اپریل میں باہر جارہی ہوں۔ پلیز میرے لیے دعا کیجئے گا۔ شعاع' خواتین کرن سے بہت کچھ سیکھا سلسلے وار ناول پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے شروع کیا اور ابھی ختم مزا نہیں آتا۔ (محبت ابر رحمت" سالار حسین اور آپی کی بے تکلفی اور باتیں پڑھ

کر مزا آیا) ویری گڈ حرا بتول باقی کہانیاں اور افسانے بھی ٹھیک لگے اب کے برس "بنت سحر محبت کو اپنے لفظوں میں پرونے کا قرینہ رکھتی ہیں ان کا طرز اسلوب اور منظر کشی بہت زبردست لگی۔ در ثمن (سرگودھا) آپ کہاں گم ہیں۔ ایک اچھی سی اسٹوری لے کر انٹری دوناں؟

فرحت اشتیاق منتظر ہیں آپ کو پڑھنے کے لیے۔ رنگوں، تتلیوں، پھولوں اور ساون پر باتیں کرتی راحت جبیں اپنے ہونے کا احساس دلائیں ناں۔

لبنیٰ جدون حقیقت سے روشناس کروانے والی بہترین لکھاری بس آخر میں۔

بارش کے مفہوم کو سمجھو ننھی ننھی بوندوں سے
مل کر اک دریا بن جاؤ، موسم ہے آزادی کا

ج: پیاری نسبت! آپ کے خط مختلف سلسلوں کے لیے آپ کا انتخاب ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس بار تو آپ کا خط ہمیں زیادہ ہی اچھا لگا ہے۔ بھئی اتنی بڑی خوش خبری جو ہے۔ ایک چھوٹے سے شہر کی باسی پی ایچ ڈی کرنے باہر جارہی ہے۔ خوشی کی تو بات ہے نا۔ بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔ آپ کی امی اور بڑے بھائی واقعی قابل تحسین ہیں جنہوں نے آپ سب بہن بھائیوں کو اعلا تعلیم دلائی۔

تبصرہ حسب معمول بہت اچھا ہے۔ فرحت اشتیاق، راحت جبیں، در ثمن اور لبنیٰ جدون تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

آمنہ ریاض چوہدری نے دو کھوبا گجرات سے لکھا ہے

سب سے پہلے جلدی جلدی "سیاہ حاشیہ" پڑھی کیونکہ پیپر بھی تیار کرنا تھا۔ بینش پر بہت غصہ آتا ہے مجھے۔ اس کے بعد "ایک تھی مثال" پڑھی۔ مثال بالکل پاگل لڑکی ہے جو واثق پر غصہ اور شک کررہی ہے۔ پھر اپنی اور دوست مریم بٹ کی فیورٹ "رقص بسمل" پڑھی۔ کہانی پڑھنے کا مزا تب آیا جب تیمور کے گھر ماورا کا استقبال ہوا۔ پھر "تجھ سے ناتا جوڑا ہے" پڑھا۔ میری بہن کو میری طرف سے سیلوٹ۔ آپی اگر میں نے کوئی ناول منگوانا ہو یا ڈائجسٹ لگوانا ہو تو پیسے کیسے بھیجوں؟

پیاری آمنہ! ایک پرچے کو ایک سال تک گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے آپ 720 روپے اس ایڈریس پر منی آرڈر کردیں۔

خواتین ڈائجسٹ 37 اردو بازار کراچی

کتاب منگوانے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ آپ کتاب کی قیمت اس ایڈریس پر منی آرڈر کردیں۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی۔

نوال گوندل نے صوفی ٹی سے لکھا ہے

ہمارے علاقے میں ان دنوں بہت سردی ہے اور میں رضائی میں دبک کر رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ جو مزہ ہاتھ میں پکڑ کر پڑھنے کا ہے، وہ لیپ ٹاپ پر پڑھنے میں کہاں۔ "رقص بسمل" تو اب بہت ہی تھک گیا۔ اللہ تعالیٰ آپی کی پریشانی دور کرے۔ ناول خاک نشین "شفق افتخار" نے بہت اچھا لکھا۔ علی حسنین بے چارے کو مروا دیا عباس نے نام سے یہ کوئی نئی رائٹر لگیں۔ کیا مہوش افتخار کی بہن ہیں۔ انداز ملتا جلتا ہے۔ اس بار ناولٹ دو ہی تھے بلکہ ایک ہی صدف آصف کا۔ کیوں کے دوسرا تو سلسلے وار ہے نا، ہمارا پیارا "سیاہ حاشیہ" صدف کا بھی دل نہیں توڑتی۔ بہت اچھا لکھا انہوں نے اور ہاں یہ مصباح علی کو کہنا تھا کرن میں تو ناول لکھ لکھ کر بہت جھنڈے گاڑ لیے ہیں۔ ہمیں افسانے پر ہی ٹرخا دیتی ہیں۔

ج: پیاری نوال! مصباح علی واقعی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ ہم نے ان سے کہا ہے، شعاع کے لیے مکمل ناول لکھیں۔ انہوں نے شعاع کے لیے ایک طویل ناول لکھا ہے جو کئی اقساط پر مشتمل ہے لیکن اس کی اشاعت کے لیے انتظار کرنا پڑے گا۔ شفق افتخار نئی مصنفہ ہیں ان کا مہوش افتخار سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔

سلمیٰ زبیر لاہور سے لکھتی ہیں

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت خوب صورت تھا پھر حمد و نعت پڑھ کے دل کو سرور حاصل ہوا۔ پیاری باتیں پڑھ کے بہت سی معلومات میں اضافہ ہوا۔ انعم فیاض اور رابعہ انعم سے انٹرویو اچھا رہا۔ "تم کو چاہ کے بھی" بہت اچھا تھا، پڑھ کے مزہ آیا۔ "سیاہ حاشیہ" کی تو بات ہی مت کریں، ہر شمارے میں بہت خوب صورت کہانی ہوتی ہے۔ افسانے تمام زبردست اور سبق آموز تھے۔

ج۔ پیاری سلمیٰ! کہانی پڑھے بغیر کچھ کہنا مشکل ہے، بلکہ بعض اوقات تو پڑھ کے بھی کچھ کہنا مشکل ہوتا ہے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ جب ہم کسی کہانی پر کچھ نہ کہیں تو وہ خود ہی سمجھ جایا کریں کہ ہم دیگر قارئین پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتے۔ آپ کو شعاع پسند آیا یہ جان کے ہمیں بھی مزہ آیا۔

نمرہ ہاشمی کنڈیاں سے لکھتی ہیں

خواتین' شعاع چھ سال سے پڑھ رہی ہوں مگر خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ پلیز نظر انداز نہیں کرنا' ورنہ آپ کی ایک بہت پیاری معصوم سی قاری بہن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ مجھے نک نیم سے کوئی نہیں پکارتا' تو آپ سے ریکویسٹ ہے کہ پلیز مجھے نک نیم سے بلایئے گا۔ دیکھتے ہیں اپنی نئی بہن کے لیے کیا نام منتخب کریں گی۔ آپ.... میں چار بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن ہوں۔ شادی شدہ نہیں ہوں مگر منگنی شدہ ہوں اور میری منگیتر میرے ماموں کے بیٹے ہیں۔ میرے ننھیال میں سے صرف میری امی کو بہت شوق ہے رسالے پڑھنے کا' وہ بارہ سال کی تھیں جب سے رسالے پڑھنا شروع کیا اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ میرے نانا جی اور نانی امی نے کبھی مخالفت نہیں کی ان کی' ہمارے ددھیال میں تو رسالے پڑھنے کا جنون ہے' جسے دیکھو ہاتھ میں خواتین' شعاع میرے ابو اور بھائیوں کو بھی بہت شوق ہے۔ شعاع کے سب ہی سلسلے اچھے ہیں مگر "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" میرا پسندیدہ سلسلہ ہے مگر افسوس میں اس میں شرکت کے قابل نہیں ہوں۔ ان شاء اللہ اگلے سال اس میں شرکت کروں گی' کیونکہ اگلے سال شادی متوقع ہے۔ اصل میں ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی کم عمری میں شادی کرنے کا رواج ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اپنے پیارے گھر اور گھر والوں کو چھوڑنے کے ساتھ ساتھ پیارے شعاع کا ساتھ بھی چھوٹ جائے گا' کیونکہ ماموں لوگوں کی نظر میں رسالے پڑھنا برا کام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے دماغ خراب ہوتا ہے۔ اکثر میری بے عزتی بھی کردیتے ہیں اسی وجہ سے۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ لڑکیوں کی تربیت میں ماؤں کے بعد شعاع' خواتین کا ہاتھ ہے۔ آخر میں شاہین رشید صاحبہ سے فرمائش ہے کہ فہد مصطفیٰ کا انٹرویو شائع کریں پلیز....

ج ۔ پیاری نمرہ! آپ نے لکھا کہ خط شائع نہ ہوا تو دل شیشے کی طرح کرچی کرچی ہوجائے گا' بھئی اتنی پتھر دل دنیا میں کانچ کے دل کا کیا کام.... ؟ دل کو مضبوط بنائیں۔

پیاری ثمر! آپ کی فرمائش پر آپ کو ثمر نام دیا ہے' ویسے آپ کا نام تو بہت پیارا ہے' آپ کو نک نیم کی کیا ضرورت ہے۔ ہونے والی سسرال کے خیالات جان کر دل افسردہ ہوا لیکن آپ پریشان نہ ہوں اگر وہ ایک دفعہ ہمارے رسالے پڑھ لیں گے تو ان کی رائے بدل جائے گی اور پھر وہ آپ کو خود شعاع لا کر دیں گے۔ مگر آپ پہلے ان کا دل جیتنے کی کوشش کریں' پھر اپنی بات منوائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ شعاع پڑھ کر وہ آپ کی عزت اور قدر بھی کریں گے۔

شاہین رشید تک آپ کی فرمائش پہنچائی جارہی ہے۔

عظمیٰ شفیق جڑانوالہ سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے "سیاہ حاشیہ" پڑھا جو کہ پورے رسالے کی جان ہے۔ زبردست جارہا ہے۔ شفیق افتخار کا ناول متاثر کن نہ تھا۔ "ابر رحمت" بس سو سو تھا۔ مصباح علی کا افسانہ امیزنگ تھا۔ صرف لکھنے پہ اتنی تذلیل۔ شازیہ جمال کا افسانہ عمدہ تحریر تھی ایمل رضا بلاشبہ کمال رائٹر ہیں مگر اس دفعہ مزہ نہیں آیا۔ نمبرون افسانہ تسنیم شریف کا تھا۔ اس کہانی پہ تو پورا ناول ہونا چاہیے تھا۔ "ایک تھی مثال" بورنگ لگنے لگا ہے۔ صدف آصف کا ناولٹ ویسے تو اچھی تحریر تھی لیکن بیس سال کی اجیہ کا پرانے کپڑے جمع کرنا پھر ان کی مرمت کرنا اور پھر غریبوں میں جاکے تقسیم کرنا بالکل ہضم نہ ہوا۔ "ناتا جوڑا ہے" میں حصہ لینے والی بہن کا پورا نام کیوں نہیں ہوتا۔

ج ۔ عظمیٰ! ہر ماہ خط لکھنے والی قاری بہنوں کا خط پانچ' چھ ماہ موصول نہ ہو تو ہمیں تشویش ہونے لگتی ہے۔ دو تین مہینوں کی غیر حاضری کو تو ہم مصروفیت کا شاخسانہ قرار دیتے ہیں مگر اب پتا چلا کہ یہ مصروفیت نہیں ناراضی ہے۔

پتا ہے ہماری ردی کی ٹوکری نے سخت احتجاج کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے وہ ردی کی ٹوکری ہے منی نہیں جسے یوں بدنام کیا جارہا ہے۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" ہے میں بہنوں کا پورا نام اس لیے شائع نہیں ہوتا کہ بہرحال انہیں اسی گھر میں رہنا ہے۔

آسیہ ارم نے ملیر کراچی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

"تجھ سے ناتا جوڑا ہے" پر پہنچی۔ کراچی سے ن ف کی آپ بیتی اچھی تھی۔ پتا نہیں جنہیں اتنا ڈرتی کیوں ہیں جس

دن میرے حوصلے نے قلم کا ساتھ دیا تو میں اپنے پورے نام کے ساتھ جلوہ گر ہوں گی۔ "خط آپ کے" میں ربیعہ حسین (کراچی) کا خط پسند بھی آیا مگر ربیعہ آپ شاید مصنفہ کی تحریریں پڑھتی ہیں' صرف' کرداروں پر غور نہیں کرتیں' جیسے آپ بینش کو صحیح (پرفیکٹ) کہہ رہی ہیں اور بڑی اماں اور ان کی اولاد کو غلط' تو میں آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں کہ بینش ایک احساس کمتری میں مبتلا خود غرض پرسنالٹی ہے اور بڑے ابا کو غلط گائیڈ کرکے تیمور' ڈیزی اور طیبہ کو ڈانٹ پڑواتی رہی ہے۔ اگر ربیعہ جی آپ کے ساتھ بھی کوئی خوامخواہ مقابلے بازی کرے گا تو آپ کیا کہیں گی۔ ہاں آپ نے یہ صحیح کہا کہ تیمور کو بالکل ہی ماورائی مخلوق دکھایا گیا ہے۔ بہن کے حوالے سے بھی اور ماورا کے حوالے سے بھی۔ میں تو بہت عرصے سے کہہ رہی ہوں کہ اگر نبیلہ کی کوئی سیریس مجبوری ہے تو پلیز اس کا اینڈ کیے بغیر ہی اسے بند کردیں' ورنہ نبیلہ کا امیج خراب ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ کا ربیعہ کی تنقید کا جواب پسند نہیں آیا۔ آپ تو کم از کم یہ نہیں کہیں۔ بینش کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ شازیہ جمال کا "محرومی" بہت اچھا افسانہ تھا ایمل رضا کی "سورج کے پار" ایک اچھی اور منفرد اسٹوری تھی۔ "ہم کو چاہ کے" بس ٹھیک ہی تھی۔ کافی جگہ پر جھول رہ گیا۔ کیا سرفراز اتنا فارغ بندہ تھا کہ سب کام دھندے چھوڑ کر اپنی ماں کے ساتھ اتنے مہینے ننھیال میں اپنا گوہر مقصود ڈھونڈتا رہا' وہ بھی بھیس بدل کر۔ یہ بات ہضم نہیں ہوتی۔ مصباح علی نے بہت اچھا افسانہ لکھا۔ واقعی آج بھی ایسے لوگ ہیں جو ایسی سوچ کے حامل ہیں۔ صائمہ اکرام کا موسٹ فیورٹ "سیاہ حاشیہ" پڑھا۔ اس بار

آپ نے عدینہ کو کچھ عجیب حرکتیں کرتے نہیں دکھایا مطلب ابھی اوریدا نے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا اور عدینہ اس کے قدموں میں بچھنے کو تیار ہوئی۔ اس کا سامان بھی خود سیٹ کر رہی ہے' جبکہ عدینہ ایک ریزرو پرسنالٹی ہے۔ باقی تمام اسٹوری ہمیشہ کی طرح سپرڈوپر رہی' آپ نے اپنی تحریر کے ساتھ ہمیشہ انصاف کیا ہے۔ میری بھانجی کی شادی ہے' مصروفیت زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں دے رہی' کیونکہ میرے میکے اور سسرال میں اگر ایک پتا اضافی بھی ہل جائے تو مجھے طلب کرلیا جاتا ہے۔ اس بات سے اندازہ لگالیں کہ ایک پیر گھر میں اور ایک میکے میں ہے کہ جن بہن

کی بیٹی کی شادی ہے' وہ بیوہ ہیں اور امی کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔ شادی میں ہار ڈالنے ہیں یا گجرے پکڑانے ہیں سے لے کر بھائی پوچھتے ہیں کہ میٹھے میں گاجر کا حلوہ ہو یا گلاب جامن۔ ایک بھائی دوسرے سے پوچھتا ہے کہ عاشی کو بتادیا کہ کھانے والے کی بکنگ کروادی ہے تو دوسرے کا فون آتا ہے کہ باقی سارے معاملات صحیح جارہے ہیں نا۔ (پیار سے سب مجھے گھر میں عاشی کہتے ہیں۔) اللہ کا شکر ہے ان محبتوں کا۔

ارے آپ غلط سمجھ رہی ہیں' میں پانچ بہن بھائی میں بڑی نہیں ہوں۔ دو مجھ سے بڑے اور دو مجھ سے چھوٹے بہن بھائی ہیں مگر کیونکہ ان سب کو آپس میں ملائے رکھنے والی میں وہ کڑی ہوں جو سب کے لیے مضبوط سہارا ہوں۔ صرف میکے میں یہ حال نہیں ہے۔ سسرال میں بھی الحمدللہ یہ ہی حال ہے۔ کوئی بھی فرد ہو سب کو بہت محبت سے باندھ کر رکھتی ہوں۔

ج - پیاری آسیہ! اللہ تعالیٰ آپ سے محبت کرنے والوں کو سلامت رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ دوسروں کی خوشیوں' غموں میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کا خیال رکھتے ہیں' ان سے اپنے تو کیا غیر بھی محبت کرتے ہیں' خوشی کی بات ہے کہ آپ کو سسرال بھی قدردان ملی ہے۔

آپ نے اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر خط لکھا۔ بہت شکریہ۔ تنقید و تعریف مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔ بینش کے لیے ہم نے جو لکھا' اس کا مفہوم یہ نہیں تھا کہ بینش صحیح کر رہی ہے' بلکہ مطلب یہ تھا کہ بینش کو محبت سے محرومی نے منتقم مزاج بنادیا ہے۔

"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" اس سلسلے میں شرکت کرنے والی قارئین ہمیں اپنا پورا نام لکھ کر بھیجتی ہیں لیکن

ہم احتیاط کے پیش نظر شائع نہیں کرتے ہیں' کیونکہ ہمارا مقصد کسی کے گھر میں آگ لگانا یا کسی کی تضحیک کرنا نہیں ہے' بلکہ گھروں کے ان مسائل کو سامنے لانا ہے جنہوں نے بہت سی لڑکیوں کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔

ثوبیہ نور نے کشن گڑھ بھاول نگر سے لکھا ہے

اس دفعہ شعاع اچانک 30 دسمبر کو مل گیا۔ غیر متوقع طور پر حالانکہ 29 کو ہی دکان والا کہہ رہا تھا کہ 2 جنوری کو آئے گا۔ اچانک ملنے کی خوشی بھی بہت

ہوئی۔ "خاک نشین" سو سو تھی۔ حسنی اور منال کی محبت قطعی غیر ضروری اور مجھے تو غیر اخلاقی بھی لگی۔ دوست کی منکوحہ سے محبت' وہ بھی نکاح کے بعد۔ پہلے کی بات ہوتی تو کچھ بات بھی تھی اور بالکل افسانوی طریقے سے آخر میں فراز صاحب بھی آکھڑے ہوئے۔ خون جگر دے کر بہر حال مجرم کیفر انجام تک پہنچ گئے۔ سو دن چور کے تو..... ایمل رضا نے حسب معمول اچھا لکھا۔ نیا اور بہترین افسانہ۔ خوش آمدید ایمل رضا۔ "تم کو چاہ کے" بس ٹھیک ہی تھی۔ اس طرح کا ڈراما شاید ہی حقیقت میں کوئی کرتا ہو گا۔

بند ہوتی کتابوں میں تتلیاں ڈال دیں
یہ کس نے رسموں کی آگ میں لڑکیاں ڈال دیں

اور بھئی فائزہ چندا کو کہیں سے ڈھونڈیں۔ کرن کے قارئین انہیں زیادہ عزیز ہیں؟ خیر کوششیں تو جاری ہیں کہ ہم ہی چلو کرن کے قاری بھی بن جائیں۔ حالانکہ سمیرا باجی کہہ رہی ہیں "میری شادی کے بعد تم لوگوں سے یہ دونوں بھی نہیں منگوائے جانے' کنجوسو!" جنوری کے اینڈ تک ان کی شادی متوقع ہے۔

ج - پیاری ثوبیہ! فائزہ افتخار تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ اپنی سمیرا باجی کو ہماری طرف سے شادی کی مبارک باد دیں۔ اللہ تعالٰی انہیں بہت ساری خوشیوں سے نوازے۔ (آمین) اور ہاں بھئی' ہمت کرکے رسالے آپ کو خود منگوانا پڑیں گے۔ ہارون آباد سے تو آپ کی سمیرا باجی نے نہیں بھیجنے۔

جمبر خورد ضلع پتوکی سے ثناء خان نے لکھا ہے

حسب معمول سارے سلسلے ذوق و شوق سے پڑھے' پھر صدف آصف کا ناولٹ "تم کو چاہ کے" نہایت خوب صورت اور ہلکی پھلکی تحریر پڑھ کر مزہ آگیا اور صدف آصف کی یہ نصیحت "ایش! رشتے ہمیشہ وہیں جوڑنے چاہئیں جہاں محبت کے ساتھ عزت بھی ملے۔ زندگی تو بہت سادہ ہوتی ہے مگر ہماری خواہشیں اسے پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔" ویل ڈن! صدف آصف۔ "سیاہ حاشیہ" بہت ہی عمدہ تحریر۔ "ایک تھی مثال" اور "رقص بسمل" اب ختم ہو جانے چاہئیں۔ شفق افتخار کا "خاک نشین" میں حسنی کی موت اور زارا کے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی نے اداسی اور افسردگی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ حرا بتول کا "ابر رحمت" بھی بہت اچھا لگا۔ اس ماہ کے شعاع میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو پسند نہ آئی ہو۔ میں نے ایم اے اردو اور ایم اے ایجوکیشن کیا ہوا ہے۔ کتابوں سے عشق ہے۔ کھانے کے لیے کچھ نہ ملے لیکن پڑھنے کے لیے کتاب مل جائے۔

ج - پیاری ثناء! آپ کی کتاب سے محبت تو اسی سے ظاہر ہے کہ آپ نے دو سبجیکٹس میں ماسٹرز کیا ہوا ہے۔ بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ نے گاؤں میں رہتے ہوئے اعلا تعلیم حاصل کی۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

عظمی اظہر خان نے کراچی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

اگر مکمل ناول کو صفحے کے ایک جانب لکھا جائے تو خاصے صفحات درکار ہوں گے' تو کیا پھر بھی اس بنڈل کو ایک لفافے میں بھیجا جائے؟ اصل میں' میں نے بھی ایک ناول لکھا ہے اور پچھلے تین' چار سال سے لکھا پڑا ہے میرے پاس مگر میں بھیجنے کی ہمت نہیں کر پا رہی۔

ج - عظمی! آپ تو کراچی میں رہتی ہیں۔ آپ ناول کسی کے ذریعے بھجوا سکتی ہیں اور خود بھی پہنچا سکتی ہیں۔ اگر صفحات بہت زیادہ ہیں اور ڈاک سے بھجوانا چاہتی ہیں تو دو لفافوں میں بھی بھیج سکتی ہیں۔

عائشہ نے نیو مری (سوراسی) سے شرکت کی' لکھتی ہیں

جب نو کلاس میں تھی تو میری بڑی بہن میری اردو کی ریڈنگ ٹھیک کروانے کے لیے ڈائجسٹ پڑھوایا کرتی تھی' خوب مار مار کے' بہر حال وہ مار بھی بے کار نہ گئی' آج میں ایک ٹیچر ہوں' آپ کے اور میرے پیارے شہر کی' کراچی یونی ورسٹی سے بوٹنی میں ماسٹرز کیا اور اپنے ساتھ کے گاؤں میں 14 اسکیل کی سائنس ٹیچر ہوں۔ ڈائجسٹ رائٹرز کا اسلامک ٹرینڈ بہت بہترین لگا' بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔

آپ کے ساتھ ایک بات شیئر کرنا چاہوں گی' بہت سی لڑکیوں کی طرح ہمارے گھر میں بھی ابو کی طرف سے ڈائجسٹ پڑھنے پر سختی تھی' جواب خود ہی ختم ہو گئی۔ اس کی وجہ جو میں نے دریافت کی' وہ یہ کہ ایک دن میں نے کچھ مردانہ قسم کے ڈائجسٹ لیے ریڈھے سے اور جب وہ پڑھے تو کانوں سے بھی دھواں نکلا۔ بہت بے باک' بہت

فضول' تب مجھے ابو کی بات سمجھ میں آئی' سوچا اگر وہ یہ پڑھتے رہے ہیں تو وہ اپنی جگہ ٹھیک سوچتے ہیں مگر ہمارے ڈائجسٹ کو کوئی عالم پڑھ لے تو بھی کچھ سبق ہی سیکھے گا۔

ج ۔ پیاری عائشہ! آپ نے باٹنی میں ماسٹرز کیا' اب اپنے گاؤں میں علم کی روشنی پھیلا رہی ہیں۔ زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ گاؤں میں ہی جاب کر رہی ہیں' جبکہ دیہی علاقوں کے بہت سے طالب علم میڈیکل کی تعلیم حاصل کرکے بڑے شہروں میں جاب کرتے ہیں اور ان کے گاؤں طبی سہولیات سے محروم رہتے ہیں۔

آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی۔ اب آئندہ باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔ آپ تو دوسری کلاس سے ہمارے پرچے کی قاری ہیں۔

نور عبدالسلام نے نواب شاہ سے لکھا ہے

شعاع کا سب سے بیسٹ سلسلہ "جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" مجھے بہت پسند ہے۔ پر اس میں شامل ہونے کے لیے بہت زیادہ ہمت چاہیے جو دیکھتے ہیں کب تک آتی ہے۔ شعاع کے سب ہی سلسلے بہت اچھے جا رہے ہیں۔

ج ۔ نور عبدالسلام! اگر اپنے سے لکھنے کی ہمت نہیں کر پا رہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ آپ کسی بھی فرضی نام سے لکھ سکتی ہیں۔ مقصد تو اپنا تجربہ دوسروں تک پہنچانا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

منزہ عطا کوٹ ادو سے شریک محفل ہیں

ہم چودہ سال سے شعاع کی خاموش قاری ہیں۔

"رقص بسمل" یہ ناول بہت اچھا ہے۔ نبیلہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں' میری تو جان ہے یہ۔ شفق افتخار آپ نے تو کمال کر دیا۔ اتنا اچھا ناول لکھا۔ صائمہ جی! آپ کا ناول "سیاہ حاشیہ" یہ ناول بھی بیسٹ جائے گا' بہت اچھا ناول ہے۔ میں آپ کو مزے کی بات بتاؤں' ہم سب کزن

آٹھ رسالے پڑھتی ہیں ہم سب نے رسالے تقسیم کیے ہوئے ہیں' ایک ایک رسالہ سب کزن لیتی ہیں۔ بات ہے' سب سے پہلے پیاری خالہ زہرا' صاعقہ' نجمہ زونیرا' حنا' رانی' عاصمہ' مدیحہ میری بہن عاصمہ اور مدیحہ یہ دونوں مفت خوریاں ہیں۔ ثوبیہ اور میں خود منزہ۔

ج ۔ منزہ! آپ تمام لوگوں کا شکریہ۔ دیکھیے اتفاق میں کتنی برکت ہے۔ آپ امداد باہمی کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہر ماہ سب رسالے پڑھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا یہ اتفاق و محبت ہمیشہ قائم رکھے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بشریٰ عباسی نے ہری پور گاؤں ڈاک خانہ کالنجر سے لکھا ہے

شعاع میں مسلسل دو ماہ سے خط بھیج رہی ہوں مگر میرے خط شائع ہونے کا نام نہیں لے رہے۔ ہمیشہ کی طرح "سیاہ حاشیہ" نے ٹاپ کیا۔ بہترین کہانی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ افسانے بھی بہت پسند آئے۔ "ایک تھی مثال" ہماری موسٹ فیورٹ رائٹر نے کیا اسٹوری لکھی ہے۔ "رقص بسمل" بھی بہت عمدہ کہانی ہے۔

ج ۔ پیاری بشریٰ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ دو ماہ سے آپ مسلسل خط لکھ رہی ہیں اور آپ کے خط شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ اگر آپ جلدی خط لکھیں تو شامل ہو سکتے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

عائشہ علیم الدین نے اورنگی ٹاؤن کراچی سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

حرا بتول کا "ابر رحمت" نام ہی کی طرح خوب صورت ناول' تمام ناول اور ناولٹ بہت ہی اچھے اور زبردست تھے۔ افسانوں میں سب سے اچھا "سورج کے پار" لگا۔ "سیاہ حاشیہ" میرا فیورٹ ہے۔ "تاریخ کے جھروکوں" کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ اس سلسلے میں چنگیز خان اور ہلاکو خان کا بھی قصہ شامل کریں پلیز۔ ایک درخواست اور ہے شازیہ چوہدری کا ناولٹ "آنچل میں جگنو" دوبارہ شائع کریں۔

ج ۔ پیاری عائشہ! آپ کے شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے شکر گزار ہیں۔ کوشش کریں گے کہ آپ کی فرمائش کو پورا کر سکیں۔

افشاں علی نے کراچی سے لکھا ہے

پچھلے سال جہاں "جام آرزو" کا اینڈ مزہ دے گیا' وہیں نایاب جیلانی کا مکمل ناول اپنے شرارتی فقروں کے ہمراہ دل کو چھو گیا' جبکہ بنت سحر کا افسانہ بھی قابل تعریف رہا۔ سال نو کے حوالے سے کیا گیا سروے نظر سے گزرا۔ سب ہی کے جوابات بہت عمدہ تھے۔ حرا قریشی کا خط ہو یا سروے

ہمیشہ منفرد لفظوں کے پیرہن سے سجا نظر آتا ہے۔ سیدہ نسبت زہرا کا انداز بھی پسند آیا۔ افسانوں میں محرومی اچھا سبق آموز افسانہ تھا۔ ”اب کے برس“ بنت سحر نے پھر سے لفظوں کا خوب صورت سا جال بچھا کر دل کو گرفت میں لے لیا۔ اس ماہ کا ٹاپ آف دی لسٹ افسانہ ”میرے لفظ کو جو زباں ملے“ تھا۔ صدف آصف کا ناولٹ بھی اچھا رہا۔ ”خاک نشین“ یوں تو اچھا ناول تھا مگر اس کے اینڈ پر ہمیں اعتراض ہے۔ علی حسنین کا یوں اچانک مرجانا دکھ دے گیا مگر اس سے زیادہ دکھ سب سے آخری پیراگراف کو پڑھ کر ہوا، مسلمان ہوتے ہوئے بھی لوگ کس طرح غیر مسلم رواج اپنانے اور اندھی تقلید کرنے میں مگن ہے۔

”محبت ابر رحمت“ بہت ہی خوب صورت ناول رہا۔ اب بات کروں گی شعاع کے سب سے زبردست سلسلے کی ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ بہت ہی انوکھا اور اچھا سلسلہ ہے۔ ایسی باہمت و باحوصلہ خواتین کو سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس سلسلے سے بہت سی خواتین کو حوصلہ ملتا ہو گا۔ ہماری ریکویسٹ ہے اس سلسلے کو برقرار رکھا جائے۔

ج ۔ پیاری افشاں! اتنے پیار بھرے انداز میں اتنا جامع اور تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ دل کی گہرائیوں سے ابھرنے والے آپ کے پیار بھرے الفاظ سیدھے ہمارے دل میں اتر گئے۔ خط قطع برید کے بعد شائع ہو تو غم نہ کریں کہ محبت کرنے والوں کے لیے دو چار پیار بھرے الفاظ بھی بہت ہوتے ہیں۔ اب آئی ہیں تو محفل میں آتی جاتی رہیے گا۔

”خاک نشین“ میں کسی غیر مسلم رواج کو دکھانے کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کا پرچار کر رہے ہیں، بلکہ معاشرے کا چلن ہی ایسا ہو گیا ہے اس کو واضح کیا ہے۔ آپ نے غلطی کی نشان دہی کی۔ تہہ دل سے شکریہ آئندہ احتیاط کریں گے۔

اقصیٰ شمس صفدر روڈ مانسہرہ سے شریک محفل ہیں

سرورق بس گزارا تھا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں بہت زبردست تھیں۔ ”جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے“ مجھے بہت پسند ہے۔ نادیہ حسین کا انٹرویو اچھا رہا۔ ایک چینل سے ڈراما سیریل ”ایک تھی مثال“ دکھایا جا رہا ہے۔ انتہائی بکواس کردار اور بوگس اداکاری۔ دل خراب ہو گیا قسم سے۔ ”سیاہ حاشیہ“ ایک دم زبردست تحریر۔ صائمہ اکرم زندہ باد، افسانے سب اچھے تھے۔ ”رقص بسمل“ اچھی ہے، پر مادرا کا کردار مجھے بالکل پسند نہیں، خوامخواہ ڈیسنٹ بنتی ہے، دل میں لڈو پھوٹتے ہوں گے۔ ولید کا کردار مجھے پسند ہے فنی سا۔ کچھ قاری بہنوں سے دلی انسیت ہے۔ جیسے سیدہ نسبت زہرا، نوال افضل گھمن، حرا قریشی، نمرہ اقرا، مسرت الطاف، یاسمین حنفی جو کہ کچھ عرصے سے غائب ہیں۔ ڈاکٹر عائشہ، ثریا شاہ وغیرہ وغیرہ۔ اللہ ان سب کو خوش رکھے۔

ج پیاری اقصیٰ! آپ کی پیار بھری دھونس پر آپ کا پچھلے ماہ کا خط اس ماہ شامل کر رہے ہیں لیکن یہ پہلی دفعہ ہے۔ اس لیے یہ رعایت کی جا رہی ہے۔ آئندہ وقت پر موصول نہ ہوا تو.... پھر آپ سمجھ جائیں۔

”سیاہ حاشیہ“ میں آپ کے سارے اندازے درست ہیں سوائے ایک کے.... کون سا اندازہ غلط ہے۔ یہ ہم نہیں بتائیں گے۔ آپ کو پڑھ کر خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔

عمیرہ بتول اللہ بخش سعیدی نے حیدر آباد سے لکھا ہے

سال نو نمبر شمارہ جنوری کا ہمیں مل گیا۔ حمد و نعت ایمان کو مضبوط بناتی ہیں۔ سلسلے تمام خوب صورت ہیں، ہمیشہ پسند آتے ہیں اور آئے ”جب تجھ سے ناتا جوڑا“ پہلی دفعہ پورا پڑھا ہے۔ ورنہ اس سے پہلے تو آدھا ادھورا پڑھ کے چھوڑ دیتی تھی۔ ہمیں ان کا یہ جملہ ”نظر نہ آنے والے کام“ بہت پسند آیا۔ ہمیں یعنی مجھے بھی اسے چھوٹے موٹے کاموں سے سخت الرجی ہوتی ہے۔ اس ماہ کی کھلکھلاہٹوں میں بندہ نواز نے ہمیں خوب ہنسایا۔ نظموں میں پروین شاکر کی نظم کچھ کچھ سمجھ میں آئی، باقی تو آدھی ادھوری سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آئے الفاظوں کے، مگر اپنی طرف سے معنی گھڑنے کے علاوہ میں بڑوں سے بھی پوچھ لیتی ہوں۔ ”بدلہ“ کہانی پڑھی۔ سوری افسانہ بڑا مزے دار، آخری پیراگراف نے دل کو چھولیا۔ میں نے ایک لطیفہ ”وجہ پریشانی“ بھیجا آپ نے سمیعہ ادریس فرام کراچی کے نام سے شائع کر دیا وہ۔

ج ۔ پیاری سمیرا! صرف وہی خطوط ردی کی نذر ہوتے ہیں جو تاخیر سے موصول ہوتے ہیں۔ آپ کا خط یہ بروقت ملا۔ اس لیے شامل اشاعت ہے۔ احمد فراز اور خمار بارہ بنکوی کی غزلوں میں نہایت سادہ الفاظ تھے، پھر بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ حیرت کی بات ہے جبکہ خط سے تو ہمیں آپ

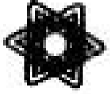
بہت ذہین اور پڑھی لکھی لگتی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے کہ جو بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ بڑوں سے پوچھ لیتی ہیں۔ سوال کرنے سے ہی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کا بھجوایا ہوا لطیفہ کسی دوسرے نام سے شائع ہو گیا اس کے سہو کے لیے معذرت۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے آپ کے ممنون ہیں۔

فبیحہ صابر نے اسلام آباد سے لکھا ہے

ناچاہتے ہوئے بھی پہلے "ایک تھی مثال" پڑھا۔ ٹی وی پر تو کہانی کا سارا ناس مار دیا ہے۔ صرف جلدی ختم کرنے کے چکر میں کتنے پہلو چھوڑ دیے ہیں۔ مکمل ناول میں حرا بتول کا "ابر رحمت" زیادہ اچھا لگا بلکہ بیسٹ لگا۔ ناولٹ میں "سیاہ حاشیہ" میں جو کچھ صائمہ اکرم دکھا رہی ہیں ہم سب بھی کچھ حد تک وہی کچھ پیروی کر رہے ہیں۔ گڈ صائمہ' صدف آصف کا "تم کو چاہ کے" اچھا ٹاپک تھا۔ کسی حد تک ایشال بے چاری ٹھیک بھی تھی۔ بھئی فرسٹ امپریشن بھی کسی چیز کا نام ہے نا.... ہاہاہا.... اس بار سارے افسانے اچھے تھے' بلکہ ناولز پر نمبر لے گئے۔ مجھے سب سے زیادہ ایمل رضا کا "سورج کے پار" اور مصباح علی کا "زباں ملے" بہت ہی پسند آیا۔ مصباح نے بھی درست دکھایا۔ سوچوں کو کاغذ پر اتارنا کون سا گناہ ہے۔ سچ تو یہ ہے جو لوگ رسالوں کو برا کہتے ہیں' ٹی وی پر سب سے آگے بیٹھ کر ناولز کے ڈرامے دیکھ رہے ہوتے ہیں داد کے ساتھ۔ شعاع کا سلسلہ "تم سے ناتا جوڑا" واہ.... بھئی واہ... جلے دل کے سارے پھپھولے وہ بھی مرچ مسالہ لگا کر.... سب ہی کو شغل مل گیا۔ ہونے چاہئیں ایسے پلیٹ فارم جہاں اپنی بھڑاس نکال لو۔ بلکہ دو چار گالیاں بھی نکال لو۔ حرا قریشی اور شہناز یوسف کو پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ بے چاریاں۔ انٹرویو اچھا لگا مگر اب سوال بدل لینے چاہئیں۔ ہاں سالانہ تبصرہ کسی نے خاص نہیں کیا۔

ج۔ پیاری فبیحہ! "تجھ سے ناتا" دل کے پھپھولے پھوڑنے کا شغل نہیں' بلکہ وہ لوگ جو دوسروں کی بیٹیوں کو اپنے گھر لا کر بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی گوشت پوست کی بنی جذبوں سے گندھی نازک دل لڑکیاں ہیں۔ انہیں آئینہ دکھانے کا سلسلہ ہے۔ شاید کہ کسی کا بھلا ہو جائے' کوئی اپنی روش بدل لے۔ اس کے پیچھے صرف یہی مقصد کار فرما ہے۔

ٹی وی پر "ایک تھی مثال" کے ساتھ جو کچھ ہوا' اس پر ہمیں قارئین کے بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔



امتہ الصبور



والٹیر

والٹیر کا اصلی نام فرانسو "ماری اروبہ" ہے۔ 1694ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ رجسٹرار تھا اور ماں ایک شریف گھرانے کی خاتون تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ والٹیر نے اپنی غصہ والی طبیعت اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی اور ذہانت ماں سے۔

والٹیر کے پیدا ہونے میں اس کی ماں کو اتنی تکلیف ہوئی کہ وہ جانبر نہ ہو سکی۔ وہ خود بھی ازحد کمزور تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دائی نے گود میں لیتے ہی کہہ دیا تھا۔ "بچہ ایک دن سے زیادہ نہ جیے گا۔" لیکن اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ وہ 86 سال تک زندہ رہا۔ البتہ بیماریوں اور جسمانی تکلیفوں میں ہمیشہ مبتلا رہا۔

والٹیر کا ایک بھائی "ارمان" بھی تھا جسے آزاد خیالی کے جرم میں کلیسا کے حکم سے قتل کر ڈالا گیا تھا۔ والٹیر کا باپ دونوں لڑکوں کو "پاگل" کہا کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ والٹیر بالکل ناکارہ نکلے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی "ناکارہ" پورے یورپ میں سب سے بڑا اہل قلم تسلیم کیا جائے گا۔ والٹیر کی ماں کے انتقال کے بعد اس کا خاندان پیرس چھوڑ کر دیہات میں جا بسا۔ یہاں ایک دولت مند فاحشہ نے والٹیر کو دیکھا اور اس میں آثار ذہانت و نجابت پائے۔ چنانچہ مرنے سے پہلے وہ یہ نیک کام کر گئی کہ دو ہزار فرانک والٹیر کو دے گئی۔ تاکہ اس روپیہ سے وہ کتابیں خرید سکے۔

والٹیر کو ان کتابوں سے بڑا فائدہ حاصل ہوا اور وہ عمر بھر اس آبرو باختہ عورت کا احسان مند رہا۔ اس کے بعد وہ پادریوں کے پاس دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا۔ جہاں اس نے فن مناظرہ اور علم کلام سیکھا۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے باپ کی ناراضی کے باوجود اس نے شعر و ادب کا پیشہ منتخب کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس پیشے کے متعلق خود اس کی (والٹیر) رائے یہ تھی۔

"شعر و ادب کا مشغلہ ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے بے فائدہ بننا ہو اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سر پر بوجھ بننا چاہتے ہوں۔ یہ ان لوگوں کا پیشہ ہے' جو بھوکا مرجانا پسند کرتے ہیں۔"

1725ء میں والٹیر نے اپنے والد سے علیحدہ ہو کر پیرس میں رہائش اختیار کی۔ اسی زمانہ میں لوئی چہاردہم نے انتقال کیا اور لوئی پانزدہم تخت نشین ہوا۔ بادشاہ کمسن تھا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ والٹیر شورش پسندوں میں داخل ہو گیا اور اپنی بے باکی اور جرأت کی بدولت جلد ممتاز ہو گیا۔ اس کی جرأت کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ نائب سلطنت نے کفایت شعاری کے خیال سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ اس پر والٹیر نے ایک مضمون لکھا۔

"کاش! نائب سلطنت آدھے گدھوں کی فروخت کا حکم بھی صادر کر دیتے' جو حکومت کی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔"

حکام کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو سخت برہم ہوئے۔ ایک دن نائب سلطنت نے والٹیر کو کسی تفریح گاہ میں دیکھا تو اس سے کہا۔

"میں تم سے شرط باندھتا ہوں کہ عنقریب تمہیں ایسی جگہ بھیجوں گا۔ جسے تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

والٹیر نے تمسخر سے سوال کیا۔ "وہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟"

نائب نے کہا۔ "باسٹل کی تاریک کوٹھڑیاں۔"

اس گفتگو کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ والٹیر کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ کاش! اس وقت کی حکومت کو معلوم ہوتا کہ ایک دن یہی

"باسٹل" والٹیر کے پیدا کردہ انقلاب کے ہاتھوں منہدم ہو کر رہے گا۔ اس وقت تک والٹیر اپنے اصلی نام "فرانسو ماری اروبہ" سے مشہور تھا۔ قید ہونے کے بعد اس نے ایک فرضی نام اختیار کیا۔ جو "والٹیر" تھا۔ یہ فرضی نام اس قدر مشہور ہوا کہ آج کی تاریخ کے سوا کہیں بھی اس کا اصلی نام نہیں مل سکتا۔

قید خانے میں ہی اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہنریاڈ" تصنیف کی۔ یہ دراصل ہنری چہارم کا قصہ تھا، جو پہلے پروٹسٹنٹ ہوا تھا۔ پھر دوبارہ کیتھولک ہو گیا اور آخرکار قتل کیا گیا۔ قید خانے میں وہ گیارہ مہینے رہا۔ اسی اثناء میں اسے سخت جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔ لیکن بعد میں خود نائب سلطنت کو اس پر رحم آ گیا اور اسے عزت کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

باسٹل سے نجات پانے کے بعد والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما "اوڈیپ" لکھا۔ یہ ایک نہایت ہی درد انگیز قصہ ہے۔ یہ ڈراما بہت مقبول ہوا اور مسلسل 45 دن پیرس کے تھیٹروں میں دکھایا گیا۔ اسی ڈرامے میں اس نے اپنے یہ انقلاب انگیز خیالات ظاہر کیے تھے۔

"ہمارے کاہن (حکام) ویسے نہیں ہیں، جیسا سادہ لوح اور عوام انہیں سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی قوت پر یقین کرنا اور ایمان لانا چاہیے۔ ہر چیز خود اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہیے۔ در حقیقت ہماری عقل ہی ہمارا معبود، ہمارا عبادت خانہ اور ہماری کاہن (حاکم) ہے۔"

اسی ڈرامے سے والٹیر نے چار ہزار فرانک حاصل کیے۔ والٹیر کے تمام دشمنوں خصوصاً کلیسائی حریفوں نے بیک زبان کہا۔

"شیطان اس کے اندر حلول کیے ہوئے ہے۔"

چنانچہ سینٹ بوف کا قول ہے کہ "ابلیس اس کے جسم میں ہے۔"

رومیسٹو کہتا ہے کہ "یہ شخص جہنم کی تمام قوتوں اور ہولناکیوں کا مالک تھا۔" دراصل والٹیر اپنے وقت کا پورا آدمی تھا۔ یورپ کی اٹھارویں صدی کی ادبیات کی سچی تصویر ہم اس فلسفی شاعر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں اس کی جملہ بھلائیاں اور برائیاں دونوں [illegible] کج خلق، بد اطوار، فحاش اور بے اصول نظر آتا ہے۔ کبھی از حد نفیس، مہذب، سنجیدہ اور با اصول نظر آتا ہے۔ والٹیر ایسی ہی متناقض صفات و اخلاق کا مجموعہ ہے۔

والٹیر کافی محنتی تھا۔ کام سے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی چستی کے ثبوت میں خود اس کے اقوال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

"سستی اور عدم ایک چیز ہے۔" ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

"تمام آدمی اچھے ہیں۔ سوائے ان کے جن کے پاس [illegible] کے لیے کوئی کام نہیں۔"

والٹیر اور روسو ان ہی دونوں نے فرانس کی تخم ریزی کی اور وہ سب کچھ مہیا کیا۔ جس کی اس انقلاب میں ضرورت تھی۔ نپولین اعظم کہا کرتا تھا۔

"بوربون (فرانس کا شاہی خاندان) اپنا تخت و تاج محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اگر والٹیر اور روسو کا منہ بند کر دیتا۔"

ایک موقع پر والٹیر نے کہا۔ "جب قوم سوچنے لگ جائے تو منزل مقصود تک پہنچنے سے اسے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"

والٹیر کے ظہور کے ساتھ ہی فرانس نے سوچنا شروع کیا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔

[illegible] کو بھی اپنے عہد میں اتنا اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ جتنا والٹیر نے حاصل کیا تھا۔ تمام جہاں اس کا مخالف تھا۔ کلیسا جو اس وقت کی سب سے بڑی قوت تھی۔ والٹیر کی دشمن تھی۔ حکومت خون کی پیاسی تھی۔ اسے قید کیا گیا۔ جلاوطن کیا گیا۔ اس کی کتابیں روکی گئیں۔ جلائی گئیں۔ حتیٰ کہ چھاپنے، بیچنے اور پڑھنے والوں تک کو سزا دی گئی۔ مگر والٹیر کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا۔ وہ تمام دشمنوں پر غالب آیا۔ تمام مشکلات پر فتح مند ہوا۔

قدرت نے اس کی عمر میں برکت دی۔ چھیاسی سال زندہ رہا۔ قدیم نظام کی خرابیاں معلوم کیں اور ان کے خلاف جہاد کیا اور جب مرا تو فتح مند تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "تاریخی شخصیتیں" سے انتخاب)

تابندہ گوہر قریشی۔۔۔ ملتان

دستک دستک دستک

شاہین رشید



نوین وقار

"کیسی ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"حال ہی میں آپ کا سیریل "مول" ختم ہوا ہے۔ بہت خوب ---- پرفارمنس دی آپ نے؟"

"شکریہ.... اس سیریل کا فیڈ بیک بہت اچھا رہا۔"

"ایسی صبر کرنے والی اور قربانی دینے والی خواتین ہوتی ہیں؟"

"جی بالکل ہوتی ہیں۔ بہت سے گھرانوں میں اس کردار سے زیادہ صبر کرنے والی خواتین دیکھی ہیں۔"

"پڑھی لکھی خواتین میں اتنا صبر نہیں ہوتا' قربانی تو غریب عورت کے حصے میں ہی آتی ہے؟"

"ایسا نہیں ہے' قربانی عورت کے ہی حصے میں آتی ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر....."

"خیر... آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"

"آج کل' ایک اسکرپٹ پہ کام کر رہی ہوں۔ ان شاءاللہ جلدی مکمل ہو جائے گا۔"

"آپ کو لکھنے کا بھی شوق ہے؟"

"لکھنے کا شوق ہی تو مجھے اس فیلڈ میں لے کر آیا۔ اصل میں تو میں ڈرامہ نویس ہی بننا چاہتی تھی اور چاہتی ہوں اور اس سے پہلے کہ میں اپنا شوق کسی پہ ظاہر کرتی یا کسی کو اپنا اسکرپٹ دکھاتی' مجھے ایک ایف ایم چینل سے آفر آگئی اور میں نے اس آفر کو قبول کر لیا کہ اس کے ذریعے راستے ہموار ہوں گے۔"

"تو پھر راستے ہموار ہوئے؟"

"ہاں.... مگر ڈرامہ تو رہ گیا دوسرے شعبوں میں کام ملتا رہا۔ میں آر جے بنی' پھر وی جے بنی اور پھر ڈرامہ آرٹسٹ بن گئی۔"

"تو ڈرامہ نگار بھی بن جائیں گی' ان شاءاللہ.... کم کام کرتی ہیں آپ اسی لیے کہ شوق نہیں تھا؟"

"نہیں اب تو شوق ہو گیا ہے اور کم کام اس لیے کرتی ہوں کہ میں چاہتی ہوں کہ کم کام کروں اور اچھا کروں۔ کبھی کبھی آؤں' تاکہ لوگ میرا ڈرامہ شوق سے دیکھیں کہ نوین وقار ہے اس ڈرامے میں تو یقیناً سیریل اچھا ہو گا۔"

"آپ آر جے رہیں۔ وی جے رہیں اور ایک دو ڈراموں میں کام بھی کر چکی تھیں مگر عالمگیر شہرت "ہم سفر" نے دی۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایسا موڑ ضرور آتا ہے جو اسے یا تو بہت زیادہ بلند رتبہ دیتا ہے یا ناکامی دیتا ہے۔ "ہم سفر" بھی ایک ایسا ہی موڑ تھا میری زندگی میں۔ جس نے مجھے راتوں رات شہرت دی۔"

"اس سیریل میں آپ "خودکشی" کر لیتی ہیں۔ حقیقت میں ایسی ناکامی ہوتی تو....؟"

"انسان کو اس حد تک نہیں جانا چاہیے۔ میں ایسا کبھی نہ کرتی۔ زندگی خدا کی نعمت اور بہت حسین چیز ہے۔ اسے اپنی مرضی سے جینا چاہیے۔"

"عموماً" ایسا ہوتا ہے کہ جس کردار سے شہرت ملتی ہے، پھر اسی طرح کے رول آفر ہونے لگتے ہیں۔ تو کیا آپ کے ساتھ ایسا ہوا؟"

"نہیں.... ایسا کچھ نہیں ہوا۔ مجھے ہمیشہ اچھے کردار کی آفر ہوئی اور ہم سفر کے کردار کو بھی ہم مکمل طور پر منفی نہیں کہہ سکتے۔ یہ پوزیٹو نیگیٹو تھا۔ حقیقت سے قریب تھا۔ لڑکیاں جب محبت میں چوٹ کھاتی ہیں تو پھر وہ نیگیٹو ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر انتقام کا ایک جذبہ آجاتا ہے۔"

"ابتدا آپ نے ایک کامیڈی سیریل سے کی۔ "عینی کی آئے گی بارات" میں بھی آپ کا کردار حقیقت نسبتاً" کامیڈی تھا' تو آپ ایزی کہاں فیل کرتی ہیں۔ سنجیدہ کرداروں میں یا کامیڈی میں....؟"

"کام اگر مزے کا ہو' میری مرضی کا ہو تو میں ہر جگہ ایزی فیل کرتی ہوں۔ مجھے کامیڈی رولز میں بھی مزہ آیا اور سنجیدہ میں بھی لیکن پھر بھی مجھے کامیڈی رول کرنے میں تھوڑی مشکل ہوئی۔ میرے نزدیک کامیڈی کرنا تھوڑا مشکل کام ہے۔"

"نوین! آپ ابھی بھی ریڈیو پہ پروگرام کرتی ہیں۔ لوگ سنتے ہیں آپ کو....؟"

"بہت سنتے ہیں اور باتیں کرکے خوش ہوتے ہیں اور دلچسپ بات بتاؤں کہ میں لائیو کالز بھی لیتی ہوں اور میرے پروگرام میں اکثر مشہور شخصیات بھی آتی ہیں' تو اس وقت مجھے بہت شرمندگی ہوتی جب لوگ مہمانوں کو نظر انداز کرکے مجھ سے بات کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

"اچھا.... ہو سکتا ہے انہیں وہ مہمان ہی پسند نہ ہوں اور وہ اس لیے آپ سے بات کرتے ہوں؟"

"ہاں.... ایسا ہی ہو گا لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ میرے مہمانوں سے بھی باتیں کریں۔"

ارجمند رحیم

"جی مزاج کیسے ہیں؟"

"الحمدللہ..."

"چپ رہو..." میں بہترین پرفارمنس دی آپ نے۔ اب کس میں اپنی اداکاری سے چونکا رہی ہیں؟"

"دو ڈرامے ہیں... ایک حسیب حسین کا ہے جو کہ آپ کے انٹرویو کے آنے تک آن ایر ہو چکا ہوگا اور ایک کی ریکارڈنگ کے لیے لاہور میں ہوں۔ اب یہ نہیں پتا کہ کب مکمل ہوگا۔"

"کبھی کراچی، کبھی لاہور، لائف ڈسٹرب نہیں ہوتی؟"

"نہیں... کیوں ڈسٹرب ہوگی۔ اداکاری میرا جنون ہے اور اس کے لیے مجھے کہیں بھی جانا پڑے میں ضرور جاؤں گی۔"

"جنون تو آپ کو کلاسیکل ڈانس کا بھی تھا؟"

"تھا کیا... ہے... مگر ہمارے ملک میں رقص کو کچھ زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، ماحول سازگار نہیں ہے، ورنہ میں نے تو باقاعدہ رقص سیکھا ہوا ہے اور سیکھنے کے لیے میں انڈیا گئی تھی اور پنڈت برجو مہاراج سے میں نے رقص کی ٹریننگ حاصل کی تھی۔"

"کام کے معاملے میں لاہور بہتر ہے یا کراچی؟"

"ایک زمانہ تھا جب سب کچھ لاہور میں تھا۔ فلمیں بھی لاہور میں بنتی تھیں اور ڈرامے بھی... اب صورت حال بدل گئی ہے، اب کراچی میں بہت کام ہو رہا ہے... فلمیں بھی کراچی میں ہی زیادہ تر بن رہی ہیں اور ڈرامے تو خیر بن ہی کراچی میں رہے ہیں... تو اب تو ایسا لگتا ہے جیسے پورا لاہور، کراچی میں شفٹ ہو گیا ہے... تو بس ہمیں تو کام کرنا ہے، خواہ وہ کراچی ہو یا لاہور..."

"فلم کی بات چلی ہے تو آپ کچھ کر رہی ہیں فلم کے لیے...؟"

"فی الحال تو کچھ نہیں کر رہی فلم کے لیے... مگر میرا



"لوگ میوزک سننا زیادہ پسند کرتے ہیں یا آپ کی باتیں؟"

"دونوں... باتیں بھی اور میوزک بھی... میں اپنے پروگرام میں ہر ٹاپک پہ بات کرتی ہوں۔ شاید اس لیے لوگ میرے پروگرام کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

"آپ کے مزاج کی خوبی؟"

"کہ میں بہت ہلہ گلہ کرنے والی لڑکی ہوں۔ ہنستی بھی ہوں، ہنساتی بھی ہوں اور موڈی بھی ہوں۔"

"کوئی دیرینہ خواہش؟"

"پوری دنیا کا سفر کرنا چاہتی ہوں۔ گھومنا چاہتی ہوں اور زندگی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔"

"طبیعت میں تیزی ہے یا سستی؟"

"سچ بتاؤں... میری طبیعت میں سستی ہے اور کبھی کبھی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ میری یہ سستی میرے کام میں رکاوٹ نہ بنے۔"

"ضدی ہیں؟"

"اپنے کام کے معاملے میں ضدی ہوں۔ جس کام کا ارادہ کر لوں کر کے رہتی ہوں۔ اپنے کام سے بہت مخلص ہوں"

ارادہ ضرور ہے۔ نہ صرف فلم میں کام کروں گی' بلکہ فلم پروڈیوس کرنے کا بھی۔۔۔ ان شاء اللہ جلد ہی آپ کو اچھی خبر ملے گی فلم کے حوالے سے۔۔۔ کیونکہ آج کل فلم کے لیے ماحول بھی سازگار ہے اور لوگ فلم دیکھنا بھی چاہتے ہیں۔"

"آج کل ڈراموں میں جو ماحول اور جو کہانیاں دکھائی جارہی ہیں اس سے آپ مطمئن ہیں؟"

"بالکل نہیں۔۔۔ یہ سب کچھ ریٹنگ کے چکر میں ہورہا ہے اور بہت غلط ہورہا ہے۔ آج جو کچھ آپ دکھا رہے ہیں' اس کا اثر فوری طور پر تو نہیں ہوگا لیکن دس پندرہ سال کے بعد اس کے غلط نتائج ہمارے سامنے آئیں گے اور پھر ہم پچھتائیں گے کہ ہم نے ایسا کیوں کیا تھا۔ لڑکیاں غلط راہ پر جارہی ہیں۔ گھر سے بھاگ رہی ہیں۔ بغیر شادی کے بچے ہورہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"تو کوئی کہنے والا نہیں ہے کیا؟"

"یہی تو۔۔۔ یہ کام پیمرا کا ہے' وہ ان چیزوں پر نظر رکھے کہ ہمارا میڈیا ڈراموں کی صورت میں کیا دکھا رہا ہے۔ آزادی کی بھی ایک حد مقرر ہونی چاہیے۔ آپ برائیاں دکھائیں مگر ان کا انجام بھی برا دکھائیں۔ انجام ایک قسط کا اور برائی کئی اقساط پر۔۔۔ یہ غلط بات ہے۔"

"اب اس فیلڈ میں پیسہ بھی بہت ہے۔ پیسے کو ہر کوئی ترجیح دیتا ہے' آپ بھی دیتی ہوں گی؟"

"میں نے کبھی پیسے کو اہمیت نہیں دی اور نہ ہی میں پیسے کے لیے کام کرتی ہوں اور نہ مجھے شہرت کی طلب ہے۔ مجھے کام کا جنون ہے' یہ اس وقت کی بات ہے' جب میں اس فیلڈ میں نئی نئی آئی تھی میں نے اپنے کام سے اپنے آپ کو منوایا ہے اور اب اگر مجھے اچھا معاوضہ ملتا ہے تو اس میں میری محنت کا بہت عمل دخل ہے اور اب ہم ان فنکاروں میں شمار ہوتے ہیں جن کی ایک ایک سال کی بکنگ ہوتی ہے۔"

"آج کل کی لڑکیوں کے لیے کیا کہیں گی؟"

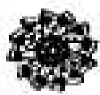
"آج کل کی لڑکیوں کے لیے کہوں گی کہ وہ بہت خوش قسمت ہیں کہ انہیں اتنے سارے چینلز مل گئے اور وہ آج کے اس دور میں ہیں جہاں کام کی اور ٹیلنٹ کی ڈیمانڈ ہے۔ اچھا ماحول ہے اور اچھے کیمرے وغیرہ ہیں۔"

"آج کی عورت کیا اتنی ہی مظلوم ہے جتنی دکھائی جاتی ہے؟"

"میرے خیال سے نہیں' کیونکہ اب عورت باشعور ہے۔ پڑھ رہی ہے اور محنت کررہی ہے۔ ایسے ڈرامے ہمارے معاشرے کا اچھا تاثر پیش نہیں کرتے۔ دوسرے ممالک میں بھی یہ ڈرامے دیکھے جاتے ہیں۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"آپ اپنے کام سے مطمئن ہیں؟"

"میں مطمئن اس لیے ہوں کہ اپنی پسند کے کردار لیتی ہوں۔ ہر آفر کو قبول نہیں کرتی۔ میں نے اب تک جتنا کام کیا' اس کے لیے میں شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے اپنے ہر کام کو انجوائے کیا ہے۔"



واصفہ سہیل

آپ جانے میں



سلسلہ

عدنان سمیع خان کو بار بار بھیک میں مانگی جانے والی بھارتی شہریت بالآخر مل ہی گئی لیکن اب باقی ماندہ زندگی عدنان کو بھارت سے اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑے گا۔ عدنان سمیع خان نے بھارتی شہریت ملنے پر وزیراعظم نریندر مودی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹوئٹر پر جے ہند کا نعرہ بھی لگا دیا۔

عدنان کے اس نعرے کا جواب بھارتی صحافی شکھر گپتا نے دیا۔

"جے ہند کا نعرہ لگا کر ہمیں خوش کرنے کی کوشش نہ کرو، تم اپنے وطن کے نہ بن سکے، ہمارے کیا بنوگے؟" (یعنی وہ کیا کہتے ہیں کہ دھوبی... گھر... گھاٹ... سمجھے؟)

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یحییٰ خان کے دور میں جنرل رانی کے نام سے مشہور ہونے والی اقلیم اختر رانی رشتے میں عدنان سمیع کی نانی تھیں۔ جنرل رانی کی بیٹی عروسہ عالم پچھلے کئی سال سے بھارت میں بھارتی پنجاب کے ایک سیاست دان ارمیندر سنگھ کی دوست بن کر رہ رہی ہیں۔ بھارتی میڈیا میں تو یہ خبریں بھی چھپی تھیں کہ عروسہ اور ارمیندر سنگھ شادی کر چکے ہیں لیکن ارمیندر سنگھ کی بیوی نے اس کی تردید کی۔ یہ عروسہ عالم، عدنان سمیع کی خالہ ہیں۔ بھانجے نے 2001ء اور خالہ نے 2004ء میں پاکستان چھوڑا لیکن اس وقت جنرل پرویز مشرف حکومت نے ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی، کیونکہ ان کے خاندان کے اہم اداروں سے مضبوط تعلق تھے۔ عدنان سمیع خان کے والد ارشد سمیع خان بھی پاکستان چھوڑ کر امریکہ چلے گئے اور ان کا انتقال ممبئی میں ہوا تھا۔ ارشد سمیع پاکستان ایئر فورس میں اسکوارڈن لیڈر تھے اور پینسٹھ کی جنگ میں انہوں نے ستارۂ جرأت بھی حاصل کیا۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں میں سفیر رہے۔ 1989ء میں کینسر کا شکار ہوئے تو بے نظیر بھٹو نے ان کا علاج سرکاری خرچ پر برطانیہ میں کرایا۔

جعلی ویڈیو

2009ء میں سوات میں ایک خاتون کو کوڑے مارے جانے کی ایک ویڈیو منظرعام پر آئی، جس نے ہمارے ملک کے ٹیلی وژن چینلز کو پاگل کر دیا۔ تمام چینلز نے ہر تیس منٹ کے وقفے سے اس ویڈیو کو بار بار چلایا اور دنوں ہفتوں اس پر پروگرام بھی کیے۔ مذاکرے ہوئے، جس میں شریک کچھ لوگوں نے تو اسلام کی سزاؤں کو ظلم و جبر قرار دے دیا، جبکہ سنجیدہ حلقے اس وقت بھی یہ کہہ رہے تھے کہ یہ ویڈیو جعلی ہے

کیونکہ کوئی عورت اتنے کوڑے کھا کر کھڑی نہیں ہوسکتی۔ خیر۔ اب 13 جنوری 2016ء کو سپریم کورٹ نے ازخود نوٹس کیس کا فیصلہ سنا دیا کہ یہ ویڈیو جعلی ہے۔ جعلی ویڈیو چلانے والے اکثر چینلز نے یا تو اس خبر کو نشر ہی نہیں کیا یا پھر سرسری سی خبر چلا دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انہوں نے ہی تو اس خبر کو لے کر اتنا شور مچایا کہ سوات آپریشن کی راہ ہموار ہوگئی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس سے ساری دنیا میں پاکستان کا نام بدنام ہوگا۔ اس ویڈیو کے ذریعے سوات امن معاہدے کو تباہ و برباد کیا گیا۔ کئی نام نہاد اسلام دشمن این جی اوز مالا مال ہوگئیں۔ (بھئی انہوں نے اس ویڈیو کے حق میں ریلیاں اور پروگرام جو کیے۔) لیکن وہ کس منہ سے عوام کا سامنا کریں گے؟ (اس ملک پاکستان میں یہی آزادی تو ہے کہ کچھ بھی کرکے آپ جواب دہ نہیں ہیں۔) ایک دلچسپ بات یہ کہ اس جعلی ویڈیو کو تو بار بار چلایا گیا۔ اس جھوٹ پر دنوں ماتم ہوا لیکن سپریم کورٹ کے اس فیصلے کا چینل پر کوئی ذکر ہی نہیں۔ (صحافت اسی کو کہتے ہیں؟)

دوستی

نئے لوگوں نے جب فلم بنانے کی ٹھانی تو فلم کا وہ ٹرینڈ جو فلم انڈسٹری کو تباہ کرچکا تھا بدل دیا۔ دور حاضر کو سامنے رکھتے ہوئے فلمیں بننا شروع ہوگئیں۔ اب وہ ڈائریکٹر جو لکیر کا فقیر بنے فلمیں بناتے تھے وہ بھی اس تبدیلی میں شامل ہونا شروع ہوگئے ہیں سنگیتا بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہیں۔ ان کی فلم ”تم ہی تو ہو“ میں متیرا کو کاسٹ کیا گیا ہے۔ سنگیتا اس بارے میں کہتی ہیں کہ میری فلم میں کوئی آئٹم سانگ نہیں ہے۔ متیرا اس فلم میں اہم کردار ادا کررہی ہے فلم انڈسٹری کو متیرا کی صورت ایک باصلاحیت اداکارہ ملے گی۔ (ویسے متیرا کے ہوتے ہوئے آئٹم سانگ کی ضرورت بھی نہیں ہے) متیرا اس بارے میں کہتی ہیں کہ ”مجھے میڈم سنگیتا کے ساتھ کام کرکے بہت کچھ سیکھنے کو مل

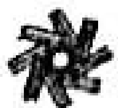


رہا ہے۔ میں تو ایک اسٹوڈنٹ ہوں، مجھے جہاں سے کچھ سیکھنے کو ملے گا میں اس سے ضرور کچھ سیکھوں گی۔ میڈم سنگیتا کے پاس بہت سے آئیڈیاز ہیں، ہم بھی ان کے سینئر ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔“ (اور عمل کتنے پر کرتے ہیں؟) ان کے ساتھ دوستانہ ماحول میں کام ہورہا ہے۔ (خیال رہے کام بھی ہو کہیں دوستی ہی نہ ہو.....)

اِدھر اُدھر سے

ستم ظریفی دیکھئے جو کام میں نے کیا جس کی وجہ سے مشرف اور اس کے بعض ساتھی ذلت کے بجائے سر اٹھانے کے اور سیدھا چلنے کے قابل ہوئے، مشرف نے جو کچھ میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ سلوک کیا اسے احسان فراموشی ہی کہہ سکتے ہیں اگر جناب بھٹو، غلام اسحاق خان، جنرل ضیاء الحق اور محترمہ بے نظیر صاحبہ اس پروگرام کو چلنے نہ دیتیں اور نواز شریف صاحب جرأت اور حب الوطنی کا مظاہرہ نہ کرتے تو ہم سب مودی کے حکم اور خواہش کے مطابق گردنیں جھکا کر اور ادب سے اس کے سامنے مارچ کررہے ہوتے۔

(ڈاکٹر عبدالقدیر خان۔ سحر ہونے تک)



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

چقندر کی سلاد اورنج ڈریسنگ کے ساتھ

ضروری اشیاء :

چقندر	آدھا کلو
کینو کا رس	ایک چوتھائی کپ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سفید مرچ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
رائی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
کینو کے چھلکے	نصف چائے کا چمچہ
پیاز گول کٹی ہوئی	ایک چوتھائی کپ

ترکیب :

چقندر کو ابالیں، جب ٹھنڈے ہو جائیں تو انہیں چھیل لیں۔ انہیں کیوبز کی شکل میں کاٹیں پھر ان کو ٹھنڈا کرلیں۔ کینو کا رس، تیل، نمک، مرچ، رائی (پسی ہوئی) اور کینو کے چھلکوں (پسے ہوئے) کو ایک پیالے میں خوب اچھی طرح سے ملالیں اور یہاں تک کہ یک جان ہو جائیں۔

اس ڈریسنگ کو چقندر کے ٹکڑوں پر ڈالیں اور گول کٹی ہوئی پیاز کے ساتھ سجائیں۔

کشمیری دم آلو

اشیاء :

آلو	ایک کلو
تیل	تلنے کے لیے
خشک کشمیری مرچیں	پانچ سے چھ عدد
دہی	دو کپ
الائچی	آدھا چائے کا چمچ
خشک ادرک	ایک چائے کا چمچہ
سونف	دو کھانے کے چمچے
تیل	ایک چوتھائی کپ
لونگ	ایک چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
بھنا ہوا دھنیا	نصف چائے کا چمچہ
گرم مسالا	نصف چائے کا چمچہ

ترکیب :

آلوؤں کو چھیلیں اور انہیں نمکین پانی میں پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں اور درمیانی آنچ پر تلیں یہاں تک کہ ان کا رنگ سنہرا بھورا ہو جائے، خشک کشمیری لال مرچوں کو پیس لیں۔

پسی کشمیری لال مرچ میں پسی ہوئی (الائچی، خشک ادرک اور سونف) کے ساتھ دہی کو پھینٹیں۔

ایک پین میں تیل گرم کریں اور لونگ ڈال دیں۔ نصف کپ پانی اور نمک ڈال کر اسے ابال لیں۔ پھر اس میں دہی کا آمیزہ ڈالیں اور اسے ابال لیں۔ پھر تلے ہوئے آلو ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ آلو گریوی کو جذب کرلیں اور تیل اوپر آجائے۔

تازہ بھنے اور پسے ہوئے زیرے اور پسے ہوئے گرم مسالے کے ساتھ سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

کھنڈوی

اشیاء :

بیسن	سوا کپ
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
ہری مرچیں	دو عدد
دہی	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	نصف چائے کا چمچہ

لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
پانی	نصف کپ
تیل	چار کھانے کے چمچے
رائی	ایک چائے کا چمچہ
کٹا ہوا ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

بیسن چھان کر ایک برتن میں رکھ دیں۔ ایک تھالی کے الٹی جانب تھوڑی سی چکنائی لگا کر رکھ دیں۔

دہی میں پانی ملا کر لسی بنائیں۔ بیسن میں پسی ادرک اور ہری مرچیں، نمک، پسی ہلدی، لیموں کا رس اور لسی ملائیں۔ یہ احتیاط کریں کہ گٹھلیاں بننے نہ پائیں۔

اس آمیزے کو اتنا پکائیں کہ وہ گاڑھا ہو جائے، برابر ہلاتے رہیں۔ پھر اس آمیزے کو گرم حالت میں چکنی کی گئی تھالی پر پتلا پتلا پھیلا دیں۔

جب ٹھنڈا ہو جائے تو نمک پارے کی شکل کے ٹکڑے کاٹیں۔

تیل گرم کر کے اس میں رائی ڈالیں۔ ٹکڑوں پر بگھار لگا دیں۔ کٹے ہوئے دھنیے کے پتوں کے ساتھ پیش کریں۔

مونگ کے چیلے

اشیاء :

مونگ دال (دھلی ہوئی)	ایک کپ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
پنیر	سو گرام
کٹی ہوئی پیاز	آدھا کپ
کٹے ہوئے ٹماٹر	آدھا کپ
کٹا ہوا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
لال مرچ (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

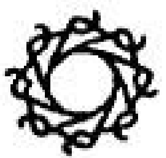
مونگ کی دال کو صاف کر کے دھو لیں۔ مونگ کی دال کو دو کپ پانی میں دو گھنٹے تک بھگو دیں۔ بھگوئی ہوئی مونگ دال کو زیرہ اور ہری مرچوں کے ساتھ پیسیں۔ دو کھانے کے چمچے کے برابر پانی میں نمک ڈال کر اچھی طرح ملائیں۔

پنیر کو کش کر لیں اور کٹی ہوئی پیاز، ٹماٹر اور ہرا دھنیا نمک اور پسی لال مرچ کے ساتھ ملائیں اور الگ رکھ لیں۔

توے یا فرائی پین میں تیل گرم کریں۔ آمیزے کو چمچے سے تھوڑا تھوڑا توے پر ڈالیں اور اسے پھیلائیں تاکہ یہ تقریباً چار پانچ انچ کا پین کیک بن جائے۔ تقریباً آدھا منٹ تک فرائی کریں۔

دو کھانے کے چمچے کے برابر پنیر کو پہلے اوپر کے حصے پر چھڑکیں۔ آمیزہ کے اطراف میں بھی تھوڑا سا تیل چمچے سے ڈالیں اور درمیانی آنچ پر پندرہ سیکنڈ تک پکائیں۔

آمیزے کو پلٹ دیں اور دوسری جانب درمیانی آنچ پر دو منٹ تک پکنے دیں۔ آمیزے کے اطراف میں چمچے سے تیل ڈالیں اور اسے پلٹ دیں۔ درمیانی تیز آنچ پر ایک منٹ مزید پکائیں۔ پودینے یا اپنی پسند کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔





سردیوں میں جلد کی دیکھ بھال ایک اہم مسئلہ ہے۔ کیونکہ جلد بہت زیادہ خشک ہو کر پھٹنے لگتی ہے۔ چہرے کے ساتھ ساتھ پیروں اور ایڑیوں کی جلد بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ سردیوں میں پانی کا کم استعمال بھی ہے۔ بارہ سے چودہ گلاس پانی ہر موسم میں ہمارے جسم کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے سب سے پہلے جسم میں پانی کی کمی دور کی جائے۔ اس کے علاوہ مختلف پھلوں کے جوس بھی پیے جاسکتے ہیں۔ سردیوں میں منہ دھونے کے بعد موئسچرائزر کا استعمال ضرور کریں اور باہر جاتے ہوئے سن بلاک لگانا نہ بھولیں۔ یہ نہ صرف گرمی بلکہ سردی کی دھوپ سے بھی محفوظ رکھے گا۔ جلد کا خیال رکھنے کے لیے مہنگی کریموں اور لوشن کا استعمال ضروری نہیں بلکہ اس کے لیے آپ دیسی ٹوٹکے اور سبزی فروٹ سے بھی مدد لے سکتی ہیں جیسے......

سردیوں کی خاص سوغات گاجر جس کا نہ صرف حلوہ بنایا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا رس پینے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اس سے رنگت نکھرتی ہے۔

ٹماٹر کا رس چہرے کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس سے بلیک ہیڈز بھی ختم ہو جاتے ہیں اور رنگت بھی صاف ہو جاتی ہے۔

چہرے اور جسم کی خشکی کے لیے زیتون کے تیل کی مالش کی جاسکتی ہے۔ زیتون کے تیل کے مستقل استعمال سے جھریوں کی آمد سست پڑ جاتی ہے۔

عرق گلاب، لیمن جوس اور گلیسرین کا آمیزہ نہ صرف چہرے بلکہ ہاتھ پاؤں کو بھی ملائم رکھتا ہے۔

آٹے میں دودھ اور لیمن جوس ملا کر لیپ کریں۔ پندرہ منٹ بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔

صندل ووڈ پاؤڈر اور ملتانی مٹی میں عرق گلاب ملا کر پیسٹ بنالیں۔ چہرے پر لگائیں۔ خشک ہونے پر صاف پانی سے دھولیں۔ یہ ماسک آپ کے چہرے سے اضافی چکنائی جذب کرے گا۔ گرد و غبار اور میل صاف کر کے ملائمت بخشے گا۔

شہد اور جو (باریک پیس کر) ملا کر پیسٹ بنائیں۔ تقریباً" آدھے گھنٹے تک چہرے پر لگا رہنے دیں، پھر سادہ پانی سے دھولیں۔

روغن بادام سے چہرے پر روزانہ ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ اس سے جھریاں ختم ہوتی ہیں۔ جلد ملائم ہوتی ہے اور رنگت بھی نکھرتی ہے۔

ایک چمچہ بیسن میں ایک چمچہ دہی ملا کر پیسٹ بنائیں۔ مساج کر کے تھوڑی دیر تک لگے رہنے دیں۔ خشک ہونے پر سادہ پانی سے دھولیں۔ (گرمیوں میں صرف بیسن ہی کافی ہوگا۔) اس سے کیل مہاسے ختم ہوتے ہیں۔

دودھ میں لیموں کا رس ملا کر روزانہ رات کو مساج کرنے سے جلد نرم و ملائم ہوتی ہے۔

دودھ میں تھوڑے سے بادام پیس کر اسکرب بنائیں۔ ہلکے ہاتھ سے مساج کریں۔ پھر دھولیں۔

پھٹے ہوئے ہونٹوں پر بالائی کا مساج کریں، پھر ہلکا نیم گرم کپڑا یا تولیہ ہونٹوں پر رکھ کر ہلکے ہلکے رگڑیں۔ اس سے ہونٹوں کی ساری مردہ کھال صاف ہو جائے گی اور ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔

لیموں کے رس میں ذرا سی چینی گھول کر ہونٹوں پر مساج کریں۔ اس سے ہونٹ گلابی ہوتے ہیں۔

گلیسرین اور عرق گلاب کا خوب اچھی طرح ایڑیوں پر مساج کریں، پھر موزے پہن لیں۔

نیم گرم پانی میں ایک چمچہ شیمپو ڈال کر پاؤں ڈبوئیں۔ اس سے قبل کسی تیل سے مساج کرلیں تو زیادہ بہتر ہو جائے گا۔ پھر جھانویں سے ایڑیاں رگڑیں۔ یہ عمل ہفتے میں کم از کم تین بار کریں۔